TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

UnEven Page Numbers within the book only

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224169
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱s d۲۰۵ ص - ۱

Acc. No. ۱۱۱۰۲
11102

Osmania University Library

Call No ۸۹۱٫ د۳۰۵ Accession No ۱۱۱۰۲

۱۱۱۰۲

Author انجمن معارف حیدرآباد دکن

Title صحیفہ - ماہوار رسالہ

This book should be returned on or before the date last marked below

بادگار جوبلی جوبلی سالہ حضور نظام خلد اللہ تعالیٰ

صحیفہ

یعنی

معارف حیدرآباد دکن کا ماہوار رسالہ

جو

علمی، اخلاقی، تمدنی، تاریخی، ادبی

اصلاحوں کے لیے شایع ہوتا ہے

اور

جس کی بڑی غرض یہ ہے کہ ابنائے ملک کی ہر قسم کی اصلاح کرے

مضامین

۱۔ صحیفے کا چوتھا برس۔ اڈیٹر۔ ۔ ۔ ۔	۱
۲۔ غزل۔ مولوی میر اکرم علی قوی۔ ۔ ۔ ۔	۱۶
۳۔ اسلام و نصرانیت۔ مولوی ملا محمد عبدالباسط (مولوی فاضل) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۷
۴۔ غزل۔ باغ حیدرآبادی۔ ۔ ۔ ۔	۲۱
۵۔ محنت (نظم) سید غلام مصطفیٰ ذہین حیدرآبادی	۲۳
۶۔ غزل۔ ابوطیب محمد یحییٰ قاصد (مولوی فاضل)	۲۴
۷۔ تواریخ طغیانی رود موسیٰ۔ ملا محمد عبدالباسط و محمد عبدالله	۲۴
۸۔ اردو شاعری اور اخلاقی مضامین	۱۸۰ تا ۱۹۳
۹۔ تاول۔ ″ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۹۳ تا ۲۰۸

مرتبہ

محمد اکبر علی مولوی فاضل، منشی فاضل (معتمد انجمن معارف حیدرآباد)

باہتمام

مرزا نثار علی اعزاز

صحیفہ پریس (دروازہ جادرگھاٹ) میں چھپا اور شایع ہوا

ترقی

ایک علمی، اخلاقی، تمدنی، ادبی، مجلسی، تاریخی اور صنعتی مضامین کا ماہوار رسالہ

اس امر کا ثبوت کہ اس رسالے کی خدمات مفید اور قابل قدر ہیں یہ ہے کہ اسکی خدمات کو پبلک نے بنظر پسندیدگی دیکھا اور ملک کے علمی مذاق رکھنے والے اور صاحب رائے اصحاب اخباروں اور رسالوں نے بارہا اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ترقی کی وہ قدردانی ہوئی کہ شاید ہی کسی علمی رسالے کو نصیب ہوئی ہوگی چنانچہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی سفارش سے سررشتہ تعلیم پنجاب اور صاحب کنٹرولر بہادر ہند نے ترقی کو سرکاری و نامل مدارس پنجاب و نامل مدارس صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے لیے جاری کیا۔ دیگر مدارس نے اسے اس تحریک کے اثر سے اپنے ہاں کے لیے جاری کرایا۔ اس بنا پر یہ کہنا مبالغے سے بالکل خالی ہے کہ

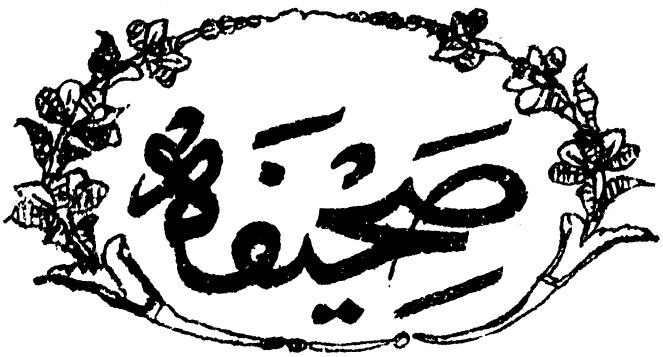
ترقی ایک قابل قدر اردو زبان کے علمی رسالوں میں اپنا نظیر آپ ہی ہے

سال ۱۹۰۸ء کا پروگرام (۱) مسلسل مضامین (۱) تاریخ قدیم۔ تاریخ ہابل (۲) تاریخ جدید۔ تاریخ یورپ جس میں موجودہ سلطنتوں کے وجود میں آنے کا حال درج ہوگا (۳) علمی مضامین وکرہ ہوا کے عجائبات۔ یورپ کی دماغی ترقی اور اسکے اسباب (۴) صنعت و حرفت و تجارت۔ بنک کینک یعنی بہی کھاتہ و امریکا کی سلطنتوں کا حال (۵) سوانح عمری جارج اسٹیفن موجد ریلوے انجن (۶) پولیٹیکل۔ تاریخ پولیٹکس یعنی زمانہ قدیم وحال کی مختلف سلطنتوں کا نظام حکومت (۷) اخلاقی و سوشل۔ زمانہ حال کے محب الوطنوں کی زندگی کے مقاصد و حالات۔ کفایت شعاری مصنفہ اسمائلز صاحب (۸) لٹریچر جدید۔ آئین ہند۔ مصنفہ سر والٹر اسکاٹ۔ متفرق مضامین۔ ہر قسم کے علمی۔ اخلاقی۔ مجلسی۔ تاریخی۔ ادبی اور صنعتی مضامین، کامیابی کے اصول و طریقے۔ ترقی کی راہیں حفظ صحت کی باتیں، نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں علمی خبریں، ماہواری واقعات عالم کا خلاصہ عجائب و غرائب یورپ و امریکہ کے کارخانوں اور کمپنیوں کے حالات زمانہ قدیم وحال کے مشاہیر کی سبق آموز سوانح عمریاں۔ ایسے لوگوں کے حالات جو ذاتی محنت اور کوشش سے ادنیٰ درجے سے ترقی کرکے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئے ہوں۔ زریں اقوال و ضرب الامثال۔ حکمت کے موتی مختلف ممالک کے رواج و علوم علمی چٹکلے، اخلاقی، نیچرل، اور نتیجہ خیز نظمیں، کارآمد اشعار اور ہر ماہ کسی خاص اور مفید بار اعلیٰ درجے کا مضمون حجم ۶۴ سرورق رنگین (۷۰) صفحہ ۲۲۶۸ قیمت مع محصول ڈاک پیشگی یا بذریعہ ویلیو پے ایبل عام

المشتہر۔ مینیجر رسالہ ترقی، انارکلی۔ متصل مارکیٹ۔ لاہور

CHECKED

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



صحیفے کا چوتھا برس

Checked 1979

آذر ۱۳۱۸ف سے شروع ہوتا ہے۔ اس سال کیا کیا ارادے ہیں؛ اور کون کون اُمور قابلِ اجرا معلوم ہوتے ہیں، اُن کا اظہار، شیخ چلّی کی داستان سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا۔ مستقبل پر کسی کو قدرت و اختیار حاصل نہیں۔ عجب چہ دانی کہ فردا چہ حادث شود لہٰذا اِن سطروں میں صرف سالِ گزشتہ کے اہم واقعات کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

گزشتہ سال، صحیفہ کی زندگی کا تیسرا سال تھا۔ تین کے عدد کی نحوست بچے بچے کی زبان پر ہے۔ دلدادۂ عقلیات کے پاس تو یہ بات نہایت مضحکہ آور ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورۂ بالا سال، نہ صرف صحیفہ کے لیے، بلکہ خود اڈیٹر کی ذاتیات کے متعلق بھی نحس اکبر تھا اِس سال ہمارے مرکزِ سکون و طمانیت میں جو تزلزل واقع ہوا، اُس کا بیان غیر ضروری اور محض سامعہ خراش ہوگا۔ لہٰذا صحیفے کو جو جو پریشانیاں اور زندگی سے مایوسیاں پیش آئیں وہی گوش گزار کی جاتی ہیں۔

رکاوٹیں اور دقتیں	تاخیرِ اشاعت کا شکوہ آغازِ سال سے ہی اِس میں پیدا ہو چلا تھا۔ اِس

بیماری کے دور کرنے کا نسخہ، صرف ذاتی پریس کا قیام تھا، مگر چونکہ ہنوز وقت نہ آیا تھا اُس کا سامان ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ چوتھے نمبر تک تو جوں توں کر کے کام ہوتا رہا۔ لیکن پانچویں نمبر سے، ایک نئی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ قدیم کاتب کا مزاج بگڑ گیا، اور علالت کا، سلسلہ دو مہینے سے زیادہ تک جاری رہا۔ ماہواری رسالے کا اتنی مدت تک التوا ناممکن تھا۔ دوسرے کاتب سے لکھوا کے پرچہ شایع کیا گیا۔ چونکہ مطبع سے مالک مطبع کی نگرانی اُٹھ گئی تھی۔ چھپائی ناقص ہونے لگی اور بعد ازاں کام بند ہو گیا، اِس حالت میں بجز اِس کے کہ مطبع مذکور سے قطع تعلق کر کے ذاتی پریس قایم کیا جاتا اور کئی ماہ کی تاخیر کا علاج کر دیا جاتا کوئی چارا نہ تھا۔

مطبع قایم کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اِس کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی۔ مگر خوش قسمتی سے صحیفے کو ایسا مربی مل گیا جس نے قیام پریس کے اخراجات کا بار اپنے سر لیا اور قریباً تین سو روپے کے خرچ سے مطبع قایم کر دیا گیا۔ ۲۵۔ شہریور ۱۳۱۷ف وہ مبارک تاریخ ہے جس میں، چھپائی کا آغاز ہوا۔ اور مہر و آبان کی مدت میں ۶ پرچے چھاپ کر تاخیر کی کسر پوری کر لی گئی، اگر صحیفہ پریس نہ قایم ہوتا تو ہرگز یہ کسر پوری نہ ہو سکتی۔

تعویق کے مرض کا تدارک تو چارو ناچار ہو گیا لیکن اِس مرض نے ایک بڑی خرابی پیدا کر دی، وہ یہ کہ جب رسالہ بروقت ناظرین کو نہ پہنچنے لگا، تو اُنہوں نے چندہ بھیجنا موقوف کر دیا۔ یہ ایسی بڑی مصیبت تھی کہ کسی کے ٹالے نہ ٹل سکتی تھی۔ لیکن صحیفہ پریس کے مربی کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے اب تک ہر ماہ کا صحیفہ بھی قرض کے طور پر اپنے صرفے اور مطبع کی آمدنی سے چھاپ دیا۔ پس اِس وقت صحیفہ پر صحیفہ پریس کا (سما) روپیہ قرض ہے۔ اور اس کی ادائی علم دوست ناظرین کے ذمے ہے جن کی ضیافت طبع کے لیے صحیفہ جاری کیا گیا، اور جن کی خدمت کے لیے اُڈیٹر ہر وقت کمربستہ ہے۔

صحیفے کے التوا کے زمانے میں قریباً ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر چندے کا روپیہ (بہ سکۂ کلدار حالی) جمع ہوا تھا، اور اب ارادہ ہو رہا تھا کہ اس کو بنک میں داخل کر دیا جائے لیکن بدقسمتی سے عین اُسی زمانے میں یہ روپیہ چوری گیا، کوڑھ میں کھاج، اور مفلسی میں آٹا گیلا ہو گیا

اُس بے درد ظالم پر خدا کی مار، جو دن کے وقت دفترِ صحیفہ کے خاص کمرے کا قفل توڑ کے نقدی کا قلمدان لے اڑا۔ اِس صدمے سے رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ مگر صحیفہ پریس کے مربی کی امداد، ٹھیک اسی وقت پہنچ کے مسیحائی کر گئی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔

سال کے خاتمے میں، بُرے ستاروں کی گردش کا منحوس اثر پورا ظاہر ہو گیا۔ ۲۲ آبان سنہ ۱۷ف پیر کے دن موسیٰ ندی کو وہ قیامت انگیز طغیانی ہوئی جس نے حیدرآباد میں حشر برپا کر دیا اور آدھے سے زیادہ شہر کو اجاڑ دیا۔ اِس آفتِ آسمانی نے صحیفے پر بھی پانی پھیر دیا۔ اور صحیفہ پریس کو بالکل ہی ڈبو دیا۔ اگر رحمتِ ایزدی سایہ افگن نہ ہوتی، اور عنایتِ الٰہی سے ملا عبدالقیوم صاحب مرحوم کے مکانات گرنے اور ڈھ جانے سے محفوظ نہ رہتے تو اِس وقت صحیفہ بجائے ناظرین کی خدمت گزاری کے خوابِ عدم کا لطف اُٹھاتا رہتا۔ طغیانی سے اور دل کا، جو جو نقصان ہوا وہ ہوا۔ لیکن صحیفے کو اِس سے جو ضرر پہنچا وہ بھی اِس قدر تفصیل چاہتا ہے کہ اِس مضمون میں سمائی نہیں ہو سکتی۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ صحیفہ پریس کا اُجرتی کام موقوف ہو گیا، اب اگر علم دوست ناظرین اپنی اپنی فرمائشیں اور ضرورتیں بھیج کر اِس کی سرپرستی نہ کریں گے، تو اِس کا گاڑھا چلتا نہیں نظر آتا۔

اِتنے گنڈموں پر بھی صحیفے کا زندہ رہنا، اور برابر شایع ہوا کرنا محض امدادِ ربانی کا نتیجہ اور نیک نیتی کا ثمرہ نہ سمجھا جائے تو اور کیا خیال کیا جا سکتا ہے۔

ایک معزز خریدار صحیفہ نے جب دفتر میں آ کے یہ دیکھا کہ صحیفہ چھاپا جا رہا ہے تو متعجب ہو کے فرمایا "ندی نے ہزارہا گھر مسمار کر دیے، ہزارہا جانیں ہلاک کر ڈالیں، مگر صحیفے کو، نہ مار سکی۔ یہ عجب سخت جان ہے کہ کئی سال سے سسکتے ہی دم بھر رہا ہے اور زندہ سلامت ہے"

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ اُن بلاؤں اور رکاوٹوں کا نہایت اجمالی اور ناتمام خاکا ہے، جو صحیفہ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں اور پیش آتی رہیں، اِس سے ناظرین کو ہر دور کی دقتوں اور جزئی مکروہات کا صحیح اندازہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اُن کا علم اُسی کو ہو سکتا ہے جس کو

وہ روزانہ بلاناغہ پیش آتی اور تاک میں دم کر دیتی ہیں۔ یا اُس کو جو ہمارے ساتھ رہ کر ہمارا شریک حال ہونا چاہتا ہے اور ہمارا ہاتھ بٹاتا ہے۔ دوسرا شخص اُن دقتوں تک رسائی پانے سے بوجوہ مختلفہ قاصر ہے۔

صحیفہ اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوا

بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ صحیفہ اپنے مقاصد یعنے علمی، واخلاقی مذاق کے پھیلانے، تصنیف و تالیف کا مادہ پیدا کرنے، اور ابنائے ملک میں ہلچل ڈالدینے میں ایک خاص حد تک ضرور کامیاب ہوا۔ بعض آنکھیں اس کی منتظر رہنے لگیں۔ بعض کانوں کو اس کی صدا میں بھلی معلوم ہونے لگیں۔ بعض دلوں میں اس کا انداز۔ دلکش پایا جانے لگا۔ اس کے خریداروں کا رجسٹر نئے ناموں سے مزین ہوتا چلا۔ اس کے مضمون نگاروں کی فہرست میں نئے اشخاص کا اضافہ ہوا اس کے مضامین میں نئی تراش خراش اور نئی دلفریبیاں ایزاد کی گئیں۔

اپنی خاص روش میں اس کو گزشتہ سال جو کامیابی ہوئی۔ اُس کو جاننے والے اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ یہی اُس کی اصلی کامیابی ہے اور اسی پر وہ مبارکباد کا مستحق ہوگا۔

ترقی کی رفتار

صحیفے کی رفتارِ ترقی جیسی کچھ قابلِ اطمینان و مسرت رہی۔ وہ اس سے قیاس کی جاسکتی ہے کہ موجودہ اڈیٹر کے اہتمام میں صحیفے کو آئے ہوئے ایک ہی سال گزرا تھا کہ دوسرے سال سے ۱۶ صفحے کا اضافہ کر دیا گیا۔ اگر مذکورہ بالا رکاوٹیں سدِ راہ نہ ہوتیں تو کوئی شبہ نہ تھا کہ اس سال بھی اور ۱۶ صفحے اس پر مستزاد کیے جاتے۔ مگر یہ ابھی مشیت میں نہ آیا تھا۔

حیدرآباد میں بعض اور بھی رسایل شایع ہوتے ہیں جنھیں بڑے بڑے عالی حوصلہ، بلند پایہ اُمرا کی سرپرستی اور فیض بخشی کا فخر حاصل ہے۔ مگر سالہا سال سے دیکھا جارہا ہے۔ کہ جس قطار میں چل رہے ہیں۔ اُس میں ذرا بھی تیزی پیدا ہوئی نہ اندازِ رفتار بدل سکا جو غالباً پاسِ وضعداری کی خاطر سے برقرار رکھا گیا ہوگا۔ ہندوستان کے بھی بعض ایسے ہی رسالے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں صحیفے کو چشم بددور بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ والحمدللہ علیٰ ذلک وعلیٰ کل حال

پہلے کی بہ نسبت مضامین میں زیادہ تازگی آگئی۔ نظمیں جدت طراز اور نیچرل شایع ہونے لگیں، مذاقِ عوام کا لحاظ ملحوظ رکھا جانے لگا۔ اور خاص اسی مقصد سے ناول کا جز مستقلاً بالالتزام شایع کیا گیا۔ علمی تحقیقیں، تاریخی انکشافات، ادبی نکتہ آفرینیاں۔ ترجمے کی رنگینیاں اس کے قالب میں ڈھلنے لگیں،

علاوہ بریں ترقی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ معزز ہمعصروں میں سے حسب ذیل اخبارات و رسایل نے نہایت پرزور الفاظ اور حوصلہ افزا عبارتوں میں اس پر ریویو لکھے۔

انسٹیٹیوٹ گزٹ (علیگڈھ) مخبر دکن (مدراس) زمیندار (کرم آباد) نیر آصفی (مدراس) الحامی (مدراس) انجم بازغ (مراد آباد) ترقی (لاہور) رہنمائے تعلیم (لاہور) کہنیا سہایک (میرٹھ) البیان (لکھنؤ) دبدبۂ آصفی (حیدرآباد)

ان کی قدردانی اور دل افزائی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ سررشتۂ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی یہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ خود عالی جناب نواب سید سراج الحسن صاحب۔ ایم۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا ناظم تعلیمات نے اس کو بچشم خود ملاحظہ فرما کر سرکار میں سفارش کی کہ مدارس کے لیے خریدا جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر تمام ہائی سکولز سرکار عالی کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے۔ ہم عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات کی اس نوازش و عنایت کے خاص طور پر ممنون ہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ عالیجناب صاحبزادہ میر تلاوت علی خان صاحب بی۔ اے۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر بلدہ و عالیجناب محمد عبدالصمد صاحب ایم۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا انسپکٹر مدارس عربیہ نے اپنے اپنے حلقہ کے مدارس میں خریدنے کے لیے ترغیبی گشتیاں نافذ فرمائیں۔ جس سے ہماری ترقی اور خوش آیند زندگی کی کفیل و ضامن ہیں۔

دلچسپی اور مقبولیت ان ریویوز کے علاوہ جو مختلف اردو رسایل میں اخبار کی نسبت شائع ہوئے اس کی دلچسپی اور مقبولیت کا شاہد، وہ مضامین اور تنقیدیں ہیں جو مختلف ہندوستان کے رسایل و اخبارات نے نقل کیے۔ ہم اپنی ناقص یادداشت کی بنا پر ذیل میں ان مضامین کی فہرست درج کرتے ہیں، جو کسی اخبار یا رسالے میں نقل کیے گئے۔

(۱) انبیائے بنی اسرائیل — مولانا محمد عبدالقیوم صاحب — اردوئے معلی علیگڈھ

(۲) اسلام و نصرانیت کا برتاؤ علم و تمدن کے ساتھ۔ — مولوی حافظ محمد عبدالحفیظ صاحب (مسعود الافضل) — شعار الاسلام الہ آباد

(۳) اورنگ آباد — مولوی حاجی حافظ محمد مظہر صاحب الحامی دکن مدراس

(۴) جاہلیت کی انسانیت (نظم) مولوی سید رضی الدین حسن صاحب کیفی یاد نہیں۔
(۵) سچا دوست " " " " پیسہ اخبار لاہور
(۶) باغ امید " مولوی سید نوازش علی صاحب تعہ اہل حدیث امرتسر
(۷) قلمی آصفی کی قدیم مسجدیں مولوی حافظ محمد مظہر صاحب صبح بہار حیدرآباد الحامی مدراس
(۸) سراجی نیوٹن " ملا محمد عبد الباسط صاحب (مولوی فاضل) " "
(۹) گدوال " برہان شاہ صاحب " "
(۱۰) غزلیات (از متفرق شعرائے دکن) اردوئے معلی علیگڑھ۔ نقشہ گورکھپور۔ مدینہ۔ سکندرآباد وغیرہ وغیرہ

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ صحیفے کے مضامین کیسے قابل قدر ہوتے ہیں، اور گھر کے باہر وہ کن نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن ملک کی بے توجہی کے نظر کرتے ہمیں یہہ کہنا پڑتا ہے کہ "سونے کی قدر معدن میں نہیں ہوا کرتی"۔

دائرۂ خریداری افسوس ہے کہ تین سال کی محنت کے باوجود خریداروں کا حلقہ اب تک تین سو سے زیادہ وسیع نہ ہوسکا۔ رسالہ پانسو کی تعداد میں چھپتا ہے اور اخباروں اور مضامین نگاروں کو پہنچنے کے بعد ایک سو کے قریب بچ رہتا ہے۔ اگرچہ اس کا زیادہ قصور پبلک کی بدمذاقی پر آئیگا لیکن کوشش کی کمی کو بھی ایک بڑی حد تک اس میں دخل ہے۔ جو مفت کام کرنے والوں کے نہ ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ توسیع اشاعت کا قوی ذریعہ، ایجنٹوں کا تعین ہے جس کی صحیفہ فنڈ میں سکت نہیں۔ اور مفت کام کرنے والوں کی ملک میں بہتات نہیں۔ سب سے زیادہ رونا جھینکنا اسی کا ہے۔ ورنہ صحیفے کے خریداروں کی تعداد بڑھنے کے بعد، جیسا کہ ہم نے گزشتہ نمبر میں، اعلان کیا ہے۔ صحیفے کا نہایت باقاعدہ ہوجانا نیز اس کی قیمت کا ارزاں کردینا کوئی بڑی بات نہیں۔

صحیفے کی ترقی علمی مذاق کے بڑھنے پر منحصر ہے۔ علمی مذاق کا نقطۂ عروج کو پہنچنا اس وقت ثابت ہوگا جب حضرت زر کی درخشاں صورت پر اس کو ترجیح دی جائے گی اور علمی رسایل وکتب کو روپے سے بڑھ کر عزیز رکھا جائے گا جن ممالک میں آفتاب علم سر پر آیا ہوا ہے۔ وہاں یہی کیفیت ہے ایک ایک رسالہ اور اخبار ہزاروں سے متجاوز ہوکر لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ وہاں مال وکمال کے بیس گنے فرق کی اچھی تمیز پیدا ہوگئی ہے۔ جوان، بوڑھے سبکو

بچے تک نشۂ علم کے متوالے، او. دولت کمال کے والہ وشیدا ہیں۔ ہر ہر شخص علیحدہ علیحدہ اخبار، رسالے خریدتا ہے اور انہیں حفاظت سے رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے یہاں اول تو پڑھے لکھے کم۔ پھر ان میں بھی اخباری مذاق رکھنے والے خال خال، اور ان کی یہہ حالت کہ مفت پر دل دوڑاتے ہیں۔ روپیہ خرچتے جی چراتے ہیں۔ ایسی صورت میں علمی مذاق کو ترقی ہو تو کیونکر ہو۔ بریں ہم غنیمت کہ کچھ اشخاص اس کا چسکا رکھتے ہیں۔ اور مانگے تانگے کی چیزوں سے ہی ذوق طبع کی ضیافت کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطروں سے ہم اس نتیجے پر آتے ہیں کہ صحیفے کی ترقی ملک میں علمی مذاق کے پھیلنے پر منحصر ہے۔ لہذا ہمیں اس مبارک زمانے کا انتظار کرنا چاہیے جس میں مذاق علمی کا بازار گرم ہو جائے۔

مذاق علمی کے پھیلانے کی کوشش محض اسی غرض کے حصول کی خاطر سے ۱۶ء کے اواسط میں یہہ تجویز کی گئی کہ صحیفے کے بدلے میں جو اخبارات و رسایل وصول ہوتے ہیں انہیں عام نگاہوں میں ڈال دیا جائے۔ یعنے ایک پبلک دار الاخبار قایم کیا جائے جس کی فیس بالکل ہلکی رکھی جائے اور عوام کو یہہ موقع دیا جائے کہ وہ چند آنے خرچنے پر اردو کے مشہور و معروف اخبارات و رسایل سے استفادہ کر سکیں۔

اس مقصد کے لیے ایک مکان کی ضرورت تھی۔ چونکہ بدقسمتی سے کوئی مناسب مکان نہ مل سکا۔ نہ دفتر صحیفہ میں اتنی گنجایش تھی کہ وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکتا علاوہ بریں فرنیچر بھی درکار تھا۔ بنا گر علیہ اس تدبیر کو دوسری شکل میں بدل دیا گیا۔ وہ یہہ کہ جو اشخاص اس دار الاخبار کی ممبری قبول کریں ان کے مکانات پر ہی ہر روز اخبارات بھیجے جائیں۔ دوسرے دن واپس لے کر دوسرے دیے جائیں۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ اور قریباً پندرہ سولہ ممبر اس میں شریک ہو گئے جو اب تک باقی ہیں۔ ممبروں کی تعداد پندرہ سولہ سے زیادہ اس لیے نہ بڑھ سکی کہ اول تو اخبارات کافی نہ ہو سکتے تھے۔ پھر اس کے لیے ایک سے زیادہ ملازموں کی ضرورت تھی۔ جن کی تنخواہوں کا بار ممبروں کی ماہانہ فیس (عصہ) کے مجموعے سے کچھ ہی کم رہتا۔

اُن کے اِسی ذکرِ جمیل پہ اکتفا کرتے ہیں۔

مضمون نگاروں کا شکریہ رسالے کی خاص دلفریبی اور اندرونی خوبی، مضمون نگاروں کے قلم کی گل افشانیوں پہ موقوف و منحصر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ صحیفے کو بڑے قابلِ قدر اور لائقِ تحسین مضمون نگار بہم پہنچے ہیں۔ خصوصاً شعرائے دکن خاص طور پر مباہات کے قابل ہیں ہم فخریہ لہجے میں کہتے ہیں کہ صحیفے میں جو نظمیں درج ہوتی ہیں وہ بالکل چوٹی کی ہوتی ہیں اور دلکش و دلفریب ہونے کے علاوہ بہ نسبت دیگر رسایل کی نظموں کے اغلاط سے پاک وصاف رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے رسایل و اخبارات میں وہ نقل کی گئیں۔

اس سال صحیفے کے قلمی اسٹاف میں حسبِ ذیل معاونین کا اضافہ ہوا۔

(۱) عالیجناب صاحبزادہ میر تلاوت علی خان صاحب بی اے مہتمم مدارسِ بلدہ۔

(۲) مولوی میر نوازش علی صاحب لمعہ

(۳) " محمد عبدالرحمٰن صاحب بدر اورنگ آبادی۔

(۴) " خواجہ فیاض الدین صاحب سررشتہ دار اسپیشل آبکاری حیدرک۔

(۵) " محمد یحییٰ صاحب قاصد حیدرآبادی (مولوی فاضل، منشی فاضل)۔

(۶) " سید مودود احمد صاحب قادری تشنہ۔

(۷) " نواب شایق حسین خان صاحب سفیر حیدرآبادی۔

(۸) " سید غلام مصطفیٰ صاحب ذہین حیدرآبادی۔

(۹) " میرزا نثار علی صاحب اعزاز حیدرآبادی۔

(۱۰) " محمد عبدالولی صاحب فروغ حیدرآبادی۔

(۱۱) " محمد عبدالغفار صاحب ساکن ورنگل۔

(۱۲) " برہان شاہ صاحب۔

ملک سے اپیل جو لوگ جاننے اور سمجھنے والے ہیں جنہیں علمی مذاق اور علمی دلچسپی ہے جن کو نفع نقصان کی تمیز ہے۔ اُن سے ہماری یہ اپیل کچھ بے جا نہ ہوگی کہ اگر وہ ملک کو جہالت سے نکالنا پسند کرتے ہیں، اگر وہ ملک میں تمدن پھیلانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ اپنی قوم کو اس کی

پستی اور ذلت سے آگاہ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، تو اُن پر علمی بیداری کے وسایل کی تائید فرض عین ہے۔ اُنہیں اُن ذرایع کی امداد جو اشاعتِ علم کے درپے ہیں۔ نہایت ضروری ہے۔ اُن کو اُن اسباب کی اعانت جو محض قومی فلاح و صلاح کے لیے فراہم کیے گئے ہیں، لازمی ہے۔ صحیفہ بھی اُن ہی کے منجملہ ایک وسیلہ، ذریعہ، اور سبب ہے اس کا مقصودِ اولین یہی ہے کہ ملک میں ذوقِ علمی پھیلائے اور اہلِ ملک میں شوقِ تصنیف و تالیف پیدا کرے۔ اِسی غرض سے وہ دوبارہ زندہ کیا گیا، اور اِسی غرض سے وہ اب تک گوناگوں آفات جھیل کر چلا یا جا رہا ہے۔ اُس کے کام کرنے والے (اور وہ بھی مفت) موجود ہیں اُس کی بقا کے کچھ موجبات مہیا ہو چکے ہیں۔ اُس کے بہی خواہوں کی ایک جماعت فراہم ہو چکی ہے۔ ایسی حالت میں اگر اُس کو تھوڑی سی ہی امداد پہنچائی جائے، تو وہ اردو رسایل میں خاص امتیاز پا سکتا ہے اور اپنا پائدار اثر پھیلا سکتا ہے۔ اُس پہ مصیبتیں آئیں اور شاید آیندہ بھی آئیں۔ لیکن شاید خدا کو اُس کا چلنا پھولنا منظور ہے کہ سخت جانی کے ساتھ سسکتے ہوئے ہی جی رہا ہے۔ اور ابھی آثارِ حیات باقی ہیں۔

ہمدردو! اور بہی خواہو! آؤ۔ قلمے، قدمے، درمے ہلکی ہلکی سی مدد کر کے اِس کی طوفانی کشتی کو سنبھالو اور اِس کے گھنائے ہوئے آفتاب کو آسمانِ ترقی پر پہنچا دو تاکہ اُس کی روشنی میں تمہارا نام چمکتا ہوا نظر آتا رہے اور اُس کی زندگی کی کرنوں کی جھلک دور دور تک پہنچ کے فضائے ظلمانی کو منور بنا دے۔

گزشتہ متحدہ نمبر کی نسبت وعدہ کیا گیا تھا کہ آبان کے اندر ہی اندر شایع کیا جائے گا، لیکن موسمی کی طغیانی نے جہاں اور کاموں میں ابتری ڈالدی، وہیں اِس وعدے کے ایفا سے بھی مانع رہی، پھر بھی صحیفہ طغیانی کے بعد دیگر مقامی رسایل میں باعتبارِ اشاعت اول رہا۔ یہی کیا کم ہے۔

صحیفے کی توسیعِ اشاعت کے لیے ہمیں اضلاع و بلدہ میں چند ایجنٹوں کی ضرورت ہے جو صاحب اِس کارِ نیک کے لیے آمادہ ہوں، جو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے۔ وہ

ہم سے خط و کتابت کریں۔

اخبارات کے متعلق ایک مختصر اور دلچسپ نوٹ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کے نظام الملک (مرادآباد) سے ناظرین کی توجہ و التفات ۔۔۔ کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ شاید اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو۔

لنڈن کے اخبارات کا مقابلہ اردو اخبارات سے

تمام یورپ کے اخبارات کو اس وقت چھوڑ دو اور صرف لنڈن کے اخبارات کو لو اور ہندوستان کے اردو اخبارات سے مقابلہ کرو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم شاید چاک گریباں کا دامان یار سے اور زر و پھول کا رخسار یار سے، یا جگنو کا مہ تاباں سے یا بگولے کا گنبد گرداں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں اخبارات ملک کا ایک بے کار عضو سمجھے جاتے ہیں، اور وہاں سلطنت کے بازو یقین کیے جاتے ہیں، جن کے بغیر کوئی حکومت ترقی کے آسمان میں پرواز کر ہی نہیں سکتی۔ یہاں اکثر اخبار والے نان شبینہ کو محتاج ہیں اور وہاں اخبار والوں کی دولت اور فراغ البالی بیان سے باہر ہے۔ جس قوم کی افسردہ دلی اور فرسودہ خاطری کا یہ حال ہو اس کی سکون و ایجاد کا مقابلہ جلا کس برتے پر کسی ترقی یافتہ قوم کی نقل و حرکت سے کیا جائے۔ لنڈن کا مشہور اخبار ٹائمس پہلے پیرس سے شایع ہوتا تھا، اور یہ وہ وقت تھا جب بوناپارٹ برسر حکومت تھا۔ شاہ نے ایک شادی کی جو دین مسیحی کے خلاف تھی اخبار مذکور میں اس کی مذمت شایع ہوئی جس پر شاہ بہت ہی زیادہ برہم ہوا ملک اخبار اپنی جان بچا کر لنڈن پہنچا اور لنڈن ٹائمس کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا اسی سال اخبار مذکور کو دس لاکھ روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس پر شرکا کی ایک مجلس منعقد ہوئی اور وجہ نقصان پر غور کیا گیا، تو یہ معلوم ہوا کہ اخبار خریداروں کے پاس وقت معینہ پر نہیں پہنچتا ہے، لہذا تجویز ہوئی کہ اس نقصان کی تلافی اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ اخبار مذکور خاص اپنی ریلوے نہ جاری کرے، اور اس ریلوے کی تکمیل میں چالیس لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ قرض لیا گیا۔ ریل کی تعمیر شروع ہو گئی اور

" قرضے برستا گیا۔ یہاں تک کہ مع دس لاکھ زرِ نقصان کے قرضے کی تعداد ستر لاکھ ہو گئی "
" اس مقروضی کا معاملہ اگر ہندوستان میں کسی کے ساتھ پیش آتا تو اس میں کچھ کلام نہیں "
" ہے کہ ہر ایک سننے والا ایسے شخص کو پاگل بتلاتا۔ لیکن فی الواقع ایسے خیال ہوتے ہیں "
" اُس قوم کے جو پست ہمت ہوتی ہے اور جو ہر شناسی کے مادے سے خارج ہوتی ہے "
" آخر ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لنڈن ٹائمس اپنی وقعت، اپنی عزت، اپنی شہرت "
" اپنی دولت میں فرد یگانہ ہو گیا۔ اپنے ایڈیٹر کو صرف **تین ہزار** روپیہ ماہوار "
" دیتا، سب ایڈیٹروں کی تنخواہ چھ ہزار سے دس ہزار روپیہ سالانہ تک ہے۔ اسسٹنٹ "
" ایڈیٹر بھی ہے، جو صرف غیر زبان کے اخبارات سے ترجمہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ "
" ولایت میں ایسے اخبارات بھی ہیں جو دن میں دو بار صبح اور شام شایع ہوتے ہیں "
" جن کے ایڈیٹر تمام شب ہاتھ میں قلم تھامے صبح کر دیتے ہیں اور اخبارات ٹائپ "
" ہو کر چھپتا ہے اور پھر مشین کے ذریعے سے کئی لاکھ کاپیوں کی خود بخود نقل ہوتی ہے اور "
" اُس پر ٹکٹ چسپاں ہو جاتے ہیں۔ تیز دست ملازم نہایت ہی فرطی سے اُن پر ہر "
" خریدار کے نام کا لیبل چپکا دیتے ہیں، اور صبح ہوتے ہوتے شہر کے ہر گلی کوچے میں "
" اخبار تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایسے اخباروں کی ایڈیٹروں کی تنخواہیں تیس ہزار روپیہ سالانہ "
" سے ۳۵ ہزار روپیہ تک ہوتی ہے۔ یہ تو لنڈن کے عام اخبارات اور ایڈیٹروں کا حال "
" ہے۔ اب نامہ نگاروں کو لو تو یہ فن بھی وہاں کمال عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور "
" اس منصب کو لوگ نہایت ہی عزیز جانتے ہیں۔ کوئی ایسا جلسہ نہیں ہوتا جس میں "
" کارسپانڈنٹ نہ ہوں۔ قصداً نامہ نگاروں کو اطلاع دی جاتی ہے اور بلوائے جاتے ہیں "
" ۱۸۷۳ء میں جب شاہزادہ اڈنبرا کی شادی ہوئی ہے تو اخبارات لنڈن کے خاص "
" نامہ نگار ہمراہ تھے۔ شہنشاہِ روس نے حکم دیا تھا کہ ہر ایک کی خاطر مدارات کا انتظام "
" خاص طور پر کیا جائے۔ اسی طرح سے شہنشاہِ روس کی رسم تاجپوشی پر نامہ نگاروں "
" کو عام اطلاع دی گئی تھی کہ اُن کے ساتھ مراحم خسروانہ ملحوظ رکھے جائیں گے اور ہر ایک "
" نامہ نگار کو زادِ راہ دیا جائے گا۔ اور شاہی مہمان بنایا جائے گا اور پانچ پانچ ہزار روبل "

" انعام دیے جائیں گے۔
" کوئی پارلیمنٹ کسی سلطنت کی ایسی نہیں ہوتی ہے جس میں کارسپانڈنٹ
" موجود نہ ہوں۔ ہر اخبار کے نامہ نگار کو خاص جگہ دی جاتی ہے۔ کوئی ایسا پیغام
" نہیں خواہ وہ کسی قدر خفیہ کیوں نہ ہو، جو پریس میں نہ پہنچ جاتا ہو۔ پارلیمنٹ میں
" لنڈن ٹائمس کے سولہ رپورٹر موجود رہتے ہیں۔ اخبار اسٹینڈرڈ کے بارہ۔ دیگر
" روزانہ اخبارات کے سے ۱۰ تک۔ اخبار ٹائمس کے اور پندرہ رپورٹر خاص لنڈن
" کے لیے ہیں۔ جو شہر کے مختلف محلوں میں رہتے ہیں اور ہر واقعے کی اطلاع
" دیتے ہیں۔ اخبارات کے رپورٹر اکثر معزز لوگ مقرر ہوتے ہیں جن کو دس ہزار
" روپیہ سالانہ تک تنخواہ ملتی ہے۔ فرانس میں ٹائمس کا جو رپورٹر ہے اس کو دس ہزار
" روپیہ سالانہ دیا جاتا ہے۔ اخبارات ٹیلیگراف اسٹینڈرڈ ڈیلی نیوز بھی اپنے اپنے رپورٹروں کو
" اسی قدر دیتے ہیں۔
" اخبارات کی نامہ نگاری بڑے بڑے جنرل کمشنر لارڈ فخر سمجھتے ہیں
" اور ذریعہ عزت سمجھ کر اس کو بدل و جان انجام دیتے ہیں اور یہی باعث ہے کہ
" جن اخبارات کے ایسے کارسپانڈنٹ ہوں ان کی آواز کیونکر صدا بہ صحرا
" ثابت ہو۔ گورنمنٹ خاص طور پر متوجہ ہوتی ہے اور ان کی ہر ایک جرح و قدح
" پر کامل غور کیا جاتا ہے۔
" لنڈن میں کوئی انشا پرداز محتاج ہرگز نظر نہ آئے گا۔ عام طور پر اخبارات میں
" جو مضامین خریدے جاتے ہیں ان کا کم از کم نرخ پچاس اور زیادہ سے زیادہ سو
" روپے تک ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے حالات زندگی مفصل لکھے جائیں تو وہ
" ڈھائی سو روپیہ تک فروخت ہو جاتے ہیں۔ لڑائیوں میں کارسپانڈنٹوں کے
" ساتھ خاص رعایت رکھی جاتی ہے وہ اگر گرفتار بھی ہو جائے تو فوراً رہا کر دیا جاتا
" ہے۔ جنگ کریمیا کا واقعہ ہے کہ ٹائمس، کرانیکل، ڈیلی نیوز، لنڈن نیوز وغیرہ
" اخبارات کے رپورٹر موجود تھے۔ گولیوں کا مینہ برس رہا تھا اور یہ تصویریں کھینچ رہے تھے

" بعض کارسپانڈنٹ گولوں کے دھوئیں وغیرہ سے بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو خود کو
" قید میں پایا۔ مگر جب یہہ لوگ جنرل کے رشتہ والے نکلے تو فوراً رہا کر دیے گئے
" پیرس میں ایک مرتبہ شاہ فرانس کے خلاف ایک مضمون لکھا گیا۔ شاہزادی نے
" برہم ہو کے کارسپانڈنٹ کی کان کاٹ دی۔ فوراً معافی مانگنے پر رہا کر دیا اور اس وقت تک
" یہہ حالت رہی جب تک کہ شہزادے کو قتل کے مقابلہ میں سزا نہ دے دی گئی۔ پارلیمنٹ
" کا جنازہ جب اٹھا ہے تو دیکھ لو کہ آدھے یورپ کا مجمع ہمراہ تھا۔ یہہ مہذب ممالک اور
" ترقی یافتہ قوموں کی قدردانی کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ اخباری مذاق اور اخبار بینی
" سے دلچسپی اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ سڑکوں پر جوتا کروب جاروب کش اور چمار
" کفش دوزی کرتے ہوئے ملیں گے۔ ان کے بھی ہاتھ میں اخبار ہوگا۔

" اب اس کے برخلاف اردو اخبارات کے مطالعہ کی بھی ذرا سیر کر لیجیے۔ اور
" ملاحظہ کیجیے کہ ایک ٹوٹا ہوا لکڑی کا پریس ایک چھپر میں رکھا ہے۔ نہ کاپی نویسوں کا
" ٹھیک ہے نہ پریسمین کا۔ آپ ہی اخبار کے اڈیٹر۔ آپ ہی کاپی نویس۔ آپ ہی
" مصحح سنگ، آپ ہی پریسمین۔ اس پر پبلک کی سرد مہری اور گویا:-

" روسے پہ سو دسے "

" ہیں۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے تعرض لیا جائیگا، جب تو غریب نے پبلک کا خاطر
" تورمہ پلاؤ نہ سہی، نان جویں مہیا کی ہوتی۔ مگر یہہ ہیں کہ دعوت شیرازہ کی بڑھ مار کر
" ڈکار تک نہیں لیتے۔

" اگر کسی محلے میں ایک اخبار آتا ہے تو سارے اہل محلہ ڈاک کے وقت جمع
" ہو جاتے ہیں، اور اخبار کے پہنچتے ہی بجز غور کے ہو جاتے ہیں۔ یہہ پبلک کا مذاق
" ہے۔ اور یہہ قدردانی ہے جس پر شکایت کی جاتی ہے کہ عموماً ہندوستانی
" اخبارات اور خصوصاً اردو اخبارات کچھ لکھتے ہی نہیں۔ جب آپ کی قدردانی
" کا یہہ حال ہے تو وہ غریب کیا لکھیں۔"

ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ سُنا اور معلوم کیا ہے کہ بعض خریداروں کو جب بعض نمبر ڈاک کی غلطی سے نہیں پہنچتے ہیں یا پہنچنے کے بعد کھو جاتے ہیں تو وہ راست دفتر کو اطلاع دیکر نہیں منگوا لیتے، بلکہ بعض اور خریداروں سے طلب کرتے ہیں، یا چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں چندہ طلب کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ پرچے برابر نہیں پہنچے۔ ان میں سے بعض تو واقعی عذر رکھتے ہیں لیکن بعض وہ خوش معاملہ عنایت فرما بھی ہیں جو صرف چندے کے تقاضے سے جان چھڑانے کے لیے یہ جا یہ حیلہ نکال کھڑا کر دیتے ہیں۔ لہٰذا مکرر اطلاع دیجاتی ہے کہ جب کسی مہینے کا رسالہ نہ پہنچے تو براہِ راست دفتر کو مطلع فرما دیا جائے۔ اگر دفتر سے اس کی تعمیل نہ ہو تو ہماری خطا میں شک نہیں۔

چندے کے متعلق معزز ناظرین خیال کرتے ہیں کہ سال گزرنے پر ادا کیا جائے گا۔ اس خیال کی پہلے بھی تردید کی گئی تھی۔ اب پھر کی جاتی ہے کہ جب تک چندہ نہ وصول ہو اس کے اخراجات کیونکر چل سکتے ہیں لہٰذا بہر حال میں چندہ پیشگی عنایت ہونا ضرور ہے۔

ایڈیٹر

غزل میر اکرم علی قوی - برادر شریعت پناہ قاضی بلدہ تلمیذ کفی حیدرآبادی

نکرد خوار بمحشر شراب خواری ما — رساند تا در بخشش گناہگاری ما
کجا گل ست و کجا او نمیرسد زنہار — جگر خراشئ بلبل بہ دل نگاری ما
بہ یک دو جام مے لالہ فام بفروشیم — کجاست آنکہ خرد جنس ہوشیاری ما
نہد بہ پائے تو زلف دراز سر ہر دم — خبر نشد زکہ آموخت انکساری ما
چہ است زلف پریشاں برگ عشاقاں — چہ فرض بود بہ تو رسم سوگواری ما
کشیم بادۂ الفت زچشم میگونش — جداست از ہمہ آئین بادہ خواری ما
طپیدن دل مجروح خوش تماشائیست — بیا، بیا؛ بنگر طرز بیقراری ما
زدست دامن دل چاک چاک میآریم — جنون عشق کند قدر دست کاری ما

قوی ہنوز نہ شد رہ بکوئے او پیدا
دریغ بر دل و بر چشم و اشکباری ما

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ

علم و تمدن کے ساتھ

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

پراٹسٹنٹ اور اصلاح

شاید کوئی یہ کہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ رومانی کیتھولک کنیسہ کا عملدرآمد تھا لیکن مسیحیت میں چند ایسے مصلح اور رفارمر پیدا ہوئے، جنہوں نے دین کو کتب مقدسہ کی اصلیت اور حقیقت کے مطابق کیا اور عامۂ ناس کو اُمورِ دین میں غور کرنے اور سمجھنے کی اجازت دی اور اُس تسلط کو اُٹھا دیا جو پہلے عام طور پر دلوں اور عقلوں پر چھایا ہوا تھا جب سے کہ اصلاح کا ظہور ہوا، اور دین کے اصلی اُصول کا نور چمکا۔ یورپ میں آفتابِ علم نے چوطرف اپنی شعاعیں پھیلائیں اور علم کے ساتھ رقی و سماحت کا برتاؤ ہونے لگا اور یہ اصلاحات اور ترقیاں محض اس لیے ظہور پذیر ہوئیں کہ طبیعتِ دین کے موافق تھیں۔

جواب میں ہم اپنی طرف سے کوئی بات لکھنا نہیں چاہتے بلکہ خود پراٹسٹنٹ فی اصلاح کی تاریخ میں جو کچھ بیان کیا ہے اُسی کو ذکر کر دینا کافی سمجھتے ہیں: "اگر کوئی شخص کسی فرقے کی عقیدے کی مخالفت کرتا تو اُس کو موت کی سزا دی جایا کرتی تھی۔ کلفان[1] نے سرٹیٹ کو جلانے کا حکم دیا تھا، کیونکہ وہ دینِ مسیحی کی نسبت یہہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اُس میں بدعتوں کی آمیزش آگئی ہے اور کہا کرتا تھا کہ روح القدس ایک دن اُس کی طبیعت کو اپنی اصلی حالت پر لائے گا۔ اُس کو اتنی سی بات پر یہہ سزا دی گئی کہ وہ آگ پہ بھونا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں فانیتی فی تلمذ بھی اسی طرح جلا کر مار ڈالا گیا۔"

---

[1] کلفان پراٹسٹنٹ کا دوسرا رفارمر ہے، اور لوتر پہلا۔

لوتر، ارسطو کے فلسفے کو نہایت نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا اور اُس کو ہمیشہ ناپاک سور کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔ کالون اگرچہ اس فیلسوف کے حق میں زیادہ اول نہیں کہتا ہے۔ لیکن وہ بھی اس کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتا اور اُس کی تصنیفات کے مطالعے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ اس کے برعکس علمائے مسلمین کو دیکھو کہ وہ کس کشادہ خاطری سے اس فیلسوف کو "معلم اول" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

خود عیسائی کہتے ہیں کہ پراٹسٹانٹ نے کتب مقدسہ کے سمجھنے میں آزادی دی۔ پادریوں کے اقتدار کو جو گناہوں کے معاف کرنے اور ثواب و سعادت اُخروی کے بیچنے میں اُنہیں حاصل تھا باطل کیا اور تصویروں کی عبادت کو اُٹھا دیا یہ سب کچھ سہی لیکن اُنہوں نے اعتقادات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔ اُنہوں نے ان اعتقادات میں کہ کتب مقدسہ نور ایمان کا ذریعہ ہونے کے علاوہ دنیوی علوم کے چراغ ہدایت ہیں، جو باتیں کتب مقدسہ کی مخالف ہیں، اُن میں عقل سے کام نہیں لینا چاہیئے، جو کچھ کتب مقدسہ میں آگیا ہے اس کے علاوہ اور معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی طرح کا تغیر و تبدل نہیں کیا۔ اُنہوں نے مذکورہ بالا اچھے اُصول میں سے کسی اُصول کو باطل نہیں کیا۔ البتہ اُصول دوم میں روما کے تسلط کا جو ذکر کیا گیا تھا، اُس میں کسی قدر تخفیف کردی ہے اور اُس تشدد و غلو کو باقی نہیں رکھا جو پہلے اس بارے میں کیا جاتا تھا۔

عیسائیوں کا بیان ہے کہ کیتھولک اور پراٹسٹنٹ مذہبوں کی بنا چونکہ ایک فطرت اور ایک طبیعت پر ہے (جس کی توضیح و تشریح ہم نے اُصول ستہ میں کردی ہے) اس لیے ان دونوں مذہبوں میں یکساں فلاسفروں اور عقلیات میں غور کرنے والوں کے ساتھ قتل اور خوں ریزی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ علم کے ساتھ برابر برتاؤ کرنے میں پراٹسٹانٹ، کیتھولک سے کچھ کم نہیں ہے اور باعتبار رزق و مدارات کے کیتھولک پر اس کو کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔

مسیحیت میں دینی اور دنیوی قوتوں کی تفریق

جامعہ نے دینی اور دنیوی قوتوں کی تفریق کے لیے جو بنیاد قایم کی اور علم کے ساتھ

دین مسیحی کی مسامحت کو ثابت کیا تھا۔ ہم کو اس میں کلام کرنا باقی ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ انجیل کی اس عبارت سے جو اس امر کے ثبوت میں پیش کی گئی تھی۔ ان دونوں قوتوں میں تفریق پیدا ہوتی ہے تو اسکا کیا علاج کہ خود بادشاہ کا مذہب ملک سے دشمنی اور مخالفت کرتا ہے۔ کیا بادشاہ کا مذہب اور اعتقاد جس میں اس کی نجات روحانی ہے ملک کے اغراض و مقاصد پر غالب نہیں آئے گا؟ ایسی بہتیری نظیریں ہیں کہ بادشاہوں نے مصالح مملکت کو اپنے عقیدے اور مذہب پر قربان کر دیا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مصالح مملکت کا خیال انسان کے مذہبی عقاید اور ایمان پر غالب آیا کرتا ہے اور دین مسیحی نے دونوں قوتوں کی تفریق کر دی ہے۔ ان میں سے دینی قوت تو زمین و آسمان کے خدا سے ملاتی ہے اور عالم بالا اور عالم فانی دونوں میں کوس لمن الملک بجاتی ہے۔ اور دنیوی قوت اس عالم میں حکومت کرتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ان دونوں میں تفریق کر دینے سے جھگڑا چک سکتا ہے؟ کیا ان میں سے ہر ایک اپنے حکموں پر غالب ہونا اور دوسرے کے تسلط کو اٹھانا نہیں چاہے گی؟ کیا وہ اپنی رعایا کے جان و مال اور ان کی عقلوں پر بادشاہوں کو اس فانی ملک کے مصالح کے موافق تصرف کرتا دیکھ کر چپ چاپ بیٹھی رہے گی۔ خاصکر ایسی حالت میں جب کہ یہ باتیں کتب مقدسہ کے خلاف اور روحانی کے ارشادات کے برعکس ہوں۔ جب ایک قوت مقابلے کے لیے اٹھے تو دوسری قوت خاموش رہے گی؟ عالم مسیحی میں جب سے کہ دینی تسلط نے ظہور پکڑا اسی قسم کے جھگڑے برپا رہے۔

دنیوی قوت میں اتنا تامل ہوتا نہیں کہ وہ دینی قوت پر غالب آئے اور اس کو اپنی حد پر قایم رکھے۔ چونکہ دینی احکام خدائی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور لوگوں کے دلوں پر ان کا گہرا اثر پڑتا ہے اور دنیوی قوت جو کچھ ہے وہ محض ان چند ضعیف و مغلوب لوگوں سے ہے جو دینی تسلط کے بوجھ میں دبے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس وقت تک دنیا دین پر غالب نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ان کثیر التعداد وسایل کو استعمال نہ کرے جو دینی قوت کے تسلط کو ضعیف کر دیتے ہوں۔ ہاں اس تفریق سے تسامح اس وقت

ظہور پذیر ہو سکتا تھا کہ اجسام جن پر دنیوی احکام جاری کیے جاتے ہیں۔ بغیر واسطۂ روح کے کام دے سکیں اور ارواح بھی بغیر اجسام کے جو روحانی قوت کے حامل ہیں کام کر سکیں۔

یہاں دیکھنا یہ چاہیے کہ انجیل کی عبارت کے سیاق و سباق سے بھی یہ تفریق مستنبط بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ انجیل میں جو قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض یہودیوں نے مسیح علیہ السلام کو آزمانا اور زک دینا چاہا۔ اور ان سے آکر پوچھا کہ قیصر کو جزیہ دینا جائز ہے یا نہیں وہ ان کی شرارت کو سمجھ گئے اور کہا کہ مجھے کیوں آزماتے ہو۔ جزیے کا سکہ لاؤ کہ میں اس کو دیکھوں اور تمہارے سوال کا جواب دوں وہ سکہ لائے۔ انہوں نے اس کو دیکھ کر کہا۔ یہ صورت اور یہ نقش کس کا ہے؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ قیصر کا۔ اس پر مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور اللہ کا اللہ کو۔ پس سیاقِ قصہ سے یہ معنی مستنبط ہوتے ہیں کہ بادشاہ جس نے سکہ جاری کیا ہے اور جس کے سکے سے تم لین دین کرتے ہو۔ اگر تم پر جزیہ مقرر کرے تو اس کو ادا کرو۔ لیکن دلوں اور عقلوں اور اپنی ان تمام چیزوں کو جو اللہ کی طرف سے تمہیں ملی ہیں اور جو اللہ کی نشانیاں ہیں، قیصر کو نہ دو۔ علم ایسی چیز نہیں ہے کہ قیصر کی طرف سے ملے بلکہ یہ خدا کی دین ہے۔ اس لیے یہ دینی اور روحانی قوت کے سوائے کسی اور قوت کے ماتحت نہیں ہو سکتی۔ پس سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں علم کے ساتھ کیا تسامح ہوا؟

مسیح علیہ السلام اور ان کے دین کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ

جو کچھ ہم نے دینِ مسیحی کی طبیعت اور اصول کے متعلق بیان کیا اور کچھ زمانے پیشتر تک طالبانِ علوم و معارف کے ساتھ اس کا جیسا کچھ سلوک رہا ہے۔ اس کو ذکر کیا ہے۔ یہ کل کا کل عیسائیوں کی مصنفہ تاریخوں اور ان کی دینی کتابوں سے جن پر ان کو وثوق یا انکا عملدرآمد ہے اخذ کیا گیا ہے۔

لیکن مسیح علیہ السلام اور ان کے دین کے متعلق خاص ہماری اور صحیح عقیدہ

رکھنے والے مسلمانوں کی رائے بالکل اِس کے برعکس ہے۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح علیہ السلام روح اللہ اور کلمۃ اللہ تھے اور بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ نے توریت کی تصدیق کی اور اُس مذہب کی ہدایت دی جس میں اُمورِ معاش و معاد کی اصلاح تھی۔ آپ نے اپنی امت کو خدا کی موہوبہ قوتوں میں سے کسی قوت کو معطل کرنے کے لیے نہیں فرمایا۔ بلکہ اِن عنایت کردہ قوتوں پر ادائے شکر کا حکم دیا، اور شکر کا حق اُسی وقت ادا ہو سکتا ہے، جب کہ اُن قوتوں کو اپنے اپنے موقع پر استعمال کیا جائے۔ آپ نے بتایا کہ عقل کا مرتبہ تمام قوتوں سے افضل و برتر ہے، وہ انسانی قوتوں کا ستون اور قوائے روحانی ہے۔ یہ تمام عالم صحیفۂ قدرت اور کتابِ الٰہی ہے جس میں انسان جس قدر زیادہ غور و فکر کرے گا اُسی قدر اُس کو خدا کی ہدایت کا راستہ ملے گا۔ مسیح علیہ السلام سے جو جو باتیں ہم تک پہنچی ہیں اگر وہ اِن اُمور کے مخالف نہوں تو ہم اُن کا اعتقاد رکھیں گے اگر کوئی بات ایسی ہو جو ظاہراً اُن کی مخالف ہو تو ہم اُس کی حتی الامکان تاویل کریں گے اور اصل حقیقت خدا پر چھوڑ دیں گے۔ اور کہیں گے کہ لا علم لنا الّا ما علمتنا۔

خدا کا دین، گزشتہ کا ہو یا اب کا، ایک ہے۔ اگر اختلاف ہے تو صُوَر اور مظاہر کا لیکن اُس کی حقیقت اور اصل جس کے لیے دنیا میں انبیا اور مرسلین بھیجے گئے کبھی متغیر نہیں ہو سکتی۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ خدائے واحد پر ایمان لانا، اُس کی عبادت میں خلوص پیدا کرنا، لوگوں کی معاونت اور ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنا، اور حتی الامکان کسی کو تکلیف دینے اور ایذا پہنچانے سے بچنا! انسانی عقلیں جس قدر بھی ترقی کر جائیں اور کمال کی انتہائی حد پر پہنچ جائیں ہرگز اِن اُصول کی مخالف نہیں ہو سکتیں۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ دین اسلام تمام انسانوں کو اِن اُصول پر متفق کرنے نازل ہوا ہے اور اِس کا بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں جو خلاف واقع ہو گیا ہے۔ اِس کو دور کرے اور ان کو اتفاق، اخوت اور محبت و الفت کی طرف بلائے۔ اِسی اُصول پر ایک قرن تک مسلمان بوجہ اسلام کی صحیح اور کامل پابندی کے عمل کرتے رہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم نے علم کے ساتھ دینِ مسیحی کی منافات اور خصومت کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا ہے۔ اگر یہ فضلائے یورپ کے اقوال سے ثابت ہے تو یورپ وحشت اور جہالت کی پستی سے، تمدن و تہذیب کے اسٹیج پر یکایک کس طرح آگیا اور اس کی حالت میں یہ عظیم الشان انقلاب کیونکر پیدا ہوگیا اور یہ تسامح اور فراخ دلی جو وہاں علم سے برتی جاتی ہے کیسے ظہور پذیر ہوگئی؟

اس کا جواب ہم جامعہ کے چوتھے اعتراض کے جواب میں دیں گے۔ لیکن ہم اس کے پہلے دینِ اسلام کی طبیعت کو واضح کر دینا اور علم و تمدن کے ساتھ اس کے برتاؤ کو بتا دینا چاہتے ہیں۔ گزشتہ موقع پر ہم نے جس ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے حتی الامکان ہم اس میں بھی اسی ایجاز و اختصار سے کام لیں گے۔

محمد عبد الباسط

غرق اتنے ہوئے ہیں ترے شیدا تہِ دریا
آباد ہے اک دوسری دنیا تہِ دریا

پانی میں کبھی دھوئے جو وہ کاکلِ مشکیں
ہو مردمِ آبی کو بھی سودا تہِ دریا

بیتابیٔ امواج یہ بے وجہ نہیں ہے
شاید ہے کسی کا دلِ شیدا تہِ دریا

ہم نے لبِ ساحل جو کبھی اشک بہائے
یہ حال ہوا چھپ گیا دریا تہِ دریا

میں ان کا گنہ گار ہوں جو چاہیں سزا دیں
یا کوہ پہ وہ پھینکیں مجھے یا تہِ دریا

پڑتے ہیں یہ کس واسطے پانی پہ پھپولے
یہ گرمِ فغاں کون ہے مجھ سا تہِ دریا

زخموں کے لہو میں دلِ پُرشوق ہے ایسا
ڈوبا ہوا جس طرح سفینہ تہِ دریا

آہوں سے مرے آگ میں جل جائے سمندر
رونے سے مرے ہو ابھی دریا تہِ دریا

پوشیدہ مرے سینے میں یوں ہیں درِ مضموں
جس طرح صدف میں درِ یکتا تہِ دریا

آنکھیں تہِ دریائے سرشک اپنی ہیں بازغ
یا یہ کوئی پانی کا ہے چشمہ تہِ دریا

بازغ حیدرآبادی

محنت

محنت کرو تو ہوگی، محنت سے دور کلفت — محنت کرو ملیگی، محنت کے بعد راحت
کیا علم و فضل و حکمت، کیا مال و جاہ و دولت — حاصل ہوں نعمتیں سب، محنت ہی کی بدولت
محنت سے جی چرانا، یہہ پست ہمتی ہے — بنتے ہیں کام اس سے لیکن بشرط ہمت
عادت کرو تم اس کی ہیں فائدے بہت کچھ — قسمت میں کاہلوں کی مقسوم ہے فلاکت
محنت کے فائدوں کو اک مفلسی سے پوچھو — سستی کی دیکھتے ہو تم رات دن مضرت
بیکار رہنے والے ہیں مبتلا مرض میں — جو لوگ محنتی ہیں، اچھی ہے ان کی صحت
مٹی خراب ہوگی، پوچھے گا پھر نہ کوئی — چندے رہے جو یونہی محنت سے تم کو نفرت
یہہ بات ہے بدیہی، ہر شخص جانتا ہے — ہوتی ہے سب کو ازبس، محنت ہی سے محبت
سوئے ہوئے مقدر، محنت سے جاگتے ہیں — ٹل جاتی ہے اسی سے، آئی ہوئی مصیبت
سب کچھ ملا اسی سے، سب کچھ ملیگا اس سے — دنیا میں مال و دولت عقبیٰ میں حور و جنت
محنت سے جی لگائے، قسمت ہو جسکی اچھی — محنت سے جی چرائے، جسکی بری ہو قسمت
افسوس سے نہ ہوگی، کچھ مدعا برآری — ادبار پر ملے گی، محنت سے فتح و نصرت
بے کار بیٹھے کرنا، قسمت کا شکوہ ہر دم — یہہ ہے، خطا تمہاری، قسمت سے کیا شکایت

محنت کرو تو ہوگا، حاصل ذہین سب کچھ
ضایع کسی کی ہوتی، دیکھی نہ ہم نے محنت

از نیر غلام مصطفیٰ

ہست چشم ساحرت چوں چشم آہو ہو بہو — می نمائی اے پری با خلق جادو دو بدو
نیست حاجت بہر قتل من بہ تیغ آہنین — ز انکہ موجود است ایں شمشیر ابرو رو برو
شد مشام جملہ عالم مشک بیز از زلف تو — ز انکہ می آرد صبا خوشبوئے گیسو سو بسو
گشتہ ابنار سر ہائے قتیلاں مثل کوہ — ریختہ خوں جہاں ایں بوئے دلجو چو بجو

قاصد از دست فراقت دوش می نالید زار
ہر زماں چوں فاختہ می گفت کو کو کو بکو

از ابو طیب محمد یحییٰ

تواریخ طغیانی رودِ موسیٰ

ایکه می پرسی زمن از سرگزشت — چون بتو گویم چها بر سر گزشت
آنکه هرگز دیدهٔ دوران ندید — واں به پیش چشم حیراں درگزشت
آنچه هرگز در خورِ رفتن نبود — بر سرِ ما، زاں همه اکثر گزشت
ماجرائے پُر حذر آمد نظر — هولناک و پر خطر منظر گزشت
منکرِ روزِ قیامت آنکه بود — معترف گشته چو ایں محشر گزشت

آبِ موسیٰ را گوا از سر گزشت
بلکه از دیوار و هم از در گزشت

چون بیاں سازم من از پهنای رود — غالباً از بحر و خاور گزشت
در علو، در فتنه و غارت گری — موجِ او از گنبدِ اخضر گزشت
از برائے قتل و اهلاکِ نفوس — آبِ او، از آبِ خنجر در گزشت
اے دکن اے مایهٔ نازش چرا — در حضیض از حدِ تا اختر گزشت
گر بویراں شهرِ تو آمد کسی — بر کشید آه و بچشمِ تر گزشت
آفتے بر حیدرآباد آمده — در جهاں امثالِ آں کمتر گزشت
آنکه بشنید و ندید احوالِ ما — ق در دلش ایں واقعه احقر گزشت

چون بدید آثارِ تاریخش بگفت
آبِ موسیٰ یا لیقیں از سر گزشت

۱۳۱۷ف

محمد عبدالباسط

تاریخ نثر عربی

إن بطش ربک لشدید

۱۳۱۷ف (محمد عبداللہ شرشتہ دار منصفی پرتھنی)

شہید	تعظیم تک شہید نہ اک آشنا سے مانگ	جو کچھ کہ مانگنا ہے تجھے اب خدا سے مانگ
〃	داغِ جگر سے قبر ہی روشن ہے غم کسے	گر ہو گیا ہوا سے چراغِ مزار گل
〃	کافر ہو، جس کو ہو حسرتِ جاہ	استغفر اللہ استغفر اللہ

اظہارِ دوستی و وفاداری و جاں نثاری (۱۹)

میر	شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے	رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا
〃	بیٹھا ہوں میر مرنے پر اپنے میں سعد	جدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جاں بانے میرے بعد
〃	قدر جانو کچھ ہماری ورنہ پچتاؤ گے تم	پھر نہیں ملنے کا تم کو کوئی ہم سا آشنا
سودا	قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور	آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے
انشا	لو، جانے والے مڑ کے ذرا دیکھیو ادھر	مانندِ سایہ ہم بھی ہیں تیرے قدم کے ساتھ
جرأت	ہم نے کیں جاں فشانیاں کیا کیا	کہو، تم منھ سے آفریں تو ہمیں
قایم	سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو	پر حیف کہ روبرو نہ سمجھے
مصحفی	ہے کس خوشی سے قلزمِ آتش میں غم طرزن	اے شمع جاں فشانیٔ پروانہ دیکھنا
〃	غنیمہ اگر پھول پان دیتے ہیں	ہم تمہیں اپنی جان دیتے ہیں
〃	اس جانِ جاں پر فدا کر چکے ہم	حق آشنائی ادا کر چکے ہم
حسن	تجھ سوا دل میں نہ ٹھہرے ہے نہ آنکھوں میں کوئی	دل کا مرغوب ہے تو چشم کا منظور ہے تو
〃	وفادار ہو یا جفا کار تم ہو	جو کچھ ہو سو ہو میرے دلدار تم ہو
شہید	حرفِ وفا کو لوحِ دلِ خاص و عام پر	تو نے شہیدِ سحر بیاں لے قلم لکھا
〃	اگرچہ آپ کے لاکھوں ہیں مہرباں مخلص	مگر جناب کا مجھ سا کوئی کہاں مخلص
〃	دوست ہیں اے دوست تیرے دوست کے	اور دشمن کے ترے دشمن ہیں ہم
〃	ہو نہ آزردہ قدیمی میں ترے یاروں میں ہوں	ہوں برا کیسا ہی لیکن نازبرداروں میں ہوں
〃	ظاہر ہے فرقِ سنگ تراش و جگر تراش	پھر ظلم ہے جو اس پہ کہیں کوہکن مجھے
〃	موج و حباب و لجہ و گرداب کی مثال	ظاہر میں گو جدا ہوں پہ دل ہے ملا ہوا
〃	انبسی ہوں میں حادثۂ بد و رد محبت	رکھتا نہیں کچھ دل میں بجز درد محبت

انتظار (۹)

میر — جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں — یہہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
" — تا بہ مقدور انتظار کیا — دل نے اب زور بیقرار کیا
سودا — کسی کو پھل کسی کو پھول بخشا باغبان جاکر — چلا جب واں سے تب نرگس کو بخشا انتظار اپنا
" — تکتے تکتے راہ تیری جان گھبرائی ہے آج — نیند کو کیا موت آئی جو نہیں آتی ہے آج
" — آہ میں بیقرار کس کا ہوں — کشتۂ انتظار کس کا ہوں
قایم — وعدہ یہہ کل کے آنے کا اُس سنگدل سے کر — طاقت ہو جس کسی کو ترے انتظار کی
مصحفی — تہ مزار ہماری ہوئیں نہ آنکھیں بند — کہ مر کے بھی ترے آنے کا انتظار رہا
غالب — پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئیں یا نہ آئیں پہ یاں انتظار ہے
شہید — کس کے اب منتظرِ وعدۂ دیدار ہیں ہم — شکلِ نرگس ہمہ تن دیدۂ بیدار ہیں ہم

احسان و عفو (۴)

قایم — بار ور نخل سے سیکھے کوئی احسان کا طریق — سنگ مارے ہے جو اُس کو وہ ثمر دیتا ہے
غالب — نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
" — روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
ظفر — دوست، تو دشمن نہو، دشمن جو بدخوئی کرے — تو نکوئی کر اگر تجھ سے بدی کوئی کرے

احتیاج (۶)

سودا — رزق کا ضامن خدا ناطق کلام اللہ ہے — تو پہ اپنی صورتوں کے روز حاجتمند ہیں
قایم — مر کے بھی چاہیے ہے گور و کفن — کون ہے جس کو احتیاج نہیں
غالب — کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
شہید — جو غنی تر ہیں وہ مفلوک تر آتے ہیں نظر — جو تھے محتاج الیہ اب وہ ہوئے یاں محتاج
" — جتنے آفات ہیں نازل ہوں الٰہی لیکن — جیتے جی ہو نہ کسی کا کوئی انساں محتاج
" — آپ ہی کے در و دولت کی گدائی ہو نصیب — نہ کرے دوسرے کا بادشہِ مرداں محتاج

انجام بینی و عاقبت اندیشی (۸)

مصحفی	وہی تو مرغ چمن میں ہے باغباں زیرک	قفس کو دیکھ کے جو سوئے آشیاں پھر جائے
〃	دیکھیے صبح ہو کیا شام بنے کیا جی پر	ہم اسی سوچ میں دن رات رہا کرتے ہیں
〃	وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا	مجھے رونا ہے خندۂ گل کا
غالب	قرض کی پیتے تھے مے پر یہ سمجھتے تھے کہ ہاں	رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایکدن
ظفر	کچھ بھی ہو جائے قدم پر نہ ہٹے واں سے ظفر	پاؤں ہر کام میں تم سوچ کے اول ڈالو
〃	کم ہو اندیشہ اگر کم ہو مال اندیشی	جتنا دانا کو ہے اتنا نہیں نادان کو خوف
〃	نہیں ہے بے تامل خوب کوئی کام دنیا میں	ظفر کیجے بھلائی یا برائی سوچ کر کیجے
شہید	کیا وہ دنیا کہ ضرر جس میں ہو عقبیٰ کا شہید	وہ نکمہ کام ہو جس کام کا انجام قبیح

اپنے عیبوں پر نظر کرنا۔ (۵)

قایم	کوسوں سے آدمی کو جو دیکھا تو کیا ہوا	وہ چشم ہے جو حال پر اپنے نظر کرے
ذوق	بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر	ہنروراپنے بھی عیب ہنر کو دیکھتے ہیں
〃	رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو	تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
ظفر	نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کی عیب و ہنر	پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نرہا
〃	غیر کا عیب و ہنر ہر کوئی دیتا ہے بتا	اپنا معلوم ظفر عیب و ہنر کس کو ہے

احتیاط (۱۰)

میر	ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں	یہ کارگاہِ دنیا دکانِ شیشہ گر ہے
〃	کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے	ٹھوکیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار
〃	اس مہلتِ دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں	اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل
قایم	غافل قدم کو اپنے رکھنا سنبھال کر یاں	ہر سنگ رہگذر کا دوکانِ شیشہ گر ہے
〃	ہر قدم کوئے بتاں کارگہِ مینا ہے	دیکھنا بچکے سنبھالے ہوئے ہشیاری سے
〃	روش سے چرخ کی امن نہو کہ ایک جہاں	اس آسیا نے انہیں کروٹوں میں پیسا ہے
جرأت	سہل سمجھے نہ کوئی کنج قناعت کی نشست	بیٹھیے یاں جو اسے لازم ہے سنبھل کر بیٹھیے
ظفر	باغِ عالم میں مناسب ہے بشر کو احتیاط	اے ظفر جلتی ہوا یاں دمبدم ہے مخلف

ظفر — ظفر ڈرتے ہیں دانا دیکھ کر سب تختہ زد اسکی / خدا جانے کہ بازی آسمان پیر کیا کھیلے
" — چاہیے حد سے زیادہ نہ بشر چل نکلے / چلیے چال ایسی کہ کچھ کام ظفر چل نکلے
" — نہ جس کے ٹھکانے ہو خرد وہ منزل کو کیا پہنچے / کہ رستہ ہاتھ آیا جسکے ہشیاری سی ہاتھ آیا

اظہار ہنر (۴)

سودا — یارب کہیں سے گرمیٔ بازار بھیج دے / دل بیچتا ہوں کوئی خریدار بھیج دے
" — کھیے کو نہ پوچھوں میں ہنرمند کسے ہوتے / اے شیخ یہ بندہ تو پرستار ہنر ہے
ذوق — ہنرشناس کو دکھلا ہنر کہ خوبیٔ زر / اگر کھلے ہے تو صراف کی نظر چڑھ کر
غالب — اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا / سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

آدمیت (۵)

قایم — کہتے ہیں اس سے کچھ آگے تھے آدمی موجود / اک اب ہے وقت کہ اس نام کا نشان نہیں
" — شیخ جی میں مانتا ہوں تم فرشتہ ہو تو ہو / لیک حضرت آدمی ہونا نہایت دور ہے
غالب — بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا / آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
ذوق — آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے / کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
ظفر — انساں ہے وہی جسمیں ہو انسان کی سیرت / ہیں یوں تو ہزاروں ظفر انسان کی صورت

افشائے راز (۵)

میر — اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں / مطلق نہیں ہے بند ہماری زبان میں
مصحفی — از بسکہ خون دل کا کھاتا ہے جوش ہر دم / مشکل ہوا ہے ہم کو افشائے راز کرنا
" — راز دل اس سے کہا ہے مگر اسکا ڈر ہے / کہ مرے راز کو کہدے نہ وہ نادان کہیں
" — راز دل اپنا کس سے کہوں ہائے مصحفی / ملتا نہیں ہے مجھکو کوئی رازدار دل
شہید — آہ بس جی بات کا مجھے ڈر تھا / اب تو وہ شوخ کر گیا معلوم

ایذا رسانی (۲)

ذوق — موذیوں کو حق نہ دے آنکھیں کہ تا ہیں بلا / ہیں حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب بنے
شہید — رند ہوں میخوار ہوں پر شکر تیرا اے کریم / موذیوں میں ہوں نہ ہرگز میں ان آزاروں میں ہیں

استفسارات

ہمارا عرصے سے خیال تھا کہ صحیفے میں ایک باب استفسارات کے عنوان سے کھول دیا جائے جس میں مختلف علمی، ادبی، تاریخی وغیرہ سوالات چھاپے جائیں اور علم دوست ناظرین کو یہ موقع دیا جائے کہ مضامین و تالیف میں توسن افکار کو مہمیز کریں اور اپنی دماغ کاویوں سے دوسرے نکتہ سنجوں کو لطف آفرینیوں کا شوق دلائیں۔

ہمارا ارادہ شاید ابھی فعلیت کا جامہ نہ پہن سکتا اگر ایک جدید نوازش فرما چند سوالات بھیجکر ہمارے خیال کی تائید نہ فرماتے۔ ہم نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے ایسے زمانے میں یہہ سوالات عنایت فرمائے جب کہ سال نو کا پہلا پرچہ چھپ رہا تھا اور ہمیں موقع تھا کہ سال نو سے اس کا مبارک آغاز کر دیا جائے۔

ہم تمام سوالات اور اُن کے جوابات کو بالالتزام سلسلہ وار چھاپا کریں گے اور کم از کم چار صفحے اس باب کے لیے وقف کر دینگے۔ اگر بعض استفسارات ایسے مفید و ضروری ہوں کہ اُن کے حل پر انعام دیا جائے تو صحیفہ ایک ایک سال کے لیے بطور شکریہ مفت اُن کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ اس باب سے افادہ و استفادہ کے علاوہ غالباً صحیفے میں دلچسپی بھی زیادہ ہو جائے گی جو ہمارا مقصود اولین ہے۔ ایڈیٹر

استفسار (۱) علم ہیئت کی کتابوں میں جدید تحقیقات کے مطابق زمین کے گول ہونے پر منجملہ اور دلائل تو یہ کے ایک یہہ دلیل بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر کسی بلند منار پر سے کوئی شے پھینکی جائے تو زمین کی حرکت کی وجہ سے وہ شے جس سیدھ پر پھینکی جاتی ہے اُس سے زمین کی حرکت کے مخالف جانب کسی قدر ہٹ کر گرتی ہے۔ اس سے یہہ بات لازم آتی ہے کہ اگر زمین کی حرکت کے جانب موافق وہ شے پھینکی جائے تو منار سے اُسی قدر قریب ہو کر گرے جتنی کہ پہلی صورت میں

لینے جانب مخالف پھینکنے سے دور ہوئی تھی۔ حالانکہ یہہ امر مشاہدے کے خلاف ہے نیز قطبین میں سے کسی قطب کی جانب پھینکنے سے بھی قرب و بعد میں کچھ فرق نہیں آتا۔ بصورتیکہ حرکت کی جانب پلٹ کر گرنا چاہیئے تھا۔

استفسار (۲)۔ از روئے تحقیقات جدیدہ یہہ امر مسلم ہے کہ امریکا کا کوئی نہ کوئی حصہ دیگر اقالیم کے کسی ایک مقام سے ایسا محاذی واقع ہوا ہے کہ اگر وہاں سے زمین میں ایک سوراخ بنایا جائے تو اس کا دوسرا حصہ امریکا میں نکلے گا۔ اس امر کے تسلیم کرنے کے بعد فرض کیجیے کہ اس سوراخ میں امریکا سے ایک پتھر ڈالا جائے تو ضرور ہے کہ وہ پتھر دوسرے دہانے سے نکل آئے اور ایسا ہی اگر اس دوسرے دہانے سے پتھر ڈالا جائے تو امریکا میں نکل آئے۔ لیکن بظاہر یہہ محال معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف سے جس کو نیچے فرض کریں اس سے اوپر کو پتھر پھینکا جا سکے اور چونکہ دونوں اقالیم کا ایک دوسرے کے محاذی ہونا مسلمات سے ہے اسلیئے اگر کرۂ ارض بیچ سے ہٹایا جائے تو دونوں کے پانی ایک دوسرے سے ملجائینگے اس لیے دونوں کی مسکونہ زمین کا حصہ اوپر ہی کا ہوا پس بتایا جائے کہ سوراخ سے پتھر کسطرح پار ہو سکتا ہے۔

استفسار (۳) علم ہیئت میں جمع کی مختلف صورتیں لکھی گئی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہہ صورت ہے جو ذیل میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے جمع کرنے کا کوئی آسان قاعدہ بیان کیا جائے۔ مثلاً عرض و طول میں دو دو گولے جمائے جائیں تو اُن کے اوپر اور ایک گولہ رہ سکتا ہے بایں شکل ⁘ جس کا مجموعہ پانچ ہوا۔ اسی طرح اگر کسی ایک تعداد میں عرضاً و طولاً گولے جمائے جائیں تو اُن کی جمع معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے مثلاً بجائے دو دو کے چار چار یا پانچ پانچ جمائے جائیں تو اُن پر کتنے گولے آسکینگے اور اُن کا مجموعہ کیا ہوگا۔

استفسار (۴) و (۵) حضرت آتش کے ان دو شعروں کا صحیح مطلب بیان کیا جائے

بلبل تصویر تھا باغ جہاں میں تیری طرح — باوجود بال و پر بے بال و پر کوئی نہ تھا
جا کے گلزار سے صیاد پھر آیا اُلٹا — کیا نصیبا ہے ترا بلبل شیدا اُلٹا

از م۔ ن۔ ل۔

ریویو

کاشتکار (جے پور۔ عہ) فن زراعت سے بحث کرنا اس کا خاص مقصد ہے جو نام ہی سے ظاہر ہے۔ زراعت کی خوبی اور ترقی پر دنیا کی زندگی موقوف ہے تمدن کا اصل الاصول زراعت ہی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اب تک بہت کم اخبار یا رسالے اس موضوع پر شایع ہوئے ہیں حالانکہ اس مبحث پر قلم اٹھانا اور ملک میں اس کی معلومات کو عام کرنا پہلا فرض ہے۔ زمیندار (کرم آباد) اور کاشتکار (جے پور) بڑے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کی جانب عنان عزیمت پھیری۔

کاشتکار کا پہلا نمبر ہمارے پاس نہیں آیا، شاید پورا ختم ہو چکا، اس لیے دوسرا تیسرا، اور چوتھا نمبر بابت جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۰۸ء بھیجا گیا ہے۔ ان نمبروں کے مضامین گواہی دیتے ہیں کہ اٹھان اچھی ہے۔ آگے چل کے ترقی کرے گا غالباً مع ٹائیٹل پیج کے اس کا ماہانہ حجم ۳۰ صفحے کا ہوتا ہے۔ قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ زمینداروں، اور کاشتکاروں کو خصوصاً۔ عام پبلک کو عموماً اسکی قدردانی ضروری ہے بلکہ بمنزلہ فرض۔

انقلاب (لاہور۔ عصا) اس نام کا ایک نیا اردو اخبار اکتوبر ۱۹۰۹ء سے نند گوپال صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہونے لگا ہے۔ حجم ہفتہ وار اصل اخبار کا ۱۶ صفحے ہے۔ ہم گزشتہ نمبر میں بیداری پر ریویو کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ اخباری ترقی کے لحاظ سے لاہور قابل مبارکباد ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو کوئی دن جاتا ہے کہ ہندوستان میں لاہور اس خاص حیثیت سے درجۂ اول کا شہر سمجھا جائیگا۔

ہندوؤں کے انتظام میں جو رسالے یا اخبار شایع ہوتے ہیں ان میں معاملات سیاست کا عنصر جزو لاینفک ہوا کرتا ہے اور وہ ایک بڑی حد تک جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے اور سچ کہنے کی تعلیم و ترغیب دیتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مقتضائے وقت اور حالات باہمی کے ناموافق رہنے سے اکثر و بیشتر مخالف نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں

چنانچہ بہت سے ہندو اخبارات کے پریس ضبط اور اخبارات موقوف کر دیے گئے ہیں۔ لہذا جو کچھ کہنا چاہیے۔ نرم پیرایے میں اعتدال کے ساتھ کہنا چاہیئے۔ تاکہ اس مصرع کا مصداق نہ بننا پڑے۔ ع کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بری طرح۔

خدا جانے حیدر آباد کی علمی فسردگی اور اخباری مردہ دلی کب دور ہوگی، اور ہمیں وہ مبارک دن کب دیکھنے نصیب ہوں گے کہ حیدر آباد کے ایک ایک محلے میں کئی کئی اخبار و رسائل کے دفتر ہوں گے اور وہاں فری ریڈنگ روم کھول دیے جائیں گے۔ بچے بچے کے ہاتھ میں اخبار ہوگا اور گلی کوچوں میں اپنی ضرورتوں کے معلوم کرنے اور بہم پہنچانے کے مشورے اور ساتھ ہی ساتھ عملی کام آغاز ہو جائیں گے۔

ایڈیٹر

غزل

بلا کے قبر میں شانوں کو بیقرار کیا — میں سو رہا تھا مجھے کس نے ہوشیار کیا
تو آگئی، مری پیاری قضا خدا کی پناہ — تمام عمر ترا میں نے انتظار کیا
گنہ جو ہم نے کیے تو نہ کر سکا زاہد — خدا کی کس نے ہے رحمت پہ اعتبار کیا
ہے سچ تو یہ، نہ ہوا مبتلائے غم گویا — بلا میں صبر کسی نے جو اختیار کیا
ہوا وصال تو لذت وصال کی پائی — لحد نے خوب ہی لپٹا کے مجھ کو پیار کیا
بہار آتے ہی وحشت کا پھر ہوا دورہ — جنوں میں جیب و گریباں کو تار تار کیا
نہ ٹپکا آنکھ سے آنسو نہ دل ہوا مضطر — کسی نے رازِ محبت نہ آشکار کیا
کسی کا اس میں اجارہ، ہمارا دل صاحب — نہ اعتبار رہا تھا نہ اعتبار کیا

جتائی یار کو الفت یہ کیا کیا اغراز
جو آشکار نہ کرتا تھا آشکار کیا

مرزا نثار علی اغراز حیدرآبادی

سیلیا اِن خیالات کو تاڑ گئی تھی، ایک رات جب اُس نے لوئی کو آہیں بھرتے اور آنسو بہاتے دیکھا تو غم سے دل بھر آیا۔ قریب آئی اور بے اختیار ہو کے پوچھا:۔

"آپ کیوں رویا کرتے ہیں؟"

لوئی: "جب تم شادی کر لوگی، تو مجھ سے چھوٹ جاؤ گی، مجھے تمہاری جدائی ناگوار ہے اسی سے رویا کرتا ہوں۔"

سیلیا: "مجھے تو شادی کا خیال تک نہیں آتا۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ میں اسی کو اپنی سعادت سمجھے ہوئے ہوں کہ عمر بھر آپ کا سایہ میرے سر پر رہے۔"

لوئی: "یہ سعادت اُس وقت پوری ہوتی جب میں زیادہ سے زیادہ ۳۵ سال کا ہوتا مگر اب کہ عمرِ عزیز کے ۴۵ سال گزر چکے ہیں۔ کیونکر مناسب ہے کہ میں تمہیں اپنے لیے روک رکھوں۔"

اِس کا جواب سیلیا کی طرف سے ایک کرشمۂ جانفزا تھا جس سے لوئی سمجھ گیا کہ سیلیا اُس کی بی بی بننے پر رضامند ہے۔ اُس کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ مارے خوشی کے جامے سے باہر ہو گیا اور بیس دن کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ سیلیا سے شادی کر لی۔ دوسرے سال سیلیا کو بیٹا پیدا ہوا۔ پال نام رکھا گیا۔

کچھ برس گزرے تھے کہ لوئی بوڑھا ہو گیا۔ چوطرف سے بیماریاں آ آ کے ستانے لگیں بیمار افریش ہو گیا۔ ع پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند۔ سیلیا جوان تھی اور اپنی سہیلیوں کی طرح لہو پسند تھی۔ اِس لیے لوئی نے اجازت دے رکھی تھی، کہ لوگوں سے ملتی جلتی رہے اور سوسائٹی سے میل جول رکھے۔

تھوڑے عرصے میں سوسائٹی کی بلاؤں سے سیلیا منجھلے میں پھنس گئی۔ ایک خوش گفتار، بامذاق نوجوان، اُس پر بے اختیار لٹو ہو گیا۔ جذباتِ عشق کا اظہار کرتا اور لطف و محبت کی باتوں سے دل لبھاتا۔ دن رات کا اکثر حصہ دونوں کی ملاقات میں گزر جاتا۔ اِس نوجوان کا نام "بیرن سمم" تھا۔ سیلیا کو باعصمت سہی، مگر نوجوان تھی اور ایک پیرِ ناکارہ کی بی بی، اگرچہ حفظِ شرافت اور پاسِ تہذیب کے تقاضے سے

بیرن کے ساتھ گرداب معصیت میں نہ پھنسی، مگر نہال عشق نے دل میں جڑ پکڑ لی جس سے عیش تلخ ہوگیا، اور خواب نوشین کا لطف جاتا رہا۔ تپ عشق میں جلا کرتی تھی اور موم کی طرح اندر ہی اندر گھل رہی تھی، صرف پال کے دیکھنے سے کسی قدر جی بہل جاتا تھا۔

بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ ڈائری (روزنامچہ) میں جہاں اور واقعات لکھتی ہیں، اپنے اہم اور پوشیدہ اسرار بھی لکھ ڈالتی ہیں۔ سیسلیا بھی اُن ہی عورتوں میں سے تھی، اُس کا کوئی راز ایسا نہ تھا جو ڈائری میں نہ درج رہتا۔ اپنے تمام جذبات عشق اُسمیں لکھ رکھتی، اور زیورات کے صندوقچے میں مقفل کر دیتی تھی۔

ایک دن مارکوس کو کاغذ کی ضرورت ہوئی، تلاش کرتا ہوا بی بی کے کمرے میں پہنچا سیسلیا اُس وقت گھر میں نہ تھی، اِدھر اُدھر ڈھونڈھا کہیں نہ ملا۔ صندوقچے پر نظر پڑی کوٹھی قفل میں لٹکتی رہ گئی تھی۔ سمجھا کہ شاید اس میں کاغذ مل جائے گا۔ کھولا تو ڈائری ملی اوراق اُلٹ کے دیکھنے اور مضمون پڑھنے لگا۔ پڑھتے ہی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ غصہ اور تاسف سے دماغ چکرایا۔ کمرے میں جا کے فرش پر گر پڑا۔

شام کو مارشینس گھر میں آئی حسب عادت ہنسی خوشی سے شوہر کے پاس گئی، اور کھانا کھاتے ہی دن کی تھکن سے جلد سو گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد، بڑے زور سے دھماکے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ایک چیخ بھی، گھر بھر میں تہلکہ پڑ گیا۔ سیسلیا نیند سے گھبرا کے اُٹھی، اور شوہر کے کمرے کی طرف دوڑی وہاں دیکھا کہ مارکوس کے سینے سے خون کا دریا بہہ رہا ہے اور خدمتگار اُس کو فرش خاک سے اُٹھا رہے ہیں۔ بدحواس ہو کے چیخ ماری اور غش کھا کے نیچے گر پڑی۔

+ + + + + + + + +

دوسرے دن مارکوس کی خودکشی کی خبر پھیل گئی۔ لوگوں نے تعجب کے کانوں سے سُنا اور وجہ قایم کرنے میں مختلف آرائے ہو گئے۔

برس دن کے بعد بیرن سمسم کی والدہ نے قضا کی اور بیٹے کے لیے مال وافر چھوڑ گئی، جس کا سالانہ سود تیس ہزار فرنک تھا۔ ماں کے مرتے ہی بیرن، سیسلیا کے پاس

آکے کہنے لگا" ہماری آرزوئیں بر آئیں، اور اب ہمارے باغِ عیش میں کوئی کانٹا نہ رہا"
مارشینس کا دل پہلے سے بیرن پر آیا ہوا تھا۔ بے تامل اُس کی استدعا منظور کرلی، تین مہینے کے بعد، دونوں کی شادی ہوگئی، پیرس میں رہنے لگے۔

مدت کے بعد سیسلیا کو معلوم ہوا کہ اُس کا شوہر، اُس کے عزیز بیٹے پال کے رہنے سے خوش نہیں ہے۔ اُس نے لوگوں سے یہ بھی سُنا کہ وہ پرلے درجے کا مسرف اور بدچلن ہے۔ نہایت ملول و متاسف ہوئی اور اپنے کیے پر پشیمان، مگر اب کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

سیسلیا کو اِس شوہر سے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بیرن اُس کو بہت چاہتا تھا لطف یہ کہ جتنا اُس کو چاہتا تھا، اُتنا ہی پال سے متنفر تھا۔ بالآخر اُس نے ایک دن کھلے لفظوں میں سیسلیا سے کہہ دیا کہ پال کو گھر سے نکال دیا جائے۔ مارشینس نے اُس کو کسی بورڈنگ اسکول میں داخل کردیا۔ اور باوجود اِس بے مہری اور بدسلوکی کے بیرن کے ساتھ دن کاٹتی رہی۔

اُس کو معلوم ہوگیا کہ بیرن بڑا سنگ دل، جفاکار، اور بے مروت ہے۔ اُس کی خوشامد اور چاپلوسی نے دھوکا دیا ورنہ وہ ہرگز اِس قابل نہ تھا کہ شوہر بنایا جاتا اِس الم سے وہ ہمیشہ کڑھا کرتی تھی اور غم کے گھونٹ پی پی کے رہ جاتی تھی، مگر بیرن سے کوئی شکایت نہ کرتی تھی، بیرن دل کھول کے فسق و فجور، اوباشی، اور قمار بازی کی، داد دیتا تھا، اور اپنے قدیم رستے پر ہو پڑا تھا۔

سیسلیا کو پال کی بڑی فکر تھی۔ اُس کی عمر پندرہ سال کی ہونے کو آئی تھی، اور اسکول کی مدت ختم ہو چکنے کو تھی، بیرن گھر میں پھٹکنے نہ دیتا تھا۔ پال کو سیسلیا کے سوا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا کہ وہاں رہتا، اِن وجوہ کی بنا پر اُس کی پریشانی بہت بڑھ گئی تھی دن رات رونے کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔

مسبب الاسباب خدا کی قدرت یہاں ظاہر ہوتی ہے کہ ٹھیک اِسی زمانے میں ایک جلیل القدر آدمی سیسلیا کی ملاقات کے لیے آیا۔ اور بیان کیا کہ "گو آپ مجھے

نہ جانتی ہوں گی، مگر میں آپ کے پہلے شوہر سے قرابت رکھتا ہوں۔ اُن کی والدہ میری پھوپھی ہوتی تھیں۔ جو آپ کے بچے پال کی دادی تھیں۔ اِس لحاظ سے مجھ میں اور آپ میں بھی ایک قسم کا رشتہ ہوا۔ میرا نام فلپ فنری ہے۔"

سیسلیا:۔ (نہایت مسرت سے) میں آپ کے تشریف لانے سے نہایت خوش ہوئی۔ اور آپ کی اِس عنایت کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ نے اپنے قدومِ ہمیت لزوم سے غریب خانے کو جو عزت بخشی ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے۔"

فلپ:۔ "یہ سب آپ کی نوازش ہے۔ میرا حاضر ہونا آپ کے بچے پال کی مصالح سے متعلق ہے اِس وقت خاندان میں میرے سوا کوئی باقی نہیں ہے۔ والدِ بزرگوار کی رحلت کے بعد، میں تجارت کے لیے جزایر گیا تھا۔ وہاں جا کے پٹاتی (نام شہر) میں ایک مہذب مالدار کے پاس ملازم ہو گیا۔ اُس نے میرے حال پہ بڑی مہربانی کی۔ اپنی بیٹی مجھ سے بیاہ دی اور تجارت میں میرا حصہ شریک کیا، زمانے کی بے وفائی ضرب المثل ہے، بیوی کا انتقال ہو گیا۔ دو بچے تھے وہ بھی رحلت کر گئے۔ آخر میں خسر صاحب بھی چل بسے۔ میں نے کمپنی سے اپنا حصہ الگ کر لیا، اور بذاتِ خود تجارت کرنے لگا۔ میرا راس المال بیس لاکھ فرنک تک پہنچ گیا۔ اب وطن میں یہ دیکھنے آیا کہ خاندان میں کون کون ارکان باقی ہیں۔ آپ کے بچے پال کے سوا (جو میرا بھتیجا ہوتا ہے) کوئی نہیں ہے۔ میں اُس سے اسکول میں جا کے ملا اور بہت خوش ہوا۔ وہ نہایت ذکی، ذہین، مہذب، خوش اخلاق، اور بامروت آدمی ہوگا اُس نے آپ کی پریشانیوں کا بھی ذکر کیا جنہیں سُن کر مجھے افسوس ہوا۔ اُس نونہال سے مجھے بڑی محبت ہو گئی ہے اِسی لیے میں بیرن کی عدم موجودگی میں اُس کے متعلق گفتگو کرنے کو آیا ہوں۔ میں بیرن سے نہایت ناخوش ہوں اور نہیں چاہتا کہ وہ مجھے پہچانے۔

بہن! میں آپ کا دوست ہوں اور مجھے آپ کے بچے سے محبت ہو گئی ہے مجھ سے بہتر آپ کو کوئی دوست نہ ملے گا۔ اِس لیے آپ کو اپنی عزت کا خیال کر کے میرا احسان قبول کرنے سے باز نہ رہنا چاہیے۔ آپ مجھ سے خواہش ظاہر کیجیے کہ میں آپ کی کیا مدد کروں۔"

سیسلیا: "سرد آہ کھینچکے، اور گرم آنسو بہا کے، آپ میرے نوازش فرما ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے ایسے اولے وقت آڑے آنے اور مصیبت دور کرنے کے لیے آپ کو بھیجا ہے، میری حالت تو معلوم ہو چکی، میں پال کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ خدا کی یہی مشیت ہے، اس لیے اُس کے نفع نقصان کے متعلق آپ کو اختیار ہے، جو چاہے کیجیے، جو چاہے نہ کیجیے۔"

سیسلیا نے فلپ سے بیان کیے وہ تمام مظالم اور کج خلقیاں بھی بیان کیں، جو اُس کی بے مروتی اور بدمعاشی کا نتیجہ تھیں۔ فلپ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا: "کیا آپ اپنے بچے کے فایدے کی خاطر سے کسی سخت بلا پر بھی صبر کرینگی؟"

سیسلیا: "اُس کے فایدے کے لیے میری بوٹی بوٹی بھی الگ کر دی جائے گی تو میں اُف نہ کروں گی۔"

فلپ: "کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ صرف جدائی۔ ضرورت پڑے تو ہر طرح کی مصیبت جھیلی ہی جاتی ہے۔ پال کو میرے حوالے کر دیجیے۔ میں اُس کی آیندہ زندگی درست کر دوں گا۔ وہ صحیح سالم رہے گا، اور جوان و شایستہ ہو کر، آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ اُس کا گھر اگر کھنڈر ہوگا تو عالی شان محل سے بدل جائے گا۔ آپ کی سب تمنائیں زندہ ہو جائیں گی، اور کوئی کھٹکا باقی نہ رہے گا۔ ورنہ بصورت موجودہ اُس کی حالت بگڑ جائے گی اور آپ غم سے گھٹ گھٹ کے مر جائے گی۔"

سیسلیا نے پہلے تو پس و پیش کیا، مگر فلپ کے سمجھانے اور اصرار کرنے سے راضی ہو گئی۔ فلپ تین دن کے بعد، پال کو ساتھ لے کے جہاز پر، سوار ہو گیا۔

دوسرا باب

پٹانی میں پال کا حال، اور فرانس کی طرف اُسکا عود

شہوت پرستیوں اور غلط کاریوں کی بدولت، بارہ سال کے بعد کسی دماغی عارضے سے، بیرن سمسی کا انتقال ہوگیا۔ وہ مرنے تک اپنی دولت کی تین چوتھائیاں اُڑا چکا تھا۔ اُس کا بیٹا لاون اُسی کے رنگ ڈھنگ پر بڑا ہوا تھا۔ ماں نے ہزار سر پٹکا اور بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ اُس کی کجروی مبدل بہ راہ روی ہوجائے مگر جسے خدا گمراہ کرے، اُسے کون رستہ بتا سکتا ہے؟ لاون ماں کی ایک بات نہ سنتا تھا اور اوباشی و بدمعاشی کے تقاضے سے اُلٹا اُس کو ذلیل و حقیر جانتا تھا۔ بڈھی ماں کیا کر سکتی تھی، اپنے دوسرے بیٹے، پال چیمبری کو ساری تمناؤں کا، خزانہ سمجھے ہوئے صبر کیے بیٹھی تھی۔

پٹانی میں پہنچنے کے بعد، پال نے پوری دلدہی کے ساتھ، کاروبارِ تجارت کو، چلانا شروع کیا۔ جو قریب قریب اُس ملک کے تمام شہروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جو اپنی راست بازی اور صاف معاملگی کے، گاہکوں کو خوش رکھتی تھی۔ چار سال کے بعد فلپ کی تجارتی کمپنی کا چوتھا شریک پال تھا جس سے سالانہ ہزاروں روپیے کا نفع ہوتا تھا۔ اِس کمپنی کا ایک شریک ولیم چالنڈی نامی، ہندوستان میں رہتا تھا۔ فلپ کے اور اُس کے درمیان قدیم الایام سے، دوستی اور محبت کے روابط، مربوط تھے۔ ولیم کی ایک بیٹی بھی تھی، لوسیا اُس کا نام تھا۔

ایک دن فلپ کے پاس ولیم کا خط آیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ "اب میری زندگی کا آخری زمانہ آپہنچا ہے۔ اگر تم یہاں آؤ تو لوسیا کے بارے میں کچھ وصیت کروں۔" مجبوراً فلپ کو وہاں جانا پڑا، اِس اثنا میں ولیم مرچکا تھا، فلپ، لوسیا کو اپنے

ہمراہ لے آیا۔ اُس کے ساتھ ایک ہندوستانی نوجوان عورت بھی تھی۔ سلیمی کے نام سے پکاری جاتی تھی، اُس کا باپ، بچپن میں مرچکا تھا، اور کوئی وارث نہ رہا تھا، اس لیے اُس کی غربت، اور یتیمی پر فلپ کو ترس آیا، گھر میں لاکے پرورش کی، وہ لوسیا کے ساتھ کھیل کود کے بڑی ہوئی، دونوں میں انتہا کی محبت تھی، اور ایک دوسرے کو، دیکھے بغیر، چین نہ آتا تھا۔ اگر گھنٹے بھر کے لیے بھی، کوئی ایک دوسرے سے جدا ہوتی تھی، تو دوسری بیقرار ہوجاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ لوسیا کے ساتھ، سلیمی بھی پونانی میں آموجود ہوئی۔

لوسیا، نہایت حسین، مہذب، اور دلفریب لڑکی تھی۔ پال اُس کی ایک ہی نظر میں گھایل ہوگیا۔ مگر پوری قوت حاصل ہونے تک اپنے عشق کو چھپائے رکھا لوسیا، باپ کے سوگ میں بیٹھی ہوئی تھی، پال کے میلان سے اُس کو معلوم ہوچکا تھا کہ وہ اُس پر سوجان سے فدا ہے، اور فلپ کو بھی اِس کا احساس ہوگیا تھا ایک دن پال نے فلپ سے کہا: "چچا جان! میں نے مدت سے اپنے دل میں جو راز پوشیدہ رکھا ہے۔ اُس کے ضبط سے اب عاجز آگیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بجائے آپ کے فرزند کے ہوں، اور لوسیا بمنزلہ آپ کی بیٹی کے ہے۔ اِس صورت میں کیا یہہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ میری بی بی بنائی جائے؟"

فلپ: "نورِ نظر! میں تمہارے راز سے واقف ہوچکا ہوں، لوسیا اِس گھر میں جب گھڑی داخل ہوئی ہے۔ اُسی گھڑی سے اِس مسئلہ کی طرف میری توجہ مبذول ہے بلاشبہہ تم لوسیا کے شوہر بننے کے قابل ہو اور لوسیا تمہاری بی بی بننے کے لایق ہے۔ مگر فقط اتنی بات باقی ہے کہ میں لوسیا سے استمزاج کرلوں۔ جہاں اُس نے رضامندی ظاہر کی۔ سمجھ لو کہ تمہارے وصال کی تدبیریں ہوگئیں"

اِس کے بعد، فلپ نے ایک دن لطیف پیرایے میں پال کا پیام لوسیا کے گوشگزار کردیا۔ لوسیا نے اپنی پوری خوشنودی ظاہر کی، اور چار مہینے کے بعد،

یہہ عاشق و معشوق، دولتِ وصل کے مزے لوٹنے لگے۔

اِس درمیان میں پال نے اپنی ماں اور اخیافی بھائی لاؤن کو متعدد خطوط لکھے تھے لاؤن بڑے خلوص و محبت کے پیرایے میں اُن خطوط کا جواب دیتا رہا۔ اور ایسے خوشنما انداز میں جوشِ اخوت کا اظہار کرتا رہا کہ اُس سے بہتر پیرایہ خیال میں نہیں آ سکتا، کیونکہ وہ خوب جانتے ہوئے تھا کہ پال عنقریب بڑی دولت لے کے فرانس میں آنے والا ہے اگر پہلے سے دوستی گانٹھ رکھیگا تو اُس کی دولت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع پا جائیگا اور اِس طرح پر اپنی عشرت پرستیوں اور سرمستیوں کی جی کھول کے داد دے سکیگا۔

سادہ دل پال، اپنی صاف باطنی اور نیک نیتی سے یہہ سمجھے ہوئے تھا کہ اُس کا بھائی اخوت کا پُتلا ہے، اور مروت و دوستی میں بے نظیر۔ مگر یہہ نہ جانتا تھا کہ رنگ میں بھنگ پڑی ہوئی ہے۔ اور لاؤن، دراصل، خباثت و شیطنت کا ڈھیر ہے۔ ورنہ اُسی وقت خبردار ہو جاتا اور ہوشیار کر لیتا۔

افسوس ہے کہ بوڑھی ماں نے بھی اُس کو مطلق، آگاہ نہ کیا۔ اُس کی افتادِ اسطرح کی واقع ہوئی تھی کہ اپنا درد و غم کسی پر ظاہر نہ کرتی تھی۔ اور نہ پال کو لکھتی تھی کہ وہ کس جاں کنی، اور تلخکامی میں مبتلا ہے۔

ایک دن فلپ نے پال کو تنہائی میں بلا کر کہا: "لختِ جگر، تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہاری والدہ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اُن سے اقرار کیا تھا کہ تم کو اِس حالت میں اُن کے پاس لا کے چھوڑ دونگا کہ تم مالدار اور قابلِ رشک آدمی ہو چکے ہوگے۔ اب تم لوسیا سے شادی کر چکے ہو۔ کمپنی سے جو نفع تمہارے حصے میں آیا ہے وہ چالیس لاکھ فرنک ہے۔ میں نے اِس کے دو حصے کر دیے ہیں بیس لاکھ کے نوٹ ہیں جس کی رقم فرانس کے بڑے بنک میں تمہیں مل جائے گی۔ باقی بیس لاکھ کی ایک ہنڈی ہے جو امسٹرڈم کے ساہوکار کی دُکان میں بھنائی جا سکتی ہے۔ اِس رقم کے علاوہ لوسیا کی میراث کے پانچ لاکھ فرنک اور ہیں۔ نیز میرے حصے کے بھی چالیس لاکھ فرنک الگ ہیں۔ جو میرے مرنے کے بعد تمہارے ہی حصے میں آئینگے۔

اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم فرانس کو واپس جاؤ تاکہ بوڑھی ماں تمہارے دیدار سے آنکھیں روشن کرے۔ اگر خدا نے چاہا تو میں بھی ایک سال کے اندر ہی اندر، روپیہ پیسہ لے کے تم سے آ ملوں گا۔ اور زندگی کا باقی زمانہ، تمہاری ہی خدمت میں بسر کروں گا اس ارادے میں اگر مجھے ناکامی ہوئی اور یہ برس پورا ہونے سے قبل ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا تو تم یہاں آنا اور میرے متروکے پر قبضہ کر لینا۔"

قلپ سے یہ ہدایت پاکے پال نے سفر کی تیاری شروع کی۔ پال کے نوکروں میں ایک فرانسیسی شخص تھا، ساڈڈ چاوری نام۔۔۔ وہ سفر سے ایک دن پہلے پال کے پاس آیا اور بولا "خداوند! میں ابتدا سے آپ ہی کی خدمت گزاری میں مصروف ہوں۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد، یہاں میرا رہنا بے کار ہے۔ مجھے زندگی میں کوئی لطف نہ آئے گا۔"

پال:۔ جب سلیمی یہاں موجود ہے، تو پھر تمہیں کیا غم ہے؟

ساڈڈ:۔ (یہ پتے کی بات سن کے، دہشت ناک ہو کے) ۔۔۔ سرکار۔۔۔ میرا راز آپ پر ظاہر ہو گیا۔"

پال:۔ سلیمی اپنا کوئی راز لوسیا سے چھپا نہیں رکھتی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اسے دل سے چاہتے ہو، چونکہ تم قلپ کے قدیم ملازم ہو، اور وفاداری سے اُن کی خدمت بجا لاتے ہو، اس لیے اُن کا ارادہ ہے کہ سلیمی سے تمہاری شادی کر دیں اور تمہیں تجارت میں بھی شریک کریں۔ تجارت سے تم بہت جلد مالدار ہو جاؤ گے اور خوشگوار عیش میں بسر کر سکو گے۔"

دوسرے دن پال اور لوسیا نے فرانس کی راہ لی، سلیمی وہیں رہ گئی، لوسیا کی جدائی سے، اگرچہ وہ بے قرار تھی لیکن ساڈڈ کی محبت سے تسلی پاتی تھی، تھوڑے عرصے میں، ساڈڈ سے اُس کی شادی ہو گئی، اور ساڈڈ شریکِ تجارت کیا گیا۔

پال ٹپانی سے چل کے سیدھا شہر باور میں داخل ہوا۔ اُس کا اخیافی بھائی لاون استقبال کے لیے موجود تھا، بڑے تپاک سے ملا۔ اور ماں کے انتقال کی خبر سنائی

ماں کے مرنے کی خبر پا کے پال کی حالت متغیر ہو گئی۔ لیکن لاون کی تسلی و تشفی اور دلاسا دینے سے سنبھل گئی۔

پال: "بھائی! آپ کو میرے آنے کی اطلاع کیونکر ہوئی؟"

لاون: "جان برادر! آپ نے اماں جان کو جو خط لکھا تھا۔ مجھے ملا۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ بھابی صاحبہ کے واسطے ایک چالاک انگلش خادمہ کی ضرورت ہے، والدہ کی وفات کے بعد، میں نے کہا کہ بیکار کیا پڑا رہوں۔ آپ کی ملاقات کے شوق میں یہاں تک چلا آیا مجھے تلاش کرنے سے آپ کی مرضی کے موافق ایک انگلش خادمہ بھی مل گئی ہے۔ اور میں نے آپ کے قیام کا بھی پورا انتظام کر لیا ہے۔ یہاں بالفعل ایک ہوٹل میں دو کمرے آپ اور بھابی صاحبہ کے لیے کرایے پر لے رکھے ہیں۔ آپ وہاں تشریف لے چلیے۔"

پال: "مرحبا! آپ کی عنایتوں کا کیا کہنا۔ میں آپ کا نہایت ممنون ہوں۔ میرے قیام کا انتظام غالباً آپ نے پیرس میں کیا ہوگا؟"

لاون: "جی نہیں۔ وہاں بڑی بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ نظم و نسق کا شیرازہ بکھر گیا ہے یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ بادشاہ تخت سے اُتارا جائے۔ میں نے وہاں تو کوئی مکان لینا مناسب نہ جانا، لیکن ایک خوش قطع ایوان جس میں خانہ باغ بھی ہے۔ ماریل میں ندی کے کنارے لے رکھا ہے۔ یہ بہت بارونق موقع پر واقع ہے اور ہرے بھرے درختوں میں گھرا ہوا ہے گویا فردوس بریں کا ایک خطہ معلوم ہوتا ہے۔ وہیں آپ کی انگلش لونڈی بھی ہے۔ اور گاڑی گھوڑے بھی موجود ہیں۔"

یہ حالات اور بھائی کی ہمدردیاں سُن کے پال بہت خوش ہوا۔ اُس کے احسانات کا شکریہ ادا کیا، اور اُس مال و دولت سے بھی اطلاع دی جو اُس کو تجارت سے حاصل ہوئی تھی، جس سے خبیث لاون کے دندان آز اور تیز ہو گئے اور بھائی کی خوشامدیں رات دن منہ سکھانے لگا۔

ہاور میں چند دن ٹھہر کے پال اور لاون ماریل کی طرف کوچ کیا۔ اور زندگی کی

خوشگوار دلچسپیوں سے متمتع ہونے لگے۔ لاون ان کی خدمت میں حاضر تھا اور حصولِ مقصد کے لیے شیطانی منصوبے باندھ رہا تھا۔

ماریل میں لے جاکے ایک علیحدہ محل میں اُتارنے سے اُس کا مطلب یہ تھا کہ پال کہیں لاون کے قبیح حالات سے نہ واقف ہو۔ علاوہ بریں اور بھی مصالح تھے جو آگے چل کے معلوم ہوں گے۔

تیسرا باب

غراب البین

کچھ مدت، پوری خوشحالی اور بے فکری سے گزر گئی۔ ایک روز ساڈڈ چاوری کا خط آیا اُس میں لکھا تھا کہ "فلپ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اُس نے مرتے وقت، پال کو اپنی دولت و جائداد کا وارث قرار دیا ہے جس کی مقدار ۵۰ اور ۶۰ لاکھ فرنک کے درمیان ہے پال کو بعض اہم اُمور کا انتظام کرنے کے لیے، بہت جلد، پٹافی میں آنا چاہیے۔"

مارکوئس کو اِس نیک نہاد، کریم النفس، بزرگ کی رحلت سے سخت صدمہ ہوا، اُس نے فوراً سفر کی تیاری شروع کی۔ جب لوسیا کو یہ معلوم ہوا تو وہ رونے لگی اور خود کو ہمراہ لے چلنے پر اصرار کیا۔ چونکہ وہ حاملہ تھی، ولادت کا زمانہ قریب آپہنچا تھا، اور سمندر کے خطروں کا سامنا، اُس کے مناسبِ حال نہ تھا، اِس لیے پال نے اُس کو، بڑی جد و جہد سے، سمجھا منا کے، ماریل کے قیام پر راضی کر لیا۔ لوسیا کا دل اندر سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور وہ کسی بلائے ناگہانی کے مہیب وسوسوں کو دل میں محسوس کرتی تھی دوسرے دن مارکوئس پال، اُس سے رخصت ہوا اور اپنے بھائی لاون کو اُس کے متعلق ضروری ہدایتیں دے کے، سفر پر چلا گیا۔

ابھی وہ لوسیا کی نظروں سے پورا اوجھل نہ ہوا تھا کہ ایک کوا آ کے قریب کے درخت پر بیٹھا اور غیق غیق کی آواز سے چیخنے لگا، لوسیا ان چیزوں کی معتقد تھی، جن سے اہل مشرق تگون وفال لیا کرتے ہیں، وہ اس منحوس پرندے کی صدا سے کانپ اٹھی، اور کمرے میں جا کر زار و قطار رونے لگی، چند روز اس حالت میں گزر گئے کہ لوسیا کا دل منقبض رہتا تھا اور مہیب آفتوں کا خیال، آ کے پریشان و متردد کیا کرتا تھا، اس کا رنج و قلق، روز افزوں تھا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کا تار ٹوٹتا ہی نہ تھا، اس کے نزدیک ایک ایک دن، مہینے سے بڑھ کر لمبا ہو گیا تھا۔ اور اس کے تخیلات اور خطروں کا، موضوع غراب البین تھا۔

لاون اس سے بہت کم جدا ہوتا تھا۔ وہ زمانے کے انقلابات پر صبر کیے بیٹھا تھا اور اپنی فکر کی چقماق کو ان شیطانی تدبیروں میں جھاڑتا تھا جو اس کے ابلیسانہ خیالات کے مطابق کامیابی تک پہنچانے والی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی بھاوج کے ساتھ بڑے لطف و مدارا سے پیش آتا، دل خوش کن وعدوں سے دلاسا دیتا۔ اور ان تیرے دسوسوں اور دور از حال فکروں پر ملامت کرتا جو لوسیا کے لطف عیش کو تلخ کرنے والی تھیں۔

چار مہینے کے بعد، اس کے شوہر کا خط آیا جس سے اس کے بخیر و خوبی پہنچنے اور عنقریب واپس آنے کا حال معلوم ہوا۔ اس خط سے فی الجملہ لوسیا کو اطمینان حاصل ہوا، پال وہاں تمام امور کا تصفیہ کر چکا تھا۔ ترکے کی رقم اس کو پچاس لاکھ فرنک ملی اس میں سے بیس لاکھ اس نے تجارتی کمپنی کو دس فی صدی سود پر قرض دیے۔ اور اس کی وصولات پر ساڈڈ چاوری کو اپنا گماشتہ بنایا۔ ساڈڈ کی اجرت سود کی نصف رقم قرار پائی۔ باقی تیس لاکھ میں پندرہ پندرہ لاکھ کے دو نوٹ لیے اور لاون کو بھیجدیے اس کی اطلاع لوسیا کو بھی دے دی اور یہ بھی لکھا کہ نوٹ پہنچنے کے پانچ دن بعد، وہ خود بھی وہاں آ جائے گا۔ اس سے لوسیا کو بڑی خوشی ہوئی اور پال سے عنقریب ملاقات ہونے کے شوق نے اسے جامے سے باہر کر دیا۔ مگر شاعر کے اس قول کی کوئی پروا نہیں کی گئی کہ

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

خط پہنچے کے پانچ دن ہو گئے۔ پھر اور پانچ دن گزر گئے حتیٰ کہ دو ہفتے بھی منقضی ہو چکے مگر مارکوئس کا پتہ نہ تھا۔ مارشینس کا دل دوبارہ متردد ہوا۔ خطرناک وسوسوں نے پھر صورت دکھائی، اور پژمردہ و اعنہائے اندوہ والم روز بروز ہرے ہونے لگے۔ لاون کی ہمت نہ بڑھتی تھی کہ دم دلاسا دیتا۔ اسے خود کھٹکا ہو رہا تھا کہ سمندر میں اس کے بھائی پر ضرور کوئی نہ کوئی بڑی مصیبت ٹوٹی ہے۔ یہ بھی سنا جا رہا تھا کہ سمندر میں پانچ دن تک سخت طوفان برپا رہا جس کے نتیجے کی اب تک اطلاع نہ ہوئی۔ وہ ہر روز اخبارات دیکھا کرتا تھا کہ کہیں یہ خبر درج ہو کہ وہ جہاز ڈوب گیا جس میں اس کا بھائی سوار تھا اور جس کا نام اس نے پہلے ہی اس امید پر اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا تھا کہ شاید بھائی کی خروج جزیرہ پر ہتھ ڈالنے کا موقع مل جائے۔ افسوس یہ وہ خیال تھا جو کسی ایسے شخص کے دل میں قیامت تک نہیں گزر سکتا جس میں ذرہ بھی انسانیت کی ہو ہو۔

چند دن کے بعد اس نے (اپنی خوش قسمتی سے) ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ مارکوئس کا جہاز غرق ہو گیا۔ صرف دو ملاح بچ کر نکلے، اور کسی انگریزی جہاز میں بیٹھ کر انگلینڈ پہنچے، اب وہاں سے دوسرے جہاز میں فرانس کو آ رہے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کے مارے خوشی کے اس کو یقین ہی نہ آیا۔ مگر لوگوں سے اس نے اس کو بیان ضرور کر دیا۔

خوشی کا سودا، لاون کے سر میں کچھ ایسا سمایا ہوا تھا کہ وہ اس خبر کو صحیح باور ہی نہ کرتا تھا اس لئے مناسب نہ جانا کہ جب تک تمام باتوں کی تحقیق نہ ہو لے شکوک و شبہات رفع نہ ہو جائیں، اس وقت تک مارشی نس کو اس واقعے کی اطلاع دے۔ ایک دن وہ مارشی نس کے کمرے میں گیا تو یوں گفتگو شروع ہوئی۔

مارشی نس: "بھائی! آج کل کیا خبریں ہیں؟"

لاون: "بھابی! خبریں تو وہی ہیں جو پہلے تھیں۔ یقینی طور پر کوئی نہیں جانتا کہ کیا اعتقاد ہوئی ارادہ ہو رہا ہے کہ بندرگاہ ہاورنگ جا کے جہازیوں اور ملاحوں سے دریافت کروں جس سے قابل وثوق خبر معلوم ہو گی اور میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔"

مارشی نس: "مناسب ہے، آپ تشریف لے جائیے۔"

مارشی نس نے کہنے کو تو یہ جملہ کہا مگر اُس کا دل اندر سے بیٹھا ہوا تھا، اور وہ کسی بڑے حادثے کا یقین کیے ہوئے تھی، اُسے اُمید نہ تھی کہ کوئی دل خوش کن خبر سُنائی دے گی۔ اِس لیے از حد غمگین، حزین، اور شکستہ دل تھی۔

لاون فوراً اُٹھ کے کمرے میں گیا۔ عمدہ کپڑے پہنے، اور روپیے کا حساب کیا تیس لاکھ فرنک نقد موجود تھے۔ نیس لاکھ بنک میں تھے، اِن ساٹھ لاکھ فرنک کے تصرف میں وہ اپنے بھائی کے حکم سے مطلق العنان تھا۔ علاوہ بریں پٹافی میں بیس لاکھ فرنک سود پر چلائے جا رہے تھے، اِس دولتِ وافر کو وہ خواب میں بھی سچ نہ تصور کرتا تھا۔

لاون کچھ روپیہ لے کے، سفرِ ہاور کے ارادے سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہاں جا کے سمندر کے کنارے پہنچا۔ ایک ملاح بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اُس سے جا کے ملا، اور دوستی گانٹھ کے ایک شراب خانے میں لے گیا۔ پھر تفصیلی ماجرا پوچھنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ فلاں جہاز میں جو جزایر کی طرف سے آ رہا تھا اس حلیے اور شکل وصورت کے ایک صاحب سوار تھے وہ میرے بھائی ہوتے ہیں۔ اب تک مجھے اُن کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔ اگر آپ کو علم ہو تو بیان فرمائیے۔"

ملاح: "جنابِ من! اگر وہ صاحب آپ کے بھائی تھے تو میں دلی افسوس سے کہتا ہوں کہ وہ غرق ہو گئے۔ میں اُسی جہاز کا ملاح تھا۔ جب جہاز ڈوبا ہے تو پانی پر صرف دس آدمی تیرتے نظر آ رہے تھے اور بدحواس ہو کے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، مگر آخر کار پانی اُن کو نگل گیا۔ میں اور میرا ساتھی محض تائیدِ ایزدی سے بچ نکلے۔"

ملاح کی زبان سے یہہ ماجرا سُننے کے بعد، لاون کو اپنے بھائی کے ڈوب جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ اُس نے اِن لکھ کھا فرنک کو تصرف میں لانے اور ایک پُر امن طریقے سے اُن پر چھاپہ مارنے کی اُدھیڑ بن میں جلد جلد منصوبے سوچے اور عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کیے، اُس نے مارشی نس کے سوا کسی کو اپنا سنگِ راہ نہ پایا۔ کیونکہ پہلے تو وہ خود قانونی وارث تھی، پھر غضب یہ بچہ جننے والی تھی، جو باپ کا بہت بڑا وارث تھا اِس حالت میں لاون کو بجز ایک چھوٹے حصے کے کچھ نہ ملتا۔ یہہ خیال آتے ہی دنیا

اُس کی نگاہوں میں تاریک تھی۔ اُس کا دم رُکنے لگا کہ اِس گرداب بلا سے کیونکر مخلصی پائے کیا حیلہ کرے اور کیا چال چلے کہ باوصف مارشی نس کے زندہ رہنے کے اِس تمام مال و دولت کا مالک بن جائے۔

تھوڑے تامل کے بعد، ایک شیطانی منصوبے پر راہ پا جانے سے دفعتاً اُس کی پیشانی تمتما اُٹھی۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اِس سوچی ہوئی چالبازی سے اِس کا مقصود حاصل ہو جاتا تھا اور مارشی نس کا اڑنگا اُٹھ جاتا تھا۔ وہ جلدی سے گاڑی میں سوار ہو کے چل پڑا۔ اور سیدھا ماریل آیا۔ کمرے میں جا کے کپڑے اُتارے اور ایک لونڈی کو مارشی نس لوسیا کے پاس بھیجا کہ اُس کے آنے کی اطلاع دے اور کہے کہ وہ آپ سے ملنے کو ابھی آتا ہے۔

لوسیا پہلے سے ہی چشم براہ تھی۔ اور گویا آگ پر لوٹ رہی تھی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ وہ اِس وقت ایسی خبر سُننے کی متوقع تھی جو یا تو اُس کے عیش و آرام کو جلا دیتی یا اُس کے جسم و جان کو جلا دیتی۔

بالآخر لاون اُس کے پاس آیا، اُس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ اور صورت پر غم و الم برس رہا تھا، لوسیا اُس کا یہ حال دیکھتے ہی کانپ گئی۔ قوی میں سنسناہٹ پڑ گئی اور ہیبت سے بدحواس ہو گئی۔ قریب تھا کہ وہ غش کھا کے زمین پر گر پڑتی۔ اگر لاون اُس کو نہ سنبھال دیتا اور تھام کر اپنی جگہ نہ بٹھا دیتا۔

اِس وقت لاون اُس کے آگے سرنگوں گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور ہاتھ پکڑ کے پیار کرنے اور آنسوؤں سے بھگانے لگا۔ بعد ازاں کچھ منٹ تک چپکا اُسی حال پہ ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ لوسیا کا دل مطمئن ہوا، خون گردش کھانے اور دماغ میں جانے لگا، لوسیا نے دیکھا کہ لاون اِس وضع سے اُس کے آگے کھڑا ہے اور ہاتھ پکڑ کے چومتا چلا جاتا ہے۔ متنفر ہوئی اور درشتی سے بولی:۔

"بھائی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اُٹھیے۔ کرسی پر بیٹھیے"

لاون اُٹھا اور کرسی لے کے برابر آ کے بیٹھ گیا۔ لوسیا نے پوچھا "کہیے کیا خبر ہے؟"

لاون ؛ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ گو کیسی ہی منحوس خبر کیوں نہ ہو آکے بیان کروں گا، مگر اب اُس کو کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

اتنا کہہ کے چپ ہو رہا۔ پھر تھوڑی سی قیل وقال کے بعد، مختصر پیرایے میں جہاز کے تباہ ہونے اور مسافروں کے ڈوب جانے کا واقعہ گوش گزار کر دیا۔ آخر میں بولا۔

"بھائی صاحب کے آخری الفاظ جو دم توڑتے وقت اُن کی زبان سے نکلے یہ تھے "لاون۔ لاون۔ میں تم کو دو آدمیوں کے متعلق وصیت کرتا ہوں۔ ایک میری جان سے پیاری لوسیا۔ دوسرا میرا پیدا ہونے والا بچہ۔ اِن دونوں کا تمہارے سوا کوئی وارث نہیں اور نہ کوئی معین و یاور ہے۔" "

اثنائے کلام میں لوسیا کی حالت بہت پتلی ہو رہی تھی۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک اُس کے رگ وپے میں سخت کپکپی پڑ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور وہ لاون کو ایک تیز نظر سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لاون نے کہا "پیاری لوسیا! کاش میں اس خالص محبت اور سچی الفت کی مقدار کو جانتیں جو مجھے تم سے ہے۔ اِس واقعے نے ہم دونوں کو اندوہناک کر دیا ہے اب بجز صبر کے کوئی چارا نہیں۔ ہاں اگر کسی قدر تسلی ہو سکتی ہے تو اس نوزائیدہ بچے سے۔ بھائی صاحب مرحوم نے تمہارے باب میں مجھے خاص وصیت کی ہے لہذا میں تم پر اپنی ایسی توجہ و التفات مبذول کروں گا جس سے تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی اور یہ سمجھو گی کہ بھائی صاحب مرے نہیں زندہ ہیں اور تمہاری ناز برداری میں مصروف ہیں۔ سوگ اُتارنے کے بعد، یا برس دو برس گزرنے پر غرض جب تمہاری مرضی ہو ہم ایک ایسے اتحاد سے متحد ہو جائیں گے، جس کے بعد کوئی انفصال باقی نہ رہے گا۔ ہم اُس رشتۂ الفت سے یک جان دو قالب ہو جائیں گے جس کو کوئی جدائی نہ کاٹ سکے گی۔ پس اب دل کو ڈھارس دو اور صبر کرو، اور یقین رکھو کہ ہر زحمت کے پیچھے رحمت آتی ہے۔

ع در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر ۲ صحیفہ جلد ۴

ایڈیٹوریل

گزشتہ سن فصلی کے خاتمے میں خوش نصیب حیدرآباد کی شادکامی اور فراغ بالی کے مسرت بار مطلع پر، محشر آفریں موسیٰ کی پر عبرت طغیانی کے ہاتھوں تباہی و بربادی کے جو ہیبت انگیز بادل چھا گئے تھے۔ اُس کی وجہ سے بے خانمانی اور بے سروسامانی گھر گھر پھیل گئی ہے۔ اِس مصیبت کے اٹل پہاڑ کو محبوب بنیاد حیدرآباد کے سر سے ٹالنے کے لیے زبردست ہاتھوں کی ضرورت ہے جو درد آمود دلوں کے تقاضے سے دیوزر کی قوت اپنے میں چھپائے رکھتے ہوں۔ اور اُس قوت کو اِس بلائے ناگہانی کے دفعیے میں کام پر لگا سکتے ہوں۔ اِس طاقت کی قوت آزمائی کے لیے، حال میں، باغ عام کے دنگل پر ایک عام جلسہ ترتیب دیا گیا تھا۔ جسمیں بلا تفریق مذہب وملت و بلا امتیاز امیر و غریب، تمام رعایائے دکن مدعو تھی خاص حیثیت رکھنے والوں کے پاس مخصوص دعوت نامے روانہ کیے گئے تھے ہلازمین کو افسران اعلیٰ کے تاکیدی احکام پہنچے تھے، کہ اِس کی شرکت سے قاصر نہ رہیں۔ اڈیٹران اخبارات و رسایل کو بھی طلب کیا گیا تھا کہ روداد قلمبند کریں اور ان کی

نشست کا معقول انتظام کیا گیا تھا (جو افسوس ہے کہ بعد کی طوفان بے تمیزی میں گم ہو گیا) جلسے کی تاریخ ۱۲ دسمبر ۱۸ء مقرر کی گئی تھی۔

حسب قرارداد ٹھیک چار بجے کارروائی شروع کی گئی۔ مگر حاضرین کی کثرت اور عوام کی گڑبڑ سے اس قدر شور و غل برپا تھا اور ایسی بلا مچی ہوئی تھی کہ جو کچھ پڑھا گیا اور جو کچھ ہوا کیا وہ معدودے چند کے سوا، نہ کسی کے کان تک پہنچا نہ کسی کو نظر آسکا۔ لوگ بجائے اس کے کہ اپنی اپنی جگہ سنبھال کے خاموشی سے بیٹھ جاتے بنچوں اور کرسیوں پر کھڑے ہو گئے تھے پیچھے والوں کے سامنے ایک دیوار سی کھنچ گئی تھی اور کہنے سننے کی صداؤں سے کان پڑے آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ یہ طوفان ایسا بدتمیز مچا تھا کہ ہر چند منتظمین جلسہ سکوت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے کوئی فائدہ نہ پیدا ہوتا تھا۔ آخر مولوی ظفر علی خاں صاحب اسسٹنٹ سکرٹری سنٹرل ریلیف فنڈ کمیٹی کو اظہار افسوس بھی کرنا پڑا۔

عالیجناب مہاراجہ بہادر سریمین السلطنت مدار المہام سرکار عالی و صدر نشین جلسہ کی افتتاحی اسپیچ پڑھی گئی۔ جو طغیانی کی داستان پڑھ کر سنائی گئی، بعد ازاں مولوی ظفر علی خاں صاحب بی اے سابق ڈیرو کن ریلیو نے ایک دلخراش طریق نظم گوشگزار سامعین کی جس کو سنتے سنتے سب پر رقت طاری ہو گئی اور آنسو جاری ہو گئے۔ سامعین پر اس نظم کا خاص اثر ہوا۔

پھر نواب افتخار الملک بہادر نے تحریک پیش کی کہ مصیبت زدگوں کی امداد کیلیے عام طور پر تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں چندہ جمع کیا جائے۔

اُن کے بعد نواب فخر الملک بہادر نے اُن چندہ دہندگوں کے شکریہ کی رزولیوشن پیش فرمایا جنہوں نے باوجود بیرون ملک رہنے کے ہمدردی ظاہر کی۔

اس کے بعد مسٹر جی کیسن۔ ڈائرکٹر معین المہام فنانس کی نوبت آئی۔ انہوں نے فراہمی چندہ کے لیے بلدہ و اضلاع میں تعلق سب کمیٹیوں کے تقرر کی تحریک کی۔

آخری تحریک نواب حسام الملک خانخاناں بہادر کی تھی، جو بندگان اعلیحضرت کی رعایا پروری اور فیاضی کے شکریے پر مشتمل تھی۔

جلسے کی سرسری کارروائی کا اختتام عالیجناب صدرنشین صاحب جلسہ کے شکریے پر کیا گیا۔ جس کے ادا کرنے کی خدمت نواب تمیشر خنگ بہادر نے انجام دی

اس وقت چندے کی فہرست کھولی گئی اور صرف چند امرائے ذی احتشام کے چندوں کی تعداد تین لاکھ چودہ ہزار تک پہنچ گئی۔

چونکہ اس جلسے میں عام طور پر مختلف طبقات رعایا کو چندے کے کارِ ثواب میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہر ہر طبقے کے لیے جلسے کا ایک ایک خاص دن مقرر کیا گیا۔ ان کے منجملہ بعض جلسے اس وقت تک منعقد بھی ہو گئے۔

اگر اسی طرح پر فراہمی چندہ کے واسطے مسلسل کوشش جاری رہی تو ایک معتدبہ رقم کا جمع ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ بندوں کے حال زار پر رحم فرما کے چندے کی معقول و معتدبہ رقم فراہم کر دے تاکہ صدہا اپاہج اور معذور آدمیوں، کم سن بچوں، نا کتخدا لڑکیوں، اور کاروباری زندگی بسر کرنے والے آدمیوں کی بسر اوقات کا انتظام ہو جائے اور نصف کے قریب اجڑا شہر دوبارہ اگلی رونق پر آ جائے۔

ہمارے خاص عنایت فرما، مولوی محمد واجد علی صاحب سرویر نلگنڈہ کو صحیفے کے ساتھ جو مخصوص وابستگی اور ہمدردی ہے۔ اس کا حال ناظرین سے مخفی نہ ہوگا۔ گزشتہ سال بھی اسی ہمدردی کے اقتضا سے انہوں نے چار غریب طالب علموں کے نام ایک سال تک صحیفہ جاری کرایا گیا تھا۔ اس سال انہوں نے چار کے بجائے چھ طلبا کے نام پرچہ جاری کرنے کی حسب ذیل الفاظ میں اطلاع دی ہے۔

"بعد از مکرم! صحیفہ پہنچا۔ ممنون کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اس سال موسیٰ ندی کی طغیانی کیا تھی۔ واقعی قہر خدا تھا۔ آپ کا مضمون
"جو اس پر لکھا گیا ہے۔ اگرچہ کہ وہ ہنوز نامکمل ہے لیکن جس قدر لکھا گیا ہے
"وہ اپنے واقعات میں نہایت محیط اور جامع ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ
"نہایت نتیجہ خیز، سخت اندوہگیں اور عبرت خیز واقعہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔
"صحیفے کے ساتھ، چندے کا کارڈ بھی پہنچا، میں نے اپنے بڑے بھائی
"محمد فیاض علی صاحب کو لکھا ہے۔۔۔۔۔ کہ پندرہ روپیے دے دیں،
"جس میں سے دسے میرے ذمے کا چندہ اور بقیہ بارہ غرباء
"غریب طالب علموں کے لیے جن کے نام گزشتہ سال میرے چندے
"سے رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس چندے کی ایک سال
"اور توسیع کی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس قابل قدر فیاضی کی نظیر، اس وقت تک ایک بھی قایم نہیں ہوئی ملک کی عام بے حسی نے ہماری امید کو مبدل بہ یاس کر دیا۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ سچی کوششیں بے نتیجہ نہ رہینگی اور مولوی واحد علی صاحب کا یہ عطیہ ضرور کوئی مفید ثمرہ بخشے گا۔

یکم نومبر ۱۹۰۹ء کے الہامی (مدراس) نے صحیفے کے متعلق بھی حسب ذیل سطروں میں گہر فشانی کی ہے:۔

"صحیفہ

"حیدرآباد میں خاص اہل دکن کو علمی تصنیف و تالیف کا بہت کم شوق
"و ذوق پایا جاتا ہے چنانچہ خاص دکنیوں، اور حیدرآبادیوں کے مضامین
"ماہواری رسایل اور اخبارات میں خال خال، دکھائی دیا کرتے ہیں
"مگر ان دنوں رسالہ صحیفہ میں جو دو تین سال سے جاری ہے بعض

"حیدرآبادیوں کے زورِ قلم کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے
"کہ رسالے کا مقصد، خاص طور پر دکن میں تحریر و تصنیف کا شوق
"پیدا کرنا ہے۔ تاریخی مضامین کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔ جس سے
"مضمون نگاروں کی محنت و دقت ثابت ہوتی ہے۔
"بعد ازاں اردو لٹریچر کی بحثیں چھیڑی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ
"کوئی ناول بھی شایع ہوتا ہے۔ غالباً اہلِ دکن اس کی قدر کرتے
"ہوں گے۔ کیونکہ یہ انہیں کے بڑے شہر سے شایع ہوتا ہے
"وہیں کے لوگ اس کی خدمت کرتے ہیں۔ قیمت سالانہ
"مع محصول ڈاک دے، روپیہ طلبا سے بشرط تصدیق صدر مدرس عصما"

معزز ہمعصر نے آخر میں جو ریمارک کیا ہے کہ "غالباً اہل دکن اس کی قدر کرتے ہوں گے کیونکہ یہ انہیں کے بڑے شہر سے شایع ہوتا ہے" اس کی قدر دانی کو کچھ ہمارے ہی دل سے پوچھا چاہیئے۔ جس کا ثبوت مختصر طور پر ان الفاظ میں دیا جا سکتا ہے کہ اب تک حیدرآباد کے سے عظیم الشان شہر میں اس کے پان سو خریدار بھی نہیں فراہم ہوئے۔

ہمارے قدیم مشفق، مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی، صحیفے کی نسبت اپنے تازہ ترین عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نلگنڈہ۔ مشفقی۔ زاد لطفہ۔ تسلیمات۔ صحایف عالی وارد ہوئے
"ماشاء اللہ صحیفے کی حالت کیا بلحاظ کتابت اور کیا بلحاظ مضامین
"آیندہ ترقی کا پتہ دی رہی ہے۔ اور بہت قابلِ اطمینان ہے۔
"جس کے متعلق میری طرف سے دلی مبارکباد قبول ہو۔
"باضابطہ رسید حاصل کرنے کے باوجود، عدم رسی کی شکایت کیا
"باقی رہنا واقعی قابلِ حیرت ہے۔ مگر اسی اتلاف سے ایک روشن پہلو

"ایسا نکل آتا ہے جس پر نظر کر کے آپ کو دل تنگ نہ ہونا چاہیے یعنی
"صحیفہ نامعلوم طور پر، بعض ایسے افراد کے ہاتھ لگتا ہے۔ جو گو شوقین اور
"علمدوست ہیں، مگر بے بضاعتی کے مرض نے اُن کو یوں آتش شوق
"بجھانے پر مجبور کیا ہے گویا صحیفے کے لفافے میں ایک پر زور کشش اور
"اُس کے مضامین میں ایک ایسی حلاوت ہے جس سے ذائقہ اندوز
"ہونے کے لیے، وہ اپنے تقاضائے طبیعت سے مجبور ہیں۔ اس طرح
"صحیفہ مالی نقصانات برداشت کر کے مخفیانہ اپنائے وطن کے دلوں میں
"گھر کر رہا ہے۔ اور اُن کو اپنا شیدا بنا رہا ہے۔ ایک وقت ایسا آئیگا
"کہ ملک کے اِس حصے سے اُس حصے تک صحیفہ اِس طرزِ عمل سے
"شہرت پذیر ہو جائے گا۔ اور درستی مذاق کی رہنمائی ہو گی۔
"جو آپ لوگوں کا مرکزِ خاطر ہے۔ ؎

"خواہی کہ زکار خود شوی برخوردار — ایں نکتۂ ما ہمیشہ در خاطر دار
"چوں ہر چہ خدا خواست آں خواہد شد — خوش باش و بفکر خویش رنجہ مدار۔"

ہمارے مشفق نے جس دلکش پیرائے میں ہمارا حوصلہ بڑھایا ہے۔ وہ قابلِ شکریہ ہے۔ ساتھ ہی عدم رسی صحائف کی وجہ نہایت پر لطف اور نتیجہ بلیغ لطیف ہے۔

ہمارے نائب قدر دان جناب محمد عبد الرب صاحب کوکب، کریم نگر سے رقمطراز ہیں:۔

"مہربان اڈیٹر صاحب صحیفہ! السلام علیکم۔ آپ کے رسالے برابر پہنچتے
"رہے جس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ میرے پاس مثل صحیفے کے اور
"رسالے، زمانہ، دکن ریویو، الہادی، آتے ہیں۔ لیکن بعد تقاضا۔
"امید کی جاتی ہے کہ اس سال بھی آپ برابر روانہ کرتے رہیں گے
"رسالے کے مضامین وغیرہ بہت بہتر اور اچھے ہوتے ہیں مختص منہ

"ناول بے شک قابل دید ہے۔ مثل اور ناولوں کے نہیں۔ جو خیالات
"بگاڑ دیتے ہیں۔ بہت ہی دلچسپ اور بہتر ہے۔ یہ جملے سچے دل سے
"نکلے ہیں۔ اور احباب نے بھی دیکھ کر بہت پسند کیا ہے۔ حقیقت میں
"وہ ہے ہی ایسا۔ ہم لوگوں کو آپ کا ممنون ہونا چاہیئے۔۔۔۔"

ہمارے قدیم نوازش فرما، مولوی سید بہاء الدین صاحب شطاری وکیل جو اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے ایسے ہی بلند پایہ ہیں جیسے اپنی عالی خاندانی کے اعتبار سے حیدرآباد کے مشائخ عظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماہ حال میں منصفی پر تور کے عہدے پر ممتاز اور اس کے زینت بخش ہوئے ہیں۔ اس تقریب میں پرھنی کے خوش مذاقوں نے انہیں ضیافتی دعوت دی تھی۔ دعوت کے جلسے میں جن جن صاحبوں نے تقریریں کی ان کے منجملہ ہمارے ہونہار دوست، منشی محمد عبدالسلام صاحب بھی تھے۔ انہوں نے اثنائے تقریر میں بیان کیا کہ مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد کے تعلیم یافتہ خاص قابلیت لے کر ملک کے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ معلومات، تحریر، تقریر، اور روشن خیالی میں وہ ایک عمدہ نمونہ نظر آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مقرر صاحب مذکور نے اپنے دعوے کے ثبوت میں بیان کیا کہ نیازمند اڈیٹر صحیفہ اس دعوے کا بین ثبوت ہے جس کی کوششوں سے صحیفہ نامی باہوار رسالہ شایع ہوتا ہے۔ اس رسالے میں خاص قابلیت سے مضامین لکھے جاتے ہیں اور مضامین کا زیادہ حصہ طلبائے دارالعلوم کے قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دارالعلوم کے بعض کامیاب طلبا، غیر معمولی لیاقت رکھتے ہیں۔ جن پر نظر ڈالتے ہوئے مقرر صاحب کا دعوی صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اس ہیچمدان نیازمند کی نسبت انہوں نے جس حسن ظن سے کام

لیا ہے، اُس کے حق بجانب ہونے میں شبہہ ہے۔

دار العلوم کی کوششوں کو زیادہ تر بار آور ہونے کے لیے، جن اسباب کی ضرورت ہے وہ بدقسمتی سے اُس کو حاصل نہیں ہیں۔ ہر چیز کی ترقی قدر دانی پر موقوف ہے، اور حیدر آباد دکن میں یہی سرے سے مفقود ہے۔ سرکار اگرچہ ہر سال ایک رقم خطیر دار العلوم کی تعلیم پر خرچتی ہے۔ لیکن تعلیم کے نتایج سے تمتع نہیں اُٹھایا جاتا۔ جو اشخاص اس کالج کی انتہائی ڈگریاں لے کر فارغ التعلیم ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں امور مملکت میں بہت کم جگہ ملتی ہے۔ بیقدری کے ہاتھوں اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے کسی معمولی خدمت پر مامور ہو جاتے ہیں جس سے اُن کے دل بیٹھ جاتے ہیں، اور حوصلے پست ہو کے دلولے مٹ جاتے ہیں۔ جس کی اس وقت متعدد نظیریں موجود ہیں۔ مولوی محمد عبد القدیر صاحب صدیقی مولوی میر موسی حسین صاحب، مولوی سید شاہ مصطفیٰ صاحب۔ مولوی سید جمال الدین صاحب، مولوی محمد مرتضیٰ صاحب، مولوی محمد عبد الباسط صاحب، مولوی میر امداد علی صاحب، مولوی محمد مظہر صاحب، مولوی سید غلام حسین صاحب، مولوی سید شاہ محمد صاحب، مولوی محمد احمد اللہ صاحب مہاجر، وغیرہم ایسے افراد ہیں۔ جو ریاست کے ہر شعبے میں اپنی سرگرم کوششوں سے مفید و ضروری نتایج پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن بڑے تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ ان اصحاب میں سے اکثر کی کچھ قدر دانی نہیں ہوئی۔ تو پھر ان کے پیچھے آنے والوں کی ہمتیں کیا بڑھ سکتی ہیں! اور اُن کی دماغی بلند پروازی میں کیا پر واز آسکتی ہے!۔

اڈیٹر

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ

علم و تمدن کے ساتھ

(گزشتہ سے آگے)

قسم ثانی۔ اسلام میں

(۲)

اسلام کا بلحاظ اپنے اصول کے علم سے برتاؤ

اصل اول کی تمہید اسلام کی درحقیقت دو دعوتیں ہیں۔ ایک تو خدا کے وجود اور اس کی توحید کی دعوت۔ دوسری محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق رسالت کی دعوت۔

دعوتِ اولیٰ کا دارو مدار محض اس پر ہے کہ عقل بشری کو تنبیہ کیا جائے کہ وہ اس عالم کون و فساد کو بغور دیکھے اور قیاس صحیح کو استعمال کرے اور دنیا جس نظام و ترتیب پر قایم اور جس طرح اسباب و مسببات پر مشتمل ہے اس پر نظر غایر ڈالے۔ اور اس ذریعے سے معلوم کرے کہ اس عالم کا ایک صانع ہے۔ جو واجب الوجود ہے۔ عالم ہے۔ حکیم ہے۔ اور ہر امر پر قادر ہے اور وہ صانع ایک ہے۔ کیونکہ اس عالم کا نظام بھی ایک ہے۔ انسان کی عقل کو پوری آزادی دی گئی ہے کہ فطرت کے راستے میں بلا کسی تقید کے چل پھر سکے۔ اس کو اسلام متنبہ کرتا ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت، رات دن کا

اختلاف، ہوا کا اس طرح چلنا کہ انسان دریا میں کشتی اور جہاز چلا سکے، ہوا کا بادلوں کو اڑانا، اور بادلوں کا پانی برسانا کہ زمین سیراب اور سرسبز ہو جائے اور نبات و شجر اُگے۔ اور اُن سے جاندار اپنی قوت بسری کرے، اور زندہ رہ سکے۔ یہ سب کی سب خدا کی آیات اور اُس کی نشانیاں ہیں کہ اگر کوئی اُن میں غور کرے تو بلاشبہ خداوند جل و علا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

اسلام اس عالم کی حقیقت کو بیان کرتا ہے تاکہ انسان کائنات میں بحث و تفتیش کرکے اُس کو اچھی طرح جان پہچان سکے، چنانچہ وہ زمین و آسمان پیدا ہونے سے پیشتر کی حالت کو اس آیت میں اسطرح ذکر کرتا ہے:-

اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقاً ففتقنا ہما وجعلنا من الماء کل شیٔ حیّ افلا یومنون۔	کیا نہیں دیکھا کافروں نے کہ آسمان زمین پہلے گولا گٹھری تھے پس ہم نے انکو کھولا اور پانی سے (یعنی ایک سیال مادہ سے) ہم نے ہر ایک جاندار شے کو پیدا کیا۔ پھر بھی کیا وہ ایمان نہیں لائینگے۔

اسی قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں عقل کو پوری مطلق العنانی اور آزادی دی گئی ہے کہ وہ اُکوان کی ابتدائی حالت معلوم کرنے کے ہر ایک طریقے کو استعمال کرے۔ حدیث و سنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم سے ایک شخص نے پوچھا کہ: "ہمارا خدا آسمان و زمین کے پہلے کہاں تھا؟" تو آپ نے فرمایا کہ: "کان فی عماء تحت ہواء" عماء ابر کو کہتے ہیں یعنی ابر میں تھا۔ اور اُس کے نیچے ہوا تھی۔

لہ سائنس والوں نے اپنی تحقیقات سے رائے قایم کی ہے کہ کائنات کی ابتدائی حالت دھوئیں کی صورت میں تھی۔ اور وہ دھواں بادل کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔

مذکورۂ بالا حدیث اس رائے کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ اس رائے کو عربی میں نظریۂ سدیمیہ کہا جاتا ہے۔ سدیم کے معنے کہر کے ہیں۔

تم دیکھتے ہو کہ قرآن اس مہم بالشان اور عظیم الشان مسئلہ میں، عقل کو کسی جکڑ بند سے مقید نہیں کرتا ہے، اور نہ کسی طرح کی تقلید کو جائز رکھتا ہے۔ قرآن میں ایسی سینکڑوں آیتیں ہیں جو پڑھنے والے کو اس عالم کی نشانیوں میں غور کرنے اور عقل و فکر سے کام لینے کی ہدایت کرتی ہیں:

اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض وما خلق اللہ من شئی۔

کیا وہ آسمان و زمین کی بادشاہت کو اور ایک شے سے جو اس نے تمام مخلوق پیدا کی ہیں دیکھتے ہیں۔

وآیۃ لہم الارض المیتۃ احییناہا واخرجنا منہا حبا فمنہ یاکلون۔

اُنکے لیے مردہ زمین ایک نشانی ہے ہم نے اُسکو زندہ کیا اور اُسمیں سے ہر قسم کے بیج اُگائے جنکو تم کھاتے ہو۔

ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم۔

خدا کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف۔

ہم اس قسم کی آیات میں ثلث بلکہ نصف قرآن سے زیادہ حصہ پیش کر سکتے ہیں۔ قرآن میں خدا کے آثار اور نشانیوں کا جو اجمالی ذکر ہے وہ محض عبرت دلانے اور نعمتوں کو یاد کرانے کے لیے ہے۔ اُس سے نیچر کا کوئی خاص قاعدہ ثابت کرنا اور مخلوقات کی نسبت کوئی خاص عقیدہ رکھنا مقصود نہیں ہے۔ خدا کی توحید پر بھی قرآن میں استدلال سے کام لیا گیا ہے۔

۱۔ لو کان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا۔

اگر زمین و آسمان میں دو خدا ہوتے تو فتنہ و فساد مچاتے۔

۲۔ ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الہ اذا لذہب کل الہ بما خلق ولعلا بعضہم علی بعض سبحان اللہ عما یصفون۔

خدا کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ اُس کے ساتھ اور کوئی خدا ہے۔ ورنہ ہر ایک خدا اپنی مخلوقات کو لے کر الگ ہو جاتا اور آپس میں ہر ایک ایک دوسرے پر غالب ہونے کی کوشش کرتا خدا پاک ہے اُن باتوں سے جو اُسکی طرف ناحق منسوب کیا کرتے ہیں۔

اسلام خدا پر ایمان لانے اور اُس کی وحدانیت کا اقرار کرنے کے لیے، سوائے دلیل عقلی اور فکرِ انسانی کے جس کے مطابق فطرت کا قانون (نظامِ طبیعی) جاری ہے۔ کسی اور شے سے کام نہیں لیتا ہے۔ وہ تم کو خارقِ عادت سے ڈرا نہیں دیتا ہے، غیر معتاد حالات سے وہ تمہاری آنکھوں کو چوندھیا نہیں دیتا ہے، تمہیں آسمانی دھماکے سے گونگا بنا نہیں دیتا ہے تمہاری فکر کی حرکت کو نمدانی آواز سے روک نہیں دیتا ہے۔ تمام مسلمان سوائے معدودے چند کے جن کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس بات پر متفق ہیں کہ خدا کا ایمان و عقیدہ، تمام رسولوں اور اُن کی نبوتوں پر ایمان و اعتقاد لانے سے مقدم ہے۔ اس لیے اللہ پر ایمان لانے کے لیے رسولوں کے کلام اور کتبِ منزلہ سے استناد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جس کتاب کو اللہ نے نازل کیا ہے اُس پر ایمان لانا اُسی وقت ممکن ہے کہ پہلے سے خدا کے وجود کی تصدیق ہو جائے۔ اور اس کو مان لیا جائے کہ وہ کتاب نازل کرتا اور رسول بھیجا کرتا ہے۔

علمائے مسلمین کہتے ہیں کہ پہلی بات جو مکلف پر واجب ہے یہ ہے کہ وہ اللہ کا اعتقاد حاصل کرنے کے لیے نظر و فکر کو استعمال کرے تاکہ اس کے بعد وہ رسولوں اور اُن کی کتابوں پر ایمان لا سکے۔ اور احکامِ خداوندی مان سکے۔ اور اُن کی حکمتوں کو جان سکے۔

دوسری دعوت: اس میں اسلام خارقِ عادت کو حجت گردانتا ہے۔ لیکن وہ خارقِ عادت کیا ہے، جس کو اسلام نبی علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق کا مبنیٰ قرار دیتا ہے؟ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو تواتر سے ہم تک پہنچی ہے۔ اور کہیں اس کا سلسلۂ روایت نہیں ٹوٹا اور ہر زمانے میں اتنے لوگوں نے اُس کی روایت کی ہے کہ اُن کا جھٹلانا عقلاً محال ہے۔ اُس کتاب کے سوائے جتنے احادیث و اخبار وارد ہوئے ہیں

خواہ اُن کی سند صحیح ہو یا مشہور، ضعیف ہو یا واہی وہ اِس درجے کو نہیں پہنچے ہیں کہ مسلمان اُن پر قطعاً یقین کر سکیں۔ اگر اُن سے استدلال کیا جاتا ہے تو اُس کتاب کے ثابت شدہ اُصول کی تقویت و تائید کے لیے، یا ایسے لوگوں کے لیے جو اُن کو تسلیم کرتے اور مانتے ہیں۔ وہ خارق عادت، تحصیل یقین کا ذریعہ اور استدلال میں مسلمانوں کی معول علیہ کتاب کیا ہے؟ صرف **قران**

اِس بات کی دلیل کہ وہ خارق عادت معجزہ ہے جو یہہ بتلاتا ہے کہ اُس کا بھیجنے والا خداوند ذوالجلال ہے۔ اور وہ کوئی انسانی من گھڑت کتاب نہیں ہے، یہہ ہے کہ وہ ایک ایسے اُمّی پر اُترا جس نے نہ کوئی کتاب پڑھی نہ کسی علم میں ممارست پیدا کی، یا ایں ہمہ وہ ایک ایسی کتاب لایا جو گمراہوں کو راستہ بتاتی ہے۔ کج روؤں کو سیدھا کرتی ہے اور اپنے مکمل نظام حیات سے، اقوام کو خسران و ہلاکت سے بچاتی ہے اور باوجود اس کے بلاغت و فصاحت میں وہ رتبہ رکھتی ہے کہ گزشتہ زمانے میں اچھے اچھے فصیحوں اور بلیغوں کو اپنے معارضے سے عاجز کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ لڑنے جھگڑنے پر اُتر آئے اور ہٹ دھرمی کرنے لگے اور مسلمانوں کو تکلیفیں، ایذائیں دینے لگے۔ لیکن خدا نے سچائی کو پکایا اور حق کو فروغ دیا اور باطل کو باطل اور دروغ کو دروغ کر دکھایا۔ اور آفتاب اسلام نے تمام عالم کو اپنی روشنی سے پرنور کر دیا اور کفر و شرک کی تاریکی کو کافور۔

اِس خارق عادت کتاب کے بارے میں بھی لوگوں کو کہا گیا ہے کہ اپنی عقلیں دوڑائیں اور اپنی انتہائی قوت سے اس میں غور و فکر کریں۔ اگر ان کے خیال میں کوئی ایسا طریقہ ہے جس سے اُس کا اعجاز باطل اور اُسکے دلائل ناقص ثابت ہوتے ہوں تو پیش کریں۔ خدا کہتا ہے۔

۱۔ ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ۔

جو کتاب ہمنے اپنے بندے پر نازل کی ہے اگر تم اُسکے بارے میں شک کرتے ہو تو اسکے مانند کوئی سورۃ لاؤ۔

۲- افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔

کیا تم قرآن میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اگر وہ سوائے خدا کے کسی اور کا ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا۔

اس کے سوا اور اور بہتیری آیتیں ہیں۔ جن میں دلیل کا دلیل سے مقابلہ کیا گیا اور علی الرغم عقل کسی بات کو تسلیم کر لینے کے لیے نہیں کہا گیا۔

قرآن کا معجزہ، قول و علم پر جامع ہے۔ سمجھنے کے بعد عقل ان دونوں امور کو قبول کر سکتی ہے۔ پس یہ ایسا معجزہ ہے کہ اس میں عقل کو دخل ہے اور عقل اس امر کی مجاز گردانی گئی ہے کہ اس میں غور و فکر کرے اور سمجھے۔ لیکن اس کا معجزہ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ انسانی طاقت اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ بریں ہم ہر شخص کو اس کی نظیر پیش کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے بغیر کسی معروف سبب کے زندے کو مار ڈالنا یا مردے کو زندہ کر دینا یا جسم سے شیطان کو دور کرنا، یا کسی مرض سے شفا دینا۔ ایسے معجزات ہیں جن میں عقل کام نہیں کر سکتی اور فہم و سمجھ بیکار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے معجزات، خدائے تعالیٰ اپنے رسولوں سے۔ ان اقوام کے لیے صادر کرتا ہے۔ جن پر وہم غالب ہو گیا ہو اور ان کی عقلیں نور علم سے روشن نہ ہوئی ہوں۔ خداوند متعال اسی طرح ہر ایک قوم کی استعداد کے موافق نشانیاں اور آیات بھیجا کرتا ہے۔

خوارق عادات کو اسلام سچائی اور حق پر دلیل نہیں گردانتا ہے۔ اس کے کسی کلمے سے یہ نہیں ظاہر ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام سنتہ اللہ کو اور قوانین فطرت کو بدل دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور یہ اس قدر مشہور بات ہے کہ اس کے متعلق زیادہ توضیح کی حاجت نہیں۔

اسلام[1] کا پہلا اُصول
حصولِ ایمان کے لیے عقل و فکر کا استعمال

سب سے پہلی بنیاد جس پر کہ اسلام کی عمارت چُنی گئی ہے۔ استعمالِ عقل اور غور و فکر ہے۔ عقل ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے ایمانِ صحیح حاصل ہو سکتا ہے۔ اِس اُصول سے ظاہر ہے کہ اسلام تمہیں، دلیل و حجت کے راستے پر لانا اور حاکم عقل کے پاس لے جانا چاہتا ہے۔ جو ایسے حاکم کے پاس تمہیں لے جائے۔ اور اُس کے تسلط کو مانے۔ وہ کیونکر ظلم و جور کو جو سراسر قوانینِ عقل کے خلاف ہے۔ جائز رکھ سکتا ہے۔

اِس اُصول کا مسلمانوں پر وہ اثر ہوا کہ اہلِ سنت میں سے بہت سے لوگوں کا قول ہے کہ جو شخص حق کو پانے کی کوشش کرتا رہے اور مر جائے اور امرِ حق میں ظن[2] کا مرتبہ بھی اُسے حاصل نہ ہو تو وہ ناجی ہے۔ اِس سے بڑھ کر بھی وسعتِ نظری اور کشادہ دلی ہو سکتی ہے؟

اسلام کا دوسرا اُصول
تعارض کے وقت ظاہرِ شرع پر عقل کی تقدیم

ہم مذکورۃ الصدر اُصول کے ساتھ ہی، اِس اُصول کو ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں اور ابھی اور اُصول کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہتے۔

---

[1] یہ اور اِس کے مابعد کے اُصول، نصرانیت کے چوتھے اُصول کے برعکس ہیں۔

[2] ظن: علم کا وہ مرتبہ ہے جس میں یقین کا پہلو راجح ہو اور شک کا مرتبہ کمزور۔

تمام اہلِ اسلام، سوائے چند غیر معتبر لوگوں کے، اِس بات پر متفق ہیں کہ جب عقل و نقل میں تعارض پیدا ہو جائے تو ایسی حالت میں عقل کو لے لیا جائے گا۔ رہی نقل۔ اُس میں دو صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ منقول کی صحت کو تسلیم اور اُس کے سمجھنے میں عجز کا اعتراف کر لیا جائے اور اصل حقیقت کو خدا پر چھوڑ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نقل کی تاویل کی جائے۔ اور اُس میں قوانینِ لغت کا لحاظ رکھا جائے تاکہ اسکے معنی اور تاویل عقل میں توافق رہے۔ اسی اُصول پر کتاب اللہ احادیثِ صحیحہ اور عملِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جہاں کہیں موقع ہوتا ہے عمل کیا جاتا ہے اِسی اُصول سے عقل کے راستے کی گھاٹیاں اور الجھنے والی جھاڑیاں صاف کر دی گئی ہیں۔ اور اُس کے لیے وسیع غیر محدود میدان بنا دیا گیا ہے، کیا فلاسفہ کی موشگافیوں کو مذہب میں اِس سے بھی بڑھکر صاف اور سلجھا ہوا راستہ چاہیے؟ - کیا طلاب علوم، اور اہلِ نظر کی جولانیوں کو مذہب میں اِس سے بھی زیادہ وسیع و فراخ فضا درکار ہے۔ باقی آیندہ

کس کے دل میں کھب گئی کسکی نظر میں جچ گئی
میرے دل ہی شے خدا معلوم کس کو بچ گئی

ہنستے ہنستے ہاتھ اسنے اپنے منہ پر رکھ لیا
آسماں سے آج بجلی گرتے گرتے، بچ گئی

تیز و تند و تلخ و دیرینہ شرابِ آتشیں
میرے ساقی نے مجھے جتنی پلائی بچ گئی

لے گئی سارے حواس، اب نقدِ جاں پر دات ہے
عرش تک، آہِ رسا کب میری للچا گئی

پیش قدمی کر کے اُس ظالم سے ملتے ہی بنی
ہاتھ کیا آیا بگڑ کر بات کی بھی بچ گئی

خونِ عاشق ہو کہ رنگِ بیوفائی ہو۔ مگر
چشمِ بددور آپ کے ہاتھوں میں مہندی جچ گئی

دل کے جانے پر یہ زور و شور فریاد و فغاں
بات آتی سی تھی، اسکی دھوم اتنی مچ گئی

اب تو میخانے میں کیفی ایک سناٹا سا ہے
وہ جھمیلا اسکشوں کا، اور وہ کچھ بچ گئی

نیک اندر بد و بد اندر نیک

کسی اُستاد نے یہہ بات کیا اچھی بتائی ہے
بھلائی میں بُرائی ہو بُرائی میں بھلائی ہے

وہیں صدہا محاسن ہیں جہاں سیدہ بُرائی ہو
وہیں لاکھوں مثالب ہیں جہاں کچھ پارسائی ہے

کہیں شاہد پرستی کا بہانہ ہے خدا جوئی
کہیں لفظ فخری بھی، سلام روستائی ہے

بہ باطن صاحب باطن ہے کوئی مالداری میں
بہ ظاہر ترک دنیا پر کوئی زر کا فدائی ہے

رسائی پر بھی اپنی کوئی شاکی نارسائی کا
کسیکی نارسائی بھی کسی حد تک رسائی ہے

عدو ہے کوئی ظاہر میں مگر ہے دوست باطن کا
کوئی باطن میں دشمن ہو بظاہر آشنائی ہے

بنا ہے کوئی بگڑا دل کسی مرشد کا سجادہ
طلب میں شاہد دنیا کی یوں بگڑی بنائی ہے

بُری صورت ردی حالت پہ کوئی ہو تو کیا سیرت
تو کوئی منہ کا بھائی پیٹھ پیچھے کا قسائی ہے

کسی کا ہم سفر کوئی مگر شک اس پہ ڈاکو کا
کسی کا رہبر تی مقصد ذریعہ رہنمائی ہے

بھرم لاکھوں کا رہتا ہو کسی کی مفلسی پر بھی
کہیں ہے گیروے کپڑے میں مجرم مرجع عالم

کسی کا جانگسل صدمہ ہنسی کی اوٹ میں پنہاں
کسی کے عیش میں بھی رنج کی جلوہ نمائی ہے

بد اندر نیک ہے کوئی تو کوئی نیک اندر بد
عجب دھندے میں دنیا کے تماشے کی خدائی ہے

بہر صورت زمانے میں سبھی بندے غرض کے ہیں
بدی نیکی کی پٹی سب کو قسمت نے پڑھائی ہے

مراسم سارے مطلب کے روابط سارے مطلب کے
غرض کا ملنا جلنا ہو غرض کی آشنائی ہے

ہمیں دنیا میں رہنا ہے یہہ دنیا ہے تمدن کی
تو ہم کس منہ سے منکر ہوں کہ آئین جگ ہنسائی ہے

نہ سوچینگے بھلائی میں کبھی پہلو بُرائی کا
ہمیں ظاہر پرستی ہی زمانے نے سکھائی ہے

اُسی کو جانینگے دشمن جو ہم سے لاگ رکھتا ہو
اُسی کو دوست ہم سمجھینگے جس سے آشنائی ہے

کرینگے اب نہ ایسی بات کی بیفایدہ کوشش
کہ کس دلمیں کدورت اور کس میں صفائی ہے

مصیبت کون سہتا ہے غرض اُس سے نہ رکھینگے
یہ مطلب اُس سے کسکو تیرِ آفت سے رہائی ہے

کوئی بے جرم بھی پائے سزا تو پائے بخت اُسکا
ہمیں کیا ہم پرائے عیب اپنی کوشش بھی پرائی ہے

حقیقت میں بناوٹ ہو کہ اصلیت حقیقت میں
نہ پوچھینگے کسی سے مردنی کیوں آپ چھائی ہے

کسی کے در پہ کوئی پھوڑتا ہو سر تو سمجھیں گے
یہی قسمت کا لکھا ہے یہ قسمت آزمائی ہے

بھلائی پر بھی مطعون خلائق ہے اگر کوئی
یہ ہم تسلیم کرینگے کہ یہ بھی اک برائی ہے

کوئی جاہل تقوی میں ریاکاری بھی کرتا ہو
کہینگے ہم اسی پر ختم ساری پارسائی ہے

زمانہ ہم سے وابستہ ہے ہم وابستہ ہیں اُس سے
کہیں پھر کس طرح سے ہم کہ یہ دنیا پرائی ہے

زمانے کا نہ دیں گر ساتھ تو دشوار ہے جینا
روابط اہل دنیا سے نہ کہیں تو برائی ہے

یہ سب کچھ ہے مگر رہتے نہیں یکساں روابط بھی
جہاں کچھ ابتدا ہے انتہا وہیں جھگڑا لڑائی ہے

کہیں تازہ آفرینی ہے کہیں فخر وفاداری
کہیں بیحد محبت ہے کہیں بالکل جدائی ہے

نہیں ممکن کہ سب کی ایک سی حالت رہے بازغ
طبیعت مختلف دنیا میں ہر انسان نے پائی ہے

بازغ حیدرآبادی

غزل

کس قہر کی تڑپ ہے ترے انتظار میں
بجلی پڑی ہوئی ہے دل بیقرار میں

آنکھیں ہیں خوں فشاں تو مرا دل ہے داغدار
یہ اپنے رنگ میں ہے وہ اپنی بہار میں

اچھا ہوا کہ یار ترا دھیان آگیا
گھبرا رہا تھا دل مرا تنہا مزار میں

ایوان دہر سے ہیں عیاں بے ثباتیاں
رنگ فنا جھلکتا ہے نقش ونگار میں

تشبیہ دے کے سنبل تر سے خجل ہوا
آتی ہے مشک ناف کی بو زلف یار میں

اللہ رے شوق دید کہ مرنے کے بعد بھی
آنکھیں اُسی طرح سے کھلی ہیں مزار میں

یارب تری طلب ترے اجلال کو رہے
خواہش نہ عز وجاہ کی ہو روزگار میں

محمد فیاض علی اجلال حیدرآبادی

ڈراما اور تھیٹر

(سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ آبان ۱۳۱۷ش)

انڈین اسٹیج

مسلمانانِ ہند اور تھیٹر

ہندوؤں کے بعد مسلمان ہندوستان کے مالک بنے، لیکن اُنہوں نے اپنے زمانۂ عروج میں کوئی توجہ ڈراما و تھیٹر کی جانب مبذول نہیں کی اسلامی دور کے اکثر صرف بھانڈ خیال کیے جا سکتے ہیں، لیکن ایسے وقت جبکہ مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہونے لگا تھا، اور انڈین ڈراما اور انڈین اسٹیج پست ترین اور مردہ حالت میں پہنچ چکے تھے، دفعتاً زمانے نے پلٹا کھایا نئے سر سے ڈراما و تھیٹر میں جان ڈالدی، اور ایک نیا دور پیدا کر دیا، ہندوستان کے آخری رنگیلے اور خوش طبع فرمانروا سلطان عالم واجد علی شاہ کی طبیعت کی لہر دفعتاً تھیٹر کی جانب پلٹ گئی، پھر کیا دیر تھی اِدھر امانت نے اندر سبھا لکھی اور اُدھر شاہی محل میں تھیٹر تیار ہوا، اور تھیٹر بھی ایسا کہ اُس کو پریوں کا جمگھٹا اور اندر کا اکھاڑا کہنا زیبا ہے، کہا جاتا ہے کہ خود شاہِ عالی جاہ بھی ایکٹنگ میں بڑا حصہ لیا کرتے تھے۔

اگرچہ امانت کی اندر سبھا ایک دیومالائی اور فرضی کہانی ہے۔ لیکن لاجواب طریقے سے لکھی گئی ہے، پلاٹ عمدگی سے بنایا گیا ہے۔ اور غزلیں، راگنیاں، وقت کے مناسب و موزوں رکھی گئی ہیں۔

ہندوستان کا موجودہ زمانہ اور تھیٹر

اودھ کا تختِ سلطنت اُلٹ جانے کے ساتھ شاہی محلسرا سے اندر سبھا کا تختہ اُلٹ گیا، لیکن فوراً عالی ہمت

پارسیوں نے جو انگلش تمدن کو اختیار کرنے میں ہندوستان بھر کے پیرو ہیں تھیٹر کو دوسرے فرنگستانی عجائبات کے پہلو بہ پہلو ایک دلنشیں تحفے کی صورت میں پہلے پہل بمبئی جیسے آباد و پُر رونق شہر میں جگہ دی بعد ازاں ہندوستان کے کُل شہروں میں اس کو پبلک سے روشناس کرادیا۔ پارسیوں کے بعد، مسلمانوں، بنگالیوں، مرہٹوں، اور مدراسی ہندوؤں نے بھی ڈراما اور تھیٹر تیار کیے۔ مسلمانوں کے تھیٹر میں اردو ڈرامے، پارسیوں کی تھیٹر میں اردو اور گجراتی، بنگالیوں میں بنگالی، مرہٹوں میں مرہٹی اور مدراسی تھیٹروں میں تامل ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، اردو، گجراتی، مرہٹی تھیٹروں کا منبع و مسقط الراس بمبئی ہے، باقی زبانوں کے تھیٹر اُن مقامات میں ہیں جہاں وہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

ضعیف کے اس مختصر رسالے میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان کے موجودہ تھیٹروں، ڈراموں کا تفصیلی تذکرہ لکھا جائے، اور اُن کے حُسن و قبح پر نظرِ تنقید ڈالی جائے، اس لیے صرف اردو تھیٹروں کے متعلق اجمالی بحث کی جاتی ہے۔ لیکن سلسلۂ بیان قایم رکھنے کے لیے اتنا لکھنا ضروری ہے کہ بنگالی اگرچہ تعصب و بے باکی سے زمانۂ موجودہ کے نقایص کا مقابلہ اور اظہار کرنے میں مبتلا ہیں، لیکن اُس کے ساتھ ہی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بنگالی لٹریچر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لٹریچر پر یہ فخر کرسکتا ہے، کہ اُس کے ڈرامے مشہور اور زبردست بنگالی انشا پردازوں کے زورِ قلم سے نکلتے ہیں، اور عموماً اُن میں کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانی زندگی کی تصویر کھینچی جائے؛ گجراتی ڈرامے کچھ تو بھوت پریت کے افسانوں اور فوق العادت کہانیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ انگریزی ڈراموں کے ترجمے ہیں؛ مرہٹی تھیٹروں میں ہندوستان کے پرانے ڈرامے ایکٹ کیے جاتے ہیں، مدراسی تھیٹر ابھی ابتدائی دور میں ہیں، اُن میں کچھ تو قدیم

ڈرامے ہیں، اور کچھ پارسی تھیٹروں کے اردو ڈراموں کے ترجمے، غرضکہ مذکورۂ بالا زبانوں میں ڈراموں اور تھیٹروں کی ترقی کے لیے بڑا بھاری میدان باقی ہے۔

انگریزوں کے تھیٹر ہندوستان میں

ہندوستانیوں کے تھیٹر کے علاوہ بمبئی کلکتے میں، انگریزوں کے مستقل تھیٹر بھی موجود ہیں، اور دوسرے اُن بڑے شہروں میں جہاں یورپین کمیونٹی کا زیادہ حصہ آباد ہے، مختلف یورپین تھیٹر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ یورپین شرفا وخواتین تفریح طبع کے لیے خود اپنی کلبوں میں ایکٹ کیا کرتے ہیں۔ اِن سب میں ڈرامے تو وہی کیے جاتے ہیں جو یورپ میں، دکھائے جاتے ہیں، لیکن ساز وسامان میں یورپ کے تھیٹر درکنار، ہندوستان کے تھیٹروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ حال میں کلکتے میں ایک شاندار تھیٹر بنایا گیا ہے۔ اور دوسرے مقامات میں بھی زیادہ ترقی کے لیے کوشش کی جارہی ہے۔

اردو ڈرامے و تھیٹر

اردو ڈراموں اور تھیٹروں کا سنگ بنیاد اگرچہ لکھنؤ میں (جو اردو کا مرکز ہے) اُسی کے ایک بلند پایہ شاعر (یعنے آغا) کے زورِ قلم کی بدولت رکھا گیا، اور وہیں کے ایک مسلمان فرمانروا نے اُس کی سرپرستی کی، لیکن یہ امر تعجب انگیز ہے کہ جس طرح اردو کا نشو ونما اغیار کے ہاتھوں ہوا اُسی طرح اُس کے ڈرامے اور تھیٹر اپنی ترقی کے لیے اُن لوگوں کے ممنونِ احسان ہیں جن کی زبان اردو نہ تھی اور اُنہوں نے اُس مقام میں اُس کو رفتارِ عروج پہ لا ڈالا جہاں کی ورنیکلر زبانیں دوسری ہیں۔

اردو ڈراموں اور تھیٹروں کی سرگزشت اب تک قلمبند نہیں ہوئی ہے، اور خوف ہے کہ اگر اسی طرح وہ چند دن تک لوگوں کی زبانوں یا سینوں سے نکل کے نقوشِ کاغذ کی صورت نہ اختیار کرے گی تو مثل

ہندوستان کے قدیم ڈراما کی تاریخ کے گم گشتگی کی تاریکی میں آجائے گی
میں اُن روشن خیال ڈراما نگار اصحاب سے جو اب اردو ڈراموں کی تصنیف
میں مشغول ہیں بڑے زور سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اِس اہم کام کی جانب
جو صرف تھوڑے سے وقت کا خواستگار ہے توجہ فرمائیں اور غفلت کو کام میں
نہ لائیں۔

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے امانت کے بعد اردو کے ڈراما نگار حافظ عبداللہ
مرزا نظیر بیگ ہیں۔ اور سب سے پُرانا تھیٹر "قدیم پارسی تھیٹریکل کمپنی بمبی"
کا ہے، جو ۴۰ سال پیشتر تیار کیا گیا تھا۔

پہلے پہلے تو صرف اندر سبھا، اور اُس کے جیسے دیو پری کے فرضی افسانوں
اور من گھڑت کہانیوں کے ڈراما بنائے جانے لگے، اِس کے بعد الف لیلہ
کے قصص اسٹیج پر دکھائے جانے شروع ہوئے۔

جس زمانے میں تھیٹر کی بنیاد قایم کی گئی ہے اُس وقت اردو زبان میں
نئی روح پھونکی نہیں گئی تھی، اور اِس کے سوا اُس وقت مسلمان شرفا
میں ڈراما تیار کرنا اور اکٹر بننا تو درکنار تماشہ دیکھنا تک معیوب خیال
کیا جاتا تھا۔ اِس صورت میں مالکان تھیٹر کو نہ تو اعلیٰ پایے کے اردو
ڈراما نگار مل سکے اور نہ مسلمان اکٹر۔ اِس لیے اُنہوں نے ہندو اور
پارسیوں کے ادنیٰ طبقے کے اکٹر بھرتی کیے جو اردو سے نابلد اور صرف طوطے
کی طرح رٹ کے تماشہ بتانے کی قابلیت رکھتے تھے، اور ڈراما نویس بھی
واجبی ہی واجبی لیاقت کے نصیب ہوئے۔ اُنہوں نے پُرانے طرز کے
اردو افسانوں کو سامنے رکھ کر قدیم طرز میں مسجع و مقفیٰ اردو ڈرامے بنائے
اب یہ وقت پیش آئی کہ اکٹر ایسے نہ تھے جو اعلیٰ موسیقی کے اُصول پر گا بجا
سکتے، اس لیے ایسے بے تُکے گانے لکھے گئے جو ہارمونیم پر بآسانی گائے جاسکیں
اور جو انگریزی طرز پر ہوں، اور اُن کا حفظ کر لینا آسان ہو، اسوقت تک

کسی کو تھیٹر کے اصلی اصول و اغراض معلوم نہ تھے اور نہ ڈراما کو نیچرل فیکٹس پر تیار کرنے کا خیال کیا گیا، صرف تفریحِ طبع ہی اُس کا مقصودِ اصلی تھا۔

تھیٹر کا تحفہ بمبئی میں بہت ہی مرغوب و دلنشیں بن گیا اور مالکوں کو خاصی کامیابی نظر آنے لگی، متعدد تھیٹر تیار ہونے لگے، رفتہ رفتہ مسلمانوں کی نفرت بھی کم ہونے لگی اور وہ بھی ایکٹ کرنے لگے۔ بمبئی، حیدرآباد، مدراس وغیرہ میں خود مسلمانوں نے تھیٹر بنائے جو بجز بمبئی کے باقی مقاموں میں چند دن قایم رہ کر ٹوٹ گئے۔

بمبئی میں جب تھیٹر کثرت سے تیار ہو گئے تو اُن کے مالکوں نے زیادہ نفع پیدا کرنے کے لیے ہندوستان میں دورہ کرنا شروع کیا۔

اب نئی تہذیب کا دور دورہ ہو چکا تھا، اُس کی روشنی میں ان تھیٹروں کے نقایص نظر آنے لگے، اور اِس امر کا خیال پیدا ہو گیا کہ ڈراما نگاری میں اصلاح کی جائے۔ اس خیال سے مولوی احسان اللہ گورکھپوری نے شکسپیر کے ڈراموں کا مختصر خلاصہ اردو میں تیار کیا۔ مولوی مرزا محمد ہادی صاحب مرزا تی۔ اے، پروفیسر ریڈ کرسچن کالج لکھنؤ نے مرقع لیلیٰ مجنوں کا ڈراما بنایا، جس میں پارسی تھیٹروں کے حسن و قبح کے متعلق تنقیدی نظر ڈالی گئی تھی۔ مرزا صاحب کی تصنیف اردو میں اپنی پہلی طرز کی کتاب ہے۔ اور اگرچہ وہ ڈراما تھیٹروں میں جگہ نہ پا سکا، لیکن ملک میں اصلاح ڈراما کا باعث ہوا۔ تھیٹر والوں کو بہ نسبت گزشتہ کے زیادہ لایق ڈراما نگار ملے اور غالباً منشی مراد علی مراد پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی اور سنسکرت کے مقبول ڈراموں کو اردو کا لباس پہنایا اور نیز اور نیل ڈرامے جو نیچرل فیکٹس پر مبنی ہوں تیار کرنے کا خیال کیا۔ اگرچہ یہ پہلی کوشش تھی اور اسی لیے اُس میں بہت سی خامیاں اور فروگزاشتیں پائی جاتی ہیں لیکن

بلحاظ موجودہ بہت ہی قابلِ تعریف ہیں۔ منشی صاحب کے ڈرامے "رائینو الفرڈ تھیٹرکل کمپنی" میں اور نیز اور بہتیری کمپنیوں میں کھیلے جاتے ہیں اور ملک میں بہت ہی مقبولیت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

منشی مراد کے بعد حافظ محمد یوسف افسوں، پنڈت دنایک پرشاد طالب منشی مہدی حسن احسن، آغا محمد شاہ حشر، مولوی نظیر حسین سخا، بیتاب وغیرہ نے اُن کی تقلید کی اور شکسپیر وغیرہ کے ڈراموں کے ترجمے تیار کیے۔ رفتہ رفتہ تمام تھیٹروں میں یہ اسی طرز کے ڈراموں کے عوض اب نئے ڈرامے کیے جاتے ہیں اور وہی پبلک کو پسند بھی آنے لگے ہیں۔

تھیٹر کے آرتھروں کے سوا لائق و قابل انشا پردازوں کو بھی ڈراما نگاری پر توجہ ہوئی۔ منشی جوالا پرشاد برق سب جج مرحوم، منشی امتیاز علی بی اے نے شکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ کیا۔

مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر نے "شہید وفا"، "بیوۂ تلخ"، مولوی ظفر علیخاں صاحب نے "محاربۂ جنگِ روس و جاپان" مولوی حبیب احمد صاحب تمنائی نے تحاصرۂ غرناطہ کے ڈرامے شایع کیے۔ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی اے نے وکرم اُروسی کا ترجمہ کیا۔

غرضکہ اردو میں بھی ڈرامے اور تھیٹر ترقی کرنے لگے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہنا بالکل حقیقت ہے۔ کہ ابھی حقیقی ترقی کے لیے منزلِ ہفت خواں طے کرنی ہے۔ بہت سے نقایص باقی ہیں جو رفتہ رفتہ دور ہوں گے، مگر بحیثیت مضمون نگار میرا فرض ہے کہ اُن کے نقایص پر ایک تفصیلی نظر ڈالوں۔ پس بغرضِ آسانی اُن نقایص پر جدا جدا عنوانوں میں بحث کی جائے گی۔ (باقی آیندہ)

محمد عبدالرحمٰن بدر
اورنگ آبادی

گلاب

اے گلاب! اے نمونۂ قدرت — زینت افزائے گلشنِ فطرت
قدرتِ حق کی اک مثال ہے تو — سارے پھولوں میں خوش جمال ہی تو
تیری صورت دلوں کو بھاتی ہے — دیدۂ شوق کو لبھاتی ہے
ہے خوش اسلوب پنکھڑی تیری — لبِ محبوب پنکھڑی تیری
کیا طرحدار ہے ترا غنچہ — دہنِ یار ہے ترا غنچہ
زلفِ محبوب کی ہے تجھ میں بُو — کیونکہ تو ہے مصاحبِ گیسو
روئے دلدار کی ہے تجھ میں جھلک — مثل تیرا کہاں سے لائے فلک
دلفریبی میں انتخاب ہے تو — دلربائی میں لاجواب ہے تو
کیوں نہ عاشق کو ہو ترا سودا — روئے دلبر کا تجھ پہ ہے دھوکا
تیری بو سے دماغ کو راحت — تیرے عطروں سے روح کو فرحت
حد سے زاید ہیں وصفِ خاص ترے — بارِ دوش ہیں خواص ترے
تجھ سے گجرے بنائے جاتے ہیں — تجھ سے گلرخ سجائے جاتے ہیں
تجھ سے قبروں کی زیب و زینت ہے — تجھ سے ارواح کی ضیافت ہے
گوندھے جاتے ہیں تجھ سے سہرے ہار — تو ہے زینت دہِ سر و دستار
سارے معشوق تیرے عاشق ہیں — سارے محبوب تیرے شایق ہیں
تجھ سے سیجیں سجائی جاتی ہیں — تجھ پہ آنکھیں بچھائی جاتی ہیں
ادویہ میں شریک ہوتا ہے — سخت بیماریوں کو کھوتا ہے
تجھ سے گلقند بھی بناتے ہیں — شوق سے لوگ جس کو کھاتے ہیں
خوب تجھ سے گلِ آب ہی کھنچتا — جو ہے فرحت دہ و سرور فزا
اپنی مٹھی میں تو ہے زر رکھتا — دل میں لوگوں کے تو ہے گھر رکھتا
تجھ پہ ٹپکے ہے کچھ عجب جوبن — وہ سفیدی میں کچھ گلابی پن

پنکھڑی پر وہ پنکھڑی تیری — کیا مزا دے رہی ہے لپٹی ہوئی
تجھ میں یہہ آن بان کیسی ہے — تجھ میں یہہ طرفہ شان کیسی ہے
باغ میں پھول سینکڑوں ہیں مگر — نہیں تیرا ہے ایک بھی ہمسر
وصف تجھ سا، نہ تجھ سی خوآن میں — رنگ تجھ سا، نہ تجھ سی بو آن میں
اس چمن میں کچھ آب و تاب نہیں — زینت افزا جہاں گلاب نہیں
سارے پھولوں کا تو ہے شاہنشا — سب سے بڑھ چڑھ کے ہے ترا رتبہ
بلبلیں تجھ پہ دل سے شیدا ہیں — محو نظارۂ سراپا ہیں
جان دیتی ہیں تیری صورت پر — صدقے ہوتی ہیں تیری رنگت پر
تیرے کھلنے پہ چہچہاتی ہیں — زمزمے کر کے دل لبھاتی ہیں
حد سے زاید ہیں خوبیاں تجھ میں — نت نئی دلفریباں تجھ میں
عیب کوئی نکل نہیں سکتا — واہ وا واہ، تیرا کیا کہنا
پر تعجب کچھ، ایک بات میں ہے — جو کہ داخل، تری صفات میں ہے
خار کیونکر ہے تجھ سے ہم صحبت — اس میں، تجھ میں، ہے کون سی نسبت
کس طرح پاس تیرے آ بیٹھا — کیسے، پہلو ترا دبا بیٹھا
ہو نہ ہو، اس میں بات ہے کوئی — غور سے، کچھ نہ کچھ، ہو ظاہر فی
ہیں جہاں میں خوشی و غم، توام — کہیں شادی تو ہے کہیں ماتم
رنج لازم ہے، ہر خوشی کے لیے — نیش پہلے ہے، نوش پیچھے ہے

گنج ہے جس جگہ، وہاں ہے مار
"پہلوئے گل میں ہو، نہ کیونکر، خار"

ا-ن-ع-ا-

رباعی لمعہ (از حیدرآباد)

یہہ عمر رواں ہے مثل آب دریا — تو مثل حباب کس لیے ہے پھولا
ہر صبح کو کہتا ہے یہی مرغ سحر — اک رات ہوئی، عمر سے کم واویلا

پتنگ

عقلمند آدمی ہر چیز سے سبق حاصل کرتا ہے، میں آج شام کو فضائے آسمان کی سیر کرتا تھا، مرغانِ کاغذی کو جو بیسیوں کی تعداد میں دوشِ ہوا پر سواری کر رہے تھے بغور ملاحظہ کیا۔ یہ پتنگ کرۂ ہوا میں قلابازیاں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر چلتے پھرتے، کودتے، دوڑتے اور ٹھہرتے تھے، اُن کا یہ چلنا پھرنا کودنا، دوڑنا، ٹھہرنا، اُن کا خود اختیاری فعل نہیں تھا بلکہ بمصداق ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اُن کی نکیل انسان کے ہاتھ میں تھی اس لیے اگر میں یہ کہوں تو بجا نہ ہوگا کہ ان کنکوؤں کی حرکتیں، اُن کے اُڑانے والوں کی حرکتیں تھیں اور اُن کی کھینچ تان، دوڑ، دھوپ، سے میں اُن کے کیارکٹر، جذبات خواہشات، اور حصولِ مقاصد کے طریقوں پر واقف ہو سکتا ہوں۔

۱۔ تار باندھ کر پتنگ اُڑانے والا یا تو بطورِ تفنن کے ایسا کرتا ہے یا جلبِ منفعت کی غرض سے، آخر الذکر، پتنگ لڑانے والوں میں سخت کمینہ شمار ہوتا ہے، گویا وہ ایسا کتا ہے جو شیروں کی لڑائی میں بغیر کسی آنچ کے مردار بوٹیاں کھینچ لے جاتا ہے۔

۲۔ مقابلہ یا یہ کہو کہ جنگ کرنے والے پتنگوں میں جو پتنگ بہادر اور سیدھے سادے آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اُن میں بہت جلد مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، اور اُن میں سے کوئی ایک فوراً کٹ جاتا ہے۔

۳۔ جو لوگ خبیث الطینت ہوتے ہیں اُن کے پتنگ بہت دیر میں جا کر دو بدو اور کلہ بہ کلہ ہوتے ہیں۔ بہت سا وقت داؤں پیچ میں صرف ہو جاتا ہے۔ گویا وہ جنگ سے بہت ہچکچاتے ہیں اور بزدلی کے باعث جان جوکھم [illegible] اُن کے پتنگوں کا ہٹنا، بڑھنا، لڑائی کے لیے مستعدی ظاہر کرنا

اور ساتھ ہی پیچھے ہٹ جانا اُن کے چھوٹے دلوں کی اضطراری حالت کا پتہ دیتا ہے۔

— محمد نصیر الدین

(اڈیٹر) — اس مختصر مگر انوکھے مضمون میں پتنگ اُڑانے سے جو نتائج استنباط کیے گئے ہیں، وہ قابلِ قدر ہیں۔ عقلمند آدمی بے شک "ہر چیز سے سبق حاصل کرتا ہے"۔

پتنگ کے متعلق ایک مبسوط مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ غالباً اُردو رسایل میں اب تک اس کی جانب توجہ نہیں کی گئی۔ ہمارے ملک میں پتنگ اُڑانے کا بہت شوق ہے امیر سے لے کے غریب تک پتنگ بازی کے جلسے کرتے ہیں، اور اُس میں بہت سا روپیہ اُڑا دیتے ہیں مگر کوئی مفید بات نہیں حاصل کرتے۔ یورپ میں بھی پتنگ اُڑانے کا شوق ہے۔ مگر یہاں اور وہاں کی پتنگ بازی میں فرق یہ ہے کہ یہاں پتنگ کے کاٹنے پر خوشی منائی جاتی ہے۔ اور وہاں پتنگ کے بہت زیادہ اونچا کرنے پر۔ جرمنی میں اس کے جلسے کیے جاتے ہیں۔ شاید غبارہ بازی کا شوق اسی پتنگ بازی سے ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پتنگ اُڑانے سے تفریحِ طبع کے علاوہ، ہاتھوں کی ورزش بھی ہو جاتی ہے اور بصارت کو بھی جولانی کرنی پڑتی ہے جس سے وہ تیز اور قوی ہوتی ہے۔ لیکن پتنگ بازی کے جلسوں میں روپیے کی سی قیمتی چیز کا جو خون ہوتا ہے، وہ ضرور قابلِ افسوس ہے۔ اگر حساب لگایا جائے گا تو ہر سال صرف حیدرآباد کا ہزارہا روپیہ اس مصرف میں ضایع ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔ پتنگ اُڑانے کے زمانے میں صدہا دُکانیں نئی کھل جاتی ہیں جن میں پتنگ، مانجھ، چرخیاں، تاگا، وغیرہ بھرا رہتا ہے اور خوب بکری ہوتی ہے۔ قوم کے بیکار افراد تو دن بھر اسی میں گتھی رہتے ہیں

مگر بعض باکار اشخاص بھی روپیے کے علاوہ اپنا عزیز وقت اس کی نذر کرتے ہیں جن لوگوں کا مذاق پتنگ بازی میں بلند پایہ ہے۔ اور وہ پتنگ بنانے سے بھی واقف ہیں۔ وہ چھ چھ مہینے آگے سے کھانب بدے تیار کرتے رہتے ہیں، اور اس مشغلے میں ایسے منہمک رہتے ہیں کہ رستہ چلتے وقت بھی اُن کے ہاتھ میں چاقو اور بانس موجود رہتا ہے۔

جو چیز اعتدال پر ہے، اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر جہاں افراط و تفریط سے کام لیا گیا کہ اس میں خرابیاں پڑ جاتی ہیں۔ اور بُرے نتائج پیدا ہونے لگتے ہیں)

مجھ سے سُنو مرا بیاں ہیں ہوں زبان آرزو
میرے سوا کوئی نہیں، مرتبہ دان آرزو

لُٹ گیا، گو دیارِ دل، ملکِ جگر اُلٹ گیا
ہے مگر اک کھلی ہوئی اب بھی دکان آرزو

اس میں اُمیدِ وصل ہے، اُس کو ہے شوقِ اختلاط
اُف رے مرادِ قلبِ دل، واہ ری شان آرزو

جیب سے ہو کے فدائے یار، دل میں اُمیدیں بھر گئیں
اس سے تو پہلے کچھ نہ تھا، وہم و گمان آرزو

میں ہمہ تن زبان ہوں، اُن کا خیال منتشر
آئے تو آئے کس طرح، لطفِ بیان آرزو

پورا ہو مقصدِ دلی میں وہ دن خدا کرے
باقی رہے نہ نام کو، نام و نشان آرزو

اُس کی اُمیدِ وصل سے، اُس کے خیالِ ہجر سے
سینہ فروزگاہِ غم، دل ہے مکان آرزو

اُن کی نگہ تھی یا غضب، اُن کی نظر تھی یا بلا
رہ گئی بارِ خوف سے، کھل کے زبان آرزو

وہ مری چشمِ انتظار، کر کے گزارشِ دلی
وہ تری، قہر کی نظر، سُن کے بیان آرزو

یورشِ فوجِ یاس سے، ہو گیا ملکِ دل تباہ
تیغِ اِلم سے گر پڑا، کٹ کے نشان آرزو

ہاں امیرؔ مدعا، دیکھ نہ ہو کہیں خطا
تیرے ہی بل پہ کھینچی ہے میں نے کمان آرزو

رہنے نہ پائی ایک دم، شامِ وصال کی خوشی
صبحِ فراق بن گئی، دشمنِ جان آرزو

تم نے تو بازغِ خزیں، ایسی کہی ہے یہ غزل
قبر میں بھی پھڑک اُٹھے سُن کے جو خانِ آرزو

شیریں کلامی

عجب چیز ہے، تو بھی شیریں کلامی — کہ شیدا ہے تجھ پر، ہر اک خاص و عامی
مٹاتی ہے رنج و غم و تلخ کامی — بناتی ہے دنیا میں لوگوں کو نامی
بن آتے ہیں سب کام تجھ سے جہاں کے
تجھ ہی سے ہیں دل شاد خرد و کلاں کے

ترے دم سے دنیا میں، خلق و مروت — ترے خلق سے لطف و اکرام و راحت
ترے لطف سے فیض و جود و عنایت — ترے فیض سے رحم و احسان و رحمت
تری رحمتیں، سایہ گستر جہاں پر
ترا سایہ ظل ہما سے ہے بڑھ کر

جہاں تو وہاں ہے مروت، محبت — جہاں تو وہاں ہے حمیت، حمایت
جہاں تو نہیں، ہے وہاں بغض و نفرت — جہاں تو نہیں، ہے وہاں رنج و زحمت
مبارک زباں، جس کو اُلفت ہے تیری
مقدس وہ دل، جس کو رغبت ہے تیری

ہر اک سے محبت، یہ ہے تیرا شیوہ — ہر اک سے عنایت، یہ ہے تیرا میوہ
ہر اک سے مدارا، یہ ہے تیرا مژدہ — ہر اک سے مواسا، یہ ہے تیرا حصہ
بنے موم تجھ سے، اگر سنگ دل ہو
عدوئے شتر کینہ، تجھ سے خجل ہو

زباں جس کی شیریں ہے شاد اُس سے سب ہیں — جو ہے تلخ گو لوگ خوش اُس سے کب ہیں
جہاں ایک دو آدمی پر غضب ہیں — وہاں ہر دم آلام و رنج و تعب ہیں
نشیمن نہ ایسی محفل سے دوری ہے بہتر
جہاں تلخ کامی سے دل ہو مکدر

سید غلام مصطفیٰ ذہین حیدر آبادی

خوشامد

یہ لفظ عام طور پر عالی ظرف اصحاب کے نزدیک بہت ذلیل ہے اور اس کا مفہوم نہایت مکروہ خیال کیا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی فرد بشر ایسا نہیں جو کبھی کسی کی خوشامد نہ کرتا ہو اور جب اس کی خوشامد کی جائے تو وہ خوش نہ ہوتا ہو تمدن کے کاروبار ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ضروریات زندگانی کے پورا کرنے کے لیے دوسروں کے پاس حاجتیں لی جاتی پڑتی ہیں پس جب تک محتاج الیہ کو اپنے حال پر متوجہ نہ کرایا جائے ممکن نہیں کہ سہولت اور سرعت سے حاجتیں پوری ہو جائیں کیسا ہی عالی ظرف اور باعزت کیوں نہ ہو اپنی ضرورت کو پورا کرتے وقت اگر محتاج الیہ کی خوشامد نہ کرے تو کم از کم نرمی سے پسندیدہ لہجے میں تو ضرور التماس کرتا ہے اور یہ ایک قسم کی خوشامد ہے۔

خوشامد کا تعلق نوع انسانی تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ہر جاندار مختلف طریقوں سے کچھ نہ کچھ خوشامد کرتا نظر آتا ہے۔ بلی کو بھوک لگتی ہے تو آکے ہاتھ، پانوں سے اپنی نرم و پشمدار جلد رگڑنے لگتی ہے۔ خرخر کر کے سامنے لوٹ جاتی ہے کپڑوں کو سونگھتی ہے کتا اپنے آقا کو دیکھ کے دم ہلاتا ہے رگر رگر کرتا ہے اور مالک کی صورت کو اس طور پر دیکھنے لگتا ہے کہ دل میں پیار آجاتا ہے، اسی طرح دوسرے جانور گھوڑے اونٹ ہاتھی وغیرہ ہیں جو اپنی بعض حرکتوں سے اپنے پالنے والوں کا دل خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو کسی کی واقعی تعریف بھی خوشامد کے سوا کچھ اور نہیں۔ کیونکہ یہ تعریف اس کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور یہی خوشامد کے اصلی معنے ہیں۔ اس نتیجے پر آنیکے بعد خدا کی مدح و ثنا اور اظہار قدرت کی نسبت عمدہ الفاظ کا استعمال خوشامد ہی خوشامد ہے اور اسی کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ع سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا بھی ہے۔

خوشامد کے لفظی معنوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ اتنی بری نہیں معلوم ہوتی جتنی اس کے مختلف طریقوں پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خرابی نفس شے کی نہیں بلکہ طریقوں کی

پیدا کردہ ہے۔ طریقے ایسے اختیار کیے جاتے ہیں جن سے خواہ مخواہ خوشامد کرنے والا عام نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، ایک شاعر کا ممدوح کی تعریف میں قصیدہ پڑھنا اور ایک بھانڈ یا میراسی کا دل خوش کن جملے کہنا اور نقل بتانا خوشامد کی ترازو میں برابر وزن رکھتا ہے، لیکن قصیدے کو سن کے لوگ داد دیتے ہیں۔ اس کے اشعار مزے لے لے کے پڑھتے ہیں اور اس کو دل سے عزیز رکھتے ہیں، بخلاف اس کے بھانڈ ذلیل کا ذلیل بنا ہی

اسی لیے ہر شخص کو خوشامد سے کام لیتے وقت سب ذیل امور کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۱۔ خوشامد کرنے والا کس حیثیت اور عزت کا ہے۔

۲۔ جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس کی کیا حیثیت و عزت ہے۔

۳۔ جو جملے یا الفاظ خوشامدانہ کہے جاتے ہیں وہ مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے موزوں و مناسب ہیں یا نہیں۔

۴۔ خوشامد کا کوئی محل و موقع بھی ہے یا کیا کہیں بے ضرورت اور بے موقع خوشامد تو نہیں کی جاتی ہے۔

۵۔ خوشامد سے نفع کے بجائے نقصان تو نہ ہوگا بعض وقت خوشامد مضر بھی ہو جاتی ہے، اس کا بڑا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

م۔ ا۔ ع۔

غزل

زندے ہیں مرے، مُردوں پہ رویا نہ جائیگا
رومال آنسوؤں سے بھگویا نہ جائے گا

نیکی کی خو، نہ چھوڑیں گے، کوئی بدی کرے
لب بوسے دو، پہ ہم سے تو بویا نہ جائے گا

حالت بدل گئی، مری تشویش ٹل گئی
پھر نشتر اب، رگوں میں چبھویا نہ جائے گا

کیوں؟ بائیں آنکھ پھڑکی، ہمیں نیک یہ شگوں
کیا سر تو دل کی طرح سے کھویا نہ جائے گا

تھا کہیں، انہوں نے بالوں میں موتی پرو لیے
آنسو تو بال بال پرویا نہ جائے گا

اعزاز آؤ، باتوں میں کچھ وقت کاٹ دیں
سر میں خفیف درد ہے سویا نہ جائے گا

اعزاز حیدرآبادی

لاون باتیں کر رہا تھا اور لوسیا ٹکٹکی جمائے پہلے کی طرح اُس کو گھور رہی تھی۔ اُسکی نگاہوں یا اُس کی وضع سے کوئی ایسا امر نہ پایا جاتا تھا کہ وہ اِن باتوں کو سمجھ رہی ہے یا اِن کی نسبت غور کر رہی ہے۔ لاون عجیب بے حواس تھا، اُس کو کچھ بھی شرم نہ آئی کہ ایسے غم و الم کے عالم اور منحوس و مکروہ وقت میں اِس قسم کی باتیں کہہ رہا تھا جو نفوسِ شریفہ کو سخت ناگوار تھیں۔ لوسیا کے سکوت نے اُس کو دھوکے میں ڈالا اُس نے خیال کیا کہ لوسیا رضامند ہے۔ حالانکہ وہ صرف آواز ہی سُن رہی تھی، سمجھنے سے عاری تھی۔ اُس کی فکریں بعید بنی ہوئی تھیں۔ مگر اُس کی کھچی ہوئی ہیئت، عجیب سکوت، ترچھی نگاہوں اور آنکھوں کی مختلف حرکتوں سے لاون کو بالکل علم نہ ہو سکا۔ اُلٹا وہ یہ سمجھ گیا کہ لوسیا اُس کی جانب مائل ہے، کیونکہ اُس کی سی دوسری عورتیں مائل ہو جایا کرتی تھیں، چنانچہ پیرس میں وہ اپنی چھبیلی باتوں سے اکثر لڑکیوں کو بہت جلد اپنے پر لگا لیتا تھا۔ لاون کے اِس خیال کو اُس ملاطفت سے اور تائید ملی جو لوسیا اُس کے ساتھ برتا کرتی تھی۔

الغرض عشقِ بہیمی کا بھوت، لاون کے سر سوار ہوا، اور اُس کی بے باکی، خیرہ چشمی کی حد تک پہنچ گئی۔ وہ جگہ سے اُٹھا، لوسیا کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا اور ملاطفت سے پیش آنے لگا۔ لوسیا نے ایک سرد آہ کھینچی۔ لاون سمجھا کہ یہ خوشنودی کا کافی جواب ہے، کمر میں ہاتھ ڈال دیے، لوسیا نے سر جھکا دیا، پھر کیا تھا لاون ریشۂ خطمی ہو گیا۔ جذباتِ عشق ظاہر کرنے لگا، بھینچ کر سینے سے ملا لیا اور لبِ لعلیں کا بوسہ لے لیا۔

لوسیا کانپ اُٹھی اور بھیانک آواز سے چیخ مار کر اپنے آپ کو اُس کے پنجے سے چھڑا لیا اُس وقت اُس پر لرزہ طاری تھا۔ اور آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ لاون دہشت ناک ہو کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اُس کو مطلق نہ معلوم ہوا کہ لوسیا کس حالت میں ہے، اُس کو لوسیا کی صورت بہت ڈراؤنی نظر آئی مگر دل کڑا کیا اور جامۂ حیا کو چاک کر کے چاہتا تھا کہ ایسی درشت کلامی سے پیش آئے کہ گویا لوسیا پر پوری قدرت رکھتا ہے کہ اتنے میں لوسیا آگے بڑھ کے قریب آئی اور آڑی ترچھی نظروں سے دیکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور زور سے ایک ہتڑ رسید کر کے بولی "او خبیث!

او شیطان - دو - ہو" پھر روتی ہوئی پیچھے ہٹ آئی - اور نگاہِ نازسے دیکھنے لگی وہ خود رفتہ ہو کر اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھ رہی تھی - اور جس چیز پر نظر ڈالتی تھی گویا جانتی ہی نہ تھی کہ وہ کیا ہے - نہ اُس کو یہ علم تھا کہ لاون ہے یا چلا گیا - وہ روتی اور آہ آہ کرتی کمرے میں گشت لگانے لگی بعد ازاں دریچے کی طرف بڑھی - خانہ باغ کی طرف نگاہ دوڑائی بلند درختوں کی چوٹیوں پر نظر کر کے بولی "یہ لو، دیکھو - غراب البین تو بیٹھا ہوا ہے" یہ سُن کے لاون ڈرا اور اُس کے پیچھے آ کے دیکھنے لگا - وہاں کچھ بھی نہ تھا - لوسیا پھر بولنے لگی "آہ غراب البین! تو کیسا بُرا اور منحوس پرندہ ہے" یہ کہہ کے عجیب آواز سے غاق غاق پکارنے اور کوے کی بولی کی نقل اُتارنے لگی - پھر گویا جاڑے کی شدت سے کانپنے اور یہ بولنے لگی "ہو ہو - ہو ہو ہو ہو - ہو ہو - کیا سخت پالا پڑا ہے - میں آج اپنا سفید لبادہ اوڑھ کر پھول توڑنے کو باغ تک نہیں جا سکتی - وہ پھول جو عطر آگیں ہوتے ہیں اور جن سے نیلا پرندا گلے ملتا ہے - مگر مجھے ڈر ہے کہ وعدے کی پابندی کروں اور باوا جان کیلیے کچھ نہ کچھ پھول جمع کر رکھوں - میرے باپ کا کیا نام؟ ——— تعجب ہے کہ میں بھول گئی - ہائے افسوس - وہ منحوس غراب البین ابتک موجود ہے - کس قدر کریہ المنظر ہے - چلا جا - چلا جا - ناق - غاق ———"

لاون اِس تمام بے ربط کلام کو سُن رہا تھا - اور بدحواس ہو کے کہہ رہا تھا "افسوس بیچاری دیوانی ہو گئی" لوسیا اپنی جگہ پہ بیٹھ کے کانپ رہی تھی لاون نے دریچہ بند کر دیا - اور آگے بڑھ کے لوسیا لوسیا کہہ کے پکارنے لگا - لوسیا نے خائف ہو کے دیکھا اور بولی "چپ رہ - خاموش، ٹھہر جا - غراب البین مجھے ڈھونڈھ رہا ہے - منحوس اور کالا بھٹ - مجھے اُس سے ڈر ہوتا ہے - میں کہاں چھپ جاؤں -

اُس نے اپنے آپ کو سکیڑ لیا اور ہاتھ پاؤں سمیٹ سمٹا کر منہ کو چھپا ڈالا اور جنون کی ہنسی ہنس کر بولی :-

"اب میں چھپ گئی - اب میں پوشیدہ ہو گئی"

لاون کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا تھا اور بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اس ہیبت ناک منظر کو دیکھ کے وہ سٹی بھول گیا۔ اور گھبرا کے کمرے سے نکل بھاگا جاتے ہوئے ایک خادمہ سے کہہ گیا کہ لوسیا دیوانی ہو گئی ہے تو اندر جا کے اسکی خبر لے۔

چوتھا باب

بیالیل

اس وقت نواپ کی فکر و تشویش انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اور اس کی تمام تمنائیں تہ خاک ہو گئی تھیں، وہ گھبرایا ہوا کمرے میں آیا اور اپنے حال و استقبال کی نسبت غور و خوض کرنے لگا۔ سوچنے پر اسے یاد آیا کہ اس کے دوست۔ مارکوس پیلی نے ایک ایسے آدمی سے اس کا تعارف کرایا تھا، جو حسن تدبیر اور خوبی رائے کے علاوہ مکاری، حیلہ سازی اور گربزی میں شہرۂ آفاق تھا۔ وہ سنگین جرائم کا مرتکب ہوتا تھا اور ہول انگیز خطروں میں بے تحاشا گھس پڑتا تھا کسی آفت یا بزدلی سے متاثر ہونا اسے معلوم ہی نہ تھا۔ خفیہ جرائم کے اقدام میں جنہیں ابلیس کے سوا کوئی اور عمل میں نہیں لا سکتا، اس کو خاص مہارت تھی۔ اور جو شخص اس کو کافی معاوضہ دیتا تھا اس کا کام ایسی ہی دلدہی اور ہمدردی سے انجام دیتا تھا کہ گویا کوئی بڑا خیر اندیش اور بہی خواہ ہے۔ اس شخص کا نام "بالیل" بتایا گیا تھا۔ (یہ وہی شیطان مجسم ہے جس کا ذکر دیباچے میں آچکا ہے۔)

بیالیل کی یاد آتے ہی لاون کو خاص مسرت حاصل ہوئی اور چہرے پر رونق آگئی، اس نے تہیہ کر لیا کہ بیالیل سے مل کر مشورہ لے گا، اور اسکی تدبیر پر بھروسہ کرے گا۔ اسی وقت تیار ہو گیا اور پہلے پرسلی سے ملنے کو چلا

پرسلی سے ملاقات ہوئی تو لاون نے بعض تجارتی کاروبار میں شوریٰ کرنے کی ضرورت بتا کے بیالیل کو بلانے پر اُسے آمادہ کیا۔ پرسلی نے بیالیل کے نام رقعہ لکھ دیا۔ لاون کو دے کر کہا آپ اُسے لے جائیے۔ غالباً ملاقات ہو جائیگی۔

بیالیل اُس وقت گھر ہی میں تھا، اور تر شہ و ہو کے بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے میز پر متعدد چٹھیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُنھیں اُلٹ پلٹ کے پڑھتا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ غیظ و غضب میں آ کے کہتا جاتا تھا:۔

"خدا غارت کرے عجب منحوس زمانہ آیا ہے کہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا وہ راہِ ہدایت پر پڑ گئے ہیں۔ اور آداب و اخلاق کا دامن پکڑے ہوئے ہیں، زمانے کی غداریاں کیا ہو گئیں! اخلاق کی ابتری کہاں چلی گئی، مکار، حیلہ باز، اور خباثت شعار کدھر مر گئے! آج کل میرے پاس ایسا ایک بھی آدمی نہیں آتا جو اُن ابلیسانہ منصوبوں کی انجام دہی پر مجھے مقرر کرے جو ابنائے دنیا کی عادت میں داخل ہیں شیطان کہاں ہے جو اُن کو شیطنت کی راہیں نہیں دکھاتا، اور اُن کے دلوں میں بُرے وسوسے نہیں ڈالتا۔ کیا اُس کا تسلط جاتا رہا، یا وہ جہنم میں جھونک دیا گیا، نہیں، یہ تو کبھی ہونے والی بات نہیں، مگر پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے اُس نے کیوں چشم پوشی کر لی، میرے بھیڑیے بھوکے ہو گئے ہیں اور میرے پاس اُن کا راتب باقی نہیں رہا، اگر چندے یہی نوبت رہی تو یقیناً وہ مجھے پھاڑ کھائیں گے، جس کا اُنہیں حق بھی ہے، کیونکہ وہ میرے خاص سپاہی ہیں اور میری خدمتیں خیر خواہانہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ مجھے اُن پر بڑا اعتماد ہے، اب کیا کروں، کون سی تدبیر سوچوں، تنخواہوں کے تقاضے میں تو سینکڑوں خط چلے آتے ہیں، لیکن ایسا ایک بھی نہیں آتا جسے دیکھ کر مجھے خوشی ہو اور امیدوں کا دروازہ کھل جائے، ہائے میں کس بدبختی میں پھنس گیا ہوں! کیا میں اسی حالت میں رہوں یا اپنا رویہ بدل دوں۔ صبر، صبر! بدی کی راہیں ہمیشہ کھلی ہوئی ہیں

اور لوگ اُن پر ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ مجھ کو مایوسی سے خوف نہ کرنا چاہیے کیونکہ بڑا مکار اور بڑا غدار آدمی بھی میرا محتاج ہوتا ہے، اور بڑے بڑے کاموں میں میرا مجھ سے مدد لیتا ہے۔"

وہ انہی خیالات میں منہمک تھا کہ خادمہ نے لاکر پرسلی کا خط دیا، اُسے پڑھتے ہی بیالیل خوشی سے اُچھل پڑا اور جی میں کہا: "ہاں! لوگوں کو مجھ سے اسی طرح پیش آنا چاہیے اور اُن کی برائیاں معدوم نہ ہو جانی چاہئیں، یہ خط نہیں، مجھ کو خزانہ ہے، جو مجھے مالا مال کر دے گا۔

چونکہ خط کے ساتھ ہیرن بھی آیا تھا، بیالیل نے خادمہ سے کہا:۔

"نواب صاحب کو اندر بلاؤ" خادمہ باہر نواب کو بلانے چلی گئی، بیالیل بڑے وقار و متانت سے کرسی پہ جا بیٹھا، اور اُس آدمی کی سی وضع بنالی جو پیشہ کاروبار کا ہجوم رہا کرتا ہو، نواب اندر آیا، مگر بیالیل نے اوپر سر نہ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ نواب آکے بازو کھڑا ہو گیا، اُس وقت اُٹھا اور صاحب سلامت کے بعد یہ کہتے ہوئے تعظیم سے کرسی دی:۔ "نواب صاحب! معاف کیجیے، میں آپ کے لینے کو باہر تک نہ آسکا۔ کثرت کار سے سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں ملتی، چونکہ کاروبار خلائق کے متعلق میرا خاص اہتمام ہوا کرتا ہے ہمیشہ خیالات پریشان رہتے ہیں اور مشاغل میں گھرا رہتا ہوں۔ غالباً آپ کی تشریف آوری بھی کسی نہ کسی مصلحت سے ہو گی، اگر میرا خیال درست ہے تو میں بڑی خوبی سے آپ کی خدمت انجام دوں گا، آپ مجھ سے صاف صاف مگر عجلت کے ساتھ پورے واقعات بیان کر دیجیے، کیونکہ طولانی گفتگو کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

نواب دل میں اس شخص کی حالت پر تعجب کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ اور اپنی سرگزشت بیان کرنے لگا: "مارکوس پال ہوم، میرے ایک بھائی تھے، ابھی ابھی اُن کا انتقال ہوا ہے۔ اُنہوں نے بلادِ خارجہ میں شادی کر لی تھی اور اپنی بی بی کے اخراجات

کی بابت بیس لاکھ فرنک میرے تفویض کیے تھے (یہاں اُس نے اپنے بھائی کی پوری دولت کا ذکر کرتے ہوئے پہلو بچایا) اُن کی بیوی دیوانی اور حاملہ ہے عنقریب اُس کی زچگی ہونی چاہتی ہے۔ یہاں اُس کے کوئی عزیز وقریب نہیں ہیں اور نہ کوئی پُرسانِ حال۔ صرف چٹانی میں اُس کی ایک سہیلی ہے جو چنداں مہتم بالشان نہیں معلوم ہوتی۔ بھائی صاحب سالہا سال کی غیبوبت کے بعد فرانس آئے تھے اور بالکل نووارد کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگوں نے فقط اُن کا نام سُنا تھا جس پر لطف یہ ہے کہ یہاں اُن کے انتقال کی خبریں پھیل گئی ہیں۔ اُن کی بیوی کو بھی کوئی اِس وجہ سے نہیں جانتا کہ بھائی صاحب جب تک مارسیل میں رہے بالکل گوشہ گزیں اور سوسائٹی سے الگ تھلگ رہے۔ اُن کی بیوی کا جاننے والا اگر کوئی ہے تو وہ ایک لونڈی اور محل کی چار مامائیں ہیں۔ اب میری خواہش یہ ہے کہ کوئی ایسا پانسا پھینکا جائے کہ بھائی صاحب کی دولت و ثروت پہ میرا ہاتھ پڑ جائے ورنہ مجھے خوف ہے کہ کل کو مبادا اُن کا لڑکا بڑا ہو کر وراثت کا دعویٰ کر بیٹھے، اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

یہ تمام گفتگو جس کو ہم نے ناظرین کی سہولت کے لیے ایک جگہ تلخیص کر دیا ہے بیالیس اور نواب کے مختلف سوالات وجوابات سے ظاہر ہوئی۔ بیالیس نے آخر بڑے غور وخوض کے بعد یہ جواب دیا: "اب مشکل آسان ہو گئی اور میں نے تدبیر سوچ لی، تدبیر کیا، منصوبہ، منصوبہ بھی ایسا جو آپ کی تمام فکروں کو زائل اور تمام غموں کو دور کر دے گا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مارشنس اور اُس کے بچے کو چھپا دیا جائے۔ اِس کی صورت یہ ہے کہ کسی دور کوہستانی شہر میں جہاں آبادی کم ہو اُس کو پہنچا دیا جائے اور کسی گھر میں محبوس رکھا جائے۔ اِس غرض کے لیے مارسیل سے بہتر مقام نہیں مل سکتا۔ وہاں ایک پُرانا ایوان ویران جس کو میں نے دیکھا ہے، اُسے کرایے پر لے لیا جائے گا۔ اور ایک بھروسے کے آدمی کو پہرے پر متعین کر دیا جائے گا۔ مارشنس اُس میں قید کی جائے گی

اس اثنا میں لڑکا تولد ہوا اور وہ زندہ رہ گیا تو اس کو راہ باٹ میں کہیں پھینک آئیں گے، لوگ لاوارث خیال کر کے دار اللقطا میں پہنچا دیں گے۔ آپ اتنا کیجیے کہ آپ کے ملاقاتیوں اور نوکر چاکروں کو یہ باور کرا دیجیے کہ "مارشنس در اصل مارکوئس کی جائز اور قانونی بی بی نہیں بلکہ داشتہ ہے جس پر آپ کے بھائی کا دل آگیا تھا، اور وہ ان کے ساتھ ساتھ فرانس میں چلی آئی تھی۔ انگلستان میں اسکے رشتہ دار تھے جنہیں اس کا حال معلوم نہیں۔ آپ کے بھائی کی رحلت کے بعد اس نے اپنے اقربا کو خط لکھ کے یہاں کی حالت سے مطلع کیا تھا، اور لکھا تھا کہ اگر کوئی شخص وہاں سے آکے اس کو لے جائے تو بہت مناسب ہوگا۔ اس کے بعد آپ نہیں جانتے کہ اس پر کیا گزری۔"

یہاں یہ خبریں پھیل جائیں گی تو آپ گرداب بلا سے نکل آئیں گے اور اپنے بھائی کی مال و دولت پر قبضہ کر سکیں گے مگر یہ ضرور ہے کہ آپ اس دولت کو بدستور ہمارے ہی قبضے میں رہنے دیں، اور چند سے صرف اس کی آمدنی پر ہی اکتفا کیجیے۔ یہ اس لیے کہ ممکن ہے آپ کے بھائی کے ڈوبنے کی خبر حد تحقیق کو نہ پہنچی ہو، اور احتمال ہے کہ جس طرح سے دو ملاح بچ کر نکل آئے ہیں اسی طرح آپ کے بھائی بھی کسی طریقے سے زندہ مخلصی پا چکے ہوں۔ البتہ جب کچھ برس گزر چکیں اور ان کا کوئی اتہ پتا ظاہر نہ ہو اور نہ کوئی خبر سنی جائے تو آپ کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ اس وقت ان کے بیوی بچے کی نسبت بھی کوئی مناسب تجویز کر لی جائے گی۔

اس وقت میرا یہ کام ہے کہ تدبیریں سوچوں اور ان پر عمل پیرا ہوں اور آپ کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ میری اطاعت کریں اور محنتانہ پہنچاتے رہیں۔"

نواب: "میں ہر طرح سے آپ کا مطیع و فرماں بردار ہوں، مجھے آپ کے احکام کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں۔"

بیالیل: "اب آپ یہ فرمائیے کہ آپ کے پاس روپیہ کتنا ہے؟"

نواب: "بیس ہزار فرنک"

بیالیل: "اوہ! یہ تو بہت تھوڑا ہے، مگر خیر دوا دوی کے لیے بس ہو جائے گا آپ اس کے دو حصے کیجیے، کچھ تو میرے ملازموں کو فی الحال دیدیجئے اور کچھ ابتدائی کاروبار کے لیے اٹھا رکھیے، کل شام کو مادیل کے محل میں بھیس بدلے ہوئے میں آپ سے ملوں گا، مجھے بھیس بدلنے میں خاص ملکہ ہے، ہر موقع اور محل کے لحاظ سے میں ایسا بھروپ بھرتا ہوں کہ کوئی پہچان نہیں سکتا۔ میں آپ کے نوکروں کے سامنے ایسی باتیں اور حرکتیں کروں گا کہ انہیں آپ کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔"

چونکہ معاملہ طے ہو گیا تھا، نواب رخصت ہو کے اٹھا، گھر آیا۔ دل میں بیالیل کی عیاری اور حیلہ بازی پر عش عش کر رہا تھا۔ نواب کے جانے پر بیالیل بھی جنٹلمینوں کی سی پوشاک زیب بدن کر کے باہر چلا اور بازاروں میں گشت کرنے لگا جس سے مطلب یہ تھا کہ اپنے جتھے کے شیطانوں میں سے کسی ہوشیار گرگے کو اس مہم کی انجام دہی کے لیے طلب کرے اور اپنے ابلیسانہ منصوبے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے اسے سمجھا دے۔

تیسرے دن نواب نے انگلش خادمہ اور دوسرے چار ماماؤں سے وہی باتیں کہیں، جن کا سبق وہ بیالیل سے پڑھ کے آیا تھا۔ ان نوکروں کو نواب نے تنخواہیں اور ہزار فرنک کے قریب انعام بھی دیا اور کہا کہ انگلستان سے جواب آنے تک ٹھہرے رہیں۔ بعد ازاں جہاں جس کا جی چاہے چلا جائے۔

نوکروں نے اس کی عنایت کا شکریہ ادا کیا اور مارشنس کی حالت پر متعجب ہوئے۔ ان کے خیال میں یہی بس گیا کہ مارشنس دراصل بیابانی بی نہیں بلکہ مارکوئس کی دانستہ ہے۔ انگلش خادمہ تو بھلا کہے بغیر کہاں تک بول اٹھی کہ "ان بدبختوں کو خدا سمجھے! اگر مجھے پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ یہ ایسے ناپاک لچے ہیں

تو میں گھڑی بھر کے لیے بھی ان کی خدمت گزاری کی روادار نہ ہوتی۔"

اسی اثنا میں مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ نوکر نے جا کے دروازہ کھولا دیکھا تو ایک شخص نفیس اور قیمتی کپڑے پہنے کھڑا ہے۔ ڈاکٹروں کی سی وضع ہے عمر ساٹھ سال کی معلوم ہوتی ہے نواب کو پوچھ رہا ہے کہ "گھر میں ہیں یا نہیں"

نوکر:۔ "سرکار اندر تشریف فرما ہیں۔ آپ ٹھہریئے۔ میں جا کے اطلاع دیتا ہوں۔"

نوکر نے نواب کو اس اجنبی کے آنے کی اطلاع دی۔ نواب نے اندر بلانے کا حکم دیا اور صحن تک آ کے استقبال کیا۔

نواب:۔ غالباً آپ مجھ سے تخلیے میں کچھ فرمائیں گے۔ اس لیے میں ــــ"

نووارد:۔ "تخلیے کی ضرورت نہیں۔ میری گفتگو آپ کے نوکر چاکر بھی سن سکتے ہیں۔"

نواب اس اجنبی مہمان کے مقابل آ بیٹھا۔

اجنبی:۔ "آپ کو مجھ سے تعارف تو حاصل نہیں ہے اس لیے آپ میری ملاقات سے ضرور متعجب ہوں گے۔ میں اس کی غایت بیان کر دیتا ہوں۔ آپ نے بصیغۂ راز "اڈیسن" کو انگلستان میں یہ نہیں لکھ بھیجا تھا کہ یہاں ان کی بھتیجی دیوانی ہو گئی ہے۔ انھیں اس کا کچھ انتظام کرنا چاہیے؟"

نواب تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو یہ بیالیل ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے اجنبی کو غور سے دیکھا اور اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے ڈاکٹر کے لباس میں خود بیالیل ہی کو مسکراتے پایا۔

نواب:۔ بے شک جناب! آپ نے ٹھیک ارشاد فرمایا۔ اب میں اس عورت کو اپنے مکان میں زیادہ عرصے تک نہیں رکھ سکتا۔ میں اس کے بارے میں خود بھائی صاحب مرحوم سے ہی جھگڑا کرتا تھا۔ مگر مجبور تھا کہ وہ میری ایک نہ مانتے تھے اور اس کے رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ اب جب کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے

اور اُن کی محبوبہ دیوانی ہو گئی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ میں اُس کو اپنے ہاں رکھوں اگر اُس کی عقل درست بھی رہتی تو میں نہ رکھتا۔"

بیالیل:۔ "آپ کا بیان معقول ہے۔ اسی سبب سے اُس عورت کے چچا نے بھتیجے ہی آپ کا خط پہنچا انتظام کر دینا چاہا، وہ اگرچہ اس کی آوارگی اور بدچلنی سے متنفر تھے، لیکن اس کے پاگل ہو جانے سے اُن کو رحم آگیا۔ اس عورت کا اُن کے گھر میں رہنا تو مشکل تھا، شرافت میں داغ لگتا اور سوسائٹی میں معیوب سمجھا جاتا، اُنہوں نے شفاخانۂ عام کے ڈاکٹر سے جو میرے نوازش فرما ہیں اور دیوانوں کے علاج میں پوری مہارت اور شہرت رکھتے ہیں، اُس کے متعلق رائے اور مدد لی، ڈاکٹر صاحب نے مجھے خط لکھا کہ اس بارے میں میری صداقت پر اُنہیں اطمینان ہے۔ میں جا کے اُسے لے آؤں۔ اور دوسرے خط پہ شفاخانۂ عام میں کو سکن بھجوا دوں۔ یہ لیجیے خط ملاحظہ فرمائیے۔ میرے پاس "اڈیسن" کا بھیجا ہوا ایک اور تحفی خط ہے۔ میں وہ بھی آپ کو گزرانتا ہوں۔"

نواب نے دونوں خط لیے اور نوکروں کو سنانے کے لیے آواز سے پڑھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "جناب من! مجھے کوئی عذر نہیں ہے اور میں بخوشی آپ کے حوالے کرنے کو موجود ہوں۔"

بیالیل:۔ "میں شام کو آؤں گا، ساتھ گاڑی اور ایک خادمہ کو بھی لیتا آؤں گا جس کو دیوانوں کی نگہداشت میں تجربہ ہے۔ اُسی وقت میں مجنونہ کو اسباب سمیت لے جاؤں گا۔"

اس کے بعد بیالیل جانے کو تیار ہوا۔ نواب نے مشایعت کی۔ بیالیل نے کان میں آہستہ سے کہدیا "ابتدائی اخراجات کے لیے دو لاکھ فرنک درکار ہیں۔ پھر سال بہ سال پچیس ہزار فرنک ادا کرتے ہوں گے۔"

نواب چونکہ اُس کے قابو میں آ چکا تھا۔ نیز بھائی کے کئی ملین فرنک پر ہاتھ مار چکا تھا، انکار نہ کر سکا۔ قبول کرتے ہی بنی۔

شام ہوئی تو حسب قرار داد صبح بیالیل آیا۔ اُس کے ہمراہ ایک بگی اور ایک بالاک عورت تھی، مجنونہ (لوسیا) کے اسباب کی باندھا بوندھی، نوکروں نے پہلے سے کر رکھی تھی۔ گاڑی آتے ہی اُس میں ڈال آئے۔ بیالیل کی ہمراہی عورت نے لوسیا کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور گاڑی نے اپنی راہ لی۔

دوسرے دن نواب نے نوکروں کو برخاست کر دیا۔ اور اپنا فرنیچر اور ضروری اسباب لے کے کسی طرف چلا گیا۔ محل سنسان پڑ گیا لوگ قریباً ایک مہینے تک مارشنس کے تذکرے کرتے رہے۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ بھولتے چلے۔

نواب وہاں سے اٹھ کے پیرس میں آیا، ایک خوش قطع مکان کرائے پر لیا اور جسطرح سے بیالیل نے پٹی پڑھا دی تھی، ایک متوسط زندگی بسر کرنے لگا۔ اُس کے پاس ایک گاڑی اور تین نوکروں کے سوا کوئی اور سامان شان و تزک نہ تھا وہ عامی لباس پہنے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ اور باشوں کے میل جول سے پورا قطع تعلق کر چکا تھا۔ اور ایک متین، بردبار، شائستہ اخلاق آدمی بن گیا تھا۔ اُس نے اگر کسی سے ملاقات جاری رکھی تو وہ "پرسلی" ہی تھا جس سے وہ اکثر ملتا جلتا رہتا تھا کیونکہ پرسلی کے پاس شریف، مہذب اور عالی رتبہ اصحاب آتے جاتے تھے۔ اور یہ اُن سے ربط و ضبط پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بڑے ادب اور کشادہ پیشانی سے لوگوں کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جن جن لوگوں کو اُس سے سابقہ پڑا تھا سب اُس کے مداح تھے۔ پر اپنے سفلہ منش اور فرومایہ احباب اگر اُس کی ملاقات کو آ بھی جاتے تو وہ اُن کی ملاقات سے خوش نہ ہوتا۔ نہ زیادہ رخ دے کر بات چیت کرتا۔ اس سے رفتہ رفتہ اُن کی آمد و شد کم ہو گئی اُن کے بجائے مہذب اور شریف جنٹلمین آنے جانے لگے۔ باایں ہمہ اُس نے میانہ روی کو لازمہ بنا لیا تھا اور یار و احباب کو دعوتیں دیکر خوشی کے جلسے سجا کر زیبا نہ ہوتا تھا۔

یہی ایسے اسباب تھے جن کی بدولت اُس کو نہایت وقیع شہرت حاصل ہو گئی تھی، اور تمام لوگ اُس کے معترف بن گئے تھے اور اُسکی تمام اگلی عادتیں،

متغیر ہوگئی تھیں۔

نواب رقص و سرود کی مجلسوں اور خوشی کے جلسوں میں خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ ان جلسوں میں وہ جوان لڑکیوں کی طرف زیادہ ملتفت ہونے کی بجائے بوڑھی عورتوں سے کلام سلام کیا کرتا تھا، اور آداب و حیا کا لحاظ زیادہ مرعی رکھتا تھا۔ ان وجوہ سے اُس کو عورتوں کی نگاہوں میں بھی عزت و وقعت حاصل ہوگئی تھی۔ اور بعض خاتونوں کا ارادہ ہوگیا تھا کہ نواب کی بی بی بنانے کے لیے کسی حسین و شریف لیڈی کو ڈھونڈھ نکالیں، چنانچہ ایک دن ایک معزز لیڈی نے جو شکر فشانی اور چرب زبانی میں انگشت نما تھی، ایک شریف، عالی خاندان اور نوجوان خاتون کو جس کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا، نواب کے سامنے پیش کیا۔ اس خاتون کا کوئی عزیز و قریب زندہ نہ رہا تھا، صرف ایک وصی تھا جس نے اُس کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی تھی، اور اُس کے مال و دولت کو بڑھاتا رہتا تھا۔ اُسی کی حسن سعی کا نتیجہ تھا کہ اس خاتون کی دولت بیس لاکھ فرنک تک پہنچ گئی تھی۔ یہ خاتون نہایت خوش جمال اور مہذب و شایستہ تھی۔ نواب نے اس کو بارہا دیکھا بھی تھا۔ "انگلمی" نام تھا۔

نواب کا اس خاتون پر دل آگیا اور اُسی لیڈی کی جد و جہد سے چار مہینے میں شادی ہوگئی۔ اس عرصہ مدت میں بیالیس نے نواب کو اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہے تو اپنی قدیم روش پر عود کر جائے۔ اُس کا اشارہ پاتے ہی نواب نے اپنے بھائی کی دولت و ثروت کو باپ کے ورثے کے نام سے ظاہر کر دیا اور شہوات دنیہ میں پڑ کے اللے تللے کرنے اور رکھل کھیلنے لگا۔ انگلمی (نواب بیگم) کو اپنے شوہر کے ان کرتوتوں سے سخت ملال ہوا، اور مہذب منٹلمین بھی اُس کی صحبت سے پرہیز کرنے لگے۔ نواب بیگم کو اس اثنا میں دو بچے پیدا ہوئے تھے۔ ایک بیٹی، ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام "ملکہ" تھا اور بیٹے کا "ریاؤل"۔ یہ بچے نواب بیگم کے غم و الم کو گھٹاتے اور تسلی دیا کرتے تھے۔

پانچواں باب

ساڈڈ چاوری اور سلیمی

مارکوئس پال جیمپری، جس جہاز میں سوار تھا اُس کے ڈوبنے کی خبریں ایک مہینے کے بعد پٹانی میں آئیں۔ ساڈڈ چاوری کو جو مارکوئس کا سچا دوست اور ایجنٹ تھا، بڑی تشویش پیدا ہوئی، اُس نے بیرن ہمسم کو خط لکھا کہ حقیقت حال ظاہر ہو، خط کا جواب آیا جسمیں اور تمام کیفیتیں تو درج تھیں مگر مارشی نس کا ذکر تک نہ تھا۔ اس سے ساڈڈ کو تعجب پیدا ہوا۔ سلیمی نے بھی مارشی نس کے نام نامۂ شوق روانہ کیا تھا، مگر دو مہینے گزرنے پر بھی صدائے برنخاست، ساڈڈ نے دوسری تیسری چوتھی مرتبہ خطوط لکھے لیکن لاجواب رہا۔ بڑی حیرت پیدا ہوئی اور سلیمی بھی محزون و مغموم رہنے لگی یہہ خیال کہ مارشی نس پر کوئی بڑی آفت ٹوٹی ہے حد یقین کو پہنچ گیا۔ ساڈڈ کے دل میں بہت سے وسوسے اور شبہے پیدا ہوئے۔ اور اس عجیب خاموشی کا کوئی سبب اُس کے ذہن میں نہ آیا۔ اگر آیا تو یہی آیا کہ کوئی عجیب و غریب حادثہ وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ اِس لیے تقدیر پر صبر ہی کرنا بہتر ہے۔

اِس زمانے میں ساڈڈ کی تجارتی کمپنی کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا تھا اِس لیے ہندوستان میں بھی ایک کوٹھی قایم کرنی پڑی۔ چونکہ کمیٹی کے ممبروں کا اعتبار و اعتماد ساڈڈ سے زیادہ کسی اور پر نہ تھا۔ اِس لیے ہندوستانی ایجنٹ بنا کر بھیجنے کے لیے اُسی کو انتخاب کیا گیا۔ ساڈڈ اور سلیمی کو ہندوستان جانا پڑا وہاں پہنچ کے ساڈڈ نے تجارتی کاروبار کو اِس تندہی اور مستعدی سے چلایا کہ کمپنی سارے ہندوستان میں مشہور ہوگئی۔

ساڑھے تین سال کے بعد اُسنے کمپنی کی شرکت سے قطع تعلق کرلیا اور

تجارت بھی موقوف کر دی، اُس کے حصے کی رقم دس فرنک ہو گئی تھی، علاوہ بریں مارکوئس کے حصے کا بھی وہی وارث تھا، جو نو دلاکھ فرنک کے قریب اُس کو ملگیا اُس نے سلیمی سے مصمم ارادہ ظاہر کیا کہ مارشی نس کو تلاش کرنے کے لیے فرانس کا سفر کرے گا۔

فرانس جانے سے پہلے اُس نے نو دلاکھ فرنک، امسٹرڈم کے ساہو کے پاس ہنڈوی کے ذریعے ارسال کر دیے، بعد ازاں سلیمی کو (جسے چند مہینے کا حمل تھا) لے کے ہندوستان کی ایک انگریزی کمپنی کے جہاز میں سوار ہوا۔ امسٹرڈم میں آکے پہلی منزل کی اور وہاں کے ساہو سے جا کے ملا۔ ساہو نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا اور مارکوئس کے حالات و واقعات بیان کیے۔ ساہو کو مارکوئس کے شادی کرنے کا حال معلوم نہ تھا۔ ساڈڈ کی زبانی معلوم ہوا۔ دونوں مارشی نس کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ دونوں کو یقین کامل تھا کہ نواب نے شیطنت سے اُس کو چھپا دیا ہے کہ بھائی کی دولت پر اکیلا ہی ہتھ مارے۔ ساہو نے نواب کی بدچلنی کا کچا چٹھا ساڈڈ کے سامنے کھول دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اُس کی بی بی اُس سے کتنی متنفر اور بیزار ہے، شادی سے پہلے وہ کتنا مہذب اور فراخ دست تھا اور اب کس قدر بدتر ہے۔ ساڈڈ کو ان حالات سے نیز نواب کے طویل عرصے تک خط کا کوئی جواب نہ دینے سے یقین آگیا کہ ضرور کوئی بڑا کھیل کھیلا گیا ہے ساہو نے اُس کو نصیحت کی کہ حقیقت حال معلوم ہونے سے پہلے پوری ہشیاری اور حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے اور خفیہ خفیہ مارشی نس کی تلاش کرنی چاہیے۔

ساہو نے ساڈڈ کی رقم بھی سود سے لے لی اور یہ قرار پایا کہ وہ اُس وقت تک ساہو کے پاس رہے جب تک مارشی نس یا خود ساڈڈ طلب نہ کرے۔ یہ معاہدہ ساہو کی اُس نوٹ بک میں درج کر لیا گیا جس میں تمام مہتمم بالشان واقعات مذکور رہتے تھے اور جو بطور میراث کے نسلاً بعد نسلٍ اِس خاندان میں چلی آتی تھی۔

اس کتاب میں جو کچھ لکھا جاتا تھا، اُس کی پابندی فرض سمجھی جاتی تھی اور اس سے صرف یہ مقصود تھا کہ لین دین میں سا لکھا جا رہے اور بے اعتباری نہ ہونے پائے۔

ان تمام کاروبار سے فارغ ہو کے ساڈڈ اور سلیمی انگلستان کی طرف راہی ہوئے وہاں سے پھر فرانس میں آئے اور ایک ہوٹل میں اُترے، اب مارشی نس کی تلاش شروع ہوئی۔ ساڈڈ پہلے ماریل آیا، وہاں مکان میں صرف ایک مالی اور اُس کی عورت تھی۔ ساڈڈ نے مالی سے نواب کی خبر پوچھی وہ کورا تھا کچھ نہ بول سکا کیونکہ اُس زمانے میں وہ وہاں نہ تھا، مگر اُسنے کہا کہ میں اور ایک مالی کو بلاتا ہوں جو اُس وقت یہاں تھا۔ غالباً اُس سے کچھ پتہ لگ جائے گا۔

دوسرا مالی آیا تو پہلے اُس نے مارکوئس کی بڑی تعریف کی۔ اُس کے حالات زندگی بیان کیے بعد ازاں اُس کی وفات کے بعد جو کچھ گزرا تھا وہ اور مارشی نس کی اُن خبروں کو جو زبان زدِ عوام ہوئی تھیں، گوش گزار کیا، جن کی تفصیل اپنے محل پر ہمارے ناول میں گزر چکی ہے۔

ان واقعات کو سننے سے ساڈڈ کی نظر میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ گرم گرم خون رگوں میں جوش کھانے لگا۔ آنکھوں میں چکر سا آنے لگا، اور اب قریب تھا کہ دائرۂ ضبط سے باہر ہو کے اُن بے تکی گپوں اور جھوٹ موٹ تہمتوں کی قلعی کھول دے جنہیں مالی اور وہاں کے باشندے سچ جانتے ہیں، لیکن فوراً امسٹرڈم کے ساہو کی نصیحت یاد آئی۔ غصے کو فرو کیا اور لوٹ کر واپس آگیا۔ مگر راستے بھر اُس مردود خبیث کو گالیاں دیتا آیا کہ اگر اُس کی شریف بی بی اور نادان بچوں کی پاسداری حایل نہ ہوتی تو میں اسی وقت اُسکو اُس کے کرتوتوں کا مزا چکھا دیتا۔ لیکن صبر صبر۔

ساڈڈ کئی دن تک ہر مقام میں پوشیدہ طور سے تلاش و تفتیش کرتا رہا وہ نہ صرف مارشی نس کا پتہ اور حال پوچھتا تھا بلکہ ساتھ ہی نواب اور اُس کے خاندان کی حالت بھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے تمام آدمیوں کو

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ

علم و تمدن کے ساتھ

(گزشتہ سے آگے)

اسلام کا تیسرا اُصول، تکفیر سے بُعد

مسلمانوں کے احکام دین میں یہ امر ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو سو صورتوں سے تو کفر کا احتمال رکھتی ہے۔ لیکن صرف ایک ہی ایک صورت سے اُس کے ایمان کا حکم لگایا جا سکتا ہے تو اس حالت میں اُس کے قول کو کفر پر حمل کرنا ناجائز ہے؛ اقوال حکماء و فلاسفہ کے ساتھ اس سے بڑھ کر کیا تسامح ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی حکیم اس قدر بھی احمق اور گاؤدی ہوگا کہ اُس کا قول کسی صورت سے بھی ایمان کا محتمل نہ ہو؟ اگر اُس کا حمق اس درجے کو پہنچ جائے تو ایسے کندۂ ناتراش کو محکمۂ تفتیش کی سزا دینا اور دھکتی آگ کا ایندھن بنانا نہایت مناسب ہے۔

اسلام کا چوتھا اُصول سنۃ اللہ سے عبرت کی ہدایت[1]

یہ اُصول تابع ہے اُصول اول کا جس کا مفاد یہ ہے کہ دعوت الی الحق میں سوائے دلیل کے اور کسی چیز پر بھروسہ نہ کیا جائے

[1] یہ اُصول نصرانیت کے پہلے اُصول کا ضد ہے۔

اور عجائب وغرائب اور خوارق عادات پر ایمان نہ لایا جائے۔ یہ اصول راہِ اسلام کے پیروؤں کے ملکاتِ نفس کی تکمیل اور اُن کی معاش و معاد کی اصلاح کیلیے مقرر کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ موجودہ اور گزشتہ لوگوں کے حالات و آثار میں سنتہ اللہ کو نظرِ عبرت سے دیکھیں اور اُس کے قوانین کی مخالفت نہ کریں۔ قرآن مجید میں اِس اُصول کو ثابت کرنے کی غرض سے جو آیات مذکور ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:-

۱۔ قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔

۱۔ تم سے پہلے بہت سی سنتیں گزر چکی ہیں پس تم سیر و سیاحت کرو اور دیکھو کہ (امر حق کے) جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

۲۔ سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلاً۔

۲۔ یہ سنت ہے اُن رسولوں کی جنکو ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا تھا۔ تو ہماری سنت میں کسی طرح کی تبدیل نہیں پائیگا۔

۳۔ فھل ینظرون الا سنۃ الاولین فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا و لن تجد لسنۃ اللہ تحویلا۔

۳۔ وہ گزشتہ لوگوں کی سنتوں کو کیوں نہیں دیکھتے۔ اللہ کی سنت میں تو کسی قسم کی تبدیل و تحویل نہیں پائیگا۔

۴۔ اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم الخ

۴۔ کیا اُنہوں نے زمین پر چل پھر کر اپنے سے پہلے لوگوں کے انجام کو نہیں دیکھا۔ الی آخرہ۔

اِن آیات میں، قران اِس امر کی تصریح کرتا ہے کہ اقوام اور اُنکے ان میں خدا کی سنتیں ہیں جو نہیں بدلا کرتی ہیں۔ سنت اُس طریقے کو کہتے ہیں کہ جس پر حالات جاری اور آثار طاری ہوا کرتے ہیں اور اُن کو "شرائع" یا "نوامیس" اور بعض لوگ "قوانین" سے تعبیر کرتے ہیں۔ قران اِن آیات میں اِس بات کو جتاتا اور بتاتا ہے کہ جمعیت بشری اور اُس کے حوادث

وحالات کا نظام ایک ہے۔ اور وہ متغیر و متبدل نہیں ہوا کرتا ہے۔ اور جو شخص اس اجتماع میں، سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ اس نظام کے اصول کو، دیکھے اور سمجھے بوجھے تاکہ اُس کے اعمال و افعال اور اُس کی سیرت و عملدرآمد ان ہی اُصول پر، مبنی رہے۔ اگر انسان اس سے غفلت کرے تو اُس کو اپنی شقاوت و بدبختی کا منتظر رہنا چاہیے۔ پس جس قدر بھی وہ اس عالم کون وفساد میں بحث و تنقیح اور تحقیق و تفتیش سے کام لے گا۔ اُسی قدر وہ سُنن الٰہی کے احکام کو پائے گا۔ اور یہ بات دین اسلام کے بالکل موافق ہے۔ اور اس سے اُس کی طبیعت ہرگز نفرت نہیں کرتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا تسامح ہو سکتا ہے؟۔

اسلام بُت پرستی کو مٹانے کی غرض سے آیا ہے۔ خواہ وہ عربی ہو یا یونانی، رومانی ہو یا کوئی اور۔ جس لباس میں وہ پائی جائے اور جس صورت میں وہ نظر آئے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ اُس کو محو کرے اور صفحۂ ہستی میں اُس کا نام و نشاں باقی نہ رکھے۔ لیکن اُس کی کتاب عربی ہے۔ اور یہ اُن لوگوں کی زبان تھی جو بت پرست اور اُس کے تقریب کے دشمن تھے اس کتاب کے معنے سمجھنا اس بات پر موقوف ہے کہ اوضاع لسان کی، معرفت حاصل کی جائے اور یہ اُس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ اُس کے الفاظ و عبارات کے مواضع استعمال اور اسالیب کلام کو معلوم کیا جائے۔ اور یہ موقوف ہے اس بات پر کہ عربوں کے منظوم و منثور، کلام پر عبور کیا جائے اور اُن کے اخلاق و عادات و اعتقادات سے کافی واقفیت ہو جائے۔ تاکہ اُن کی جاہلیت، وحشت، اور بُت پرستی کی تصویر آنکھوں کے سامنے رہے۔

گزشتہ زمانے کے مسلمانوں نے یہی کیا کہ بڑے بڑے اسفار کیے، اپنی عمریں صرف کر دیں، روپیہ پیسے خرچ کیے، اور عربوں کا کلام جمع کیا

اُس کو مدون کیا، اور اُس کی تفسیر کی، اور اُس کو حفظ کیا محض اِس لیے کہ قرآن کے معنی سمجھ میں آئیں۔ وہ اِن مشقتوں کو عبادت میں شمار کرتے تھے اور اِس میں ثواب آخرت کے امیدوار رہتے تھے، پس دین اسلام کی طبیعت میں یہہ بات مرکوز ہے کہ وہ علم دین کی مخالفت نہ کرے جس میں کہ اُس کی پیدائش ہوئی ہے بعض علم ایسے ہیں کہ اُن کو دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اُن کا حسن نیت سے سیکھنا بھی درست ہے، یہہ تو حال ہے پہلے زمانے کے مسلمانوں کا۔ اب گزشتہ زمانے کے مسیحیوں کو دیکھو۔ اُنہوں نے، مسیح علیہ السلام کی زبان کو خواہ سریانی ہو یا عبرانی بالکل چھوڑ دیا اور اناجیل کو یونانی زبان میں لکھا، سوائے انجیل متی کے کوئی انجیل عبرانی میں نہیں لکھی گئی۔ مقام غور ہے کہ انجیل متی کا نام خود یونانی رکھا گیا ہے اور یہہ کل باتیں یہودیوں کی وجہ سے تھیں جن کی زبان میں مسیح علیہ السلام وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ محض اس لیے تھیں کہ اُن کے لٹریچر اور اُن کے عادات و اخلاق کو مطالعہ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

اِسلام کا پانچواں اُصول۔ دینی تسلط کا ارتفاع

یہہ اِسلام کا نہایت ہی زرین اور جلیل الشان اُصول ہے۔ اِسلام نے دینی تسلط کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ کر پھینک دیا اور اُس کے آثار کو بالکل، محو و منسی کر دیا۔ حتیٰ کہ جمہور اہل اسلام میں اِس کا نام و نشاں بھی باقی نہیں رہا۔ خدا اور اُس کے رسول کے بعد اِسلام کسی کو کسی کے ایمان و عقیدے پر کوئی تسلط اور کسی قسم کا اختیار نہیں دیتا ہے۔ رسول کو بھی جو اختیار دیا گیا ہے وہ صرف تبلیغ و ارشاد کا ہے نہ جبر و اکراہ کا۔

خدا فرماتا ہے: فذکر انما انت مذکر لست علیہم بمسیطر۔ پس نصیحت کر تو ناصح ہے۔ اُن پر مسلط کر کے نہیں بھیجا گیا ہے۔

اسلام میں عیسائیت کی طرح کسی شخص کو آسمان و زمین کی کنجیاں نہیں دی گئی ہیں کہ وہ جسطرح چاہے حل و عقد کرے۔

اسلام، مسلمان کو، سوائے اللہ کے، ہر ایک کی غلامی سے آزاد کر دیتا ہے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر گو اُس کا رتبہ اسلام میں بدرجہا بڑھا چڑھا کیوں نہ ہو، سوائے نصیحت و ارشاد کے کوئی حق حاصل نہیں ہے خدائے تعالیٰ ناجیوں کے اوصاف میں بیان کرتا ہے۔

۱- وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

۱- اُنہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق بات پر عمل پیرا ہونے اور صبر کرنے کی نصیحت کی۔

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

۲- ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر واولئک ہم المفلحون۔

۲- اور تم میں ایک گروہ ایسا ہو کہ وہ خیر کی طرف لوگوں کو بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے اور وہی فلاح پانے والا ہے۔

فرماتا ہے۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔

کیوں نہ نکلے اُن کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کے پاس جب لوٹ کر آئیں تو اُنہیں اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں تاکہ وہ (بُری باتوں) سے بچیں۔

مسلمانوں کو باہمدیگر نصیحت و ارشاد سے کام لینے اور ایسے گروہ کو مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے گمراہوں کو راہ راست دکھائے۔ اُس کو سوائے دعوت و ارشاد اور تحذیر و انذار کے اور کسی طرح کا حق حاصل نہیں ہے۔ اُس کو اور نہ کسی شخص کو

جائز ہے کہ دوسرے شخص کی برائی کی پیروی کرے، قوی ہو یا ضعیف، کوئی اس امر کا مجاز نہیں ہے کہ کسی شخص کے عقیدے کی ٹوہ لے اور اس کے مذہب کو ٹٹولے۔ مسلمان پر واجب ہے کہ سوائے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے عقاید و اعمال میں کسی شے کو اپنا ماخذ نہ بنائے۔ ہر ایک مسلمان پر واجب ہے کہ وہ سلف و خلف میں سے بلا توسط احدے کتاب اللہ اور کلام رسول اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلے ان وسایل کو حاصل کرے جو تفہیم و تفہم میں ممد و معاون ہیں۔ مثلاً زبان عربی کے قواعد اور اس کے لٹریچر اور اسالیب کلام پر عبور پیدا کرے اور زمان بعثت میں عربوں کی معاشرت و تمدن کی جو حالت تھی اس سے واقفیت پیدا کرے۔ نزول وحی کے وقت جو جو واقعات پیش آئے ان سے آگہی اور ناسخ و منسوخ کی واقفیت بہم پہنچائے۔ اگر وہ ان تمام امور کی تحصیل نہیں کر سکتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ علما اور واقف کار لوگوں سے کتاب و سنت کی معلومات پیدا کرے، اور جو کچھ حاصل کرے دلیل و حجت کے ساتھ حاصل کرے۔ اعتقادات اور اعمال میں سے ہر ایک امر کو دلیل عقلی سے ذہن نشین کرے۔ پس اس سے ظاہر ہے، کہ اسلام میں مطلق دینی تسلط نہیں ہے۔ (باقی آیندہ)

محمد عبدالباسط

کبھی وہ بت جو بھولے سے سوئے بیت الحرم نکلے — نظر آئے جو بلوہ جیب خود زاہد کا دم نکلے
کریں ہم کس سے شکوہ ہمدموں کی کم نگاہی کا — ہمارے چاہنے والے جب ارباب ستم نکلے
مٹا کر خواہشوں کو اپنی ہستی کو فنا کر کے — ترے کوچے سے عاشق صورت نقش قدم نکلے
بہت مشکل ہے ظاہر اور باطن ایکسا ہونا — موحد جن کو سمجھے تھے پرستار صنم نکلے

تہیہ کر لو اب تشنہ کہ تم بھی چلنے والے ہو
جہاں کے رہنے والے جادہ پیمائے عدم نکلے

سعید مودود احمد تشنہ ورنگلی

ڈراما اور تھیٹر

(گزشتہ سے آگے)

تھیٹروں کا سرمایہ کسی عظیم الشان عمارت کی خوبصورتی، نفاست، پاکیزگی سے آنکھیں سینکنے کے بعد ہمیں (ایک انجینیر کی نظر سے) یہہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آیا اُس کی نیو اِس قابل ہے یا نہیں کہ وہ اُس زبردست بلڈنگ کا بوجھ سنبھال سکے۔ اِسی طرح ہمارے تھیٹروں کی ظاہری نمائش سے قطع نظر، اُن کے سرمایے کی مقدار کو پرکھا جائے تو بہت جلد اِس امر کا اظہار ہو جائے گا کہ بجز ایک دو سر برآوردہ ناٹکوں کے سب کا دار و مدار محض آنے والی کمائی پر ہے اور چونکہ وہ بھی ایک حد تک غیر مستقل اور ناقابل اطمینان ہے اِس لیے عموماً ایسے بھک منگے تھیٹروں کی بنیادیں سال دو سال میں ہل جاتی ہیں، اور اُن کے ملیامیٹ ہونے کا باعث ہوتی ہیں۔ اب یہاں یہہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قایم کیسے ہوئیں۔ اِس کا آسان جواب یہہ ہے کہ شوق کے ہاتھوں۔ مثلاً ایک شوقین دولتمند نے شہرت کے خیال سے پہلی مرتبہ تو ایک بیش قرار رقم کسی تھیٹر کے قایم کرنے میں لگا دی لیکن یہہ نہ جانا کہ کن وسایل سے ایسی بلند پروازیاں حدِ کمال کو پہنچ سکتی ہیں۔ کچھ دنوں اُسی ناچیز (اُسے بمقابل ایسے غیر معمولی کاروبار کے ناچیز ہی کہنا چاہیے) سوت سے چرخہ چلتا رہا۔ ادھر سوت ہو گیا اِدھر چرخہ کاتنے والے تھک گئے لیجیے چرخہ ٹوٹ گیا۔ اِس سے یہہ نتیجہ بخوبی ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ انڈین تھیٹرس کی بنیادیں کیسی غیر مضبوط اور نامستحکم ہوتی ہیں اور اُن کے سرپرست کیسے ناتجربہ کار اور بے ہمت ہوتے ہیں۔ بجالیکہ یورپ میں

جب کسی تھیٹر کا قایم کرنا مقصود ہوتا ہے تو اُس کے متعلق اول اول اس قدر سرمایہ جمع کیا جاتا ہے کہ اگر سال دو سال تک تھیٹر کو کوئی آمدنی نہ بھی ہو تو وہ اُس سرمایے کی امداد سے اپنا کام بخوبی انجام دے سکے۔

ایکٹرس | جس طرح ایک گھڑی کے چلانے میں اُس کے متعلقہ کیل پرزوں کی سخت ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اُسی طرح سے ایک تھیٹر بلا اچھے ایکٹروں کے کبھی چل نہیں سکتا۔ اگر تھیٹر کو گھڑی فرض کیا جائے تو ایکٹرس اُس کے کیل کانٹے ہیں، اگر تھیٹر قالب انسانی فرض کیا جائے تو ایکٹرس بمنزلہ اُس کی آنتوں، رگوں اور رووں کے ہیں۔ لیکن یہاں ایکٹرس سے مراد وہی ایکٹرس ہیں جنہیں ایکٹنگ (Acting) میں کامل مہارت ہو، وہ ایکٹنگ کو اُسی کے معنوں میں کر دکھاتے ہوں، چنانچہ ایکٹنگ کی تعریف بھی یہی ہے کہ "اُس میں ایک ڈراما کے (جو فرض کر لو کہ کسی زمانے کے ایک واقعے کو مدنظر رکھ کے لکھا گیا ہو) متعلقہ اشخاص یعنے ہیرو، ہیروئن، بادشاہ، وزیر، خونی، قاتل، چور، گرہ کٹ، شرابی، بدمست، مکار، فریبی وغیرہ وغیرہ کی زبان سے کہلوائے ہوئے الفاظ بعینہٖ اُسی طرح سے ادا کیے جائیں، جس طرح اُنہوں نے اپنے زمانے میں کہے ہونگے۔ اُن کے کیرکٹرز کا ایسا ہی اظہار ہو جیسا اُنہوں نے کیا ہوگا یا جیسا ایک خاص شخص کو کرنا چاہیے، اُن کے جذبات، غم، غصہ، خوشی، فکر، جنون، مستی، رشک، حسد، کینہ، انتقام، نیکی، سعادت مندی، وفاداری، آرزو، عشق، زہر خند، شکر خند، چوری، مستعدی، جوانی، بڑھاپا، نزاکت، بہادری وغیرہ وغیرہ اُسی صورت سے دکھلائے جائیں، جس صورت سے ان حالتوں میں ایک اصلی شخص ہمیں نظر آتا ہے وہ بھی اس شرط سے کہ آمد معلوم ہو آورد نہ پائی جائے، بے ساختگی ظاہر ہو، بناوٹ نہ خیال میں آئے، نیچر ہی نیچر نظر آئے۔ ان نیچرز (Natures) کی بو باس تک سمجھی جائے۔

ایکٹنگ کی اِس تعریف کو پیشِ نظر رکھ کر ہمارے یہاں کے ایکٹروں کی حالت دیکھی جائے تو ہمیں بہت افسوس کرنا پڑے گا کیونکہ وہ ایسے جذبات کے دکھلانے اور اُن کو نقل سے اصل کر دینے پر قادر نہیں ہیں۔ اکثر ناٹکوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک بزدل فریبی کی نسبت قتل کا حکم صادر ہوا، لیکن اُس نے کوئی علامت خوف اور گھبراہٹ کی اپنے چہرے سے ظاہر نہیں کی بلکہ اُلٹا تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہوا مسکراتا رہا، یا ایک معزول بادشاہ کو اپنے ناگہانی زوال سلطنت کے غم میں سودائی بن کے جنوں آمیز باتیں اور اُسی قسم کی حرکات کرنی ضروری تھیں لیکن اُس نے اُنگلی تک نہ ہلائی، اگر کچھ باتیں کیں بھی تو ایسی جیسے کوئی کتاب پڑھ رہا ہو، غرض ایسی ہی سینکڑوں صریحی غلطیاں ہیں، جو ہمارے نادان، ان پڑھ، جاہل، ایکٹروں سے روزانہ سرزد ہوا کرتی ہیں۔ یہ غلطیاں حقیقت میں ایکٹنگ کا خون کرتی ہیں۔ کیونکہ ایکٹنگ کا مقصد ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ تماشائی متاثر ہوں جب ان نافہموں اور بناوٹوں کی خرابی سے وہ متاثر ہی نہیں ہوتے تو وہ ایکٹنگ ایکٹنگ ہی کہاں رہی وہ تو بھانڈوں کی نقل ہو گئی، اِس سوال کا جواب کہ کیوں ایکٹر اس قابلیت سے معرا ہیں، ہمارے خیال میں یہی ہے کہ وہ جاہل ہوتے ہیں اور اُن میں ڈراما کے روزمرہ کو سمجھنے اور الفاظ کا معنی خیال میں رکھنے کی قابلیت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کہ وہ سب عموماً پارسی، گجراتی، برہمن یا پنجابی ہوتے ہیں۔ اُن کو ڈراما کی، مقفیٰ عبارتوں کا رٹوانا ہی اُن پر، یا اپنی زبان پر ظلم کرنا کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک مظلوم ایک قاتل کی تلوار کے نیچے پڑا ہوا نہایت موثر الفاظ یا اشعار میں اُس سے رحم کا خواستگار ہوتا ہے، تماشائی آہستہ آہستہ متاثر ہوتے نظر آتے ہیں، کوئی روتا ہے، کوئی جلاد کو گالیاں دیتا ہے

اکثر سرد آہیں بھرتے ہیں۔ اب گویا مظلوم جینے سے نا امید ہو کر قاتل کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسانہ یہہ الفاظ زبان پر لاتا ہے" بے رحم ظالم! کیا تو میرا کھون (خون) کرے گا" یا تو سب افسردہ تھے یا اکدم سے پنڈال (تماشا ہال) بھر میں ایک ہنسی مچ گئی۔ اور لوگوں کے دل میں اُس سین کا کچھ بھی اثر نہ رہا۔ نہ ایکٹنگ کی کچھ وقعت باقی رہی۔ ساری کیفیات یک لخت دلوں سے رفو چکر ہو گئیں۔ تلفظ سے ناواقفیت کی برائیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں جاہل ایکٹروں کی شرکت کے بُرے نتائج جو ہندوستان کی عامیانہ ناٹکوں سے متعلق ہو رہے ہیں، اسی طرح کے ہیں۔ برعکس اس کے یورپ کی ناٹکوں کے ادنیٰ سے ادنیٰ ایکٹر بھی پڑھے لکھے اور قابل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہر ہر پارٹ (Part) کے ایک چھوٹے سے چھوٹے حصے کو بھی بخوبی سمجھتے اور اُس کے سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ پبلک کو متاثر کرنا اور اُن کے تیار دلوں پر قبضہ پانا اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی اور اُن کے تھیٹر کی وقعت پبلک میں ایسی ہی ہوتی ہے، جیسے ایک اسکول اور اُس کے معلموں کی۔

ایکٹروں کا چال چلن ہندوستانی ایکٹروں کے چال چلن کے متعلق بھی مختلف باتیں سُننے میں آتی ہیں۔ جن کا اظہار گویا اپنی توہین اپنی ہی زبان سے کرنا ہے لیکن اتنا کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ باتیں ہیں جنکے سبب ابھی تک پبلک کی بدگمانیاں تھیٹر کی نسبت صبح کی دیسی قایم ہیں۔

ڈراما و ڈراما نویس جب تھیٹر ایسے ہیں۔ ایکٹر ایسے ہیں تو ظاہر ہے کہ ڈراما نویس کیسے ہوں گے، جس طرح انسان کی زندگی کا دار و مدار صحیح و تندرست دل پر ہوتا ہے۔ اُسی طرح تھیٹر کا سارا کھڑاگ ڈراما نویس صاحب کے دم کے ساتھ وابستہ ہوا کرتا ہے، ہمارے ڈراما نویسوں کی حالت یہہ ہے کہ دماغ پر زور ڈال کے کوئی عمارت بنانا چاہتے ہی نہیں

یورپی طرز کے دلدادہ رہتے ہیں، اور شکسپیر کا چربہ آمارا کرتے ہیں۔ بہت ہوا تو فلسفہ اور پالیٹکس کو کامک کی دو دو چونچوں میں وصل کر کے دکھا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ وہ انگریزوں ہی کی تقلید کرتے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ اسٹیج پر تو چنگیز خاں آتا ہے۔ اور حوالی موالی سب دستار بند ہوتے ہیں۔ گویا شاہِ دکن کا دربار نو روز آراستہ ہے۔ سماں دکھلایا ہے نواب کا اور باتیں ہو رہی ہیں کنگس پلیس (ایوان شاہی) میں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ چارکمان[1] کا ذکر بھی خیر سے موجود ہے۔

یہ غلطیاں تو اس کی اندھی تقلید کی ہوئیں۔ اب اوریجنل ڈراموں کو لیجیے۔ کھیل ہندوستان سے متعلق ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں، یورپ کا ہے۔ دربار میں آنا چاہیے راجہ صاحب کو، اور تشریف لاتے ہیں کنگ صاحب۔ راج کنور، یا ولیعہد بہادر کسی ہندی ماہوش پر عاشق ہوئے تھے مگر تماشے میں پرنس بہادر ایک میڈم کے عشق کا دم بھر رہے ہیں اگر تسلیم کیا جائے کہ جذبات کا اظہار، سنیری کی عمدگی، پوشاک کی، آرائش اور بناوٹ یہ سب مالکان کمپنی کی مرضی یا اسٹیج ماسٹر کی تربیت پر موقوف ہے۔ اس میں ڈراما نویس کا دخل نہیں تو کیا ڈراما نویس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ ڈراما کے مضمون کو مہملات و مزخرفات سے پاک رکھے، مقفیٰ عبارت اور دقیق مضامین سے سلاستِ زبان کو نہ بگاڑے بیہودہ تک بندیوں سے لطفِ بیان کو ہاتھ سے نہ دے۔ انگریزی کے

---

[1] حیدرآباد دکن کی مشہور، تاریخی، قابلِ دید عمارت چار منار کے چاروں اسمات میں ایک ایک بڑا طاق ہے اسی کو چارکمان کہا جاتا ہے۔
ایڈیٹر

استعارات، کنایات اور تشبیہات کا اردو سے ایسا جوڑ نہ ملائے۔ جیسا کمخاب کا کمخاب سے ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کے ڈراما نگار، ان باتوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے، اُن کے ترجمے، اُن کی تصنیفات ہمیشہ ہزلیات ہی سے پُر دکھائی دیتی ہیں۔ نہ تو اُن کی نظم ہی اچھی ہوتی ہے نہ نثر۔ مثلاً ایک جگہ لکھا گیا ہے "ماشاء اللہ آپ کے باغ کا کیا کہنا حضور! چشم بد دور، رشک وادیٔ طور، نورٌ علیٰ نور، اشجار سے پُر، میووں سے معمور، غیرت دہ بوستان غفور" الخ اور اس کے ساتھ ہی دوسرا لنگور۔ بے تور کافور کے قافیے باندھتا چلا جاتا ہے۔ یا ایک جگہ ظرافت میں لکھا ہے "خبردار رہنا، نہیں کھوپڑی کی کویلو پر جوتیوں کی بارش برسیگی"۔

یہہ تو نثر ہوئی، اب نظم سُنیے "ارج گرج موری سنو سنو پیاری جان پیاری جان پیاری جان سُنو سُنو نندن پل چھن گن دلداری غمخواری، جاں نثاری کروں پیاری او جانی جانی موری دھن تو لے جانی، تورے من میں انے مانی پیاری پیاری میں تورے واری۔ الخ۔

یہہ نمونے منتخب کیے ہوئے نہیں ہیں میں نے یوں ہی ایک جگہ سے نقل کر دیے ہیں اور یہہ کچھ ایک دو نہیں اکثر ایسی ہی تک بندیاں ہوتی ہیں جیسے تاک، ٹاک، دھاک، بھاک۔ یہہ باتیں معمولی نہیں بلکہ نہایت ضروری اور قابلِ توجہ ہیں کیونکہ ان سے ہمارے لٹریچر کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ڈراما نویسوں کی قابلیت ہمارے ڈراما نویسوں میں بہت کم ایسے ہیں جو ڈراما نویس کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے۔ سب کے سب اس فن سے کورے ہی ملینگے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر اردو کی دو چار کتابیں پڑھ کے اور مشہور ناولسٹوں کے ناول دیکھ کے ڈراما لکھنے لگ جاتے ہیں حالانکہ اس کے لیے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے۔

ڈراماٹسٹ کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ جذبات انسانی کی تصویر ایسے الفاظ میں کھینچے جن کے سننے سے تصویر نظر کے سامنے کھچ جائے۔ اس کے لیے ضرورت ہے الفاظ کی حقیقت دانی کی، شاعری کی، انشا پردازی کی، اثر کلام کی معلومات کی، اور ان تمام باتوں کے لیے پہلے تو ذوق سلیم کی حاجت ہے۔ بعد ازاں لٹریچر کو بغور مطالعہ کرنے اور اس پر حاوی ہونے کی احتیاج ہے۔

مذاق عام کی پیروی

ڈراما نویسوں کو ایک خاص مشکل ڈراما لکھتے وقت یہ پیش آتی ہے کہ انہیں مذاق عام کو گرویدہ کرنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اس کوشش میں انہیں تسخیر نزلیات، اور گرے ہوئے مذاق کو جا بجا کھپانا پڑتا ہے۔ بعض ڈراموں میں فواحش تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہ خرابی محض مذاق عام کی پیروی کرنے سے پیدا ہوتی ہے، جس پر وہ مالکان تھیٹر کی جانب سے مامور ہیں۔ اور مالکان تھیٹر اپنی وافر آمدنی کی صورت دیکھ کر اس کو جائز خیال کرتے ہیں یہ مرض اسی وقت دور ہو سکتا ہے، جب کہ مالکان تھیٹر تعلیم یافتہ ہوں آمدنی کا منہ نہ دیکھ کر درستی مذاق کی فکر کریں۔ (باقی آیندہ)

کلام کیفی

وہ نہ آئے ہیں نہ آئینگے نہ آ سکتے ہیں — ہم بھی کس وعدہ فراموش کی رہ تکتے ہیں

بگڑ کے حضرت دل آپ کیا بنا لینگے — انہیں تو زعم ہے ہم روٹھ کر منا لینگے

سر آرائش دستار و ذوق شانہ رکھتے ہیں — طبیعت دار عاشق وضع معشوقانہ رکھتے ہیں

کام غیروں سے کوئی بنتا ہے — جس کا روٹھا اسی سے منتا ہے

بہت سے کام ہیں ذمے حیات تھوڑی سی — سو ان گ حد سے زیادہ ہیں رات تھوڑی سی

اسیر دام زلف یار چھوٹا ہے نہ چھوٹیگا — طلسم عشق ہے کیفی نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹیگا

نہ یہ سر محتسب کا ہے نہ یہ ندوں کا ساغر ہے — یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹیگا

اختلاف ابنائے زماں (۳)

ذوق | کوئی ہو کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کا ہے دین و مذہب | جو اسکے نزدیک ہمبری ہے وہ اس کے نزدیک ہمنشیں ہے
ظفر | یکساں نہیں عالم کوئی دشمن ہے کوئی دوست | ہے ایک سے راحت تو ظفر ایک سے تکلیف
شہید | ایک کہتا ہے کہ لعبت خدا کے گھر چل | ایک کہتا ہے کہ کر قصد صنم خانے کا

امتحانِ قسمت (۳)

قایم | میں جاتا ہوں کہیے کو اب دیر سے | بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے
غالب | آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے | کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
" | کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب | آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

آزاد مزاجی (۴)

ناباں | ہم سے طاعت خدا کی نہ ہوئی | کس کی تاباں کریں اطاعت ہم
مصحفی | غرض دونوں جہاں سے ہم ہیں آزاد | غمِ دنیا نہ ہم کو فکرِ دیں ہے
نصیر | باغِ دنیا میں نہیں وابستہ مزاج | نگہتِ گل کو نہ دیکھا کوئی یکجا ٹھہرے
غالب | غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو پیشِ نیک و بد | برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

الفت و محبت (۱۰)

سودا | تمیز خوب و زشت سے آخر بیاں کب | محبت میں سبھی یکساں ہیں جس کی جس سے بن آئے
قایم | خدا کسی سے کسی دل کو آشنا نکرے | یہ ابتلا ہے بُری طرح کا خدا نکرے
جرأت | پوچھو نہ کچھ سبب مرے حالِ تباہ کا | الفت کا یہ ثمر ہے نتیجہ ہے چاہ کا
سودا | کوئی مشکل نہیں رہنے کی مشکل | محبت ہی اگر مشکل کشا ہے
مصحفی | کوچے سے ترے دل مجھے جانے نہیں دیتا | اسبابِ سفر یاں سے اٹھانے نہیں دیتا
غالب | ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد | ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

ظفر | لاکھ چاہت کو چھپائے کوئی پر چھپتی نہیں | پیار کی آنکھ اور الفت کی نظر چھپتی نہیں
شہید | ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا | ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا
" | لا اسئلکم[1] کی خوب ہے تفسیر مجھ کو یاد | ہے نامۂ اعمال مرا فردِ محبت
" | کم مہرِ سلیماں سے محبت کا نہیں داغ | خاتم جو مرا دل ہے تو خاتم کا نگیں داغ

آہِ مظلوماں (۲)

قایم | ڈر آہِ خسکاں سے تو کہ ہنگامِ دعا اُن کے | حرمِ قدس میں لاکھوں ملائک محوِ آمیں ہیں
سوز | غریبوں پر نہ کیجے جور کچھ خوفِ خدا بھی ہے | مجھے ڈر ہے کسی دل سے مبادا بد دعا نکلے

امتیاز (۱)

ظفر | خوبیٔ جوہر سے پائی ہے ہر اک شے امتیاز | لعل بھی پتھر ہی ہیں لیکن وہ پتھر اور ہیں

اسمائے باری تعالیٰ (۱)

ذوق | ذوق اسمائے الٰہی ہیں سب اسمِ اعظم | اُسکے ہر نام میں عزت ہے نہ اک نام میں خاص

اہلِ نظر (۱)

درد | اہلِ نظر کو رہنما درد نہیں ہے کچھ ضرور | مثلِ شرر وہی ہے چشم اور وہی چراغ ہے

اظہارِ بے گناہی و معذرت (۷)

قایم | کون ہے قایم اس جگہ جس کو نہیں کسی سے ربط | میری ہی چاہ کی فقط شہر میں دھوم پڑ گئی
" | تجھ سے لگی تھی آنکھ جب سے مفت میں یہ دل | تقصیر تھی کسی کی گرفتار ہے کوئی

[1] قال اللہ تعالیٰ، قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ۔ لعہ

قایم	بتوں کی دید کو جاتا ہوں یہ میں قایم	مرا کچھ اور ارادہ نہیں خدا نکرے
صحفی	کافر نہ کہیو مجھ کو اے متومنان صادق	کرتا ہوں بت کو سجدہ میں تو خدا سمجھ کر
انشا	آپ ہی آپ مجھے چھیڑو رکو بھی آپ ہی	آپ ہی بات میں پھر روٹھے رہو اہ رے تنو
نصیر	آپ کا کون طلبگار نہیں عالم میں	ایک بندہ ہی گنہگار نہیں عالم میں
افسوس	نہیں کچھ اس سے یار د کام مجھکو	بھلا کرتے ہو کیوں بدنام مجھکو

باب الباء

بے ثباتی دنیا - (۶۵)

میر	ہستی اپنی حباب کی سی ہے	یہہ نمایش سراب کی سی ہے
"	موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو	جائیگا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا
"	کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات	کلی نے یہہ سن کر تبسم کیا
"	چمن زار عالم کی خوبی پہ مت جا	کہ گل اس بے ثباتی پہ خندہ زناں ہے
سودا	نہ کیجو تکیہ تو اس جان و جسم پر سودا	ہوا تو ایک ہے ان دو میں دو غبار ہی ایک
"	کوسوں کا نہیں فرق وجود اور عدم میں	قصہ ہے تمام آمد و شد کا دو قدم میں
"	سودا ہے کیا طلسم زمانہ کا اعتبار	نے جام ہی یہ ہے نہ جہاں میں جم رہے
ہاں	باغباں اپنے گلستاں پہ نہ تو مغرور	مل گئے خاک میں ایسے گل و گلزار کئی
"	نہ یہہ بہار رہیگی نہ یہہ چمن نہ یہہ گل	خزاں کے ہاتھ سے ہو جائیگا یہہ سب کچھ خوار
"	خزاں تک تو رہنے دے صیاد ہمکو	کہاں یہہ چمن اور کہاں آشیانہ
رد	مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی	کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کو کی دم کا
"	وائے ناداں بوقت مرگ یہہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
"	حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں	آشنا اپنا بھی واں اک سبزہ بیگانہ تھا
"	چمن میں صبح یوں کہتی ہے ہو کر چشم تر شبنم	بہار باغ گویوں ہی رہی لیکن کدھر شبنم

درد	نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار	کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں
″	ہم بھی اس جشت سرا سے ہیں آدمی ولے	اور بھی جو آئے سو یاں کم رہے
سوز	بلبلو مار لو اب جھپٹے اس باغ میں تم	پھر کوئی روز کو ڈھونڈو گے تو گلزار کہاں
″	مت کیجیو اعتبار اس کا	ہے نقش یہ آب زندگانی
″	اک ہستی موہوم سے ہے صورت اشیا	ہے دیدۂ تحقیق میں جز نام خدا ہیچ
″	سید ہیچ ہے ہم جان چکے وضع جہاں کو	غم ہیچ طرب ہیچ ستم ہیچ جفا ہیچ
″	اے سوز کیا طلسم زمانہ کا اعتبار	لے جام ہی رہے ہے جہاں میں نہ جم رہے
جرأت	گل کو کیا روتی ہے تو اے بلبل	یہ گلستاں ہی نہیں رہنے کا
″	آنکھ جب سے کھلی نہ دیکھا کچھ	زندگانی میں اور حباب میں فرق
″	گر پختہ مزاج ہو تو سمجھ	ہے رشتۂ حسام زندگانی
″	پیدا ہوے جب تب ہی سے لائی	مرنے کا پیام زندگانی
″	گل جو ہنستا ہے تو غنچے کا چٹکنا جرأت	کوس رحلت ہیں گلشن میں بجا دیتا ہے
قایم	خوش ہو اے دل اگر تو شاد نہیں	یاں کی شادی کا اعتماد نہیں
″	جو دیکھیے ہو اس میں خیالات و خواب ہے	دنیا بھی اک نمودِ موج سراب ہے
مصحفی	دیکھی جو آنکھ کھول کے غافل تو جان لے	ہستی تری یہ رنگ سحر ہے بھی اور نہیں
″	جو سیر کرنی ہے کر لے کہ جب خزاں آئے	نہ گل رہیگا چمن میں نہ خار بھی رہیگا
″	ثبات کس کو یہاں ہے دم بھر ہی رنگ لا ہو اچمن کا	تبسم گل غنچہ دہن ہی ہر ایک چاک اپنے پیرہن کا
انشا	یہ دو روزہ تشو و نما کو تو یہ سمجھ کہ نقش بر آب ہے	یہ سراب ہے یہ حباب ہے نہ قط ایک قصۂ خواب ہے
نصیر	ملایا خاک میں لاکھوں ہے تو نے شہسوار و رنگ	ذروں ہوں لایق ایام تیری بدر کابی ہے
″	جہاں میں یوں تری بنیاد ہے آدم خاکی	کہ جوں پانی کا اٹھکر ایکدم میں بلبلہ بیٹھے
″	ہستی ہے خاک کام ہے مثل شرر مجھے	آتا ہے گر یہ ہستی موہوم پر مجھے
″	جوں غنچہ ایک دم کے لیے مت بنا نسیم	اب باندھنا ہے دولت بے رخصت سفر
″	نصیر اسکا بھروسہ جو کرے تا دماں ہے وہ بیشک	بنائے ہستی خاکی ہے دم کے آنے جانے

بھاگ نگر

اور

اُس کی بعض عمارتیں

آج کل حیدر آباد جس جگہ آباد ہے، قطب شاہیوں کی حکومت کے زمانے میں یہاں ایک موضع موسوم بہ چچلم آباد تھا اور دار الریاست گول کنڈہ تھا ابراہیم قطب شاہ کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ موضع چچلم کی ایک طوائف بھاگ متی نامی پر عاشق تھا۔ اور ہر روز پوشیدہ طور پر دار الریاست سے موضع چچلم کو، اپنی معشوقہ کے پاس جایا کرتا تھا۔ حسب معمول ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر گولکنڈے سے نکلا، جب موسیٰ ندی پر پہنچا تو اُس کو نہایت طغیانی پر پایا، بے نیل مرام واپس ہونا سخت ناگوار تھا۔ جذب محبت کے جوش نے فوراً گھوڑا ندی میں ڈال دیا، اور حافظ حقیقی نے اپنے فضل سے دوسرے کنارے پر صحیح و سالم پہنچا دیا۔

ابراہیم قطب شاہ کو جب اِس واقعے کی خبر ہوئی تو محبت پدری کے اقتضا سے راستے میں ایک مستحکم پل تیار کرایا۔ یہی پل آج کل **پُرانا پل** کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پل حیدر آباد کے آباد ہونے سے بیس سال قبل ۱۰۱۸ ہجری میں تعمیر ہوا ہے۔

ابراہیم قطب شاہ نے ۱۰۸۸ھ میں انتقال کیا اور تخت سلطنت پر سلطان محمد قلی قطب شاہ جلوہ آرا ہوا۔ تخت نشینی کے بارہویں سال دار الریاست گول کنڈہ میں کثرت آبادی اور قلت آب سے ہوا بگڑ گئی

۱؎ قلعۂ گول کنڈہ کے شمال رو یہ ایک پہاڑ واقع ہے۔ موسیٰ ندی اسی پہاڑ سے نکل کر فصیل حیدر آباد سے ملتے ہوئے دریائے کشنا وبھیرا سے جا ملتی ہے ۱۲

بادشاہ کا ارادہ ہوا کہ ایک دوسرا شہر ندی کے دوسرے کنارے آباد کیا جائے، چونکہ بھاگ متی کی یاد دل میں تازہ تھی اور اراکین سلطنت کی بھی رائے تھی موضع چچلم کو جو آب و ہوا کی تازگی میں نظیر نہیں رکھتا تھا آباد کرنے کا حکم دیا۔ تجربہ کار معماروں نے شہر کا نقشہ مرتب کیا۔ چار وسیع بازار، چار طاق، جو اب چار کمان کے نام سے مشہور ہیں اُن کے وسط میں مدور حوض، متعدد حمام، خانقاہیں، مدرسے، مسجدیں، لنگر خانے اور مہمان خانے تعمیر کیے گئے ہر بازار میں قریباً چودہ ہزار دکانیں تھیں غربی طاق کا نام دولت خانۂ عالی اور شرقی طاق کا نام نقار خانۂ شاہی رکھا گیا، جنوبی طاق کے متصل جامع مسجد اور ایک حمام تعمیر کیا گیا جاگیرداروں اور امرا کی نشست کے لیے چندن محل اور کنگن محل بنائے گئے، شمال کی طرف ایوان سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جہاں ہر روز پہر دن چڑھے بارہ ہزار سلحدار اور یارگیر مسلح ہو کر نشست پر آتے تھے سب کو وہیں سے کھانا ملتا تھا دوسرے روز اُسی وقت چلے جاتے تھے دوسرا گروہ اُن کی جگہ پر آجاتا تھا۔ عدالت کے لیے دادمحل، بیماروں کے لیے دارالشفا تیار ہوا۔ دارالشفا میں دوا اور غذا سرکار سے مفت ملا کرتی تھی۔ موسیٰ ندی پر ندی محل اور نبی باغ بنایا گیا آخری چہار شنبے کو اُس میں جلسہ ہوا کرتا تھا۔

۱۰۳۱ ہجری میں عاشور خانۂ شاہی تعمیر کیا گیا۔ بادشاہ کو منظور تھا کہ شہر کی آبادی مشہد مقدس کے نمونے پر ہو اس لیے اُس نے امام ضامن ثامن علی موسیٰ رضا کے روضے کے بجائے چار مینار تیار کرایا جس کی بلندی ۶۲ گز ہے۔ اس پر ایک مسجد، ایک حوض اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر میں دو لاکھ ہون (۷ لاکھ روپیہ) صرف ہوا۔

تاریخ بنائے حیدرآباد **یا حافظ** اور تاریخ اختتام **فرخندہ بنیاد** ہے
۱۰۰۶ ۱۰۰۰

جب پورا شہر آباد ہو گیا تو بادشاہ نے اس کو اپنا مستقر بنا کر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر (یعنے خوش نصیب شہر) اس کا نام رکھا بھاگ متی کے مر جانے پر بھاگ نگر کا نام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام پاک سے موسوم کر کے **حیدر آباد** رکھا گیا۔

اسی بادشاہ کے عہد میں ۱۰۲۷ھ ہجری سے مکہ مسجد کی تعمیر ہوئی بنیادی پتھر رکھتے وقت شہر میں منادی کی گئی تھی کہ جس شخص کی نماز تمام عمر میں، قضا نہ ہوئی ہو وہ آ کر اس مسجد کا پتھر رکھے۔ شہر بھر میں ایک بھی ایسا نہ نکلا جس کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو؛ البتہ دو شخص ایسے نکلے جن کی صرف ایک ایک نماز قضا ہوئی تھی۔ جب یہ حال بادشاہ کو معلوم ہوا تو سجدۂ شکر بجا لایا اور کہا کہ میں ہی اس کا بنیادی پتھر رکھوں گا، کیونکہ میری تہجد تک قضا نہیں ہوئی ہے۔

اس بادشاہ کے عہد میں اس مسجد کی تعمیر میں تیس ہزار من صرف ہوئے تھے اور تعمیر نامکمل تھی اس لیے سلطان محمد عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے زمانۂ حکومت میں جاری رہی عالمگیر کے زمانے میں ختم ہوئی۔ سال ختم ۱۰۸۴ھ ہے۔ گویا چار سلاطین کے اہتمام نے اس کو پورا کیا عالمگیر کا آٹھ لاکھ روپیہ اس میں صرف ہوا تھا اور ابھی بعض حصے بنانے باقی تھے۔ داروغۂ تعمیرات نے معروضہ پیش کیا کہ اگر ایک لاکھ روپیہ اور مرحمت ہو تو مسجد کی حیثیت کے مطابق تعمیر ختم ہو جائیگی۔ لیکن عالمگیر نے اس درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے یہ شعر لکھ دیا۔

ے کار دنیا کسے تمام نکرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید

۱۱۸۰ھ میں اس کا نام "مکہ مسجد" رکھا گیا۔ اس کا طول ۷۰ گز عرض ۴۳ گز بلندی ۹۴ گز ہے۔

حیدر آباد کی فصیل قطب شاہیوں کی حکومت میں بننی شروع ہوئی تھی اور آصف جاہ اول کے زمانے میں اختتام کو پہنچی فقط

(ماخوذ از نگارستان آصفی و تاریخ خورشید جاہی)

محمد رشید الدین احمد وکیل

معن بن زایدہ کے کارنامے

معن بن زایدہ عراق کا بڑا حلیم و دریادل رئیس گزرا ہے۔ اُس کے حلم و سخاوت کے کارناموں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں ہم یہاں اُس کی دو تین فیاضیاں حوالۂ قلم کرتے ہیں۔

۱۔ میدانِ جنگ سے چند باغی گرفتار کر کے معن کی خدمت میں لائے گئے اُس نے اُن کے قتل کا حکم صادر کیا بعض باغیوں نے کہا "امیر المؤمنین! کیا آپ بھوک اور پیاس کے عالم میں ہم پر قتل کا فرمان نافذ کرتے ہیں آپ کی سخاوت تو اس کو جائز نہیں رکھ سکتی" معن نے حکم دیا، کہ اُن کو کھلا پلا کے سیر کر دیا جائے، جب وہ کھا پی کے فارغ ہو گئے تو کہنے لگے:۔

"خدا امیر المؤمنین کی عمر دراز کرے، پہلے ہم آپ کے قیدی تھے اب مہمان ہو گئے، لہذا دیکھنا چاہیے کہ مہمانوں سے آپ کیا سلوک کرتے ہیں"۔ معن نے کہا:۔ "میں نے تم سب کا قصور معاف کر دیا۔ اب تم آزاد ہو"

اس پر ایک نے جواب دیا:۔ "امیر المؤمنین! قسم کھا کے کہتا ہوں کہ آپ کی اُس روز کی فتحیابی سے، آج کی یہ دریادلی بدرجہا بڑھی ہوئی ہے"

معن کو یہ بات نہایت پسند آئی، ہر ایک کو ایک ایک خلعت اور کچھ روپیہ انعام دے کے رخصت کیا۔

۲۔ اہل کوفہ میں سے ایک شخص، خوارج کے ساتھ مل کے، خلیفہ منصور کے خلاف، بدامنی اور فساد پیدا کیا کرتا تھا۔ منصور نے اُس کے مار ڈالنے کا حکم نافذ کیا تھا اور اشتہار دے دیا تھا کہ جو شخص اُس کو پکڑ لائے گا یا گرفتار کرا دے گا، اُس کو ایک لاکھ درہم دیے جائینگے، کمبختی سے

ایک دن وہ شخص بغداد میں آیا، اور ایک کوفی اُسے دیکھ پایا، فوراً جا کے پکڑ لیا۔ اور خوشی سے کہنے لگا "آج امیر المومنین کا مطلوب مل گیا"

اسی اثنا میں معن بن زائدہ بھی وہاں پہنچ گیا، گرفتار شدہ نے معن سے مدد چاہی اور اُس کی پناہ میں چلا گیا۔ معن نے گرفتار کرنے والے سے کہا۔ "اسے کیوں پکڑا ہے چھوڑ دے۔ اب یہ میری پناہ میں آگیا" بعد ازاں نوکر سے کہا "تو اپنے گھوڑے پر اس کو بٹھا لے، اور ساتھ لے چل" گرفتار کرنے والے نے کہا "یہ امیر المومنین کا مطلوب ہے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا" پھر بہت ہاتھ پاؤں مچائی اور لوگوں سے امداد طلب ہوا۔ مگر معن نے اُس کی ایک نہ مانی اور لے کے چلتا بنا۔

اُس شخص نے جا کے منصور سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ منصور نے معن کو طلب کیا۔ معن جانے کو تیار ہوا، اور جاتے ہوئے اپنے عزیز و اقارب سے کہتا گیا۔ جب تک تمہاری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ اس شخص کا بال بیکا نہ ہونا چاہیے۔

پھر منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا۔ منصور نے سلام کا جواب نہ دیا اور بولا "کیا تیری جرأت اتنی بڑھ گئی ہے کہ تو میرے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے؟"

معن: "جی ہاں! حضور"

منصور: "تو خلاف ورزی کر کے اُس پر جی ہاں حضور بھی کہتا ہے"

معن: "امیر المومنین! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی سلطنت میں کتنی دفعہ مجھ پر بلائیں اور مصیبتیں آئیں اور کتنی مرتبہ میں نے آپ کے لیے جان جوکھم میں ڈال دی۔ کیا آپ میری خاطر سے ایک ایسے شخص کو نہیں معاف کر سکتے جس نے میری پناہ میں آنا پسند کیا۔ اور مجھ کو آپ کا ایک غلام سمجھا ہے؟ آپ میری نسبت جو چاہیں حکم دیں میں حاضر ہوں"

یہ جواب سُن کے منصور سر بہ گریبان ہو گیا۔ اور اُس کا غصہ دھیما پڑ گیا تھوڑی دیر تامل کر کے بولا: "ہم نے اُس کو معاف کیا اور تیری پناہ میں دے دیا۔"

معن: "اگر آپ کی مرضی میں آئے تو مناسب ہو گا کہ آپ اُس کو کچھ انعام بھی دیں۔ تاکہ جان بخشی سے نہ صرف وہ ہی اُٹھے بلکہ مالدار بھی ہو جائے۔"

منصور: "اچھا! ہم نے اُس کو پچاس ہزار درہم انعام دیئے۔"

معن: "امیر المومنین! ایک اور بات عرض کرتا ہوں۔ خلفا کی سخاوتیں رعایا کی خطاؤں کے موافق ہوا کرتی ہیں۔ اِس شخص کی خطا درحقیقت نہایت عظیم ہے۔ اس لیے اُس کا انعام بھی عظیم ہونا چاہیے۔"

منصور: "تو نے سچ کہا ہم اُس کو ایک لاکھ درہم انعام دیتے ہیں۔"

معن: "تو پھر امیر المومنین! جلدی سے عنایت بھی فرمایئے۔ کیونکہ ع

تعجیل کن نیت مگر در عمل خیر

منصور نے حکم دیا کہ فوراً معن کو ایک لاکھ درہم دیدیے جائیں۔ منصور اُنھیں لے کے، گھر پہنچا اور اس آدمی کے حوالے کر کے کہا: "خبردار! آئندہ سے ایسی جرأت نہ کرنا اور خلفا کی مخالفت سے دور بھاگتے رہنا۔"

۳۔ ایک دن ایک بدوی اُس کے حلم کا امتحان لینے کو آیا اور کہا "تجھے یاد ہے کہ تو کبھی بکری کی کھال اوڑھا کرتا تھا اور اُونٹ کے چمڑے کی جوتیاں پہنتا تھا؟"

معن: "ہاں! یہ مجھے یاد ہے۔ میں اسے بھولا نہیں۔"

بدوی: "تو پھر خدا کا شکر کر کہ اُس نے تجھے حکومت دی، اور تختِ شاہی پر بٹھایا۔"

معن :۔ "میں بے شک خدا کا شکر کرتا ہوں۔"

بدوی :۔ "میں اگر حشر تک زندہ رہوں تو تجھے شاہی نہ کروں گا۔"

معن :۔ "سلام تو سنتِ اسلام ہے۔ اور پھر رئیس کو۔ لیکن تو نہیں کرتا، تو تجھے اختیار ہے۔"

بدوی :۔ "جس شہر میں تو رہے گا۔ میں وہاں سے چلا جاؤں گا اگرچہ زمانہ مجھ پر کیسی ہی سختی ڈالے۔"

معن :۔ "اگر تو ہمارے پاس آئے تو ہم تیرا خیر مقدم ادا کرینگے۔ اور اگر چلا جائے تو خدا حافظ کہینگے۔"

بدوی :۔ "اے کمظرف! میں سفر کرنا چاہتا ہوں مجھے کچھ دے۔"

معن :۔ "(اپنے نوکروں سے) اس کو زادِ راہ کے لیے ہزار دینار دیدو۔"

بدوی :۔ "تو نے جو کچھ دیا بہت کم ہے۔ میں اس سے زیادہ کی امید رکھتا تھا۔"

معن :۔ "(نوکروں سے) اس کو اور ہزار درہم دو۔"

بدوی :۔ "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تجھے قیامت تک زندہ رکھے کیونکہ دنیا تیری نظیر سے خالی ہے۔"

معن :۔ "(نوکروں سے) اس کو اور ہزار درہم دیے جائیں۔"

بدوی :۔ "امیر المومنین! میں اب تک فقط آپ کا حلم آزما رہا تھا کیونکہ اس کی نسبت بہت سے قصے میرے سننے میں آئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ میں اتنا زیادہ حلم ہے کہ اگر تمام عالم پر اس کے حصے بخرے کیے جائیں تو وہ کافی ہو جائے گا۔"

معن :۔ "(نوکروں سے) تم نے اس کو اس کے اشعار پر تین ہزار درہم انعام دیے ہیں۔ اب اس کی نثر پر بھی اتنا ہی انعام دو۔"

۴۔ ایک شاعر مدت سے انتظار میں تھا کہ معن سے مل کر اپنے قصیدہ کا اظہار کرے مگر موقع نہ پاتا تھا۔ عرصے تک ناکام رہنے کے بعد اس نے ایک نوکر کو اس بات پر راضی کر لیا کہ جب معن اپنے باغ کی سیر کو آئے تو وہ شاعر کو مطلع کر دے۔ خوش قسمت سے ایک دن یہ موقع مل گیا اور شاعر کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ لکڑی کے ایک تختے پر یہ شعر لکھ کر اس نہر میں ڈال دیا جو باغ میں داخل ہوتی تھی:۔

ایا جود معن، ناج معنا بحاجتی فمالی الی معن سواک سبیل

اے معن کی بخشش! معن سے میری احتیاج بیان کر کیونکہ تیرے سوا معن تک پہنچنے کی میرے پاس کوئی سبیل نہیں

اتفاق سے معن کی نظر اس تختے پر جا پڑی، شاعر کو بلایا اور پوچھا کہ "یہ تم نے کیا لکھا ہے؟" شاعر نے وہی شعر اس کے سامنے بھی پڑھ دیا۔ معن نے خوش ہو کر ہزار درہم انعام دیے اور اس تختے کو اپنے بیٹھنے کی جگہ پر فرش کے نیچے رکھوا دیا۔ دوسرے دن جب وہاں آ کے بیٹھا تو تختے کی سختی محسوس ہوئی۔ حکم دیا کہ شاعر کو بلا کے اور ایک ہزار درہم انعام دیے جائیں۔ تیسرے دن بھی یہی حال ہوا۔ شاعر اس متواتر فیاضی کو دیکھ کر دل میں ڈر گیا اور خیال کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو اس بے انتہا سخاوت پر عقل اسے ملامت کرے اور اپنا دیا دلایا واپس لے لے۔ فوراً وہاں سے چل بھاگا۔ چوتھے دن معن نے اس کو پھر بلایا۔ معلوم ہوا کہ چلا گیا۔ معن کو اس کے چلے جانے سے بڑا افسوس ہوا۔ کہا کہ "اگر وہ ٹھہرا رہتا تو میں اس کو ہر روز ایک ایک ہزار درہم انعام دیتا یہاں تک کہ میرے پاس ایک بھی درہم باقی نہ رہتا۔"

ترجمان

ریویو

جناب توفیق کا سہرا: مولوی سید جلال الدین صاحب توفیق نے جن کے زور طبع کے نمونے، ناظرین صحیفہ کی پسندیدگی حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے ایک دوست میر ہاشم علی صاحب کی شادی کی تقریب میں، سہرا کہا ہے، جو بڑی خوبی سے لکھا اور چھاپا گیا ہے اور جس میں نوشاہ کی عکسی شبیہ سے مزید زینت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سہرے کے بعض اشعار ایسے عمدہ نکل پڑے ہیں کہ دل سے اُن کی داد دی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہوں:۔

دے جو بالیدگی شوق اجازت اس کو
سر نوشاہ سے ہو ہاتھ بھر اونچا سہرا

پڑ گئے پیچ نزاکت سے کمر میں لاکھوں
گل جو دامن میں سنبھالے ہوئے اٹھا سہرا

پیچ در پیچ ہیں رخسار پہ لڑیاں اس کی
ورق گل پہ ہے مشکل خط طغرا سہرا

دی جگہ پہلوئے ارماں میں تو لپٹی بدھی
سر پہ چھایا تو بنا ہار گلے کا سہرا

ایسا الجھا کہ ہوا ساتھ چھڑانا مشکل
مل کے پیچ سے کس پیچ میں آیا سہرا

سر پہ چھا کر اسے نوشاہ نے دی چوعزت
ایسا پھولا کہ نہ جامے میں سمایا سہرا

تار ہائے نگہ شوق سے مل کر دم شوق
بن گیا عارض نوشاہ پہ دھرا سہرا

بن کے خورشید جو شادی کا ستارہ چمکا
خندۂ صبح تمنا نظر آیا سہرا

اس کے دیکھے سے نہ کیوں آنکھیں ہوں پُر نور کہ ہے
خانۂ حسرت و ارماں کا اجالا سہرا

پھول سہرے کے ترو تازہ رہیں دل کی طرح
تا قیامت رہے توفیق شگفتا سہرا

فریاد ظفر: مولوی ظفر علی خاں صاحب بی اے کی وہ موثر نظم، جس کو اُنہوں نے جلسۂ امداد مصیبت زدگان حیدرآباد میں پڑھ کے سُنانے والے

حاضرین کو متاثر کر دیا تھا چھوٹی تقطیع کے ۳۲ صفحوں پر چھاپی گئی ہے اور سرورِ رودِ موسیٰ کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس کی آمدنی حیدرآباد کے امدادی فنڈ میں دی گئی ہے۔ قیمت ۴ر رکھی گئی ہے۔

رودِ موسیٰ کی بربادی پر آج تک جتنے مرثیے کہے گئے ہیں۔ ان سب میں یہ نظم چوٹی کی کہی جا سکتی ہے باوجود یکہ مولوی ظفر علی خاں صاحب کو طغیانی کے دوسرے دن سے جلسے کے دن تک مطلق فرصت نہ ملی، اور وہ امدادی کاموں میں رات دن منہمک رہے پھر بھی انہوں نے یہ ایسی بہتر نظم لکھی کہ بے ساختہ تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زود گو شاعر کو نظم پر ایسی ہی قدرت ہے جیسی نثر پر۔ اس نظم کے بعض اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

اس باغ میں ہے کیسا یہ مجمع پریشاں — صورت سے فکر ظاہر چہروں سے غم نمایاں
لالے کی طرح سب کے سینوں میں داغ تاباں — شبنم کی طرح سب کی آنکھوں سے اشک غلطاں
کیوں اوس پڑ گئی ہے اس باغ پر یکایک — جاتی رہی وہ رونق باقی نہیں وہ خوشیاں
بجتے تھے جس میں کل تک شادی کے شادیانے — شاں خدا وہیں ہیں ماتم کے آج ساماں
ماتم بھی ایک دو کا گر ہو تو صبر کر لیں — لیکن یہاں تو صدیا گھر ہو گئے ہیں ویراں
موت اور زندگی میں ہے ایک حدِ فاصل — لطفِ جنابِ باری یا قہر و خشمِ یزداں
قہرِ خدا کی صورت نازل ہوا دکن پر — بن کر قضائے مبرم موسیٰ ندی کا طوفاں

اے نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا — اُلٹا ہے تو نے تختہ یاران آشنا کا
ہم سے تو وہ وفائیں اور تجھ سے یہ جفائیں — بدلا دیا ہے تو نے اچھا ہمیں وفا کا
اچھا کیا ادا حق ہمسائگی کا تو نے — ہم تجھ سے لو لگائیں۔ تو نے ہمیں کوتا کا
اک کاررواں آصف اترا ترے کنارے — اونا سپاس تو نے ڈالا اسی پہ ڈاکا
تیری ہر ایک لہر داعی ہے اجل کی — تیرا ہر اک تھپیڑا قاصد ہے قضا کا
منجدھار میں ہے کشتی ٹوٹا ہوا ہے لنگر — سر پر ہے رات کالی طوفان ہے بلا کا

تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے — مورد ہونا خدا کیوں الزام ناروا کا
شب ہے شب قیامت دن ہے حساب کا دن — وقت آگیا سزا کا عہد آگیا جزا کا
خالی امید کا گھر دروازہ توبہ کا بند — آے اثر کہاں ہے موقع نہیں دعا کا

اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہیگا
کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہیگا

واحسرتا وہ صدہا گھر بار کا اجڑنا — ہر نخل آرزو کا بنیاد سے اکھڑنا
وہ نقشہ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا — کوہ قضا کا سر پر پل بھر میں ٹوٹ پڑنا
دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا — سنگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا
وہ دہم بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا — وہ جان ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا
اس ہاتھ کا نہیں ہے کچھ جسمیں جان باقی — بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا
ماں سے لپٹ لپٹ کر بچے کا وہ بلکنا — اور صدمے اسکے سینے پر ایڑیاں رگڑنا
بچے کا ہاتھ آکر پھر ماں سے چھوٹ جانا — زخم جگر کے ٹانکوں کا یک بیک اکھڑنا
سب دل کی ولولوں کو پیوند آب کرنا — اک رات کی دلہن کا نوشہ سے یوں بچھڑنا
وہ ڈوبے ہوؤں کا سب کو سلام کرنا — اور ان کی حسرتوں کا جا کر دلوں میں گڑنا
تھا فتنہ قیامت اے سیل رود موسیٰ — من کر ترا اچھلنا بن کر ترا امڈنا
شان جناب باری قہر خدا کا نقشہ — ہر لہر کا بپھرنا ہر موج کا اکڑنا

کیوں ساتھ ساتھ اپنے لیکر چلا نہ ہم کو
جو قافلہ چلا ہے سر منزل عدم کو

معلم البرق: منشی طالب علی صاحب پابند نے، جن کی علمی کوششیں لاہور کے اردو رسالے "رہنمائے تعلیم" کی صورت میں ہر مہینے اشاعت پاتی ہیں۔ یہ مختصر رسالہ مسایل علم برق کے متعلق لکھا ہے جس میں جا بجا نقشے اور اشکال کھینچ کر مسایل سمجھائے گئے ہیں۔ وہ طریقہ جس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی

مادری زبان میں علوم و فنون کا ذخیرہ مہیا کرے۔ اُس وقت تک یادگار رہیگا اور عزت و استحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ جب تک وہ زبان صفحۂ دنیا پہ باقی رہے گی، علمی خزانوں اور خصوصاً یورپ کے انکشافات جدیدہ سے اردو کا گھر بالکل خالی ہے۔ لہذا اردو کے خزانے میں جو لوگ اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی قدر افزائی اور اُن کے خدمات کی عزت، ملک پر فرض ہے۔

یہہ کتاب، ہمارے پاس، طغیانیٔ رود موسیٰ سے پہلے آئی تھی اور ہمارا ارادہ تھا کہ غور و تعمق سے دیکھکر تفصیلی ریویو لکھیں۔ لیکن ہمیں بہت افسوس ہے کہ طغیانیٔ موسیٰ نے جہاں صدہا دوسری کتابوں پر پانی پھیر دیا۔ وہیں اس کتاب کو بھی بے پتہ کر دیا۔ لہذا اُس کی قیمت اور حجم کے نہ لکھنے پر مصنف صاحب ہم سے ناخوش نہوں تو قرین انصاف ہے۔ یہہ کتاب مصنف سے دفتر "رہنمائے تعلیم" لاہور کے پتہ سے مل جائیگی۔

گلچیں ہر نظم و نثر اردو کا ماہانہ رسالہ جس کا حجم عموماً ۲۸ صفحے کا ہوتا ہے۔ اور جس کا غالب حصہ منظم رہتا ہے لکھنؤ (محلہ نخاس) سے جناب سید محمد عسکری صاحب وسیم کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے مشہور شعرا کا کلام اس میں درج رہتا ہے۔ اس کی قیمت والیان ملک سے (۱۰) امرا و رؤسا سے (۵) اور عوام سے (۴) روپیے سالانہ لی جاتی ہے۔

ہمارے پاس ماہ ستمبر کا رسالہ آیا ہے۔ اُس کے ابتدائی چار صفحوں میں کمیٹی اصلاح سخن کی طرف سے ایک تحریر چھپی ہے۔ جس میں بعض قوافی مثلاً چھپر، تل، ڈھوال، سام وغیرہ کے ترک و استعمال پر بحث کی گئی ہے۔

اس قسم کی کوششیں ثبوت دیتی ہیں کہ اردو بولنے والوں کی توجہ اپنی زبان کی طرف منعطف ہو گئی ہے۔ اگر یہہ کوشش اعلیٰ پیمانے پر شروع کی جائے تو کوئی دن جاتا ہے کہ اردو زبان ایک مکمل اور مدون زبان کی شکل میں جلوہ افروز عالم ہو جائیگی۔ ایڈیٹر۔

خطرے سے امین ہونے کے لیے ایک عجیب حیلے سے بیالیل پیرس کے ہوٹل میں گیا تھا اور ساڈڈ کا سامان لے کے فرار ہو گیا تھا۔ اُس اسباب میں سلیمی کے زیورات بھی تھے، اُنہیں تو خود لے لیا تھا اور باقی کاغذات اور اسباب کو جلا کے خاکستر بنا دیا تھا جس سے ساڈڈ کا قتل مخفی کا مخفی رہ گیا تھا۔

یہاں یہہ بیان کر دینا ضرور ہے کہ اُس کے بعد مارشی نس پر کیا گزری؟ وہ عورت جو اُس کی دیکھ ریکھ پر مقرر کی گئی تھی اُس کے ساتھ رہتے رہتے بیزار ہو گئی اُس کو ایک سڑن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ وہ بیالیل کو مارشی نس کے ہر ہر حال سے مطلع کیا کرتی تھی اُس نے باصرار و الحاح بیالیل سے درخواست کی کہ اِس رنجدہ بلا سے اُس کو رہائی بخشے۔

جس وقت ساڈڈ اور سلیمی کے متعلق تمام خطرے اور شبہے دب دبا گئے تو بیالیل لجبی سے بھیس بدل کے گیا اور مارشی نس کو اُس کی خادمہ سمیت لے کے ایک جانب روانہ ہوا (یہہ حال چوکیدار کی زبانی بوڑھا چرواہا سن چکا ہے) جاتے جاتے ایک گھنے جنگل میں پہنچا۔ رستے میں ایک بڑا سا گڑھا نظر پڑا۔ خادمہ سے کہا کہ مارشی نس کا ہاتھ پکڑ کے گڑھے کے کنارے بٹھا آ وہ اُسی طرح بٹھا کے آ گئی۔ اِس کے بعد وہ پیرس چلا گیا، اِس کارگزاری سے نواب اور بیالیل دونوں کو اطمینان ہو گیا اور اُنہوں نے کچھ نہ دریافت کیا کہ مارشی نس پر کیا واقع ہوا۔ زمانہ گزرتا گیا اور معاملہ سربستہ کا سربستہ رہ گیا۔

باقی کیفیت معلوم کرنے کے لیے موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔

چھٹا باب

زوال

ذیل کے اقوال، نہایت پسندیدہ اور مجرب ضرب الامثال ہیں:-

۱- چیزے کہ بے رنج آید بر فتش رنج نہ شاید۔

۲- ایلہے کو روز روشن شمع کافوری نہد زود بینی کش شب روغن بنا ندر چراغ

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ بیرن لاون، حد درجے کا عیاش، مسرف اور بدچلن تھا حوائجات نفسانی اور تلذذات نفسانی میں ادھا دھند روپیہ اڑائے جاتا تھا۔ اس کی بدولت طبیعت کے لیے بھائی کا روپیہ مل جانا گویا ملی کے نصیب سے چھینکے کا ٹوٹ جانا تھا۔ وہ بی بی سے قطع تعلق کر چکا تھا اور شرفا کی معیت چھوڑ کر اوباش کی ہم نشینی اختیار کر لی تھی، اس کی دولت کے سنہرے حوض میں سے نئی نئی نہریں نکلتی تھیں۔ نکلتے نکلتے حوض کے خشک ہو جانے کی نوبت پہنچ گئی۔ تب کہیں وہ خواب غفلت سے کسی قدر چونکا اور فضول خرچیوں سے کسی قدر باز رہا مگر چونکہ تنگی کی تاب نہ لا سکتا تھا، اور پھر اس کے تنعم و عیش پرستی کی ملک بھر میں دھوم مچ گئی تھی جو اس کے ہم چشموں کو نصیب نہ تھی اس لیے وہ مجبور ہو گیا کہ قرض دام لے کر اپنا کام نکالے چلا جائے، اس نے متعدد اشخاص سے بہت سا روپیہ، بڑی بڑی مدتوں کے بعد ادا کرنے کے وعدے سے قرض لیا اس کے عوض اپنے تمام باغات، زمینات، ملک املاک کو رہن کر دیا۔ اس کی خصوصیت کے ساتھ فضول خرچیوں کی شہ دینے والی ایک نوجوان، خوبصورت دلربا تھی جس نے اپنی کرشمہ سنجیوں سے اس کا دل سرہ لیا تھا اور عقل پر جادو پھینک دیا تھا۔ نواب ایک بات میں بھی اس کی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ نہ اس کے تباہ کار اغوا ات کو روک سکتا تھا جب اس بدکار کو علم ہوا کہ نواب عنقریب

اوج ثروت سے تھا افلاس میں گرنے والا ہے تو ایک عجیب عیاری سے رہا سہا مال سمیٹنے لگی۔ بیش قیمت جواہرات، گھوڑے اور زر و زیور وغیرہ کو چھپے چوری بیچ کے کہا کرتی آج فلاں چیز کھو گئی، کل فلاں چیز جاتی رہی، پرسوں وہ سامان چوری گیا، وغیرہ وغیرہ، نواب کو اس کے بدلے دوسری چیز لا دینی پڑتی۔ اگر کبھی کبھی وہ غصے میں آتا تو بگڑ کے بولتی "میں صرف اس لیے تمہارے پاس رہتی ہوں کہ تم میری خواہشوں کو پورا کرتے ہو۔ ورنہ آج ہی چلی جاتی، شہر میں صدہا تم جیسے مشتاق ہیں جو میرے ہاتھ کو بوسہ دینے کی خواہش میں تڑپتے رہتے ہیں۔" بچارہ نواب اپنی جگہ افسردہ ہو کے چپ رہ جاتا۔

ان ہی دنوں، برازیل کا ایک نوجوان پیٹر نامی وارد پیرس ہوا۔ یہ شخص کئی ملین فرنک کا مالک تھا مگر خرابی یہ تھی کہ بڑا ہی مردہ دل تھا اور ایسے کاموں میں روپیہ لٹاتا تھا جو اس کو مطلق خوش نہ کرتے تھے۔ چونکہ نواب اپنے اسراف کے صدقے میں مشہور آفاق ہو گیا تھا، اس لیے پیٹر نے سب سے پہلے پیرس میں جس سے جان پہچان پیدا کی وہی نواب تھا۔ پیٹر نے جلد نواب کا مشرب اختیار کر لیا، اور سوسائٹی میں میل ملاپ رکھنے اور شہرت حاصل کرنے میں اس کو اپنا شیر کار بنا لیا۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی اور نواب کی پیٹر کے پاس آمد و رشد بڑھ گئی۔ اس زمانے میں نواب کا حال پتلا ہو چلا تھا۔ اس نے ڈیڑھ لاکھ فرنک اور اسی کے لگ بھگ اور بھی رقمیں پیٹر سے قرض لیں، اور وہ بے تامل قرض دیتا گیا۔ نواب کو اس کی بے پروائی اور دولت کی فراوانی دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ ہنستے ہنستے پوچھ بیٹھا "بھئی! تمہارے پاس کتنی دولت ہے؟"

پیٹر نے بتایا "تیس ملین فرنک (دو اور تین کروڑ فرنک کے مابین)"

یہ تعداد سن کے نواب مبہوت ہو گیا۔ اور اس کے منہ میں رال ٹپک پڑی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اس عقل کے اندھے اور گرہ کے پورے کا روپیہ

اینٹھنے کے لیے کچھ ایسے داؤ کھیلے کہ کم از کم اس کے متفرق قرضے ہی بیباق ہو جائیں۔ اُسے معلوم تھا کہ عنقریب اُس کے قرض خواہ اُس کے سر پر آدھمکینگے اور اُن کے بُرے تقاضوں سے چھٹنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کا دوست پیرس میں مسافرانہ حیثیت سے آیا ہے۔ آج کل میں چلا جائے گا، ان اسباب سے وہ پیٹر سے زیادہ قرض لینے لگا تھا اور تخفیفِ مصارف پر نظر رکھ کے اپنے ملازموں کو گھٹاتا جاتا تھا جنہیں پیٹر اپنے ہاں نوکر رکھتا جاتا تھا۔

ایک دن پیٹر نے نواب سے کہا "مجھے ایک پیش خدمت اور کوچین کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اپنا پیش خدمت اور کوچین مجھے دے دیں تو بڑا احسان ہوگا" اسی دن نواب کے پاس ایک غریب جس کے چہرے سے راست بازی اور سچائی آشکار ہوتی تھی نوکری کی تلاش میں آیا۔ وہ خدمتگاری اور سائیسی دونوں کاموں سے واقف تھا، نواب نے بڑی خوشی سے اُس کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور اپنے خدمتگار پیٹر کے حوالے کیے نواب کے اس نئے ملازم کا نام فریڈرک تھا۔

ایک دن نواب کو ساٹھ ہزار فرنک ادا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ جی میں بولا "کہیں سے روپیہ ملنے کی صورت نہیں۔ البتہ پیٹر سے مل سکے گا، چلو! اُسی کے پاس جائیں" یہ سوچ کر وہ پیٹر کے پاس آیا۔ وہ اُس وقت گھر میں نہیں تھا، نوکروں نے بیان کیا کہ دو ہفتے کے بعد آئیں گے۔

نواب کو پیٹر کے سفر پر جانے سے بڑا قلق ہوا۔ اور وہ روپیہ ملنے سے مایوس ہو گیا۔ اس ملال و قلق میں اُس کو ایک تدبیر سوجھی، اُس نے پیٹر کے ملازم سے (جو سابق میں نواب کے ہاں نوکر تھا) اجازت چاہی کہ پیٹر کے دارالانشا میں جا کے دو ضروری خط لکھ آئے۔ ملازم اُس کی استدعا کو رد نہ کر سکا۔ نواب نے دارالانشا میں داخل ہو کے اندر سے کواڑ بند کر لیے

اور اطمینان سے آہنی صندوق کی طرف بڑھا۔ وہ دل میں بولا:۔

"اسی صندوق میں تین کروڑ فرنک ہوں گے۔ پیٹر ایسا آدمی تو ہے نہیں جو مجھے ایک لاکھ فرنک سے منع کرے۔ بہتر ہوگا کہ میں اس میں سے روپیہ نکال لوں اور اس کے بجائے ایک چٹھی رکھ دوں۔"

لیکن چونکہ صندوق مقفل تھا، کوشش پیدا کرنے کے لیے، اس نے کمرے کے اندر اور قلمدانوں میں ڈھونڈھاڈھانڈی شروع کی۔ ایک قلمدان میں اس کو کچھ نوٹ نظر آئے۔ جلدی سے انہیں اٹھالیا۔ اس وقت اس کے دل میں خیر و شر کی قوتوں میں لڑائی ہونے لگی جس کا انجام شر کی فتح پر ہوا۔ اس نے ایک لاکھ کا نوٹ اٹھالیا، اور پیٹر کے ایک خط کی مدد سے جو اسی قلمدان میں مل گیا تھا، اس نوٹ پر پیٹر کے جعلی دستخط بنا دیے۔

جب پیٹر سفر سے گھر آیا اور ایک نوٹ بھنانے کے لیے قلمدان کھول کر نوٹ گنے تو معلوم ہوا کہ ایک نوٹ کم ہے۔ اس نے اپنے پیش خدمت کو بلا کر پوچھا:۔ "میری غیر حاضری میں یہاں کون کون آیا تھا؟"

پیش خدمت نے چند نام گنائے جن میں نواب کا بھی نام تھا۔

پیٹر:۔ "ان میں سے کوئی میرے دارالانشا میں بھی داخل ہوا تھا؟"

نوکر:۔ "میرے پہلے آقا مارکوئس کے سوا کوئی نہیں داخل ہوا۔ دو ضروری چٹھیاں لکھنے کو فقط وہی گئے تھے۔"

پیٹر:۔ "تم نے بہت اچھا کیا جو انہیں دارالانشا میں جانے کی اجازت دی۔ وہ میرے سچے دوست ہیں اور میرے دروازے ہمیشہ ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اچھا تم جاؤ اپنا کام کرو (دل میں) اس نواب کا چلن درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور اس کا خاتمہ بہت برا نظر آتا ہے۔"

پھر پیٹر نے باقی نوٹ لے لیے اور چالیس ہزار فرنک وصول کرنے کے لیے صراف کے ہاں گیا۔ صراف بولا:۔ "جناب من! بیس لاکھ فرنک کے سوا آپ کا

کچھ روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہ لیجیے، ایک لاکھ کا چک۔ آپ کا دستخطی موجود ہے جس کی رقم دو ہفتے کے پیچھے ادا کی گئی ہے۔"

پیٹر:۔" آپ فکر نہ کیجیے میں نیا روپیہ لاکے داخل کر دیتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ واپس لوٹا (دل میں) اس نواب کی حماقت بہت بڑھ گئی ہے۔ مجھے بھی اُس کی چالبازیوں کا بدلا کرنا لازم ہے۔

صراف کی طرف سے لوٹ کے اُس نے نواب کے محل کا رُخ کیا۔ نواب کے پاس گیا تو اس کو دیکھتے ہی نواب کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر پیٹر نے بڑی گرمجوشی سے ملاقات کی اور دوستانہ طور پر صاحب سلامت کر کے بیٹھ گیا۔ نواب کو کسی قدر سکون ہوا اور اُس نے خیال کیا کہ وہ اُس نوٹ کو بھول گیا ہے جس کو نواب لے کے چلتا بنا تھا۔ بے شک جو شخص اُس کی طرح کروڑ پتی تھا۔ وہ نوٹوں کے گننے کی طرف کب متوجہ ہوگا۔ اور اُس کو کیا معلوم ہوگا کہ ایک نوٹ گم ہو گیا ہے۔"

نواب:۔" (پیٹر سے) کہو یار! اتنے دن تک کہاں غائب تھے؟"

پیٹر:۔" بھئی! کیا کہیں ایک مہ پارہ کے حسن و جمال کا شہرہ سُنا تھا۔ اُس کے گھورنے کو گئے تھے۔ مگر ہماری بدبختی دیکھو، وہ سفر پہ گئی ہوئی تھی! ہم یونہی ہاتھ ملتے ناکام واپس آئے۔"

یہ کہہ کے وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ چہل پہل کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں اُس کی نظر ایک نوجوان خوبصورت نازنین کی تصویر پر، جا پڑی جو ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ پیٹر اس کو دیکھتے ہی ہکا بکا ہو کے رہ گیا نواب کو پیٹر کی اِس حالت پر تعجب ہوا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ پیٹر کو عورتوں سے الفت نہیں ہے۔ پھر یہ انقلاب کیسا؟ اُس نے حیرت سے دریافت کیا۔

"پیٹر! تم آج کل عورتوں پہ بے طرح ریجھے ہوئے ہو! تمہاری کایا تو نہیں پلٹ گئی؟"

پیٹر:۔ "نواب! تم بھی عجب نادان ہو! ہر فرد بشر کی گرناگوں انقلابات سے بھری ہوئی زندگی میں کبھی نہ کبھی عشق کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے اب تک جتنی عورتوں کو دیکھا۔ اُن میں سے کوئی بھی میرا دل نہ لے سکی۔ اگر کسی نے لیا تو وہ یہی تصویر ہے۔ بھئی بتاؤ! یہ کس کی تصویر ہے اور میں کیونکر اُس تک پہنچ سکتا ہوں؟"

نواب:۔ "اپنی فکروں کو حماقت میں نہ پھنساؤ۔ یہ تصویر اینجانب کی دخیر نیک اختر کی ہے۔"

پیٹر:۔ "آئیں کیا تمہاری کوئی بیٹی بھی ہے۔ تعجب ہے کہ تم نے مجھ سے اب تک اُس کا ذکر نہیں کیا۔"

نواب:۔ "ہماری گفتگو میں ایسا کوئی ذکر نہیں چھڑا، کہ میں اُس کا تذکرہ کرتا۔"

پیٹر:۔ "خیر اس کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ اُس کا نام کیا ہے؟ عمر کیا ہے۔ اور وہ ہے کہاں؟"

نواب:۔ "اُس کا نام ملکہ ہے۔ عمر بیس سال کی ہے اور وہ اس وقت اپنی ماں کے ساتھ دور دراز شہروں میں مقیم ہے۔"

پیٹر:۔ "تم اور تمہاری بی بی میں جدائی کیوں واقع ہوئی؟"

نواب:۔ "اختلاف طبایع کی وجہ سے۔"

پیٹر:۔ "اچھا تو اب تم اُس سے قربت حاصل کرنے کی فکر کرو۔"

نواب:۔ "مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں اُسکی قربت کوئی آسان بات نہیں ہے۔"

پیٹر:۔ "نہیں! انکار نہ کرو۔ تقدیر تم کو اسی پر مجبور کرے گی۔"

یہ کہہ کے پیٹر خاموش ہوگیا۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر رخصت ہو کے جلدی سے چلا گیا۔ نواب اُس کی اِن حرکتوں اور باتوں سے متحیر تھا اور پیٹر کے اِس جملے کا اعادہ کر رہا تھا:۔ "تقدیر تم کو اسی پر مجبور کرے گی۔ تقدیر تم کو اسی پر مجبور کرے گی۔" وہ اِس جملے سے دل میں کھٹک گیا۔ اور زمانے کے

اُلٹ پھیر پر غور کرنے لگا۔ اُس کو تنبہ ہونے لگا کہ اب تک وہ کیسی بدچلنی اختیار کیے ہوئے تھا۔ مگر پھر بھی اُس کا دل خواہشات بہیمی پر ہی مایل تھا اُس کی سرکشی کا گھوڑا، ندامت کی باگ سے رام نہ ہوتا تھا۔ اور اُس کو اپنے تنزل و انحطاط کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ وہ جی میں کہنے لگا:۔ "اب مجھے نئی چالیں چلنی چاہییں۔ میری گرہ میں پیسہ نہیں ہے اور مجھے بدبختی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ مگر میری نواب بیگم کا روپیہ میں کیا تدبیر کروں؟ اگر اُس کے پاس جاتا ہوں تو وہ پھٹکنے نہیں دے گی اور نہ میری بدچلنیوں سے چشم پوشی کر کے مجھ سے خوشنود ہو گی۔ کیا تدبیر کروں؟ سوائے ایک رستے کے اور کوئی سبیل نہیں ملکہ جس طرح اُس کی بیٹی ہے، میری بھی بیٹی ہے۔ اور ملکہ پر نواب بیگم کے جو حقوق ہیں۔ میرے بھی ہیں۔ مجھے چاہیے کہ نواب بیگم سے ملکہ کو چھین لوں، اُس وقت میں جو کچھ کہوں گا۔ نواب بیگم کو سننے ہی پڑے گی۔ کیونکہ وہ ملکہ کی جدائی پر ایک منٹ بھی صبر نہیں کر سکتی۔ ملکہ ہی میری امیدوں کا سرمایہ ہے اور ملکہ پر ہی میری زندگی کا دار و مدار ہے۔

ساتواں باب

میراثِ وافر

نواب اپنے ان ہی خیالات میں منہمک تھا جو گزشتہ باب کے خاتمہ میں بیان ہوئے ہیں اور ہنوز وہ اپنے دلی منصوبوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اُس کا نیا نوکر فرڈرک آ کے بولا:۔ "حضور! اسٹرڈم کے ساہوکار آپ کی ملاقات سے مشرف ہونے کو حاضرِ بارگاہ ہوئے ہیں۔"

نواب:۔ (ساہوکار کے آنے پر متحیر ہو کے) اُنہیں فوراً بلاؤ۔"

نوکر:۔ "بہت بہتر! ابھی بلایا۔"

ساہوؔ (حاضر ہو کے متانت بھرے لہجے میں) سرکار! آداب بجا لاتا ہوں۔"

نواب ؔ "آداب جناب! تشریف لائیے۔"

ساہوؔ "حاضر ہوا۔ سرکار کا مزاج مبارک ہے؟"

نواب ؔ "خدا کا شکر ہے۔"

ساہوؔ "جناب مجھ سے ناآشنا ہوں گے اور شاید میرے حاضر ہونے پر متحیر بھی؟"

نواب ؔ "میں اگرچہ آپ سے تعارف نہیں رکھتا تھا مگر آپ کے نام سے میرے کان آشنا تھے، کیونکہ آپ کا نام آفتاب سے زیادہ روشن ہے لہذا میں آپ کی تشریف آوری پر خیر مقدم کہتا ہوں اور آپ کی ملاقات سے مسرت اندوز ہوا۔"

ساہوؔ "حضور! میں ایک قدیم حسابی معاملے کے تصفیے کی غرض سے مکلف خدمت ہوا ہوں۔"

نواب ؔ "میں حاضر ہوں۔ فرمائیے کیا معاملہ ہے؟"

ساہوؔ "آپ کے مرحوم بھائی مارکوئس پال کے متروکے کی حوالگی جس کو رکھے ہوئے مدت گزر چکی اور جو اس وقت ایک رقم خطیر بن گیا ہے۔"

نواب ؔ (خوشی اور استعجاب سے) میرے مرحوم بھائی مارکوئس پال کے متروکے کی حوالگی! اور وہ ہے کس قدر؟ اور آپ تک پہنچا کیونکر؟"

ساہوؔ "اس کی مقدار بیس ملین (یعنے دو کروڑ) تک ہے جو سود کے اقرار پر بہ مد امانت مجھ تک پہنچا۔"

یہ سنتے ہی مارے خوشی کے نواب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اور وہ خیال کرنے لگا کہ شاید خواب دیکھ رہا ہے۔

پھر ساہو نے تفصیل سے وہ واقعات بیان کیے، جن سے معلوم ہوا کہ سادڈ چاوری کے ذریعے سے، یہ رقم اس کو ملی۔ مرور ایام سے اس مقدار تک

پہنچ گئی اور اب وہ آیندہ اُس کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ کئی سال سے ساؤڈ چاودری کی بھی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔ پس اس وقت نواب کے سوا اور کوئی وارث ایسا موجود نہیں ہے کہ جسے یہہ مال تفویض کیا جائے۔

اِن باتوں کے سننے سے نواب کو یہہ تصور ہو رہا تھا کہ ع

ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب؟

اور ذہول و خود رفتگی کا یہہ عالم تھا کہ نواب کو کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ دیر کے بعد اُس نے ساہو سے کہا:۔ "آپ نے آج وہ مژدہ جانفزا سنایا ہے کہ ع

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست۔

آپ کی یہہ مہربانی ایسی بڑی اور بھاری ہے کہ کوئی مہربانی اس کے ہم پلّہ نہیں ہو سکتی، میں نہیں سمجھ سکتا کہ راست نشی، دیانت داری، وفاشعاری اور امانت گزاری میں صفحۂ دنیا پر آپ کی کوئی نظیر بھی ہے یا نہیں؟ میں کس طور پر آپ کی مدحت سرائی کروں؟ اور کن الفاظ میں آپ کا شکریہ بجا لاؤں؟ آپ نے مجھے اُس احسان سے گرانبار کیا ہے جس کے مقابلے میں بڑے بڑے پہاڑ بھی ہلکے ہیں۔"

ساہوکار:۔ "آپ کی اِس ثنا گستری کا شکریہ، مگر اب اسے طول نہ دیجیے۔"

نواب:۔ "دل تو نہیں مانتا مگر جب آپ فرماتے ہیں تو خیر چپ رہتا ہوں۔ اب آپ یہہ کہیے کہ مجھے کس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے؟ اگر آپ فرمائیں تو میں اسی وقت چلنے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔"

ساہوکار:۔ "کیا ضروری کاغذات آپ کے پاس موجود ہیں؟"

نواب:۔ "جی ہاں! میرے پاس والدۂ مرحومہ کی شادی، وفات، اور اپنی ولادت کا سیاہہ موجود ہے۔"

ساہوکار:۔ "یہہ کافی نہیں ایک اور بھی سیاہہ ضروری ہے۔"

نواب:۔ "میں سمجھ گیا! آپ بھائی صاحب مرحوم کی رحلت کا سیاہہ مانگتے ہیں مگر

آپ خود جانتے ہیں کہ انہوں نے سمندر میں ڈوب کر انتقال فرمایا ہے۔ میرے پاس ایک اور بھی سند موجود ہے جس سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ بھائی صاحب مرحوم نے مجھے اپنے ذاتی کاموں کے انصرام کا عام اختیار دے دیا تھا۔ یہ سند آپ کو اُن کے انتقال کے سیاہے سے مستغنی کر دے گی۔"

ساہو:۔ "نواب صاحب! میری مراد اس سیاہے سے نہیں ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ آپ کے مرحوم بھائی نے پٹانی میں شادی کی تھی؟ مجھے اُن کی بی بی کے انتقال کا سیاہہ درکار ہے۔"

یہ سوال نواب پر بجلی گرانے والا تھا۔ بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر مصیبت آفرین وہ مضطرب و مضطرب ہو گیا۔ مگر فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور اطمینان ظاہر کر کے کہنے لگا:۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

ساہو:۔ "کیا آپ کے بھائی ایک نوجوان عورت کو اپنے ہمراہ نہیں لائے تھے؟"

نواب:۔ "لائے تو تھے (جو ایک انگلش لیڈی تھی) مگر وہ اُن کی بی بی نہیں بلکہ داشتہ تھی۔"

ساہو:۔ "تعجب ہے! نواب صاحب آپ کیونکر فرماتے ہیں کہ وہ اُن کی بی بی نہیں بلکہ داشتہ تھی؟ وہ تو اُن کی جائز اور شرعی و قانونی بی بی تھی۔"

نواب:۔ "نہیں وہ اُن کی داشتہ تھی۔ تعجب مجھ پر نہیں آپ پر ہے۔ آپ ایسی بات فرما رہے ہیں جو میں نے کسی سے نہیں سُنی اور نہ کبھی اُس کی تصدیق کروں گا۔"

ساہو:۔ "تھوڑی دیر کے لیے فرض کیجیے کہ آپ کو شادی کا علم نہ ہوا۔ مگر زمانہ عجیب و غریب انقلابات دکھاتا ہے۔ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا واقعہ اور سچا واقعہ ہے۔ میں اُس کی صحت کا کفیل ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو وہ سیاہہ بھی دکھا سکتا ہوں جو پٹانی کے محکمۂ قضا میں موجود ہے۔"

نواب ساکت و بدحواس اپنے مقام پر چپکا رہ گیا، اور زمین اُس کے پاؤں کے تلے سے نکل گئی۔

سا ہو:۔ شادی کے ثبوت کی بنیاد پر مارشی نس لوسیا بھی اپنے شوہر کی شرعی وارث ہوں گی۔ لہٰذا جب تک اُن کی وفات کا سیاہہ نہ موجود ہو یا جب تک وہ حاضر نہوں رقم نہیں دی جاسکتی مجھے یقینی طور پر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس زمانے میں جہاز ڈوبا ہے اُن کی زچگی ہونے والی تھی۔ میں نے اُن کے بچے سے قطع نظر کرکے بہت کچھ خود اُن کی بھی تلاش کی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اُن کا انتقال ہوگیا مگر چونکہ قانونی ثبوت نہیں ہے میں مجبور ہوتا ہوں کہ اس میراث دافر کو جو صرف آپ ہی سے مخصوص ہوسکتی ہے۔ عرصہ دراز تک اپنے قبضے میں رکھ رہوں۔ میں اس رقم کو سوائے مارشی نس یا اُس آدمی کے جس نے یہ رقم میرے پاس رکھوائی (یعنے ساڈڈچاوری) کسی اور کو دینے کا مجاز نہیں ہوں سوائے اس صورت کے کہ اٹھارہ سال گزر چکیں۔ اُس وقت ورثائے قانونی میں سے جو جو اشخاص باقی رہیں۔ اُنہیں یہ رقم دی جائے۔ اس وقت اٹھارہ برس گزر چکے ہیں اور آپ کے سوا کوئی اور وارث موجود نہیں ہے۔ مگر رقم کی حوالگی کے لیے مارشی نس لوسیا کے انتقال کا سیاہہ پیش کرنا ضروری ہے جو بدقسمتی سے آپ کے پاس موجود نہیں ہے۔"

نواب:۔ "ہائے افسوس! میرے پاس موجود نہیں ہے۔ نہیں ہے بے شک نہیں ہے۔"

اُس کی حالت متغیر ہوگئی آواز دب گئی اور پیشانی سے بھل بھل پسینہ بہنے لگا۔

سا ہو:۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ مارشی نس کا انتقال ہوگیا؟"

نواب:۔ "میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

سا ہو:۔ "اور آپ اُن کی وفات کا سیاہہ نہیں حاصل کرسکتے؟"

نواب:۔ "اگر حاصل کرسکتا تو اتنا حیران و پریشان کیوں ہوتا؟"

سا ہو:۔ "مگر تعجب ہے کہ آپ کے بھائی کا انتقال ہوتے ہی آپ نے اُن سے

بالکل قطع تعلق کر لیا اور اس سے بالکل لاعلم رہے کہ اُن پر کیا گزری؟"
نواب:" گزشت آنچہ گزشت، میں سمجھتا تھا کہ وہ اُن کی داشتہ ہے۔ اسی لیے غلطی سے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔"
ساہو:" درست ہے غلطی ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے بھائی نے آپ کو اس کی اطلاع نہ دی کہ وہ اُن کی بی بی ہیں۔"
نواب:" اس اخفا پر مجھے نہایت افسوس ہے، اصل یہ ہے کہ بھائی صاحب مرحوم کی طبیعت ہی کچھ عجیب واقع ہوئی تھی۔ وہ نہ کسی دوسرے سے ملتے جلتے تھے، نہ مجھ سے زیادہ کہتے سنتے تھے اسی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی۔"
ساہو:" تو اب ہم کو یہ فرض کرنا چاہیے کہ مارشی نس بقید حیات موجود ہیں کیونکہ ہمارے پاس اُن کی موت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ چونکہ ہمیں حقیقت حال کی دریافت واجب ہے۔ اس لیے تلاش و تفتیش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا چاہیئے۔"
نواب:" تلاش کہاں اور کیونکر کی جا سکتی ہے؟"
ساہو:" نواب صاحب! میں نے جو روایت سُنی ہے اگر وہ صحیح ہو تو مارشی نس اپنے شوہر کی وفات کے کچھ دن بعد دیوانی ہو گئی۔"
نواب:" میں نے بھی یوں ہی سُنا ہے اور یہ بھی کہ اُن کے اہل و اقارب نے ایک ڈاکٹر کو اُن کے پاس بھیجا تھا۔ وہ ڈاکٹر آ کے اُنہیں لے گیا۔"
ساہو:" کیا یہ سب صحیح ہے؟"
نواب:" خدا معلوم مجھے کچھ علم نہیں۔"
ساہو:" کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا معاملہ ہے، میری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ میرے پاس بیس ملین (دو کروڑ) فرنک موجود ہیں۔ میں اُن کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ آپ یا تو مارشی نس کا وفات نامہ لائیے یا وہ صداقت نامہ دکھائیے جس سے اُن کا رجوع شفاخانہ ہونا ثابت ہو۔

بصورت ثانی اُن کا حق الارث ساقط ہو جائے گا اور میں رقم مذکور آپ کے حوالے کر دوں گا۔ پیرس میں ابھی تین مہینے تک میرا قیام رہے گا۔ اس عرصے میں آپ غالباً یقینی خبر حاصل کر لینگے اور غریب خانے پر تشریف لاکر مجھے آگاہ فرمائینگے، اب میں تخفیفِ تصدیع کرتا ہوں اور آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔"

نواب نے ساہو کو رخصت کیا۔ اُس کے قویٰ مضمحل اور اُس کے حواس پریشان ہو رہے تھے، ساہو کے چلے جانے پر جب وہ تنہا ہو گیا تو اپنے اندرونی درد و کرب کو جس کے چھپانے سے اُس کا سینہ تنگ آ گیا تھا، اور جس سے اُس کی فکروں میں الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا، علانیہ ظاہر کرنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیا اور اُس آدمی کی طرح جس پر بجلی گری ہو۔ گڑگڑانے لگا، اور آہ وزاری کرنے لگا۔ اِس حالت میں اُس کی زبان سے جو الفاظ نکل رہے تھے۔ یہ تھے:۔

"آہ! بیس ملین فرنک! اتنی بڑی رقم میرے ہاتھ سے چلی جا رہی ہے۔ دولت کی ایک مقدارِ وافر میرے قبضے میں ہے لیکن میں اُسے چھو نہیں سکتا۔ میرے قرضخواہ بھوکے بھیڑیے کی طرح مجھ سے آکے چمٹ جاتے ہیں، اور میں ہلاکت کے گڑھے میں گر جانے کو ہوں ۔۔۔۔ خدا جانے وہ بدبخت (مارشی نس) کہاں ہو گی! میں اُس کو کہاں تلاش کروں! بیالیس اُس کو کسی ایسے مقام پر چھوڑ آیا تھا، جس کو میں نے دیکھا نہیں تھا۔ نہ یہ پوچھا تھا کہ وہ مقام کہاں واقع ہے، افسوس بڑی بیوقوفی ہوئی، یقین ہے کہ ان سالہا سال کے عرصے میں وہ مر گئی ہو گی۔ اب کیا کیا جائے! اور کون سی تدبیر اختیار کی جائے! میں اُس کی وفات کا جعلی سیاہ بھی نہیں بنا سکتا ساہو بڑا کائیاں ہے، ایک ہی نظر میں بھانپ لیگا۔ لینے کے دینے پڑ جائینگے کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی

"افسوس! ہزار افسوس!! واویلا! وامصیبتاہ!! مجھے کیسا سخت صدمہ پہنچا ہے
"میں بالکل پاگل ہو جانے کو ہوں، میری چھوٹی قسمت سے بیالیل بھی مر گیا
"کاش وہی زندہ ہوتا۔ بیس ملین فرنک! ہائے بیس ملین فرنک۔ ان کے چلے
"جانے سے ضرور میری زندگی بھی چلی جائے گی۔ کاش بیالیل زندہ رہتا
"افسوس! افسوس!!"

حقیقت میں بیالیل مر گیا تھا، اور اس کو مرے ہوئے ایک زمانہ بھی گزر گیا تھا، کیونکہ خفیہ پولیس کی تفتیشوں نے اس تیرہ بخت کو اضافت کے ہاتھوں پہنچا دیا تھا اور جب وہ گرفتار ہوا تھا تو عدالت کے شکنجے میں نہ پھنسنے کے لیے، سر میں پستول خالی کر لیا تھا۔

لیکن اگر عذاب دنیا سے چھوٹ گیا تو کیا ہوا۔ عذاب آخرت سے تو نہیں چھوٹ سکیگا۔ وہاں تو احکم الحاکمین کے آگے میزان عدل قایم ہے۔

آٹھواں باب

کرنیل گیرڈی

امسٹرڈم کا ساہوکار، نواب سے رخصت ہو کے ایک خوش قطع، عالیشان بنگلے میں جو سائڈزبرگ روڈ پر واقع تھا، داخل ہوا۔ اس وسیع بنگلے کے ایک کمرے میں کرنیل گیرڈی، زمانہ آیندہ کی فکروں اور اپنی دوسری تدبیروں میں مستغرق تھا، وہ ابھی اپنے تخیلات میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی وہ گھبرا کے اٹھا اور دروازہ کھولا ہی تھا کہ ساہوکار اندر آیا، کرنیل گیرڈی اس کے ساتھ بڑے اشتیاق اور خندہ جبینی سے پیش آیا۔ اور اس کا چہرہ بغور دیکھنے لگا، ساہوکار کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اس سے کرنیل کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے سوال کیا "جناب من! شاید آپ کی جد وجہد بار آور نہ ہو سکی؟"

ساہو:۔ بے شک حضور آپ کا مخلص کوئی عمدہ نتیجہ استنباط نہ کر سکا۔"
گیرڈی:۔ "نواب کی حالت کیا تھی۔ اور اُس کی گفتگو سے کیا پایا جاتا تھا؟"
ساہو:۔ "وہ ہائے وائے کرتا نظر آتا تھا، مگر دروغ گوئی میں اُسے بڑا کمال ہے۔ اور اُس کو قطعاً نہیں معلوم کہ مارشی نس پر بچہ پیدا ہونے کے بعد کیا گزری۔"
گیرڈی:۔ "افسوس ہے کہ میری امیدیں، مایوسی سے بدل گئیں۔"
ساہو:۔ "صبر کیجیے اور دل کو ڈھارس دیجیے۔ ممکن ہے کہ زمانہ ان اسرار کو ظاہر کر دے۔"
گیرڈی:۔ "کس طرح اور کب تک صبر کروں، موجودہ مشکلات میں بجز گیوں کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ مارشی نس مر گئی اور یہ بھی دور از قیاس نہیں کہ ان ظالموں نے اُسے مار ڈالا ہو۔"
ساہو:۔ "خداوندا! اس خیال کو تو آپ بھولے سے بھی اپنے دماغ میں جگہ نہ دیجیے مجھے اندیشہ ہے کہ یہ منحوس خیال کہیں آپ کی جان کا لاگو نہ ہو جائے۔ جن ظالموں نے بچے پر رحم کھایا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ماں کو قتل کر ڈالینگے۔"
گیرڈی:۔ "آخر وہ کہاں ہے؟ کدھر چلی گئی؟ کیا ہو گئی؟"
ساہو:۔ "آپ کو جستجو اور جد و جہد سے ملول و مایوس نہ ہونا چاہیے جناب باری کا فضل عنقریب ہم پر نازل ہونے والا ہے اور مجھے کامیابی کی بہت سی صورتیں نظر آ رہی ہیں۔ خدا پر بھروسہ کیجیے وہ آپ کو نامراد نہ رکھیگا اور بہت جلد اپنی عنایت بیحد دل کرے گا۔ ؎

اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار ۔۔۔ نہو اُس سے مایوس امیدوار"

گیرڈی:۔ "مجھے اُس پر پورا بھروسہ ہے، اور اُس کی رحمت مجھ پر نازل ہے میں نے بچے کو تو پا ہی لیا ہے مگر ماں کے ملنے پر میری خوش قسمتی کا مدار ہے اس پاجی خبیث پر خدا کا غضب، اس کی شیطنت سے مجھے کیا کیا عذاب سہنے پڑے، میں نے ہر مقام اور ہر جگہ پر مارشی نس کی تلاش کی۔ جب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر ۴ صحیفہ جلد ۴

ایڈیٹوریل

خدا کے فضل سے اس نمبر کے شایع ہونے پر تاخیر اشاعت کا ناگوار مرض دور ہو جاتا ہے۔ اور امید بندھتی ہے کہ آیندہ یہہ روزِ سیاہ (انشاءاللہ) نہ دیکھنا پڑے گا۔

ناول کی نسبت استفسارات ہوتے ہیں کہ کب ختم ہوگا۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سال ضرور اختتام کو پہنچ جائے گا۔ ایسے ناول کا انتخاب جو سال کے خاتمے پر ختم ہو جائے بے شک مناسب ہے۔ لیکن اگر کوئی دلچسپ ناول، دو سال میں جا کے ختم ہو تو اس میں خرابی ہی کیا ہے۔ بعض رسالے جو ناول شایع کیا کرتے ہیں تین تین سال میں ایک ایک ناول ختم کرتے ہیں۔

آذر ۱۸ف کے رسالے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ مینیجر صاحب کے

مقرر ہو جانے سے آیندہ ہمارے نام پر بجائے مہتمم کے صرف "اڈیٹر" لکھا جائے گا۔ اِس پر معزز ناظرین نے بجائے خود یہہ سمجھ لیا کہ رسالہ ہماری مِلک میں آگیا۔ اور انجمن معارف سے اِس کا تعلق جاتا رہا۔ ہم ناظرین کو اطمینان دلاتے ہیں کہ رسالہ بدستور سابق، انجمن ہی کی مِلک میں ہے۔ اور ہم اِس کے مرتب کرنے والے ہیں۔ نہ کہ "پروپرائیٹر"۔ ناظرین اپنا شک رفع کر دیں۔

صحیفہ میں جو جو کوتاہیاں اور قابلِ رفع اُمور، بعض نکتہ سنجوں کو نظر آتے ہیں اُن سے ہم مطلع نہیں کیے جاتے۔ اور بجائے ہمارے ایسے اشخاص سے اُن کا اظہار کیا جاتا ہے جن سے اُن کا اظہار بے فایدہ ہے۔ ہم پہلے اعلان کر چکے ہیں کہ ہمارے بہی خواہوں کو جو جو باتیں قابلِ اصلاح نظر آئیں۔ اُن سے راست طور پر ہمیں مطلع فرما دیا جائے۔ ہم اُن کے از حد ممنون ہونگے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری استدعا پر لحاظ نہ کر کے ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو بے سود اور قابلِ اعتراض ہے ہم اپنے عنایت فرماؤں کا بہت بڑا شکریہ ادا کرینگے۔ اگر وہ ہمیں آیندہ سے بلا کھٹکے اپنی رایوں اور مشوروں سے فیضیاب کرنے کا موقع عطا فرمائینگے۔

اخبارِ الحامی اور اُس کے بعض نامہ نگاروں کو صحیفہ کے ساتھ جو عنایت آمیز ہمدردی ہے وہ متعدد مرتبہ ناظرین کو معلوم ہو گئی ہوگی ۲۴۔ ڈسمبر ۱۹۳۰ء کے نمبر میں ہمعصر مذکور رقمطراز ہے:۔

"صحیفہ کی کوششیں"

"ہم نہایت خوشی سے اظہار کرتے ہیں کہ حیدرآباد کے ہونہار رسالے

"صحیفہ نے بڑے زور شور سے ثابت کر دیا ہے کہ اہلِ دکن بھی کیسے بہتر سے بہتر"
"اور عمدہ سے عمدہ مضامین لکھ سکتے ہیں۔
"انجمن ترقی اردو سے تاریخ التاریخ پر مضمون لکھنے کا اعلان ہوا اس پر ایک"
"دکنی ہی نے قلم فرسائی کی"
"نظم میں نثر کی طرح سوال و جواب کا طریقہ ایک دکنی ہی کی دماغ کاوی"
"کا نتیجہ ہے"
"عروض میں اردو بحروں کو ایجاد کرنے کی تحریک ایک دکنی ہی کی"
"لطافتِ طبع کا ثمرہ ہے"
"ایک زمانے سے اردو شاعری پر اعتراض ہو رہا تھا کہ اس میں"
"عشقیہ مضامین کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس کی تردید میں ایک دکنی ہی"
"نے عملی ثبوت بہم پہنچایا"
"اس میں بہتر سے بہتر نیچرل نظمیں ہوتی ہیں"
"اسلام و عیسائیت کا مضمون بھی پہلے اسی رسالے میں شایع ہوا جس"
"کے قبولِ عام کا یہ حال ہے کہ ضیاء الاسلام مراد آباد میں بجنسہ نقل کیا گیا۔ اور"
"اس کا ماحصل علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، وکیل امرتسر، دارالسلطنت کلکتہ"
"کرزن گزٹ دہلی میں چھپا"
"عربی شاعری اور فلسفے پر بھی تحقیقانہ مضمون لکھا گیا"
"اورنگ آباد کا مضمون بھی بہت ہی محنت و کنج کاوی سے لکھا گیا تھا"
"جس کو مخبرِ دکن، صبحِ بہار کے علاوہ اس اخبار میں نقل کیا گیا تھا خوشی"
"کی بات ہے کہ اس کی تحریکات کا خوشگوار نتیجہ مرتب ہو رہا ہے"
"امید کی جاتی ہے کہ دوسری تحریکوں پر بھی نواب بہزور جنگ بہادر"
"و فصیح الدین احمد صاحب اپنی توجہِ عالی مبذول فرمائینگے۔ ذیل میں وہ"
"تحریکیں درج کی جاتی ہیں جو زیرِ غور یا زیرِ عمل ہیں"

"۱۔ نمازِ جمعہ صرف جامع مسجد میں ہونے کی تجویز درپیش ہے"
"۲۔ جامع مسجد کے شکستہ حجرے درست کیے جا رہے ہیں"
"۳۔ مقبرۂ رابعۂ دورانی کے داخلے کا ٹکس موقوف کیا گیا"
"۴۔ رابعۂ دورانی کے حجرے و منار درست کیے جا رہے ہیں"
"۵۔ ہائی اسکول کی عمارت بن رہی ہے"
"۶۔ مقبرۂ رابعۂ دورانی میں مختصر میوزیم قایم کی جا رہی ہے"
"۷۔ ایک مفید عام دارالاخبار و کتبخانہ بنام انجمنِ عثمانیہ قایم کی گئی ہے"
"۸۔ ایک انجمنِ قرضہ بھی قایم کی گئی ہے"
"ہائی اسکول و مدرسۂ صنعت کے لیے بجائے نیا مکان بنانے کے بہتر ہوتا"
"کہ نوکھنڈی کے مکانات میں سے دو ایک کو ہی درست کیا جاتا جس طرح کہ مسٹر"
"ہنکن نے محابس اور رنگ آباد و نظام آباد کے لیے قدیم سرائے و قلعہ کو اپنے"
"ڈھب پر درست کرا لیا"

جے پور کا ماہوار اردو رسالہ کا شکار، صحیفہ کو جس نظرِ قدردانی سے دیکھتا ہے وہ ان الفاظ سے معلوم ہو سکتی ہے:-

"رسالۂ صحیفہ حیدرآباد دکن"

"حیدرآباد دکن کی ایک فاضل اور برگزیدہ جماعت سے یہ پرچہ ہر ماہ میں"
"شایع ہوتا ہے۔ اس کے مضامین واقعی پبلک کے لیے نہایت مفید ہوتے ہیں"
"علاوہ ظاہری خوبی لکھائی و چھپائی کے مضامین اور حالات کی خوبی سے مملو ہے"
"ہمارے پاس اس کے تین نمبر بطور تبادلہ آ چکے ہیں۔ اس کے مقاصد ذہنی"
"اخلاقی اور علمی ترقی کرتا ہے۔ رسالے کا حجم ۵۲ صفحوں کا ہے اور ہر فصلی ماہ کے"
"واسطے میں باہتمام مرزا نثار علی صاحب اعزاز مینیجر صحیفہ پریس دروازہ چادرگھاٹ"
"حیدرآباد دکن سے شایع ہوتا ہے۔ قیمتِ رسالہ عوام سے (۴) سالانہ مقرر ہے"

سال حال کے دسے کے نمبر میں، ہم نے مولوی محمد واجد علی صاحب کا وہ خط درج کرکے جس میں آنہوں نے چھے طالب علموں کے نام صحیفہ جاری کرایا تھا۔ افسوس ظاہر کیا تھا کہ اس قسم کی فیاضی کی نظیر اس وقت تک ایک بھی قایم نہیں ہوئی۔ ساتھ ہی اُمید بتائی تھی کہ ایسے عطیے ضرور کوئی نہ کوئی مفید ثمرہ بخشینگے۔

اُس وقت ہمیں خبر نہ تھی کہ ایک ہی مہینے کے بعد، ہماری امید، حدودِ تمنا سے نکل کے فضائے حصولِ مرام میں جا پہنچیگی۔

صحیفہ کے دلی و عملی معاون و مضمون نگار، جناب مولوی محمد مرتضیٰ صاحب (مولوی فاضل)، نے، جن سے ناظرین علاوہ مضمون نگاری کے یوں بھی، واقف ہیں کہ اُنہوں نے اپنی قابلِ قدر تصنیف "روحِ ترقی" کو خریدارانِ صحیفہ کی خدمت میں مفت روانہ کیا تھا۔ حال میں اطلاع دی ہے کہ اُن کی جانب سے دس غریب طلبا کے نام ایک سال تک صحیفہ جاری کیا جائے ؎ آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو۔

یہ علمی ہمدردی، مولوی صاحب موصوف کی اُس ترقی عہدہ کے ضمن میں ہے جو سنٹرل ریلیف کمیٹی حیدرآباد کے عملے کی خدمتِ منتظمی پر، فایز ہونے کی بدولت مولوی صاحب موصوف کو حاصل ہوئی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ عموماً ہمارے احباب اور خصوصاً یہی خواہانِ صحیفہ اسی طرح روز افزوں ترقی کرکے درجاتِ امتیاز پر فایز ہوں اور ہماری دلی مسرتوں اور عملی کوششوں میں ازدیاد و اضافہ کرتے رہیں۔

اس خبر کو گوشگزارِ ناظرین کرتے وقت ہم جوشِ مسرت سے چلمنِ طرب میں پھولے نہیں سماتے کہ روشن خیال تعلیم یافتہ ابنائے ملک کی کوششیں ملک میں عام ہوتی چلی ہیں اور دارالعلوم کا فیضِ تعلیم خوش آیند ثمرات پیدا کر رہا ہے۔

ہم نے دے ۱۳۱۸ف کے نمبر میں بعض فارغ التعلیم طلبائے دارالعلوم کے نام گنا تے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ ان حضرات کی مساعی جمیلہ ملک کے ہر صیغے میں مفید و ضروری نتائج پیدا کرنے والی ہونگی۔ انہی کے منجملہ ایک نام مولوی میر امداد علی صاحب مولوی فاضل منشی فاضل کا تھا۔

مولوی صاحب موصوف کا وطن چٹگوپہ نامی ایک قصبہ ہے جو ضلع بیدر کے مضافات میں سے ہے۔ اس قصبے میں علمی مذاق رکھنے والے معدودے چند ہیں اور لکھنا پڑھنا جاننے والے بھی اسی نسبت سے ہیں۔ سخت ضرورت تھی کہ علمی مذاق پیدا کرنے اور روشنخیالی پھیلانے کے لیے وہاں کوئی ایسی انجمن قایم کی جاتی جس میں اردو کا ذخیرہ مہیا رہتا اور اخبارات و رسایل کی تحریروں سے خیالات میں تبدیلی کی جاتی۔ اس ضرورت کو جناب موصوف عرصے سے محسوس کر رہے تھے اور سرگرم کوشش تھے۔ آخر کوشش بار آور ہوئی اور محنت ٹھکانے لگی۔

باشندگان قصبہ اور بعض عہدہ داروں کے اتفاق سے نواب محمد معین الدین خان بہادر خلف نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی سالگرہ کی تقریب میں ایک انجمن کا انعقاد ہوا۔ انجمن اصلاح اس کا نام رکھا گیا۔

۷۔ ذیقعدہ ۱۳۲۶ھ کو تخمیناً تین سو دو دار اشخاص کا مجمع اس کے افتتاحی جلسے کی رونق کا باعث ہوا۔ صدارت کی کرسی کو صحیفہ کے قدیم مربی جناب میر محمود علی صاحب تحصیلدار چٹگوپہ نے زینت دی کئی صاحبوں نے تقریریں کیں اور بالآخر نہایت مسرت و کامیابی سے جلسہ برخاست ہوا۔

ہم مولوی میر امداد علی صاحب بانی و معتمد انجمن کو مبارکباد دیتے ہوئے انجمن اصلاح کے قیام و ترقی کے لیے بارگاہ ایزدی میں دل سے دعا کرتے ہیں اور وہ قطعۂ تاریخی جو اس تقریب میں ہمارے خاص عنایت فرما مولوی سید رضی الدین حسن صاحب کیفی حیدرآبادی نے لکھا ہے

درج ذیل کرتے ہیں :-

نام اس انجمن کا ہے اصلاح — اس کی مسعود و میمنت ہے بنا
کہ ہے یہ یادگار سال گرہ — اے زہے سال ابتہاج افزا
جشن عید جشن سال گرہ — مرحبا واہ واہ کیا کہنا
کس کی ہے ایسی نیک سال گرہ — جس سے عقدہ مسرتوں کا کھلا
کون ہے وہ ؟ نواب ابن نواب — کون ہے وہ ؟ ستودۂ اُمرا
نام اُس کا ہی کیا ؟ معین الدین — وصف کیا ہے ؟ معاون غربا
نیر برج آسماں جاہی — یعنے۔ فرزند امیر اکبر کا
روز میلاد اُس کا ہے مسعود — جس نے اس انجمن کا در کھولا
خضر کی عمر دے خدا اُس کو — ہے یہی اہل انجمن کی دعا
انجمن کو ملے دُرِ مقصود۔ — اور بانی انجمن کو جزا
انجمن کیا ہے ایک خوان علوم — یا ہے اک علم دوستوں کا جتھا
ملک کے حق میں انجمن ہو مفید — اس سے ہوں مستفید سب شر کا
اس کے بانی ہیں ایک دوست مرے — مولوی فاضل اہل حلم و حیا
ہیں وہ دار العلوم کے شاگرد — کہ نہیں کوئی مدرسہ ایسا
مجھ سے کی تھی انہوں نے فرمایش — کہ کوئی نظم کا ہو سیرایا
جس میں تاریخ بھی نکل آئے — نیز ظاہر ہو انجمن کی بنا
مگر اس کے لیے ہے مدت کم — ایک دو دن میں ہو تو ہے اچھا
اُن کا امداد علی ہے اسم شریف — جس نے اس طرح مجھ سے فرمایا
بانی انجمن معاف کریں — اس میں مجھ سے ہوئی ہے سہو خطا
حتی الامکان حکم کی تعمیل — کی ہے لیکن۔ صلاح کار کجا
آپ کی انجمن پھلے پھولے — آپ کی سعی ہو نتائج زا
مقصد اس انجمن کا ہے اصلاح — مستقر انجمن کا چٹگویا

مصرعِ سالِ افتتاح یہ ہے
منبعِ فیضِ مجلسِ علما
سنہ ۱۳۴۶ھ اکتوبر

رباعیاتِ لمعہ

ہر کاخ کو ہم نے خاک ہوتے دیکھا — ہر صبح کا سینہ چاک ہوتے دیکھا
ہے لمعہ کو وردِ کُلُّ شَیْءٍ ہَالِک — جس کو دیکھا ہلاک ہوتے دیکھا

ولہ

رندوں کے لیے دورِ شراب اچھا ہے — مستوں کے لیے چنگ و رباب اچھا ہے
عاشق کے لیے وصالِ محبوب ہو خوب — ان سب کے لیے لمعہ شباب اچھا ہے

ولہ

دم بھر کے لیے ہے زندگی مثلِ حباب — جھونکے ہیں ہوا کے عہدِ طفلی و شباب
اک قطرۂ آب سے ہے انساں کی نمود — قایم رہے لمعہ کس طرح نقش بہ آب

ولہ

خواہش نہ کسی چیز کی رکھتا ہوں طلب — مجھ کو نہ غرض نہ ہے کسی سے مطلب
اب گیا میں طلب کروں کسی سے لمعہ — مطلب ہی سے خود عیاں ہے شکلِ مطلب

ولہ

دنیا مردار اہلِ دنیا ہیں کلاب — کرتے ہیں خوشامدِ امیر و نواب
اے لمعہ کبھی کسبِ توکل کو نہ چھوڑ — پہنچاتا ہے رزق سب کو رب الارباب

ولہ

راحت میں بسر ہو گیا عہدِ طفلی — اور عیش و نشاط میں جوانی گزری
پیری نے سنائی وہ کہانی ہم کو — ایسے سوئے کہ پھر نہ جاگینگے کبھی

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ

علم و تمدن کے ساتھ

(گزشتہ سے آگے)

سلطان اور اسلام

اسلام نے دینی اور شرعی لحاظ سے، حدود اور حقوق مقرر کیے ہیں لیکن ہر ایک معتقدِ اسلام اُن پر عمل نہیں کر سکتا۔ ہوا و ہوس اور خواہشاتِ نفس اُس کو راہِ حق سے پھیر دیتے ہیں اور اِس رستے پر اُس کے قدموں کو ڈگمگا دیتے ہیں۔ اِس لیے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہوئی جو اُن کو اپنے اپنے حدود پر قایم کرے اور اُن سے احکامِ حق جاری کرائے۔ اور جماعت مسلمین کے نظام کی حفاظت و نگہداشت کرے۔ یہہ قوت متفرق اور منتشر نہیں ہو سکتی۔ بدیں وجہ اِس کا ایک ہونا ضروری ہوا۔ اور وہ سلطان یا خلیفہ ہے۔

مسلمانوں کے اعتقاد میں خلیفہ معصوم نہیں ہے اور نہ مہبطِ وحی ہے اور نہ اُس کو یہہ حق حاصل ہے کہ وہ کتاب و سنت کا مالک بن بیٹھے اور من مانے اُس کی تفسیر کرے۔ ہاں خلیفہ بننے کے لیے ایک شرط یہہ ہے کہ وہ زبان عربی اور اُمورِ مایتعلق بہا سے واقف رہے۔ تاکہ وہ کتاب و سنت کو سمجھ سکے۔ اور استخراجِ احکام میں اُس کو سہولت ہو اور وہ حق و باطل اور صحیح و فاسد میں تمیز کر سکے اور عدل و انصاف قایم رکھ سکے

اُس کو آسانی رہے۔

بایں ہمہ اسلام، کتاب و سنت اور علم کو کچھ خلیفہ ہی پر منحصر نہیں کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک طلبِ علم میں وہ اور دوسرے افراد برابر ہیں۔ وہ علم کے دروازے کو کسی شخص پر بند نہیں کر دیتا ہے بلکہ جو کوئی اُس کی اہلیت رکھتا ہے وہ اُس کو علم حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا ہے (۱) جب تک خلیفہ یا سلطان راہِ راست پر چلتا رہے اور کتاب و سنت پر عمل کرتا رہے۔ اُس کی اطاعت لازم ہے۔ لیکن اگر وہ راہِ راست سے منحرف پایا جائے یا بیراہہ رو ہو جائے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اُس کی اصلاح کریں۔ اور اُس کی کجی کو دور کر دیں۔ (۲) لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ (ایسی اطاعت جس سے خدا کی معصیت و نافرمانی لازم آتی ہو۔ ہرگز جائز نہیں۔) (۳) اگر خلیفہ کا عملدرآمد کتاب و سنت کے برخلاف ہے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اُس کے بجائے کسی اور کو خلیفہ مقرر کریں۔ لیکن یہہ اُس وقت تک کہ اس سے کوئی ایسا فتنہ و فساد برپا نہ ہوتا ہو کہ جس سے مصلحتِ مقصودہ فوت ہوتی ہو (۴)۔

(۱)۔ اِس امر کا شاہدِ عادل یہہ ہے کہ علما کا رتبہ اُن خلفا سے جو علم و فہم میں اُن سے کم تھے۔ بہت بڑھا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید اور امام مالک کا قصہ ایک ایک مشہور کہانی ہے۔ دیکھو امام نے درس کے وقت کس طرح خلیفہ کو تخت سے اُتروا دیا۔ اور عام شاگردوں کے برابر بٹھایا۔ (۲) اِس کی نظیر یہہ ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے خطبے میں کہدیا تھا۔ اِن زغت فقوموني (اگر میں ٹیڑھی چال چلوں تو مجھ کو سیدھا کر دو)۔ (۳) یہہ حدیث ہے بخاری و مسلم وغیرہما نے اُس کی روایت کی ہے۔ (۴) اِس کی مثال ایسی ہے کہ خلیفہ کو عصبیت حاصل ہو اور قوم اُس کا مقابلہ نہ کر سکتی ہو اور اپنے ہلاک و برباد ہو جانے کا خوف رکھتی ہو تو ایسی حالت میں مفاسد کو دور کرنا منافع و مصالح کے حاصل کرنے پر مقدم ہوگا۔

پس اسلام نے جو کچھ اختیار و اقتدار دیا ہے وہ قوم کو دیا ہے۔ قوم ہی خلیفہ کو مقرر کرتی ہے اور قوم ہی بوقتِ مصلحت اُس کو معزول کرتی ہے۔ لہٰذا خلیفہ کو ہر اعتبار سے دنیاوی حاکم کہنا زیبا ہے۔

مسلمانوں کے خلیفہ کو فرنچ کے گھڑے ہوئے نام "ٹیوکراٹیک" خدائی حاکم سے موسوم کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ اُن کے خیال میں خدائی حاکم وہ ہے جس پر اللہ کی طرف سے شریعت اُترتی ہے۔ شریعت کا وہی مختارِ کل ہوتا ہے اور اُس میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ اُس کو لوگوں پر بیعت اور حمایت و عدل کا حق نہیں بلکہ غاشیہ برداری، غلامی، اور اطاعت کروانے کا حق حاصل رہتا ہے۔ مومن جب تک مومن رہے اُس کے مخالف نہیں کر سکتا گو وہ دل میں یہہ اعتقاد کیوں نہ رکھتا ہو کہ وہ دشمنِ دینِ خداوندی ہے۔ گو وہ اپنی آنکھوں سے کیوں نہ دیکھتا ہو کہ اُس کے اعمال شریعت پر کسی طرح منطبق نہیں ہیں۔

یہہ سب اِس لیے کہ وہ تسلطِ دینی کا حاکم ہے۔ جو قول اور عمل اُس سے صادر ہوگا مظاہرِ شریعت میں اُس کا شمار ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ کنیسہ کا تسلط قرونِ وسطیٰ میں اسی طرح کا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اِسی تسلط کی حقداری کا دعویٰ کرتی رہی۔

جب جدید تمدن نے پر پرزے نکالے تو دینی اور دنیوی دونوں قوتوں میں تفریق کر دی۔ کنیسہ کو اعتقادات اور عبادات میں تصرف کا حق دیا اور دنیوی قوت کو لوگوں کے معاملات فیصل کرنے اور قوانین جاری کرنے اور اُن کے نظامِ اجتماع کی حفاظت اور صرف امورِ معاش کی اصلاح کرنے کا اختیار دیا۔ اور اِس تفریق کو اپنے زعم میں سمجھ لیا کہ خیر و برکت کا منبع ہے۔ عیسائی اسلام کی نسبت یہہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ ان دو قوتوں کو ایک شخص میں جمع کرنا چاہتا ہے۔ اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے خیال میں

سلطان یا خلیفہ دین کا مقرر کرنے والا، اُس کے احکام کا وضع کرنے والا ہے۔ دین و ایمان اُس کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے کہ وہ جدھر چاہتا ہے دلوں کو اُس کے اشارے سے پھیر دیتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے عقلوں کو اُس کے ذریعے سے جھونک دیتا ہے۔ اُنہوں نے دیکھا تھا کہ دینی حاکموں نے علم سے لڑائی جھگڑے کیے تھے اور جہالت و وحشت کی حمایت کی تھی۔ بنا بران وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جب تک سلطان کا تقرر دین اسلام کا اُصول رہے گا وہ ہرگز علم کے ساتھ مسامحت کا برتاؤ نہیں کر سکتا۔ لیکن ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہہ کھلی غلطی اور اُصول اسلام کی نسبت صریح غلط فہمی ہے۔ اسلام میں کسی قسم کا دینی تسلط نہیں ہے۔ اگر کسی قسم کا تسلط ہے تو صرف یہہ کہ نرمی اور عمدگی کے ساتھ وعظ و نصیحت کی جائے۔ بھلائی کی طرف لوگوں کو بلایا جائے بُرائی سے بچایا جائے اور یہہ ایک ایسا تسلط ہے کہ اُس کی وجہ سے ادنیٰ اعلیٰ کے کان پکڑ سکتا ہے اور اعلیٰ ادنیٰ کے۔ اب عیسائیوں پر کھل گیا ہو گا کہ نصب خلیفہ کوئی ایسا تنگ و تاریک مسئلہ نہیں ہے کہ جس کے کارن اسلام اور علم میں اَن بَن رہے۔ خلفائے عباسیہ اور اسپین کے اموی سلاطین نے علم اور علما کے ساتھ جو جو عظیم الشان احسانات کیے تھے ہم نے اجمالاً پہلے اُن کا کچھ ذکر کر دیا ہے۔ آیندہ بھی حسب موقع اُس تذکرے کو دُہرایا جائے گا۔

عیسائی یہہ کہیں گے کہ اگر خلیفہ اور سلطان دینی حاکم نہیں ہیں تو کیا قاضی یا مفتی یا شیخ الاسلام بھی نہیں ہیں اس کا جواب یہہ ہے کہ ان لوگوں کو بھی لوگوں کے عقاید اور احکام دین ایجاد کرنے کا ادنیٰ سا ادنیٰ اختیار بھی نہیں ہے۔ ان لوگوں کو صرف دنیوی اقتدار حاصل ہے ان میں سے کسی شخص کو جایز نہیں ہے کہ وہ کسی کے ایمان و عقیدے کا مالک ہو جائے یا اُس کے

طریقۂ عبادت اور مذہب کے متعلق لڑے جھگڑے۔

اِسلام کا چھٹا اُصول

دفعِ فساد کے لیے دعوتِ اسلام کی حفاظت

عیسائی کہتے ہیں کہ دینِ اسلام میں جدال و قتال فرض کیا گیا ہے چونکہ وہ جہادی دین ہے اِس لیے اُس کی فطرت میں اپنے مخالفین سے شدت و سختی کا برتاؤ موجود ہے۔ اور تحمل و صبر جو صلح کن اور آشتی پسند شریعت کے لوازم سے ہے اُس میں مفقود ہے۔ اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دینِ مسیحی کی طبیعت اُس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ایسی بہتیری مسیحی وصیتیں ہیں جن میں مسالمت اور مصالحت کی ہدایت کی گئی ہے چنانچہ اِن میں سے ایک وصیت یہ ہے کہ:-

"جو شخص تمہارے بائیں گال پر تھپڑ لگائے تم اُس کے لیے"
"اپنا سیدھا گال بھی پیش کر دو۔ جو تم کو ایک میل تک پکڑ لیجائے"
"تو تم اُس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔"

دینِ مسیحی کے پیروؤں کو دشمنوں کے ساتھ محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگرچہ محبت دشمن کی ہو یا دوست کی۔ کوئی اختیاری بات نہیں ہے۔ امر اختیاری دشمنوں اور دوستوں کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک ہے لیکن خدا کی قدرت میں کوئی شے ناممکن اور محال نہیں ہے۔ یہ ہے عیسائیوں کا ادعا۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ شر کو شر کے ساتھ دفع کرنا ناگزیر ہو اگر دینِ اسلام جہاد کو جائز رکھتا ہو تو یہ اُسی کے ساتھ خاص ہے۔ یا یہ ہر طبیعت کا خاصہ ہے؟ دینِ اسلام کی طبیعت میں

عفو و مسامحت ہے نہ خون و قتل چنانچہ قرآن میں آیا ہے:-

خذ العفو و أمر بالعرف و اعرض عن الجاہلین۔ عفو کو مدنظر رکھ اور نیکی کا حکم کر اور جاہلوں سے اعراض کر۔

اس میں شک نہیں کہ دشمنوں کے جور و ظلم کو رد کرنے اور اُن کے شر و فساد سے بچنے کے لیے جہاد فرض کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ جبراً و قہراً دینِ اسلام کو منوایا جائے اور مخالفینِ اسلام سے انتقام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فتوحاتِ اسلامی کی تاریخ میں تم نہ زیادتیاں نہ پاؤ گے جو محاربات مسیحی میں دیکھتے ہو۔ کوئی اسلامی جنگ تاخت و تاراج کی غرض سے نہیں واقع ہوئی۔ لیکن مسیحیوں کے ہاتھوں ایسی لڑائیاں بہت برپا ہو چکی ہیں۔ قابل غور امر ہے کہ باایں ہمہ عنایتِ ایزدی نے اسلام کو تھوڑی سی مدت میں مدافعتِ اعداء پر وہ دسترس دی تھی کہ اُس کے اغیار کو وہی بات ایک زمانہ دراز کے بعد حاصل ہوئی۔ اُس نے اپنے بچپنے میں نہ کام کیے کہ اوروں سے بڑھاپے میں بھی بن نہ آئے۔

جنگجو اسلام اور صلح جو مسیحیت کا مقابلہ

جنگجو اسلام، جب کسی ملک میں داخل ہوتا اور اُس کو فتح کر لیتا تھا تو لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا اور اُن کے دین سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا تھا۔ اُس کی زیرِ حکم رعایا اپنے اعتقادات کے موافق اپنے واجبات و فرایض ادا کرتی تھی مگر اُس کی طرف کوئی آنکھ تک اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا ہاں جزیہ اُن پر مقرر کیا جاتا تھا مگر اس لیے کہ اُن کے جان و مال کی حفاظت کی جائے اور وہ امن و عافیت کے ساتھ اپنے مذہبی فرایض اور دنیوی کاروبار انجام دے سکیں۔ انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور کسی طرح کا ظلم اُن پر

روا نہ رکھا جاتا تھا۔ خلفائے مسلمین اپنے کمانڈروں اور گورنروں کو تاکیدی احکام دیتے تھے کہ راہبوں سے تعرض نہ کیا جائے۔ اُن کی عزت و حرمت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اور عورتوں اور بچوں اور معذور و لاچار بڈھوں کا پاس کیا جائے اور اُن کا خون نہ بہایا جائے اہل ذمہ کے حقوق کی حفاظت اور اُن کی امداد ہی کی مبالغت میں احادیث متواترہ صادر ہوئی ہیں جن میں سے دو یہ ہیں :-

۱- لہم مالنا ولہم ما علینا۔ ہمارے فائدے کے ساتھ اُن کا فائدہ ہے اور ہمارے نقصان کے ساتھ اُن کا نقصان ہے

۲- من اذی ذمیا فلیس منا۔ جس نے ذمی کو ایذا دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

جب تک اسلام قوی رہا اِن احکام پر عمل ہوتا رہا۔ مگر جب اُس میں ضعف پیدا ہو گیا تو بد نام کنندۂ نکو نامے چند مسلمانوں نے اِن ہدایتوں سے انحراف کیا لیکن اُن کے طرزِ عمل سے نفسِ اسلام پر کوئی داغ دھبہ نہیں لگ سکتا۔

صلح جو مسیحیت کے زیرِ تسلط جب کوئی دوسرا مذہب آجاتا ہے تو وہ اہلِ مذہب کے اعمال پر سخت نگرانی شروع کر دیتی ہے اور خاصکر اُن ہی لوگوں سے اس طرح کا سلوک کرنے لگتی ہے کہ اس پر صبر کیے رہنا ناممکنات سے ہو جاتا ہے اور جہاں اُسے اُن کو نکال باہر کرنے کا موقع ہاتھ لگ جاتا ہے تو فوراً جلاوطنی کا حکم سنا دیتی ہے اور شہروں سے اُن کے آثار تک کو پاک و صاف کر دیتی ہے جس سرزمین پر مسیحیت نے اپنا قدم رکھا ہی ہو ا۔ ایک مسیحی کے ظلم و ستم سے غیر مسیحی کو سوائے زورِ بازو کے کوئی عدالت نہیں بچا سکتی اِس کی شہادت تاریخ اور مورخ دونوں دے رہے ہیں۔ یہ سب محض اِس لیے کہ دینِ مسیح صلح کرنے نہیں آیا بلکہ تلوار چلانے کے لیے۔ وہ

اس لیے آیا ہے کہ باپ بیٹے اور ماں بیٹی میں عداوت کا بیج بوئے (۱)
اسلام کو دیکھو! وہ اپنی کتاب میں والدین کی نسبت کہتا ہے کہ:

وان جاہداک علیٰ ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعہما وصاحبہما فی الدنیا معروفا واتبع سبیل من اناب الیّ۔	اگر والدین تجھ سے اس بات پر لڑیں کہ تو شریک گردانے میرا ایسی چیز کو جس کی نسبت تجھ کو علم نہیں ہے تو اُن کا حکم تو نہ مان لیکن دنیاوی امور میں تو اُن سے نیکی کا سلوک کر اور اس کی پیروی کر جو میری طرف متوجہ ہوا ہے۔

(۱) نوٹ۔ اس کے متعلق انجیل متی میں جو کچھ وارد ہوا ہے وہ تو سابقاً قید تحریر میں آچکا ہے۔ انجیل لوقا باب ۱۴-۲۵-۲۶ میں آیا ہے کہ:

"مسیح نے اُن لوگوں سے کہا: اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے ماں باپ اور جورو لڑکے اور بھائی بہن بلکہ اپنی جان سے دشمنی نہ کرے میرا شاگرد نہیں ہو سکتا"

اُسی کے انتیسویں باب میں ہے: "میرے اُن دشمنوں کو جنہوں نے نہ چاہا کہ میں اُن پر بادشاہی کروں یہاں لاؤ اور میرے سامنے قتل کرو"

توریت کے اسفار میں بھی مخالفین کے ساتھ اسی قسم کی سختی کا سلوک کرنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ تثنیہ الاشتراع کے ۱۳-۹ میں مذکور ہے:

"اگر تمہارا اخیافی بھائی، بیٹا، بیٹی، لے پالک، ماں یا تمہارا جان سے زیادہ عزیز دوست تنہائی میں تم سے کہے کہ چلو کسی دوسرے خدا کو پوجیں جس کو تم جانتے ہو نہ تمہارے قریب و بعید کے آباؤ اجداد تو اُس کا کہا نہ مانو۔ اور اُس کی بات پر ہرگز راضی نہ ہو اور کبھی اُس پر رحم نہ کرو بلکہ قتل کر ڈالو۔"

اسلام دین پر قایم رہنے کی تاکید کرنے کے باوجود، باپ بیٹے اور ماں بیٹی میں جدائی ڈالنا نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ مسلمان لڑکوں کو اپنے مشرک ماں باپ سے دنیا میں رفق و مدارات اور احسان کا سلوک کرنے کو کہتا ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ اسلام ایک طرف تو ملکوں کو فتح کرنے کے بعد، وہاں کے باشندوں پر نہایت اقل قلیل ٹیکس لگاتا ہے جو اور گورنمنٹوں کے ٹیکس سے بدرجہا کم ہے اور پبلک فیلنگ سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور لوگوں کے خانگی حالات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ہے۔ ان امور میں وہ جائیں اور ان کا کام اور دوسری طرف مسلمان افراد کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ ذوی القربیٰ سے گو وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہوں قطع تعلق نہ کریں۔ ان سے حسن معاملہ سے پیش آئیں پس ایسے مذہب کی طبیعت میں یہ بات ضرور ہوگی کہ وہ لوگوں کے دلی بھیدوں کو خدا پر سونپے، اپنے غیر معتقدین پر ظلم نہ ہونے دے اور پناہ گزینوں کی حمایت کرے گو وہ ٹیڑھے راستے پر کیوں نہ چل رہے ہوں اور جہالت کی تاریکی میں کیوں نہ پھنسے ہوئے ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسا مذہب علم اور علما کے ساتھ فراخدلی برتنے میں کوتاہی کرے گا۔ کیا ایسا دین محققین اور فلاسفہ کے ساتھ درشتی اور سختی کو جایز رکھے گا؟ ہرگز نہیں! کبھی نہیں!

جو شخص بحث و تنقید کرے، داد تحقیق دے، تجربے کی کسوٹی سے کھوٹا کھرا پرکھے، معلومات کی پوٹی سے اچھا برا دکھلائے۔ اسلام کبھی اس سے تعرض نہیں کرنے کا۔ ہرگز اس سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا ہاں اگر وہ اخلاق و ادب کے دامن کو آلودہ معائب کرنا چاہتا ہے اور بجائے اصلاح کے افساد کا قصد رکھتا ہے تو بیشک اسلامی گورنمنٹ کا ہاتھ اس کے لیے دراز کیا جائے گا۔

اسلام کا ساتواں اصول

مذہبی مخالفین سے الفت و محبت

مصاہرت: اسلام نے مسلمانوں کے واسطے کتابیہ کا نکاح خواہ وہ نصرانیہ ہو یا یہودیہ مباح کر دیا ہے۔ کتابیہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور فروض عبادت کو ادا کرنے کے باوجود اپنے مسلمان شوہر سے متمتع ہو سکتی ہے اور کنیسہ کو بے کھٹکے جا سکتی ہے۔ اسلام میں وہ اپنے شوہر کا جزء ہے اور عزت و ذلت اور سفر و حضر میں اُس کی رفیق ہے۔ اُس کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہے۔ وہ اُس کے گھر کی مالک اور اُس کی اولاد کی مختار ہے۔ جس طرح اُس کا شوہر اُن میں حق تصرف رکھتا ہے۔ یہ بھی رکھتی ہے۔ وہ جس طرح اُن کے متعلق جو چاہے کر سکتا ہے یہ بھی کر سکتی ہے۔ دین اسلام نے حقوق زوجیت میں خواہ وہ ایک مسلمہ کے ہوں یا ایک کتابیہ کے کوئی تفریق نہیں کی۔ زوجہ کتابیہ کو اختلاف عقیدہ کی وجہ سے اُن حقوق سے محروم نہیں کیا جو مسلمہ کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں جو آیت لکھی جاتی ہے اُس میں کسی طرح کی تخصیص نہیں ہے۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون ۔

خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم اُن سے تسکین حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت و رحم پیدا کیا ہے یہ نشانیاں ہیں اُس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتی ہے۔

پس مسلمہ کی طرح کتابیہ بھی اپنے شوہر کی مودت و رحمت میں شریک کی گئی ہے اور اُس کی راحت اور اُس کے دل کی ٹھنڈک گردانی گئی ہے۔ مصاہرت سے بیوی کے قرابتدار اور شوہر کے قرابتدار آپس میں نہایت گہرے تعلقات قایم کرینگے اور ایک دوسرے کے ساتھ سچی محبت و الفت کرسکینگے۔ اور یہہ دنیا کی دیکھی ہوئی بات ہے کہ بچے ماں کی طرف کے لوگوں سے بیحد محبت و اُلفت رکھا کرتے ہیں۔ اور بھانجوں اور ماموؤں میں عموماً نہایت خوشگوار اور مستحکم روابط رہا کرتے ہیں۔ پس اسلام نے اِس قسم کی آزادی دیکر اِس بات کا موقع دیا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم میں نہایت مستحکم اور قوی رابطۂ الفت قایم کیا جائے اور یہہ تسامح ایسا ہے کہ اُس کی نظیر موجودہ اور گزشتہ ادیان بالکل خالی ہیں۔ (۱)

نوٹ (۱) ۔ بعض نصاری یہہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام اتفاق و اتحاد اور رفع اختلاف کیلیے مسلم کو کتابیہ سے نکاح کرنے کا مجاز گردانا ہے تو مسلمہ کو کتابی سے نکاح کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ اِس کا جواب یہہ ہے کہ مرد فطرتاً عورتوں سے قوی ہوا کرتا ہے اور اہل کتاب کے مذہب کا یہہ اُصول ہے کہ مخالفین مذہب کے ساتھ بغض و عناد رکھا جائے اور اُن سے کبھی نرمی اور رفق و مدارا کا سلوک نہ کیا جائے چنانچہ اِس کو ہم نے اُصول نصرانیت میں اچھی طرح ثابت کردیا ہے اِس لیے یہہ کسی طرح عدل و انصاف کی رو سے صحیح نہیں ہے کہ ایک قوی شخص کے لیے جس کا دین اُس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان اختلاف مذہب کی وجہ سے جدائی ڈالتا اور تفریق کا بیج بوتا ہے۔ جایز رکھا جائے کہ وہ مسلمان عورت کے ساتھ نکاح کرے اور ناموافقت کے منجھیلے میں پڑے۔

اِسلام نے یہہ اُس شخص کے لیے جایز رکھا ہے جو عدل و انصاف اور رحم و کرم پر عمل پیرا ہے اور وہ مسلمان ہے۔ ۱۲۔

ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس طرح کا تسامح اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دین و ایمان خدا اور بندے کا معاملہ ہے اور اعتقاد ایک دلی کیفیت ہے جس کی باگ خدا کے ہاتھ ہے۔ اس بارے میں مخلوق دست اندازی نہیں کر سکتی اور کسی طرح کا دخل نہیں دے سکتی ہاں اگر اُن میں سے کسی کو کوئی حق ہے تو اتنا ہی کہ عالم جاہل کو سکھائے اور ہادی گمراہ کو رستہ دکھائے اپنے لوگوں کی امداد سے جی نہ چرائے اُن سے بیرحمی اور بے تعلقی نہ کرے۔

فرض کرو ایک مسلمان کی بیوی اہل کتاب میں سے ہے اور عقلیات و نظریات میں ید طولیٰ رکھتی ہے اور اُس کا مذہب اور عقیدہ اپنے شوہر کے برعکس ہے۔ ایسی صورت میں کیا مسلمان اپنی بیوی سے محبت کم کر دے گا۔ اور اُس سے رحمت و شفقت کا برتاؤ چھوڑ دیگا؟ نہیں! کیونکہ یہ اُس کے مذہب کے مخالف ہے۔ پس جب مسلمان اپنی بیوی سے جو بلحاظ اعتقاد اور مذہب و ملت کے اُس سے اختلاف رکھتی ہے۔ محبت اور معاشرت، میل جول کا عادی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اور لوگوں سے بھی جو نظام مخلوقات میں نظر و فکر سے کام لیتے ہیں اور اسرار عالم کی تحقیق چاہتے ہیں اور بظاہر اُس کے اعتقادات سے اختلاف رکھتے ہیں میل جول کرنے سے متنفر ہو جائے اور ان کے ساتھ محبت و معاشرت رکھنا اُس کی طبیعت کو ناگوار گزرے۔

باقی آئندہ

محمد عبد الباسط

رباعی لمعہ

رندوں کو ہے مرغوب سدا دورِ شراب — مستوں کو ہے مطلوب دف و چنگ و رباب
عاشق کو ہے منظورِ نظر جلوۂ یار — ان سب کا ہے کیا لطف رہا جب شباب

ناظورۂ گیتی

اے صرصرِ غم پھر چمنِ دل میں وزاں ہو — اے ناوکِ حسرت مرے سینے میں نہاں ہو
اے اشکِ مسلسل مری آنکھوں سے رواں ہو — ہاں اے دلِ غمگیں ہمہ تن تو بھی زباں ہو
افسانہ مجھے کہنا ہے اندوہ و الم کا
شکوہ مجھے کرنا ہے زمانے کے ستم کا

افسردگیٔ طبع نہ کر ترکِ رفاقت — پژمردگیٔ دل نہ مرے دل سے ہو رخصت
کاہیدگیٔ تن ہے بڑی تیری ضرورت — آسودگیٔ جاں تو بدل سابقہ حالت
اب منتظرِ طولِ امل میں نہ رہوں گا
منت کشِ پیغامِ اجل میں نہ رہوں گا

ہاں اے فلکِ پیر ستم اپنا کیے جا — اے گردشِ ایام انکا لیف دیے جا
اے جوشِ جنوں مجھ کو جہاں چاہے لیے جا — اے غمزدہ دل اور مئے رنج پیے جا
واقف ہی نہیں کوئی مرے قہر و غضب سے
جب دن مرے آئینگے سمجھ لونگا میں سب سے

آنکھیں ہیں مری رو کشِ جنددِ قلزم — طوفاں مچا دے مرے اشکوں کا تلاطم
آہوں کا دھواں چھوڑوں تو ہو جائے فلک گم — تڑپا دے زمانے کو مری طرزِ تکلم
محشر ہی بپا کر کے دکھا دوں جو میں چاہوں
مٹی کا تو پتلا ہوں مگر ایک بلا ہوں

پرکالۂ آتش مجھے کہیے تو بجا ہے — یا برقِ جہانسوز کی تشبیہ روا ہے
یہ چرخِ ستمگار کئی بار پھنکا ہے — کچھ ایسی شرر ریز مری آہ رسا ہے
اُف کرنے پہ آجاؤں تو اک آگ لگا دوں
نالہ جو کروں عرشِ معلیٰ کو ہلا دوں

اے ضبط تجھے آج سے اللہ کو سونپا — اے سبر بگریبانئ بازغ تو چلی جا
اے پنبہ دہانی تری کچھ بھی نہیں پروا — اے فرطِ خموشی تری کچھ بھی نہیں سنتا
گو قیدئ زنداں دہن میری زباں ہے
کہہ ڈالوں گا سب آج جو کچھ دل میں نہاں ہے

دنیا ہی کی یہہ بوقلمونی کا سبب ہے — کم عیش و طرب ہے تو فزوں رنج و تعب ہے
پھر جینے پہ سب مرتے ہیں یہہ اور غضب ہے — اس ہستئ معدوم سے مطلب نہیں کب ہے
اب شکوہ کرینگے نہ غریب الوطنی کا
اب ساتھ نہ دینگے کبھی یہ دنیائے دنی کا

کیا فائدہ ہے کشمکش بیم و رجا سے — کیا نفع جو امید کریں نخبت رسا سے
دنیا کی میسر نہیں عشرت تو بلا سے — لے جائینگے اک تودۂ غم دار فنا سے
ہرگز نہ پھینگے ہوس عیش و طرب میں
معتوبِ خدا ہونگے نہ دنیا کی طلب میں

ہے اس کے پردے میں رخِ یار کا جلوہ — جلباب میں عشرت کے ہے عشرت کا نظارہ
ہر چیز بناوٹ کی ہے ہر بات ہے دھوکا — دنیا کے ہر اک کام کا الٹا ہی نتیجہ
برباد کن خلق ہے تکلیف رساں ہے
یہہ مادرِ گیتی تو نہیں دشمنِ جاں ہے

سب جھوٹ جگر کاوی عشاق گرفتار — بے اصل ہے بیدردی معشوق جفاکار
فرقت ہے دروغ اور غلط وصل کا اقرار — ہے صرف ترحم ستم گنبد دوار
اک دھوکے کی ٹٹی ہے یہہ نیرنگ زمانہ
عاشق ہے نہ معشوق نہ قصہ نہ فسانہ

کیوں ہو دل ناکردہ گنہ بستہ زنجیر — کیوں رنج پراگندگئ زلف گرہ گیر
کیوں سینے پہ رکھی رہے معشوق کی تصویر — کیا چیز ہے آخر کششِ حسن کی تاثیر
یہہ کھیل تماشے بھی ہیں دنیائے دنی کے

سب کشتے ہیں عشاق اسی ناشدنی کے

اظہارِ وفاداری و فریادِ جفا کیا — بے جرم و گنہ کشتۂ شمشیرِ ادا کیا
گیسوئے دوتا، قیدیٔ گیسوئے دوتا کیا — دلبر کا ستم عاشقِ بیخبروں کی عطا کیا

سب کہنے کی باتیں ہیں کوئی بات نہیں ہے
اس شعبدہ بازی کا گماں ہے نہ یقیں ہے

بدلے ہوئے تیور، غلط اندازِ نظر، جھوٹ — الفت کی کشش، جذبِ محبت کا اثر، جھوٹ
زخمِ کہنِ دل، طپشِ سوزِ جگر، جھوٹ — امیدِ ملاقات، جدائی کا خطر، جھوٹ

بیمارِ محبت سے مسیحا نفسی، ہیہج
فریادیٔ فرقت کے لیے دادرسی، ہیہج

دو دن کی حکومت کا تبختر نہیں اچھا — دو روز کی دولت پہ تفاخر نہیں اچھا
اربابِ فلاکت سے تنفر نہیں اچھا — فانی ہے جو ہستی تو تکبر نہیں اچھا

دنیا کے کسی فعل کو اچھا نہ سمجھیے
اس قطرۂ ناچیز کو دریا نہ سمجھیے

اس شاہدِ دنیا کی عجب جلوہ گری ہے — سب اس کے طلبگار ہیں یہ سب سے بری ہے
تسخیر بھی کچھ ایسی رگ و ریشے میں بھری ہے — اچھو لیں جو کھوٹی ہے تو کھوٹوں میں کھری ہے

دریائے اجل قطرہ ہے انداز کا اس کے
اک گوشہ ہے میدانِ قضا ناز کا اس کے

ناطورۂ گیتی کا اڑا تجھ سے ہی خاکا — نقطوں سے بنایا ہے عجب پیکرِ دنیا
دشوار تھا تحریر میں تصویر کا نقشا — آسان نہ تھا تھامنا مٹھی میں ہوا کا

وہ میں ہی مصور تھا کہ یہ کام کیا ہے
الفاظ کے خوٹو میں نیا رنگ بھرا ہے

بانی غ حیدرآبادی

مقدمۂ تاریخ ورنگل

ہمارے نئے عنایت فرما جناب سید ظفر حسن صاحب عبرت (منشی فاضل) نے تلنگانے کی ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے۔ جو ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کا مقدمہ بلحاظ اپنی دلچسپی کے اس قابل تھا کہ صحیفے میں شایع کیا جائے لہذا ناظرین کی نظر افروزی کا باعث کیا جاتا ہے۔ اڈیٹر

ورنگل

ریاست حیدرآباد جو اس وقت ہندوستان کی ایک بڑی سلامی ریاست ہے بلحاظ آبادی چار صوبوں پر منقسم ہے منجملہ ان کے ایک صوبہ ورنگل ہے۔ یہاں ایک قدیم اور شکستہ قلعہ واقع ہے جو زمانہ سابق میں ریاست تلنگانہ کا دار السلطنت تھا۔ یہ قلعہ نہایت مہتم بالشان اور تاریخی مقام ہے۔ قدیم حیدرآباد سے گوشۂ شمال و مشرق میں چھیاسی ۸۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس صوبہ کا مستقر ضلع قصبہ ہنمکنڈہ ہے۔ لیکن قلعہ ورنگل کی قربت کی وجہ سے کل آبادی شہر ورنگل کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

ضلع ورنگل کے حدود اور رقبہ

مشرق میں دریائے گوداوری مغرب میں اضلاع نلگنڈہ و نظام آباد شمال میں ضلع کریم نگر جنوب میں دریائے کرشنا رقبہ (۱۴۷۰) سوا سات ہزار مربع میل ہے۔

نمائش طبعی

اس کی سطح کی بلندی سمندر سے دس ہزار اور گیارہ ہزار فیٹ کے درمیان ہے اور اس واٹر شیڈ پر واقع ہے جو دریائے گوداوری و کرشنا کے مجرہائے زیرین کے طاسوں کو جدا کرتا ہے۔ اس کے اطراف کے مقامات اونچے اونچے میدانوں اور گھنے جنگلوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میدانوں میں بسالٹک قسم کی پہاڑیاں جابجا ہیں۔ اور

مشرق و مغرب کے رخ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک مٹھوارہ کے جنوبی سمت سے گزرتی ہے اور ایک ورنگل کے شمالی اور مغربی گوشے کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سلسلہ وادیٔ گوداوری کی طرف بڑھتا ہوا کوہ وندھیاچل اور کامٹی میں مل گیا ہے۔

قوم تلنگ

تاریخ لکھنے کے پہلے ایک مورخ کی حیثیت سے ہم پر فرض ہے کہ جن لوگوں کے حالات ہم لکھنا چاہتے ہیں اُن کی اصلیت اور ذات پر بھی نظر غایر ڈال لیں کہ یہ لوگ کس معیار پر جو کھے اُترتے ہیں۔ عموماً مورخین کا خیال ہے کہ دکن کے باشندے کچھ سیتھین اور کچھ تاتاری یا مغل ہیں اور بقیہ یہاں کے اصلی باشندے مثل دراوڑ۔ گونڈ۔ بھیل وغیرہ

اصلی باشندے | ہم کو اُن لوگوں سے جنہوں نے اپنا ملک چھوڑ دیا ہے اور مختلف وقتوں میں سلسلہ در سلسلہ منتقل ہو کر یہاں بس گئے ہیں کچھ بحث نہیں اُن کے حالات میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مورخین نے بہت سی موشگافیاں کی ہیں۔ لیکن اصلی باشندوں کی اصلیت پر کسی نے مطلقاً روشنی نہیں ڈالی سخت تعجب ہے کہ انگریزی مورخین باوجود ادعائے تبحر بعض وقت ایسی کنائیاں کاٹتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ کیا ایسی قوم کے بارے میں جو ہند کی خالص آب و ہوا میں پلی ہو یہاں کی صبح و شام کی نیرنگیوں کا لطف اُٹھایا ہو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ آخر یہ تو ظاہر ہونا چاہیے کس کی اولاد ہیں؟ اور کہاں سے آئے؟ کچھ شنبم تو نہ تھے جو آسمان سے ٹپک پڑے یا گھاس نہ تھے کہ زمین سے اُگ آئے۔

طوفان نوح | حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں طوفان کے بعد تمام مخلوق انسانی

صرف حضرت نوح کے تینوں بیٹوں حام سام - یافث سے پیدا ہوئی اور موجودہ چہل پہل آبادی سرسبزی انسانی صورتیں سب انہیں لوگوں کی یادگاریں ہیں یہی تین شخص تھے جن کو حضرت نوح نے مختلف زبانیں سکھا کر دور دراز مقامات پر روانہ کیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دنیا کے آباد کرنے کی کوشش کی جائے - یہہ لوگ حسب الارشاد نوح علیہ السلام عالم کے مختلف گوشوں میں روانہ ہو گئے اور وہاں کے سنسان اور خطرناک ویرانوں میں گردش کرتے رہے ان کی یہہ دوڑ دھوپ اور گردشیں ایک ہزار سال کے بعد کامیابی سے مبدل ہو گئیں اور انسان کی خال خال صورتیں اقصائے عالم میں تمدن اور معیشت میں مصروف نظر آنے لگیں یہی زمانہ تبدیل زبان کا کہا جا سکتا ہے -

ان مسافروں کا قاعدہ تھا کہ چند مکانات یا جھونپڑیاں ایسے مقام پر جہاں پانی اور سبزہ بکثرت ہوتا تھا بنا لیتے تھے اور سالہا سال قیام کرتے تھے - ضروریات زندگی اور سامان راحت کسی وجہ سے ختم ہو جاتے تھے تو وہاں سے بھی کوچ کر جاتے تھے اور دوسرے مقامات پر پھرتے تھے اسی طریقے پر کہیں اپنی اولادیں چھوڑ گئے اور کہیں خود رہ گئے بہرحال عالم کے وحشت کدے کو اسی طرح آباد کیا اب ان کی نسلوں اور خاندانوں کے باہمی ارتباط اور تالف سے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا اور تجارت و زراعت ہونے لگی - جس سے یہہ لوگ خوش حال اور مطمئن نظر آنے لگے -

رنگ روپ | ان کی چال ڈھال صورت شکل وضع و قطع میں فرق تھا کیونکہ وہ گروہ جو سام و یافث کی اولاد تھی گوری گندمی رنگ چست و چالاک اور مہذب تھی لیکن حام کی اولادیں کچھ تو فطرت کے اثر سے اور کچھ ان گرم ممالک کی آب و ہوا سے جن میں یہہ رہتے تھے سیاہ فام،

بدڈول، بدقطع وحشی اور نامہذب تھے۔ یہ گروہ ہندوستان۔ یونان اور افریقہ کے جنگلوں میں روانہ ہوا۔ اور وہیں اُس نے اپنی مستقل بود و باش اختیار کرلی۔

حال کی نہایت مکمل تحقیقات سے جو ڈاکٹر جانسن نے کھوپریوں کے ذریعے سے کی ہے یہ بات محقق ہوچکی ہے کہ ہندوستان کے اصلی باشندے اور آفریقہ و آسٹریا کے رہنے والے لوگ ایک ہی خاندان اور ایک ہی مورثِ اعلیٰ کے اولاد ہیں۔ چنانچہ تلنگ، گونڈ، بھیل وغیرہ قومیں جو یہاں کے قدیمی باشندے اور متوطن کہے جاسکتے ہیں ابنائے حام کی جیتی جاگتی نشانیاں ہیں۔ اِن کا خالص امتیاز سام و یافث کی اولادوں سے ان کو جدا کر رہا ہے۔ جو اِس وقت بھی مبصرین کی نظروں سے چھپا ہوا نہیں ہے اور یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاہ فام بدشکل بدقطع مخلوق اپنے مورثِ اعلیٰ کی حقیقی خصوصیت کی طرف بہت تیز دوڑ رہی ہے۔ باوجودیکہ زمانے میں لاکھوں انقلاب ہوچکے خزاں و بہار نے کروڑہا رنگ بدلے لیکن اِس فطرت کی سادہ مخلوق نے کروٹ تک نہ لی۔ گویا ان پر ایسا پختہ رنگ و روغن چڑھا ہوا تھا جسکو مبدءِ فیاض ہی چاہتا تو بدلتا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ اس میں کسی قسم کی اصلاح کرسکتا۔

قولِ ہنود۔ آغاز کلجگ سے پہلے حضرتِ انسان کا وجود دنیا میں نہ تھا صرف یہاں دیوتا اور نورانی اشکال بود و باش رکھتی تھیں۔ ابتدائے خلقتِ انسانی میں ایک شخص تھا جس کو منو کہتے تھے اُس کے تین لڑکے

۱؎ ہندوستان قدیم و الہنود جلد اول و دوم مصنفہ مرزا کاظم برلاس۔
۲؎ الفٹنس ہسٹری آف انڈیا و فرشتہ و انٹروڈکشن ٹو دی میکنزی پیپرس۔
۳؎ المجوس والتثلیث۔

سورج۔ چاند۔ یُون ہوئے۔ گویا دیوتاؤں اور روحانیوں کی انتہا اور مادی انسان کے آغاز کا زمانہ آیا۔ منو مہاراج نے اپنے تینوں لڑکوں کو اطراف عالم میں چلے جانے کو کہا۔ ان لوگوں نے اپنی طبیعت کے موافق رہنے سہنے کے مقامات منتخب کیے۔ انہیں کے خاندان کے لوگ ہیں جو اب تک خود کو سورج بنسی اور چندر بنسی کہتے ہیں۔ اگر ان ناموں کو حضرت نوح کے تینوں لڑکوں کے ناموں سے بذریعۂ علم اللسان مطابقت کی جائے تو کوئی شبہہ نوح اور منو کے ایک ہونے میں باقی نہیں رہتا۔

مطابقت | زبان عرب میں یافث سورج اور سام چاند کو کہتے ہیں۔ لفظ سام عجب نہیں جو زبان سنسکرت کا سوما ہو جس کے معنے چاند کے ہیں اور جو بہت تھوڑے تغیر سے زبان عرب میں منتقل ہو گیا ہے لفظ یُون کو عام محققین خیال کرتے ہیں کہ یہ لفظ یونانی گروہ کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ خیال ہمارے نزدیک واقعیت سے بہت دور ہے حام کا لڑکا پرشیا اور پرشیا کا لڑکا یُون تھا جو امتداد زمانہ و کثرت استعمال کی وجہ سے یُون ہو گیا۔

حکومت خاندان یُون نے مدتوں یہاں حکمرانی کی ہے۔ ان کی پُرامن سلطنت اُس وقت بہت ترقی پر تھی جب مصر کی تخت سلطنت پر طولیس اور چین کی سرزمین میں یافث خاندان کے لوگ کامیابی سے سلطنت کر رہے تھے۔

آریہ قوم جب آریاؤں نے خطۂ ہندوستان میں قدم رکھا تو ان بیچاروں پر سخت مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اُن کے آئین ذات بندی اور امتیاز قومی نے

---

۱ - المجوس
۲ - الہنود و الفلسفن ہسٹری۔

اُن کو ناکارہ ہی نہیں کر دیا بلکہ اُن کی بنیادِ سلطنت کو مرکزِ ثقل سے اُکھیڑ کر ہمیشہ کے لیے آغوشِ عدم میں ڈال دیا۔ چونکہ وہ لوگ نہایت عقلمند تھے اور ہر کام اُن کا انجام بینی سے خالی نہ ہوتا تھا جب کوئی قوم اُن کی سدِ راہ ہوتی تھی تو وہ اکثر فتحیاب ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی دانشمندیوں اور دلیریوں سے یہاں کے اصلی باشندوں کو اُنہوں نے وجودِ معطل بنا دیا اور بندر اور راکھشس کا خطاب دے کر شہر بدر کر دیا۔ یہ لوگ وڈا اور تلنگ۔ کول وغیرہ تھے۔ اُن کے تمدن اور شائستگی کے آثار اب بھی دکن میں موجود ہیں۔ ان کے بعد اور بھی بہت سی قومیں آتی گئیں۔ بقول مورخ تھیوڈوٹس[2] (غالباً اس کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے پندرہ سو برس پیشتر ہے) مصر کی ملکہ سیمی رامس نے دکن پر حملہ کیا تھا اُس کے ساتھ تیس لاکھ فوج تھی۔ ممالک دکن کو اُس نے مسخر کر لیا تھا اور اپنی فوج انتظامِ مملکت کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ ان فوجوں کی اولادیں بھی یُون کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اُنہیں مختلف قوموں اور مختلف خاندانوں کے میل جول سے نئے نئے خاندانی نام[3] پیدا ہوئے اور ہر خاندان اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام سے شہرت پاتا گیا۔ اسی قیاس میں قومِ تلنگ بھی داخل ہے جو حام کے بیٹے تلنگ کی اولادوں سے کہی جا سکتی ہے۔

"حکومتِ تلنگانہ کی قدامت کا ثبوت"

چکرا ورتی مہاراج بن کشن | دو ہزار دو سو برس قبل عیسیٰ علیہ السلام جبکہ تختِ اجودھیا پر اُن آریاؤں کا راجہ مہاراج بن کشن فرمانروائی کر رہا تھا

---

[1] الجوس و ناسخ التواریخ [2] ہندوستان قدیم [3] ناسخ التواریخ و تاریخ فرشتہ۔

یہہ ملک دکن میں موجود تھا۔ غالباً یہاں کے فرمانروا راجے مہاراجگان اجودھیا کے باجگزار بھی تھے۔ کیونکہ اُن کی سرکشی اور متمردانہ نخوت کے قلع قمع کرنے کے لیے مہاراج کے زمانے میں ایک فوج روانہ کی گئی تھی جو ممالک ملیبار و تلنگ و کرناٹک میں امن و امان قایم کرکے واپس گئی۔

مہا بھارت مہابھارت کی خونریز لڑائی میں جس طرح تمام ملک ہندوستان کے راجہ کسی نہ کسی فریق کی معاونت و امداد میں آئے تھے اُسی طرح راجگان تلنگ بھی گئے تھے۔ یہہ زمانہ حضرت عیسیٰ سے تخمیناً چودہ سو اکیاون برس قبل محسوب کیا جاتا ہے۔

راجگان آندھرا دکنی آندھرا راجاؤں نے (جو کبھی نہایت زبردست ہو گئے تھے) تلنگانے کے علاقے میں سمندر کے کنارے جگناتھ جی اور دوسرے دیوتاؤں کے مندر تعمیر کیے۔ یہہ مندر بہت ہی قدیم اور متبرک مانے جاتے ہیں۔ بالخصوص جگناتھ کا مندر جس کی رتھ جاترا نہایت دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ بہت ہی قدیم مانا جاتا ہے۔ غالباً اس مندر کی بنیاد آٹھ سو برس قبل عیسیٰ علیہ السلام پڑی ہوگی کیونکہ مہابھارت کی لڑائی کے بعد بہار کے راجہ مہاپدما نند نے کشن جی سے سخت جنگ ہوئی تھی جس میں کشن جی ہزیمت کھا کر گجرات میں بھاگ گئے تھے اور وہاں ایک شہر دوارکا کے نام سے آباد کیا تھا جو اب بھی موجود ہے۔ جگناتھ جی کی پیدائش کشن کے بعد کی ہے اُن کے رحلت کے بعد مندر کی بنیاد پڑی۔

تحقیق لفظ آندھرا تمام مورخین کا خیال ہے کہ آندھرا ایک خاندان کا نام ہے جو مگدھ دیش (جسکو اب پٹنہ عظیم آباد کہتے ہیں) میں فرمانروائی کرتا تھا یہہ خاندان

ناسخ التواریخ۔ ۲ کالندکا یہہ کاشی و ترک ہند و الہند ۳ سیر المتاخرین ۴ فرشتہ ۵ الشامیت۔

بہت طاقتور اور جنگجو تھا تمام ہند کی زمام سلطنت اُس کے ہاتھ میں تھی۔
بعض محققین کا خیال ہے کہ آندھرا ایک سلطنت تھی جس کا
دارالسلطنت شمالی ہند میں کسی غیر معلوم مقام پر تھا لیکن حال کی
تحقیقات سے جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ہوئی ہے نہایت واضح
طور سے منکشف ہو جاتا ہے کہ درحقیقت آندھرا ایک ملک کا نام ہے
جو جنوبی ہند میں تھا اور جسکا مرکز پر تھا جس کو اب تلنگانہ کہتے ہیں
جو لوگ تلنگی زبان سے واقف ہیں اُن کو ہمارے کلام کی تصدیق
میں بالکل عذر نہ ہوگا کیونکہ تلنگانے کو اب بھی آندھرا ہی کہتے ہیں۔

آندھرا پتی یون | اس ملک کا پہلا بادشاہ آندھرا پتی یون تھا جس نے
یہاں سلطنت کی بنیاد ڈالی اور ملک اُسی کے نام سے موسوم ہوگیا لیکن
اس کے اور اس کے بعد کے راجاؤں کا جو چوتھی صدی عیسوی تک گزرے ہیں
ہم کوئی حال نہیں بیان کر سکتے۔

جگناتھ کا مندر | تلنگانے کے فرمانرواؤں نے کبھی کبھی وسعت سے فتوحات حاصل
کی ہیں۔ راجگان تلنگانہ سے اکثر یہ لوگ برسرکار زار رہتے تھے ان کا ملک بھی
کئی دفعہ ان لوگوں نے چھین لیا ہے اور بڑی شان سے حکومتیں قایم کی ہیں چنانچہ
کہتے ہیں کہ دیول کے بانی "آندھرا دمنا" ہے اس خاندانی نام سے معلوم ہوتا ہے
کہ ضرور کوئی تلنگانے ہی کا راجہ تھا جس نے دیول کو بنایا مگر بعض مورخین کا خیال
ہے کہ یہ اجین کا بڑا اولوالعزم راجہ تھا بہرحال ہم تاریخی حیثیت سے اس پر کچھ روشنی نہیں ڈال
سکتے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ہند کی تاریخی دنیا میں بالکل تاریکی ہی تاریکی تھی۔ روشنی کی
کہیں جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی تھی گو تمدن و تہذیب شائستگی کے نشانات ویسے ہی تھے
جیسے اب ہیں لیکن اس زمانے میں روحانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہستی فانی کے نام و نمود کے
خیالات عیب سے خالی نہ سمجھے جاتے تھے وہ لوگ اپنی نفیس اور بے عیب صنعتوں کو بطور یادگار

۱؎ گورنمنٹ انڈیا گزیٹیر۔ ۲؎ رپورٹ مردم شماری سرکار نظام تاریخ مکا مصنفہ کاظم برلاس ۳؎ سیاحت پرکاش۔

ہمارے لیے چھوڑ گئے لیکن اپنے حالات کے آگاہی کے ذرایع سے چشم پوشی کی۔

غلط رائی۔ مسٹر انفسٹن و مسٹر ایلیٹ تحریر کرتے ہیں کہ "حضرت عیسیٰ سے پانچسو برس قبل عمارت خان و خان نے ممالک تلنگانہ پر بڑے زور شور سے حملے کیے تھے۔ نتیجے سے تو ہمکو آگاہی نہیں مگر قیاس سے اور بعض آثار سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو کامیابی ہوئی اور یہہ لوگ یونانی تھے"، مگر ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے اپنی رائے میں غلطی کی کاش کہ اور زیادہ اس امر میں غور کرتے۔ درحقیقت یہہ لوگ یونانی نہیں ہیں ان کے نام کی طرز و وضع ہم کو تاتاری یا مغل قیاس کرنے پر مجبور کرتی ہے کیونکہ یونانیوں کے نام ان ناموں سے ذرہ برابر بھی مشابہت نہیں رکھتے۔

ان تمام شہادتوں سے تلنگانے کا ایک قدیم ملک ہونا ثابت ہوگیا اب ہم اپنے ناظرین کے لیے اصل تاریخ لکھنے سے پہلے قدیم زمانے کے حدود ملک بھی لکھے دیتے ہیں کہ آیندہ تاریخ دیکھنے میں سہولت ہو۔

قدیم تلنگانے کے حدود مشرقی حد اُس مفروضہ خط سے بنی ہے جو بیدر سے شروع ہو کر ادھونی اور آنندا پور اور نلدرگ میں گزر کر گھاٹ کے اُس مقام تک جو پولی کٹ اور بنگلور کے درمیان میں ہے پہنچی ہے۔ اس کی مغربی حد اور کرناٹک کی مشرقی حد باہم مشترک ہیں۔ لیکن اس کی یہہ مغربی حد مقام چاندا تک جو دریائے وردھا پر واقع ہے اور وسیع کرنا چاہیے۔ یہاں سے شمالی حد مشرق کی جانب سوہن پور تک ہے جو مہاندی پر واقع ہے۔ اور مشرقی حد سوہن پور سے سیکاکول تک اور اور یہاں سے سمندر کے قریب قریب پولی کٹ تک سمجھنا چاہیے جہاں یہہ حد اُس ملک سے ملتی ہے جس میں تامل زبان بولی جاتی ہے[1]

سید ظفر حسن عبرت (از منیکنڈہ)

[1] سلسلۂ آصفیہ جلد اول۔

اُس کی دیوانگی کا حال معلوم ہوا، تو فرانس کا ہر ہر شفاخانہ چھان مارا۔ اُس کے انگلستان جانے کی خبر ملی تو میں انگلستان بھی جا کے ڈھونڈھ آیا۔ مگر افسوس! کوئی دلخوش کُن نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھ تو ایسی ایسی مصیبتیں ٹوٹیں اور یہ شیطان آرام سے زندگی بسر کرے۔ افسوس۔ میں اُس کو ایک منٹ میں برباد کر سکتا ہوں، مگر اُس پاک دل خاتون (نواب بیگم) اور اُس کے شریف بچوں کی دعا ہمیشہ مجھ سے رحم کی درخواست کرتی ہے، اور جوشِ انتقام کو بٹھا دیتی ہے۔

خدا نے مجھ کو کریم النفس پیدا کیا ہے۔ بدلہ لینے کی خواہش میری فطرت میں نہیں ہے۔ مگر کیا محسنوں کی یہی جزا ہے! اور اُس شخص کا جو اپنے جانی دشمن کے بڑے بڑے جرایم پر پردہ ڈال دے، اُس کے شرمناک افعال کے مصائب کو صبر سے جھیل لے، اور نیکیوں سے اُن کا مقابلہ کرے یہی صلہ ہے! اگر بچے کے ساتھ ماں بھی مل جاتی تو اِس شیطنت سے درگزر کرنا آسان تھا مگر افسوس اِس کی کوئی صورت نہیں نظر آتی پھر بھی میں صبر کرتا ہوں اور اِسکا انصاف خدا پر چھوڑتا ہوں۔ خدائے تعالیٰ عادل ہے اور بدلہ لینا صرف اُسی کے لیے زیبا ہے۔"

ساہو: "جب اُس کا ضمیر اُس کو ملامت کرے گا تو ممکن ہے کہ اُس کو اپنی بدسلوکیوں پر پشیمانی ہو اور وہ حقیقتِ حال کو ہم پر ظاہر کر دے۔"

گیرڈی: "جب وہ کچھ جانتا ہی نہیں تو بتائے گا کیا؟"

ساہو: "اپنے پاجی دوستوں سے دریافت کرے گا۔"

گیرڈی: "وہ ہیں کہاں اور وہ اُنہیں پائے گا کیونکر! میں نے اِن خانہ برانداز دوں کی بھی بہت جستجو کی۔ مگر کہیں اُن کا پتہ نہیں۔ پولیس اُن کی ٹوہ میں لگی ہوئی ہے اور ہر ہر جگہ اُن کے حالات کا تجسس کرتی ہے۔ وہ اب تک اُنہیں یا تو گرفتار کر چکی ہو گی۔ یا کیفرِ کردار کو پہنچا چکی ہو گی یا خود وہ بدبخت کہیں بھاگ گئے ہوں گے۔ میں نے اپنے باوفا نوکر اینڈری کو فرڈرک کے نام سے

نواب کے پاس نوکر رہنے کو بھیج دیا ہے۔ وہ مجھے نواب کے روزانہ واقعات سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ شیطان جس نے اس شرمناک کوشش میں نواب کا ہاتھ بٹایا تھا، موجود رہتا اور نواب کے ہاں آیا جایا کرتا تو اینڈری کو ضرور خبر ہو جاتی اور وہ مجھے فوراً اطلاع دیتا۔

مجھے فقط اتنا معلوم ہوا ہے کہ ایک برازیلی شخص جس کا نام "پیٹر گسٹری" ہے نواب کا بڑا گاڑھا دوست ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اُس کی خباثتوں میں شریک ہو۔"

ساہو: "نہیں جناب! میں باوجودیکہ اُس سے بہت کم آشنا ہوں۔ مگر بخوبی جانتا ہوں کہ وہ اِس قسم کے کاموں میں کبھی جانے والا نہیں ہے۔ اُس کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ موجود ہے۔ اور وہ اپنی ذات سے بالکل مستقل ہے کجی اور بے ایمانی کے راستوں پر کبھی چلنے والا نہیں۔ وہ بظاہر چھچھورا سا نظر آتا ہے لیکن باطن میں بڑا ہی متین ہے۔ اُس کا دل فساد انگیز نہیں ہے۔ نہ اُسکی طبیعت میں شرارت ہے اس میں گو چند برائیاں ہیں۔ مگر بہت سی خوبیاں بھی ہیں جو برائیوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔"

گیرڈی: "مجھے بھی اِسی قسم کی خبریں پہنچی ہیں مگر میرا ذہن لوگوں کی برائیوں کی طرف جلد منتقل ہوتا ہے۔ اِس بدگمانی کا سبب اور تو کچھ نہیں۔ صرف اُن دونوں کے گہرے تعلقات ہیں۔

خیر جو کچھ بھی ہو، میں تو آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ کہ آپ نے میری مقصد برآری اور میرے فائدے کے لیے، زحمت گوارا کی اور تکلیف اُٹھائی۔ میں ابھی تین دن اور یہاں گزارتا ہوں۔ بعد ازاں انبیال کو جاؤں گا۔ وہیں مجھ کو راحت ملتی ہے۔ اور وہیں میرا لطفِ زندگی ہے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد، شاید میں پیرس میں آپ کے دیدار سے مسرت اندوز ہو سکوں۔"

ساہو: "اِس اثنا میں اگر نواب سے ملاقات ہو جائے تو۔"

گیرڈی " آپ اُس کی طرف التفات نہ فرمایئے۔ کیونکہ اب اُس سے ملنا لاحاصل ہے
میں ہمیشہ آپ کی نیکیوں کو یاد کرتا رہوں گا۔ اور آپ کا شکر گزار رہونگا"
دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے اور صحبت برخاست ہوگئی
شام کو حسب معمول اینڈری کی بھیجی ہوئی رپورٹ جس میں نواب کے دن
تمام کے واقعات لکھے رہتے تھے گیرڈی کے پاس آئی۔ اُس کا مضمون یہ تھا۔
" آج نواب دن بھر گھر ہی میں رہا۔ شام کو بھی سیر کے لیے نہ نکلا۔ پیٹر گسٹری
اس کی ملاقات کو آیا تھا۔ دونوں کے تعلقات پیشتر کی طرح عمدہ اور مستحکم ہیں
پیٹر نے نواب کو اُس کے قرضوں سے سبکدوش کر دیا ہے اور نواب اُس کی
دوستی سے فایدہ اُٹھا رہا ہے۔ ساہو کی ملاقات سے اُس کو بڑا رنج و غم
اور تاثر پیدا ہوگیا ہے۔ ساہو کو رخصت کرنے کے بعد، وہ تنہا بہت دیر تک
کمرے میں مضطرب، دیوانہ وار ٹہلتا اور کچھ کچھ بڑبڑاتا رہا۔ کبھی چیختا
چلاتا، کبھی روتا بلبلاتا، اور کبھی تڑپتا تھا اور بار بار "بیس ملین ڈنک"
کو دہراتا تھا۔ وہ گھڑی گھڑی سینہ کوٹتا اور بے انتہا حزن و ملال ظاہر کرتا
تھا۔ اُس کو مطلق نہیں معلوم کہ مارشنس کہاں ہے اور اُس پر کیا گزری؟
نواب جو جو باتیں کہہ رہا تھا۔ اُن کے منجملہ میں نے ان الفاظ کو انتخاب
کر لیا " خدا جانے وہ بدبخت کہاں ہوگی! میں اُس کو کہاں تلاش
کروں! بیالیل اُس کو کسی ایسے مقام پر چھوڑ آیا تھا جس کو میں نے
دیکھا نہیں تھا۔ نہ یہ پوچھا تھا کہ وہ مقام کہاں واقع ہے۔ افسوس
بڑی بیوقوفی ہوئی۔ یقین ہے کہ ان سالہا سال کے عرصہ میں وہ مرگئی
ہوگی۔ بیالیل بھی مرگیا۔ کاش وہی زندہ رہتا" ان الفاظ سے آپ کو
بہت سے مطالب واضح ہو جا سکینگے۔ فقط

آپ کا وفادار خادم
اینڈری "

گیرڈی: "یہ وہ باتیں ہیں جن پر مجھے پورا اعتماد کرنا چاہیے۔ مارشی نس کے حال سے نواب کی لاعلمی حدِ یقین کو پہنچ گئی۔ اور یہ ناکامی کا دوسرا دروازہ ہے۔ الٰہی یہ راز کب تک سربستہ رہے گا اور میں کب تک وقفِ آلام و افکار رہوں گا۔"

خدایا تجھی سے مدد چاہتا ہوں — گرفتارِ کلفت و رنج و بلا ہوں
ہجومِ مصائب سے جینا ہے مشکل — پریشانیٔ دل سے گھبرا رہا ہوں
نئی آفتیں روز ہوتی ہیں نازل — نئے حزن و اندوہ میں مبتلا ہوں
مری مشکلیں کر دے آساں الٰہی! — یہی رات دن میں دعا مانگتا ہوں"

کرنیل گیرڈی نے جیکب ولیم اور اُس کے متبنیٰ لڑکے جوب کو خطوط لکھ کر اپنے پاس طلب کیا تھا۔ دونوں کے آنے کا دن آج ہی کا تھا۔ چونکہ دونوں الگ الگ شہروں میں تھے۔ اس لیے ہمرکاب ہو کے نہ آسکے۔ علیحدہ علیحدہ اس طور پر آئے کہ ایک کے آنے کی دوسرے کو خبر نہ ہوئی پہلے پہل جیکب ولیم، کرنیل کے مکان میں داخل ہوا۔ کرنیل گیرڈی بڑی خندہ جبینی اور خوشدلی کے ساتھ اُس سے ملا۔ اور ایک خاص کمرے میں لے جا کے کہا "یہ کمرہ آپ ہی کے لیے آراستہ کیا گیا ہے یہیں آپ کو ٹھہرنا ہوگا اور یہیں آپ کو لباس سفر بدلنا ہوگا۔"

تھوڑی دیر کے بعد جوب بھی آپہنچا اور خوش اخلاق گیرڈی سے مل کے بیحد مسرور ہوا اور کہنے لگا:-

"میرے مشفق! میرے محسن! میں آپ کے حسب الحکم آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں اور آپ کے فرمان کی تعمیل کے لیے جان و دل سے تیار ہوں۔ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟"

اے جان اگر جاں طلبی جاں بنہ بخشم — از جاں چہ عزیز است بگو آں بہ بخشم"

کرنیل گیرڈی، جو سب سے بڑی کشادہ پیشانی اور ملاطفت سے پیش آیا کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بعد ازاں جیکب ولیم سے اُس کو ملایا، دونوں کو اِس اچانک ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ باہم گلے ملے اور خاموش بیٹھ گئے، جس مطلب سے یہہ دونوں طلب کیے گئے تھے، اُس کو معلوم کرنے کے لیے بہت بے صبر اور مضطرب ہو رہے تھے۔ مگر گیرڈی اُس کی نسبت کچھ نہیں کہتا تھا۔

ناشتے کے لیے دسترخوان چُنا گیا جیکب سمجھ رہا تھا کہ شاید وہاں اِس راز سے پردہ اُٹھایا جائے گا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ کھانے کے بعد، میوے آئے پھر چائے پیش کی گئی۔ اِس اثنا میں دونوں نے سرگوشیاں بھی کیں جس کو گیرڈی نے دیکھ بھی لیا مگر تجاہل کر گیا۔ چونکہ دونوں کی بے صبری حد سے بڑھ گئی تھی اِس لیے گیرڈی نے کہا "چونکہ آپ دونوں صاحب آج ہی سفر کر کے آئے ہیں۔ اِس لیے کل تک آپ کو غریب خانے پر قیام فرمانا ہوگا۔ اور مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ میں کل ہی کہوں گا۔ لہٰذا اب یہہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ بقیہ وقت کس شغل میں بسر کیا جائے؟"

جیکب اور جوب "(متفق اللفظ ہو کے) جو آپ کی مرضی میں آئے ہمیں اُس سے انکار نہ ہوگا"

گیرڈی "میری رائے میں اگر ہم سب عجائب خانہ چل کے نئی چیزوں کی سیر کریں تو بہتر ہوگا"

جیکب اور جوب "بسر و چشم"

تینوں آدمی ایک ہی بگی میں سوار ہو کے عجائب خانے کو روانہ ہوئے جانوروں اور کتوں کو دیکھتے دیکھتے اُن کی نظر ایک کتے پر جا پڑی۔ اُس کو دیکھ کے جیکب حیرت سے کہنے لگا "یہہ کتا تو مجھے اپنے غریب کتے ہیمر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ اِس کا منہ، ڈیل ڈول، اور بال وغیرہ بالکل اُسی کے سے ہیں"

گیرڈی :۔ "تو آپ مجھے اجازت دیجئے کہ اس کو خرید کے بطور یادگار کے آپ کی نذر کروں۔"

جیکب نے کچھ جواب نہ دیا۔ گیرڈی نے اس کو رضامند پا کے عجائب خانے کے مہتمم کو بلایا اور پچاس فرنک دے کے وہ کتا خرید لیا۔

عجائب خانے سے نکل کے شام تک تینوں آدمی پیرس کے مختلف حصوں کی سیر میں پھرتے رہے۔

نواں باب

ہنا کا ظہور

دوسرا دن نکلا۔ اور تینوں آدمی کھانے سے فارغ ہو کے باتیں کرنے کے لیے بیٹھے۔ گیرڈی نے یوں کلام کا آغاز کیا "آپ صاحبوں کو اس پر ضرور تعجب ہوگا کہ میں نے بے وقت آپ کو یہاں تک بلانے کی تکلیف دی۔ خاصکر میرے مشفق جیکب ولیم کو جو بوڑھے اور ناتواں ہو گئے ہیں۔ اس سفر میں بڑی زحمت برداشت کرنی پڑی ہوگی۔ مگر میں آپ کی ہمت اور خلوص محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری دعوت قبول فرما کے اپنی تکلیف کا کچھ خیال نہ کیا۔

میں نے جس غرض سے آپ کو طلب کیا اس کا اظہار ایک رازِ سربستہ کا انکشاف ہے جس سے حیرت و استعجاب کے ساتھ آپ کو بڑی بہجت و مسرت بھی ہوگی۔ پس آپ صاحبوں نے جس طرح پہلے آلام و مصائب کے نرغے میں پامردی اور ثابت قدمی سے کام لیا ہے۔ اسی طرح اب وفورِ سرور و شادمانی میں ضبط و تحمل سے کام لیجئے اور آپے سے نہ گزر جائیے۔"

اس تقریر سے دونوں حیران ہوئے اور تعجب سے گیرڈی کی صورت دیکھنے لگے۔

گیرڈی "مسٹر جیکب! آپ قوی دل ہو جائیے اور اور مسٹر جوب آپ بھی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھے رہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ فرطِ انبساط سے آپ دونوں شادی مرگ ہو جائیں اور دائرۂ اعتدال سے باہر نکل پڑیں۔

دوستو! پیارے دوستو! سنو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ..... وہ نوجوان خاتون ..... وہ گم گشتہ نازنین ..... وہ عدیم النظیر ..... وہ عدیم المثال ..... وہ جس سے زمانے نے خیانت کی ..... وہ جس سے فلک نے بے وفائی برتی ..... وہ جیکب کی بیٹی اور اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ..... وہ جو جوب کی محبوبہ اور اُس کی پیاری منگیتر تھی ..... یعنے ہنا .....

جوب خود رفتہ ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اور روتے روتے اُس کو ہچکی بندھ گئی جیکب نے آہِ سرد کھینچ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور دونوں ایک ساتھ بول اُٹھے "وہ کیا ہوئی!"

گیرڈی "وہ ابھی کہتا ہوں کہ کیا ہوئی! صبر کرو تھوڑا سا صبر دشمنِ زندہ نہ ہو جاؤ اور آنے والا مژدہ سن کر جامے سے باہر نہ نکل پڑو ..... وہ خدا کے حکم سے ..... زندہ ہے"

جیکب اور جوب "زندہ ہے! وہ خدا کے حکم سے زندہ ہے ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں آتا"

دونوں روتے روتے نڈھال ہو گئے اور آہ و گریہ کی صدا بلند ہو گئی جوب نے بدحواسی میں گیرڈی کے چہرے پر نظر ڈال کر کہا "آپ انجو بہ روزگار ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں خدائی طاقت سما گئی ہے"

گیرٹی :- خاموش! جوب خاموش! ایسی باتیں نہ کرو۔ ہم سب ہیچ خاک ارض و سما کے ناچیز بندے ہیں۔ طاقت، رحمت، عزت، قدرت اور جلال صرف اُسی قادرِ مطلق کو حاصل ہے۔ میں نے صرف اُس فرض انسانی کو انجام دیا جو ہر رحمدل انسان کا خاصہ ہے اور جس کو ہر انسان بخوشی و بآسانی ادا کرتا ہے۔"

جیکب :- (جوش گریہ کو ضبط کرکے) کیا واقعی ہما زندہ ہے؟ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط؟ آپ ہمیں دھوکا تو نہیں دے رہے ہیں ـــــ نہیں آپ دھوکا نہ دینگے۔ آپ ایسے بے رحم بھی نہیں کہ ایک بوڑھے کے بڑھاپے کی ہنسی اڑائیں اور ایک دل رفتہ متاسف کی تضحیک کریں ہمیں یقین آگیا کہ وہ زندہ ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہوئے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ بہت جلد ہمیں دکھا دی جائے گی۔ آپ اُسے بُلائیے۔ جلد بُلائیے تاکہ میرے پاس اُس کے آتے ہی میری گئی ہوئی زندگی بھی واپس آجائے اور میرے سینے سے اُس کے لپٹتے ہی میری جوانی بھی عود کر آئے۔ میرا تحمل عاجز آگیا ہے۔ میرا خانہ صبر خالی ہوگیا ہے۔ میں صرف سُننے ہی پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ بچشم خود دیکھ بھی لونگا۔ میں اُس کو گلے سے لگاؤنگا۔ پیار کرونگا اور یہ سمجھوں گا کہ ؎

ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب"

تھوڑے عرصے میں دونوں کو کسی قدر سکون ہوا۔ اور جوب نے بھی وہی کہا جو جیکب نے کہا تھا۔ گیرٹی کہنے لگا "ہنا بال بال بچ گئی۔ اور وہ بھی دو مرتبہ۔ ایک دفعہ اُس ننگ و عار کے داغ سے، جو اُس کے دامانِ عصمت پر لگنے والا تھا۔ دوسری بار اُس موت کے چنگال سے جس کے ناخن اُس کی روح میں گڑنے والے تھے۔ جس بدنصیب نے اُس کو ان دونوں بلاؤں سے مخلصی دلائی اُس کو اُس کی جانفشانیوں کا

ثمرہ یہ ملا کہ "بربادکنندۂ عصمت" سمجھا گیا۔ اور اس کی پاداش میں جیلخانہ بھیجا گیا۔ حالانکہ "اس" کو تم سے سچی اُلفت ہے۔ اور وہ اخلاص بھری محبت رکھتا ہے" جیکب نے کہا "وہ شخص جنگلی انسان تو نہیں!"

گیرڈی بتا دیا۔ اُس نے گفتگو سیکھ لی اور ہمیں حقیقتِ حال سے آگہی بخشی"

اس کے بعد گیرڈی نے وہ تمام رام کہانی جو ہنا پر بیتی تھی۔ کہہ سنائی۔ ریاول کے ساتھ جو ماجرا پیش آیا تھا۔ وہ بھی بیان کر دیا۔ لیکن ریاول کا نام نہ بتایا ہنا کا بہریں ڈوبنا، جنگلی انسان کا بچانے کی کوشش کرنا، گیرڈی کا اُدھر سے گزرنا، اینڈری کا جنگلی انسان کی مدد کرنا، گیرڈی کا ہنا کو اپنے ساتھ لے جانا، ہنا کا پاگل ہو جانا، گیرڈی کا اُس کو علیحدہ مکان میں رکھ کے معالجہ کرانا، اور ایک ماہر ڈاکٹر کو اُس کے علاج کے لیے نوکر رکھنا۔ اور تا وقتیکہ ہنا کو پوری طرح صحت نہ ہو، جیکب اور جوب کو اُس کی حالت سے آگاہ نہ کرنا، یہ سب واقعات من وعن دونوں کے گوش گزار کر دیئے۔

عجائب خانے سے کتے کا خریدا جانا، ڈاکٹر کی کوششوں میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کرنے والا تھا۔ جیکب اور جوب کی اضطراب آمیز دلی تمنا تھی کہ ہنا اُن کو دکھائی جائے۔ لیکن تا وقتیکہ ڈاکٹر اجازت نہ دے۔ گیرڈی اُن کے احکام کی تعمیل نہ کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً اس کارروائی کو کل پر اُٹھا رکھا گیا۔

جنگلی انسان کو جیلخانے سے رہا ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔ اُس کو بات چیت پر بھی قدرت حاصل ہو چکی ہے، اور وہ عنقریب اُس رتبے اور عزت کو پہنچنے والا ہے۔ جس کو زمانے خیانت اور بے وفائی سے چھین لیا تھا۔

گیرڈی کے اثنائے کلام میں جیکب اور جوب، تعجب، خوف، محبت، اضطراب اور سکون کے مختلف اشارے ظاہر کرتے تھے۔ ختم کلام کے بعد، دونوں نے جان و دل سے گیرڈی کے احسانات عظیمہ کا شکریہ ادا کیا اور اُس کی ہمت و مروت کی دل کھول کر داد دی۔

دسواں باب

کرنیل گیرڈی کی کوششوں کا تتمہ

حسب قرار دادِ سابق، دوسرے دن علی الصباح جیکب اور جوب سے ڈاکٹر نے ملاقات کی، اور وہ تمام تدبیریں انہیں سمجھا دیں۔ جن کا عمل میں لانا، اُس کی رائے میں ضروری تھا۔ دوسرے روز دونوں اپنے اپنے مستقر کو سدھارے، کرنیل گیرڈی نے بھی انبیال کا رُخ کیا۔ تاکہ وہاں جا کے جنگلی انسان کی خبر لے۔ وہاں پہنچ کے اُس نے جنگلی انسان کے اُستادوں سے ملاقات کی، جو اُس کو فنونِ سپہ گری، آدابِ امارت، اور اخلاق و زباندانی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جب اِن اشخاص سے اُس نے جنگلی انسان کی ذکاوت جودت، اور حسنِ کارگزاری کا حال معلوم کیا تو اُس کی دلی مسرتوں کی کوئی انتہا نہ باقی رہی۔

یہاں سے ہو کے وہ نواب بیگم سے ملنے کو گیا۔ نواب بیگم بڑی پریشانی اور فکر و ملال میں پھنسی ہوئی تھی اور زندگی اُس کو تلخ ہو گئی تھی۔ کرنیل نے اُس سے ملاقات کے بعد یوں گفتگو شروع کی۔

"کہیئے بیگم صاحب! مزاج تو اچھا ہے۔ آپ کے بشرے سے آثارِ تردد ظاہر ہوتے ہیں۔"

نواب بیگم۔ جناب من! کیا کہوں کہ کیا حال ہے! ہر دم آفتوں ہی آفتوں کا سامنا ہے۔ سُنا ہے کہ آج کل نواب صاحب سنگین محل میں آ کے رونق افروز ہوئے ہیں۔ اور مالک علی الاطلاق بن کے سالہا سال کے اندوختے پر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اب انہیں صرف میرے آنے کا انتظار ہے۔ میرے تو اِس خبر کے سنتے ہی جیسے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا

کہ کیا کروں۔ انجام کو سوچتی ہوں تو دم خفا ہونے لگتا ہے۔"

گیرڈی: "میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آپ کا اندوختہ سمیٹنے کی نیت سے آئے ہیں۔ آج کل اُن کے پاس نان شبینہ بھی نہ ہوگی۔ ساری ملک املاک رہن پڑی ہوئی ہے اور رات دن قرضخواہ چمٹے رہتے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ ایکی مرتبہ وہ ایسی پٹکی کھائیں کہ پھر اُنھیں اُٹھنا نصیب نہ ہو۔ پرانے قرضوں کے علاوہ پانچ لاکھ فرنک کا نیا قرض اُنہوں نے ایک ایسے شخص سے لیا ہے۔ جو مہذب و بامروت ہے اور تقاضہ کرنا نہیں جانتا۔ اُس سے اکثر اُن کی صحبتیں بھی رہا کرتی ہیں۔ مگر اس طور پر کب تک گزر ہو سکتی ہے۔ آخر ایک دن ذلت و رسوائی نصیب ہوگی۔ وہ یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ آپ میں تو اُن سے ہماہمی کرنے کی تاب نہیں۔ جو چاہینگے کر گزرینگے۔ مگر آپ اطمینان رکھیے اور اُن کی دھمکیوں اور شرارتوں سے مطلق خوف نہ کھائیے۔ میں آپ کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ وہ آپ کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ آپ مع صاحبزادی کے کسی دلچسپی سے محل کو تشریف لے جائیے۔ وہاں آپ دیکھینگی کہ نواب کے ساتھ ایک نوکر ہوگا۔ وہ دراصل میرا وفاشعار خادم اینڈری ہے۔ اُس کو میں نے اس غرض سے نواب کے پاس بھیج دیا ہے کہ مجھے اُس کے حالات سے وقت بوقت آگاہ کرتا رہے۔ آپ اُس کو اپنا معین و راز دار تصور کیجیے۔ اور اُس سے کوئی بات چھپا نہ رکھیے۔ ساتھ ہی اپنے مال و دولت سے پوری طرح باخبر و ہوشیار رہیے کہ مبادا آپ کو غفلت میں پا کر نواب کچھ لے اُڑے اور آپ ہاتھ ملتی رہ جائیں۔ اور آپ کے بچے ورثے سے محروم ہو جائیں۔"

نواب بیگم: "میں مقدور بھر اُس کے بچانے کی کوشش کروں گی۔ آیندہ اللہ مالک ہے۔ بچوں کے ورثے کی نسبت آپ کا جو ارشاد ہے اُس سے مجھے اختلاف ہے۔ میرے بیس ملین فرنک صرف اِس لیے ہیں کہ انسان دینی ہمدردیوں میں صرف ہونے کے بعد جنگلی انسان کو اُن مصائب

وآفات کے بدلے دے دیے جائیں۔ جو میرے شیطاں سیرت شوہر کی بدولت اُس کو جھیلنی پڑیں۔"

گیرڈی: "آپ کا فرمانا بجا ہے۔ اور یہ آپ کی شریف النفسی اور پاک خیالی کا نتیجہ ہے۔ مگر آپ جنگلی انسان کے لیے کچھ تردد نہ کیجیے۔ اُس کا ادب و اخلاق مانع ہے کہ وہ آپ سے کسی قسم کا مطالبہ کرے۔ یا قدیم ظلم و زیادتی کی یاد دلائے۔ آپ نہیں جانتیں۔ وہ عنقریب ایک ثروت جزیرہ کا مالک بننے والا ہے۔ جو صرف اُسی کے لیے جمع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جب اُس کو آپ کی فرزندی میں آنے کا شرف حاصل ہوگا۔ تو وہ یوں بھی نصف میراث پالے گا۔ باقی نصف ریاول کے لیے ہوگی۔ ان تمام اُمور سے قطع نظر کرکے جنگلی انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ملکہ جیسی پریوش نازنین اُس کی بیوی بن جائے گی جس کے تخیل زندگی کی آپ کے چشمۂ اخلاق سے آبیاری ہوئی ہے اور جو اپنے اوصافِ کاملہ کے لحاظ سے حورِ دنیا کہی جاسکتی ہے۔"

نواب بیگم: "کیا وہ خیانت جو محتاج بیاں نہیں۔ ان کے تعلق کی مانع نہیں۔"

گیرڈی: "بالکل نہیں۔ محبت تمام خرابیوں کو دور کر دیتی ہے۔ نہال عشق ان دونوں کے دل میں جگہ پکڑ چکا ہے۔ جنگلی انسان کا ملکہ کو پالینا گزشتہ مظالم عظیمہ کا بدلا ہے۔ وہ بہت جلد اپنے اصلی مرتبے پر پہنچ جائیگا اور باپ کے خطابات حاصل کرلے گا۔ لہٰذا میں خاتون ملکہ کو مارگوئس ہینی ہیمبری کی بی بی بننے پر ابھی سے مبارکباد دیتا ہوں۔"

نواب بیگم: "کیا آپ اس تعلق کو ناگزیر اور لازمی ہی سمجھتے ہیں۔"

گیرڈی: "بالکل لازمی سمجھتا ہوں۔ میں کبھی پسند نہیں کرسکتا کہ یہ عاشق و معشوق بنعمتِ وصال سے محروم رکھے جائیں۔ کیونکہ میں ہینی کا وارث اور ملکہ کا خیر اندیش ہوں۔ ان کی بُرائی کیونکر گوارا کرسکتا ہوں۔"

نواب بیگم:۔ "مجھے آپ کی مخالفت منظور نہیں۔ کیونکہ آپ میرے حامی اور میرے بچوں کے بھی خواہ ہیں۔ آپ جب اس کا انعقاد مناسب سمجھیں مجھے شادی کی تیاری سے انکار نہ ہوگا۔

اب میں آپ کے اس وعدے پر بھروسہ کرتے ہوئے رخصت چاہتی ہوں جو بوقت ضرورت، امداد و اعانت سے میری دستگیری کرنے کے متعلق آپ کی جانب سے وقوع میں آیا ہے۔"

گیردی:۔ "آپ بالکل خاطر جمع رہیں۔ میں کچھ دن بعد، پیرس جاؤنگا جنگلی انسان بھی میرے ساتھ ہوگا۔ آپ کو جس وقت میری مدد کی ضرورت محسوس ہو۔ فوراً مجھے مطلع فرما دیجیے۔ میں انتظام کر دوں گا۔"

نواب بیگم:۔ "ہاں! خوب یاد آیا۔ مارشی نس لوسیا اور ہنا کی کیا خبریں ہیں؟"

گیردی:۔ "ہنا کے مل جانے کی تو قوی امید ہے۔ اور ماریل میں اس کے متعلق بہت سے واقعات وقوع پزیر ہونے کی خبریں عنقریب آپ کے گوش زد ہوں گی مگر افسوس ہے کہ لوسیا کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر بھی میں خدائے تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو گیا ہوں۔ دیکھئے زمانہ کیا دکھاتا ہے۔"

اتنا کہہ کے گیردی رخصت ہوا۔ نواب بیگم نے ملکہ کو بلایا۔ اور سفر کے ارادے سے مطلع کیا۔ سفر کی خبر سن کے ملکہ کو تردد ہوا۔ اس کی پریشانی کو دیکھ کے نواب بیگم بولی:۔ "بیٹی تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے والد وہاں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں چار ناچار چلنا پڑیگا۔ میں تمہیں ہدایت کرتی ہوں کہ جب تم ان سے ملو تو، ادب اخلاص اور وفا شعاری سے پیش آؤ۔ اور ان کی گزشتہ بدسلوکیوں کو بھول جاؤ۔ کیونکہ جس طرح تم پر میرا کوئی حق ہے۔ اسی طرح ان کا بھی

کوئی حق ہے۔ لہٰذا یہ تمہیں نازیبا ہوگا کہ ایک سے تو ایک طرح پر پیش آؤ اور دوسرے سے دوسری طرح پر۔ تم کو اُن کا دل رکھنے کے لیے کم از کم اتنا ضرور کرنا چاہیئے کہ بظاہر مجھ سے کسی قدر الگ تھلگ اور اُن سے ہر وقت لگی لپٹی رہو۔ اور جس طرح ایک اطاعت گزار اور حرمت شعار بیٹی اپنے باپ سے برتاؤ کرتی ہے۔ تم بھی اطاعت و حرمت کرتی رہو۔"

کرنیل گیرڈی، نواب بیگم کے مکان سے نکل کے جنگلی انسان کے دیکھنے کو گیا تھا جنگلی انسان اس وقت شمشیر زنی اور تفنگ اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ گیرڈی کے جانے پر نوکر نے اُس کو مطلع کیا جنگلی انسان نے مشق موقوف کر دی اور کمرے میں جا کے پوشاک تبدیل کی۔ اس وقت اگر کوئی شخص اُس کی موجودہ حالت کا اُس حالت سے موازنہ کرتا جو جھاڑیوں کی بود و باش کے زمانے میں نظر آتی تھی۔ تو اُسے بڑی عبرت ہوتی۔ اور وہ انقلابات دہر سے اچھا سبق حاصل کرتا۔ لباس کے استعمال سے جنگلی انسان کا بدن گداز ہو گیا تھا۔ چہرے کی رنگت خوب نکھر گئی تھی۔ صورت سے ذکاوت و بلند حوصلگی کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور وضع قطع۔ تراش خراش کے لحاظ سے وہ ایک خوشرو اور فیشن ایبل انسان معلوم ہوتا تھا۔ جس کو ہر دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ کوئی شریف و مہذب امیر ہے۔

یہ کرشمہ ہے اُس سچے عشق کا جو عادات و اخلاق، اور صورت و ہیئت کو تبدیل کر دیتا ہے۔ جنگلی انسان کی کایا۔ صرف اُس کی جیون ساتھی اُس کی راحت دل، اُس کی روشنی چشم یعنے ملکہ کے عشق نے پلٹ دی تھی۔ ملکہ کا دسترس جنگلی انسان پر اتنا قوی ہو گیا تھا کہ جنگلی انسان سے جو جو کام کرانے مقصود ہوتے، ملکہ کی ایک نگاہ لطف اُن کی تعمیل کرا دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علوم و آداب اور تعلیم و تہذیب کے حصول میں

دہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ حدِ کمال کو پہنچ گیا۔

کرنیل گیرڈی کمرے میں داخل ہوا تو جنگلی انسان اُس کے لینے کو سرو قد اُٹھا اور دلی شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنے لگا۔ گیرڈی نے فرطِ شفقت سے اُسے گلے لگا لیا اور احساساتِ محبت کو بہ مشکل ضبط کر کے بیٹھ گیا۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ گیرڈی نے لطیف پیرایہ میں بیان کیا کہ جنگلی انسان کو لے کے پیرس جانا ضرور ہے۔ اسی طرح نواب بیگم اور ملکہ کو سنگین محل کا رُخ کرنا واجب ہے۔ اس اچانک خبر کے سنتے سے جنگلی انسان کا دل بیٹھ گیا اور وہ سرنگوں ہو کے سرد آہیں بھرنے لگا۔ گیرڈی بولا۔

"میرے پیارے! میری آنکھ کے تارے! تم جانتے ہو کہ مکروہاتِ زندگی پر صبر کرنا جوانمردوں کا شعار ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کو اپنی پیاری محبوبہ کے فراق سے ملال ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے بعض فرایض ایسے بھی ہیں جن کو ادا کیے بغیر کوئی گزیر نہیں۔ اس میں ضرور مصائب کو انگیز کرنا پڑتا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور ایسا وعدہ جو ایک سچا وفادار دوست کرتا ہے کہ میں تمہاری جدائی کے زمانے کو زیادہ طول نہ دوں گا۔ اس لیے تم کو زیادہ فسردہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ تمہاری خوش اخلاق ملکہ کو تم سے ایسی ہی محبت ہے جیسی تم کو اُس سے ہے۔ پس یہہ بات ایک نہ ایک دن ہونے والی ہے کہ میں تم دونوں کو ایک جگہ جمع کر دوں۔ میں کھلے الفاظ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ عنقریب تمہاری بی بی بن جائیگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہہ بات تمہیں خوشنود و مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے اور تم اس فراق پہ صبر کر سکو گے اور آلام و مصائب کو ٹھنڈے دل سے جھیل لو گے۔"

اس تقریر کے بعد، دل رفتہ عاشق کو بجز تسلیم و موافقت کے کوئی

پیارا نہ تھا۔ علاوہ بریں وہ کرنیل گیرڈی سے اسی طرح خوف کرتا تھا جس طرح ایک مطیع بیٹا، اپنے بُردبار باپ سے ڈرا کرتا ہے۔ وہ اُس کو اپنا حکمران خیال کرتا تھا۔ [illegible] سے گیرڈی کے افضال و احسانات کی ایسی ہی قدر تھی جیسی ہونی چاہیے وہ اپنی گزشتہ اور موجودہ حالت میں صرف گیرڈی کی کوششوں سے عظیم تبدیلی محسوس کرتا تھا اور ایسے الفاظ تلاش کرتا تھا جو گیرڈی کی فیض رسانیوں کا اظہار کر سکیں۔ لیکن نہیں پاتا تھا گیرڈی اُس کو متامل پا کے پھر بولا: "پیارے دوست! مجھے تمہارے بعض حالاتِ زندگی کا علم بہت پہلے سے ہو چکا ہے۔ لیکن ابتدائی سوانح معلوم نہیں اور اُن کے معلوم کرنے کا از حد اشتیاق ہے۔ اب جبکہ تم گفتگو پر قادر ہو چکے ہو، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ابتدائی واقعات کو وضاحت سے بیان کرو۔"

خنگلی انسان: "میں بہت خوشی سے بیان کرتا ہوں مگر میں نہیں جانتا کہ اِن واقعات کو کس تسلسل سے بیان کروں۔ علاوہ بریں یہ حالات کچھ تحقیقی اور مبصرانہ نہیں ہیں۔ بلکہ میں نے اپنے زورِ طبع سے معلوم کیے ہیں اور اُن سے عظیم الشان نتائج مستنبط کر لیے ہیں۔"

اِس کے بعد اُس نے اپنے واقعات اور چشمدید حالات کو اُس وقت سے لے کر جب کہ وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ اُس وقت تک جب کہ وہ جوان ہوا اور قید خانے میں بھیجا گیا۔ تفصیل سے بیان کیا۔

چونکہ اِس ناول کے ناظرین اُن کے اکثر حصے سے واقف ہیں۔ اِس لیے ہم تفصیل کو نظر انداز کر کے مختصراً کچھ اُمور حوالۂ قلم کرتے ہیں۔ خنگلی انسان کہنے لگا: "جب سے میں نے ہوش سنبھالا، ایک سپید بزغالے کے سوا کسی اور کو اپنا مونس و غمگسار نہ پایا۔ وہ مجھ سے اور میں اُس سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر ۵ صحیفہ جلد ۴

ایڈیٹوریل

بڑے تعجب کی بات ہے کہ صحیفہ کے بعض قدر دانوں کی خدمت میں باہر کے جو رسالے اور اخبار وی پی پارسل کی شکل میں آتے ہیں۔ انہیں وہ فوراً بطیب خاطر وصول فرما لیتے ہیں۔ لیکن جب صحیفہ کا ملازم چندۂ سالانہ کی رسید لے کے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو اُسے آئے بائے بتا کے مہینوں سوکھا ٹالتے رہتے ہیں اگر انہیں وی پی پارسل ہی مرغوب ہے تو آئندہ سے صحیفہ اُسی طرح روانہ کیا جائے گا مگر اُس وقت رقم سکۂ کلدار میں ادا کرنی پڑیگی اور اس میں معزز قدر دانوں کا تھوڑا سا نقصان ہوگا۔

آذر ۱۳۱۸ف کے پرچے میں جو استفسارات درج ہوئے تھے۔ اُن میں سے بعض بعض کے جوابات صرف تین چار صاحبوں سے وصول ہوئے ہیں اور ایک صاحب نے پورے جوابات ارسال فرمائے ہیں۔ غالباً

ناظرین نے اُن کی جانب پوری توجہ نہیں مبذول کی۔ ورنہ اِس چار ماہ کی مدت میں بہت سے جوابات آگئے ہوتے۔ لہذا اُن کی طرف توجہ معطوف کرائی جاتی ہے اور جوابات وصول شدہ کی اشاعت اِس نمبر میں ملتوی رکھی جاتی ہے۔

شکر ہے کہ توسیع اشاعت کے بارے میں ہماری اپیل کو بعض ہمدردوں نے اپنی خاص التفات کی نگاہ سے دیکھا اور نئے خریدار بہم پہنچا کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔ اِس کے پورے حالات سال کے خاتمہ پر رپورٹ میں ظاہر کیے جائینگے یہاں صرف اُن ہمدردوں کے نام لکھ دینے پر اکتفا کی جاتی ہے جنہوں نے اشاعت میں حصہ لیا۔

۱۔ منشی محمد عبد السلام صاحب۔ ۲۔ وکیل محمد رشید الدین صاحب۔
۳۔ مولوی محمد نصیر الدین صاحب ۴۔ مولوی ابو نصر محمد احمد اللہ صاحب مہاجر
۵۔ مرزا سکندر بیگ صاحب۔ ۶۔ مولوی سید جلال صاحب۔

اِس مہینے میں بعض معزز ہمعصروں نے ناچیز صحیفہ کی نسبت اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

جنوری سنہ ۱۹۰۹ء کا پردہ نشین (آگرہ) رقمطراز ہے:۔

"**صحیفہ حیدر آباد دکن**۔ انجمن معارف حیدر آباد دکن کا ماہوار"
"علمی رسالہ ہے جس کے متعلق اتنا لکھنا کافی ہے کہ حیدر آباد کی ایک"
"برگزیدہ اور قابل لوگوں کی جماعت، اِس پرچے کی قلمی معاون ہے"
"اور ہر ہفتہ اعلیٰ درجے کے علمی۔ اخلاقی، تاریخی، تمدنی ادبی۔ مضامین"
"شایع ہوتے ہیں۔ جو زمانہ کی رفتار کے مطابق۔ اور اہل ملک کے واسطے"
"از بس مفید ہیں۔ منیجر صحیفہ حیدر آباد دکن چادر گھاٹ سے منگا کر"

"نمونہ دیکھئے اور جاری کرائیے"

فروری ۱۹۰۹ء کا رہنمائے تعلیم (لاہور) خامہ فرسا ہے:-

"صحیفہ حیدرآباد دکن - اس رسالے کا ریویو کسی پچھلے نمبر میں
"کیا جا چکا ہے مگر یہ رسالہ دن بدن مضامین وغیرہ کی عمدگی کے
"لحاظ سے جو ترقی اور دلچسپی حاصل کر رہا ہے - اس سے مجھے اپنے
"ناظرین کی خدمت میں اس کی خریداری کی مکرر سفارش کی ضرورت
"محسوس ہوئی ہے - امید ہے کہ وہ بھی اسے ایسا ہی پسند کرینگے
"جیسا کہ میں کرتا ہوں - اور اس کے مطالعے سے جو فوائد انہیں حاصل
"ہونگے انہیں ہر صورت میں اس کی سالانہ قیمت کے مقابلہ
"میں زیادہ قیمتی خیال فرمائینگے -"

مدراس کا انگریزی روزانہ اخبار انڈین پیٹریٹ صحیفے سے اپنا
تبادلہ منظور کرتے ہوئے یوں گل افشاں ہے:-

"ہم کو ایک اردو
"ماہانہ رسالے صحیفہ کے
"نمبر وصول ہوئے - جو
"حیدرآباد دکن میں بڑے اہتمام
"فاضل عربی مولوی محمد اکبر علی
"صاحب چھپتا اور شایع ہوتا ہے
"اسمیں علمی اخلاقی تاریخی مضامین
"پر بحث ہوتی ہے یہ ایک بہت
"عمدہ رسالہ ہے اور ہماری دعا
"ہے کہ اسکو پوری کامیابی حاصل ہو"

We have received copies of a hindustani monthly journal "Sahifa" printed & published in Hyderabad Deccan, under the management of a well learned arabic scholar, Moulvi Mohammed Akber ali, sahib, It deals with educational, moral & historical topics. It is a very promising journal, & wish it every success.

آذر ۱۹۱۰ء کے نمبر میں "متفرقات" کے تحت میں "محقق" صاحب نے لکھا تھا کہ ہندوستان کے بعض اخبارات کلام الٰہی کی بڑی توہین کرتے ہیں کہ اُسے متفرق کاغذات پر چھاپ کے نمونہ دکھانے کے لیے اخبار کے ساتھ بھیجدیتے ہیں۔ اور وہ اِدھر اُدھر بکھر کے ہاتھ پانوں میں پڑ جاتے ہیں۔ جہاں تک دیکھا گیا یہہ بات ہمارے تجربہ میں بھی درست معلوم ہوئی۔ ہمارے دفتر میں بعض اخبارات متبدلہ کے ساتھ ایسے پرچے آتے ہیں جن کا حفاظت سے رکھنا، ایک مستقل کام ہو جاتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہہ طریقہ نہایت ناپسندیدہ ہے اِس واسطے کہ اول تو اخبار جس طرح مسلمانوں کے پاس جاتا ہے اُسی طرح اُن افراد کے پاس بھی جاتا ہے جن کے ہاں مذہبًا ایسے پرچوں کی کوئی حرمت نہیں۔ دوسرے یہہ کہ مسلمانوں کے پاس بھی بے احتیاطی ہونے کا اندیشہ ہے۔ نمونہ بتانے کے لیے کوئی اردو عبارت خطِ نسخ میں لکھ کے شایع کی جاسکتی ہے۔ اور اگر کسی کو یونہی اصلی نمونہ دیکھنا منظور ہو تو وہ ٹکٹ بھیج کے منگوا سکتا ہے۔

ہم خاص طور پر اپنے معزز ہم عصروں، کرزن گزٹ (دہلی)، وطن (لاہور)، انوار الاسلام (سیالکوٹ) کو اِس جانب متوجہ کراتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اِس بارۂ خاص میں ضرور کوئی عملِ صواب اختیار کرینگے۔

ہماری سرکار کے سب عظیم و اہم کالج (دار العلوم) کی اصلاحوں کے لیے جس کمیٹی کا انعقاد ہوا ہے وہ عنقریب اپنے اجلاس مقرر کرے گی۔ اِس موقع پر عموماً ابنائے ملک کا اور خصوصاً دار العلوم کے فیض یابوں اور بہی خواہوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اپنی رایوں سے اصلاحات میں سرکار کا ہاتھ بٹائیں۔ صحیفہ کے خریداروں میں بعض بعض فارغ التحصیل نیز سربرآوردہ طلبہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اگر یہہ حضرات اپنی اپنی رائیں ہمارے پاس

روانہ فرمائیں تو سب کو اکٹھے چھاپ کے وکالتِ ملک کی حیثیت سے پیشگاہ سرکار میں روانہ کر دیا جائے۔

ہم کو سمجھنا چاہیے کہ دار العلوم کی اصلاح پر ملک کی اصلاح موقوف ہے کیونکہ اس مدرسے نے ریاست میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کیے ہیں وہ کوئی اور مدرسہ نہ پیدا کر سکا۔ نیز اس کو جو قدامت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں نصیب ہے۔ لہذا ہر اس شخص پر جو ملک کی اصلاح چاہتا ہے فرضِ عین ہے کہ اس ضروری فریضے سے بے پروائی نہ کر جائے۔ اور خوابِ غفلت میں سوتا نہ پڑا رہے ورنہ وقت نکل جانے پر پچھتانا پڑیگا اور ہاتھ ملنے سے کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔

اڈیٹر

رباعی

دوزخ میں کبھی محبِ سرور نہ گیا — فردوس میں دشمنِ پیمبر نہ گیا
یاد آگئی جب شہادتِ تشنہ دہن — تلخی کا مزا پی کے بھی کوثر نہ گیا

سلام

غمِ شہ سے دل کیوں نہ مضطر رہے — یہ سودا ہے جب تک مرا سر رہے
ملے لال کیا کیا نہ کچھ خاک میں — مگر شاہ دم بھر نہ مضطر رہے
دلِ زار اتنا غمِ شہ میں رو — قیامت میں بھی آستیں تر رہے
دکھا دینگے دیدار اپنا نبی — اگر حبِ آلِ پیمبر رہے
جو آلِ نبی پر ہیں دل سے فدا — انہیں خوف کیا روزِ محشر رہے
نظر شاہ کی اس طرف جب پڑی — تو دوزخ سے حر کو بچا کر رہے
گلِ باغِ زہرا کی توصیف سے — دہن میں زباں بھی معطر رہے
غمِ تشنگاں میں یہ تھا تشنہ حال — کہ کونین بھی خاک برسر رہے

تشنہ حیدرآبادی

تفاخرِ عرب

اور

دربارِ کسریٰ

چودہ سو سال پہلے کا ایک دلچسپ تاریخی واقعہ

عراق و ایران کا مشہور آفاق داد گستر جس کی شان میں ناصح زمانہ حضرت سعدی فرماتے ہیں - ع نوشیرواں مرد کہ نام نکو گزاشت - اپنا دربارِ عدل آراستہ کیے ہوئے تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہے بلادِ خارجہ کے سفرا اور باجگزار رؤسا حاضر ہیں - اُن ہی میں عرب کا مشہور رئیس، نعمان ابن منذر بھی ہے - ہر ہر رئیس اپنے اپنے ملک و رعیت کے حالات بیان کرتا ہے - نعمان کی بھی باری آتی ہے - اور وہ عرب کو تمام اقوامِ عالم پر، بلا استثنائے روم و ایران ترجیح دے دیتا ہے - کسریٰ کو یہہ امر ناگوار ہوتا ہے اور اپنے مُلک کی طرفداری میں آکے کہتا ہے :- "نعمان! ما بدولت کو تمہاری تقریر کے ماننے سے انکار ہے - ما بدولت نے عربوں اور دیگر قوموں کے حالات میں اکثر اوقات بہت غور و فکر کی - ہر ہر قوم میں کوئی نہ کوئی وجہِ امتیاز پائی گئی - مگر عربوں میں کوئی موجبِ مباہات نظر نہ آیا -

چنانچہ دیکھو! رُومیوں میں اتفاق کا عنصر بہت غالب ہے اُن کی عملداری زیادہ وسیع ہے - اُن کے شہروں میں عالی شان عمارتیں اور قابلِ دید مقامات ہیں وہ ایک مستقل مذہب رکھتے ہیں

جس سے اُنہیں حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے اور جس سے وہ اپنے جہلا کو درست کرتے اور سفہا کو راستے پر لگاتے ہیں۔

ہندوؤں میں بھی اسی قبیل کی بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اُن میں فلسفہ اور طب کی فضیلت موجود ہے۔ اُن میں علم حساب پایا جاتا ہے۔ اُن میں لطیف صنعتوں کا وجود ہے۔ اُن کے ملک میں عمدہ عمدہ میوے اور غلے پیدا ہوتے ہیں۔ شیریں و خوشگوار پانی کی نہریں بہتی ہیں۔ اُن کی آبادی بھی معتد بہ ہے۔

چینیوں میں بھی سلطنت موجود ہے۔ اُنہیں فنونِ جنگ میں بڑا دخل ہے۔ وہ آلاتِ حرب میں خوب مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کو دستکاری اور صنعت و حرفت کا اچھا سلیقہ ہے۔ وہ شہسوار ہیں اور لوہے کا بہترین استعمال جانتے ہیں۔

تُرک باوجودیکہ اُن کی معاش ناقابلِ اطمینان ہے۔ اُن کے ملک میں غلے اور میوے کم پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے شہروں میں قلعے بھی نہیں ہیں۔ اُن کی حالت، بلحاظِ عمارات، پوشاک اور امورِ تمدن کے بہت گھٹیا ہے۔ پھر بھی اُن میں بادشاہی ہے جس سے امورِ مملکت کا نظم و نسق ہوتا ہے اور مشکلات حل کی جاتی ہیں۔

اِن سب کے مقابلے میں **عرب** بالکل ہیچ ہیں۔ اُن کی نہ دنیا درست ہے نہ دین اچھا ہے۔ اُنہیں نہ قوت حاصل ہے نہ جمعیت۔ وہ نہ قومیت رکھتے ہیں نہ سلطنت۔ نامانوس وحشیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور فضا میں منڈلانے والے پرندوں کے مانند ایامِ حیات گزارتے ہیں اُن کے فقر و فاقے کی نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ جب کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو اپنے بچوں کو مار ڈالتے ہیں اور ضرورت کے وقت جس کسی کو پاتے ہیں مار کھاتے ہیں۔ اُنہیں نہ کھانے پینے کا سلیقہ ہے

نہ لہو و لعب کا ڈھنگ آتا ہے۔ نہ کپڑے لتے کا استعمال یاد ہے۔ اُن کے امیر و رئیس عمدہ سے عمدہ غذا جو پاتے ہیں وہ اونٹوں کا گوشت ہے۔ اور یہ گوشت جیسا کچھ ناگوار، بدمزہ، دیر ہضم، بیماری آور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اُس کو اکثر درندے تک نہیں کھاتے۔ مگر عرب ہیں کہ اس گوشت پر جان دیئے جاتے ہیں۔ یہی گوشت مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور اگر خود کسی کے ہاں مہمان بن کے کھا آتے ہیں۔ تو اُس کا بڑا احسان مانتے ہیں۔ اس پر اُن کے شعرا مباہات کرتے ہیں اور قصاید و اشعار کہتے ہیں۔

باایں ہمہ اُن کی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ اپنی ذلت، کلفت، غربت، وحشت، بدحالی، بدافغانی کو خطرے میں نہ لاکر چاہتے ہیں کہ اقوام عالم کے سر پر سوار ہو جائیں اور دنیا پر اپنی بڑائی ثابت کریں۔

مابدولت نے اُن کی نسبت جو کچھ ارشاد فرمایا ہے کیا وہ اُن کی دوں ہمتی، بے وقعتی، اور کم عیاری کے ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

نعمان اپنی جگہ پر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہنے لگتا ہے "خدا شاہنشاہ عالم کو توفیق نیک عطا فرمائے۔ جس قوم پر آپ کا سا عادل نیز وہ فرمانروا سایہ گستر ہے۔ اُس کو تو بے شک سزاوار ہے کہ دنیا میں عالی رتبہ، بلند حوصلہ اور جلیل الشان قوم کہلائے۔ لیکن زبان فیض ترجمان سے عربوں کی نسبت جو کچھ ارشاد ہوا ہے اُس کے بارے میں ہر فقرے کا میرے پاس جواب شافی موجود ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ معدلت پناہ کی تردید یا تکذیب کروں۔ بلکہ احوال واقعی کا اظہار منظور ہے۔ اگر مرضی خداوندی کے خلاف نہ ہو اور اس کا اطمینان دلایا جائے کہ مورد عتاب سلطانی نہ ہو جاؤں گا تو معرض قبول تک پہنچانے کی جسارت کرتا ہوں۔"

کسریٰ: "بیان کرو۔ تمہیں کوئی صدمہ نہ پہنچیگا۔"

نعمان: "شہنشاہِ عالم! اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی قوم سے دنیا کی کوئی قوم لگا نہیں کھا سکتی، اُس کی عقل آرائی، عالی وقعتی، بلند مرتبتی ایسی نہیں کہ وہاں تک کسی کی رسائی ہو سکے۔ مگر باقی قومیں جو اثنائے تقریر میں ذکر کی گئیں۔ اُن میں ایک بھی ایسی نہیں کہ اگر عربوں کے مقابلے میں لائی جائے تو میں عربوں کو اُس پر ترجیح نہ دے سکوں!"

کسریٰ: "ترجیح کن وجوہ کے لحاظ سے دی جا سکتی ہے؟"

نعمان: "اُن کی عزت و خودداری، اُن کی خوبصورتی، اُن کی حفاظتِ نسب اُن کی کریم النفسی، اُن کی زبان آوری، اُن کی ملت و شریعت، اُن کا ایفائے عہد، یہ سب ایسے وجوہ ہیں جو اُنہیں اوروں پر ترجیح دلاتے ہیں۔

میں اُنہیں تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔

عزت و خودداری: عرب ہمیشہ سے حضور کے اُن اسلاف کا ساتھ دیتے آئے ہیں، جنہوں نے ممالک کو مسخر کیا، لشکروں کو مطیع بنایا، اور شہروں کو فتح کیا۔ عرب پر کوئی بادشاہ چڑھائی نہ کر سکا۔ اور عربوں تک کوئی بُرائی نہ پہنچ سکی۔ اُن کے قلعے گھوڑوں کی پیٹھیں ہیں۔ اُن کا فرش چٹیل زمین ہے۔ اُن کی چھت نیلا آسمان ہے۔ اُن کی سپریں سینہ شگاف تلواریں ہیں اور اُن کا زادِ سفر صبر و استقلال ہے۔ اس کے خلاف دوسری قوموں کی عزت، پتھر ہیں، اور مٹی ہے اور سمندر کو طے کرنے والی چیزیں ہیں (اس سے نعمان کی مراد لعل و جواہر، عمارات اور کشتیاں ہیں جن پر دوسری قومیں فخر کرتی ہیں)

خوبصورتی: عربوں کا حسن مشہور و مسلم ہے۔ برعکس اُن کے ہندی کُبڑے اور بدقوارہ ہوتے ہیں چینی دُبلے پتلے، اور صرف پوست استخواں

نظر آتے ہیں، تاتاری بے ڈول اور کریہ الصورت دکھائی دیتے ہیں اور رومی ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا کسی نے اُن کی کھال کھینچ لی ہے۔

حفاظت نسب :- اکثر قومیں اپنے آبا و اجداد اور بزرگ اسلاف کو بھول جاتی ہیں چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی سے اُس کے دادا کا نام اور حالات پوچھے جائیں تو وہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن عربوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے بزرگوں کو سلسلہ بہ سلسلہ نہ بتا سکے اور اُن کے نام نہ گنوا سکے عرب اپنا حسب نسب بڑی تحقیق سے یاد رکھتے ہیں اور کبھی اُسے فراموش نہیں کرتے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی قبیلے کا کوئی فرد دوسرے قبیلے میں نہیں داخل ہو سکتا۔ نہ کسی دوسرے نسب سے منسوب ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا بیٹا کہلا سکتا ہے پس عرب اپنے نسب کی محفوظیت پر جس قدر فخر کریں زیبا ہے۔

کریم النفسی :- کیسا ہی غریب سے غریب عرب کیوں نہ ہو جس کے ہاں صرف ایک اونٹ اور ایک اونٹنی ہو جس پر اُس کی گزران ہوتی ہو اور جس سے اُس کا پیٹ چلتا ہو۔ اگر اُس کے پاس کوئی ایسا مہمان آجائے۔ جسے روٹی کا ایک ٹکڑا اور پانی کا ایک گھونٹ سفر کی کلفتوں سے آرام دینے کو کافی ہو سکتا ہو تو وہ اپنی غریبی کی پروا نہ کر کے اُس مہمان کی ضیافت کے لیے اپنی اونٹنی کو ذبح کر دیتا ہے اور خواہ اُس کی دنیا بگڑے یا سدھرے۔ وہ نام نیک اور سلوکِ احسن کے مقابلے میں کسی نقصان کی پروا نہیں کرتا۔

زبان آوری :- خدائے تعالےٰ نے عربوں کے کلام و اشعار میں جو خوبی اور دلاویزی بخشی ہے وہ دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتی۔ اُن کی زبان میں کثرت سے قوافی ہیں۔ محاورات ہیں اور ضرب الامثال ہیں۔ وہ الفاظ کے رنگ و روغن سے اشیا کا فوٹو اِس صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں جس کی نظیر نہیں مل سکتی وہ اپنی جادو بیانی سے روئے کو

ہنساتے، ہنستے کو رُلا دیتے ہیں اور اپنی آتش افشانی سے لڑائیوں کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

ملت و شریعت: عرب سختی سے اپنے مذہب کے پابند ہیں عبادتیں بجا لاتے ہیں اور قابل احترام مہینے، شہر اور گھر رکھتے ہیں۔ جہاں وہ مناسک عبادت ادا کرتے اور قربانیاں دیتے ہیں۔ یہاں اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے دشمن بلکہ اپنے باپ یا بھائی کے قاتل سے بھی دوچار ہوتا ہے اور اُس سے انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہے تو بھی ماہِ حرام اور بیت الحرام کی حرمت کے باعث اس سے باز رہتا ہے اور اُس کی شرافت و دینداری اُسے منع کرتی ہے کہ موجباتِ احترام میں خلل اندازی کرے۔

ایفائے عہد: اگر کوئی شخص کسی کو نظر بھر کے دیکھ لے اور گوشۂ ابرو سے اشارہ کر دے تو یہ صلح و آشتی کا ایک عہد محکم ہے جس کو موت ہی توڑے تو توڑے۔ زندگی میں کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتا۔ اگر کوئی راہ چلتے میں، زمین سے ایک تنکا اُٹھا لے اور اُس کو رہن کر دے تو اُس کا یہ رہن کبھی نہیں توڑا جاتا اور اُس کا معاہدہ شکست نہیں ہوتا۔ اگر کسی عرب کو یہ خبر پہنچے کہ کوئی اُس کی پناہ میں آگیا تھا اور بوجہ دوری یا معاونین کی کمی کے بلائیں پھنس گیا تو وہ اُس وقت تک چین نہ لے گا جب تک اُس قبیلہ کو فنا نہ کر دے جس نے اُس کی پناہ کا کوئی لحاظ نہ رکھا تھا اور پناہ گیرندہ پر مصیبت ڈھائی تھی یا یہ کہ خود وہ قبیلہ فنا ہو جائے جس کا یہ ایک فرد ہے۔

ایک بالکل اجنبی مجرم، جس سے نہ قرابت ہوتی ہے نہ اگلی جان پہچان کسی قبیلہ کی پناہ میں آجانا چاہتا ہے تو اُس قبیلہ کی جانیں اُس کی جان پر قربان ہو جاتی ہیں اور قبیلہ کا مال و منال اُس کے مال و منال پر

نثار کر دیا جاتا ہے۔

معدلت پناہ نے ارشاد فرمایا کہ عرب اپنی اولاد کو مار ڈالتے ہیں۔ اس کی نسبت میں عرض کروں گا کہ ایسا بے درد انہ فعل، صرف بعض جہلا سے سرزد ہوتا ہے اور وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ۔ کیونکہ جہالت کی وجہ سے اُن کو بڑا عار آتا ہے کہ اپنی بیٹیوں کو دوسروں کے تصرف میں دیں لہٰذا جوشِ حمیت میں آکے ایسی ابلہانہ حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ شت

عدالت گستر کا یہہ فرمان کہ عربوں کی عمدہ غذا صرف اونٹوں کا گوشت ہے۔ اس کے بارے میں گزارش کرتا ہوں کہ یہہ گوشت فقط اس وجہ سے پسند کیا گیا کہ دوسرے کسی جانور کا گوشت اتنا نافع نہیں ہوتا جتنا اونٹ کا۔ وہ بہت خوشگوار، میٹھا، لذیذ اور چرب آلود ہوتا ہے اونٹ عربوں کی سواری میں بھی کام آتا ہے اور غذا بھی بنتا ہے۔ اس لیے اس افضل بہایم کو اختیار کیا گیا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر دوسرے جانوروں کے گوشت سے اونٹ کے گوشت کا مقابلہ کیا جائے تو ضرور اُس کو ترجیح دی جائیگی۔

جہاں پناہ نے بیان فرمایا کہ عرب باہم خانہ جنگی کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں اور کسی ایسے کے مطیع و منقاد نہیں ہوتے جو اُن پر حکمرانی کرے اور اُن کا شیرازہ باندھے اس کی بابت میں یہہ کہونگا کہ ایسے افعال بعض ضعیف قبیلوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ ورنہ ہر ہر حصۂ ملک میں ایک ایسا اونچا گھرانا ہوتا ہے جس کی فضیلت مانی ہوئی ہوتی ہے اُسی کی طرف تمام امور رجوع کیے جاتے ہیں اور اُسی کے احکام پر سب کی گردنیں جھکتی رہتی ہیں۔

عرب خراج گزاری کی ذلت کو نہیں سہہ سکتے نہ کسی قسم کی لینت قبول کرتے ہیں۔ ان کا ہر ہر شخص اپنی عالی ہمتی سے خواہش رکھتا ہے کہ بجائے خود بادشاہ بن بیٹھے۔

نعمان کی تقریر ختم ہوتی ہے اور وہ بجائے خود بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی فصاحت و روانی، خیالات کی برجستگی، زبان کی شستگی اور دلائل قویہ کا اظہار، کسریٰ کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ کسریٰ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے: "نعمان! تم کو اپنی قوم کی فرمانروائی زیب دیتی ہے اور تم اپنی قوم کے افضل سے افضل پر بھی حکمرانی کرنے کے مستحق ہو مابدولت اپنی شاہانہ نوازشوں سے تمہیں سرفراز کرتے ہیں"

یہہ کہہ کے ایک بیش بہا خلعت منگواتا ہے اور نعمان کو اُٹھا کے عزت و احترام سے رخصت کرتا ہے۔

اڈیٹر

غزل

طبیعت جو اُس شوخ پر آگئی — عجب بیخودی قلب پر چھا گئی
الٰہی یہہ کیسی بلا آگئی — شگفتہ کلی دل کی مرجھا گئی
خوشی میں چھکنے لگیں بلبلیں — وہ گلشن میں آئے بہار آگئی
بڑی باوفا تھی تری آرزو — مرے ساتھ تربت میں بھی آگئی
چلی حلق پر رُک کے قاتل کی تیغ — وہ ننھے سے ہاتھوں میں تڑپا گئی
سرِ قبر آکر وہ رونے لگے — ہماری وفا اُن کو یاد آگئی
عروسِ قضا نے کیا جب سنگھار — نظر ہی نظر میں ہمیں کھا گئی
چلی کیسی یارب ہوائے خزاں — اڑا رنگِ گل مردنی چھا گئی
ہنسی اُن کی گو تھی مسرت فزا — مگر میرے دل پر غضب ڈھا گئی
شبِ وصل دل کی خلش مٹ گئی — کسی پر جو ناطاقتی چھا گئی
سنبھلنے نہ پایا تھا غمناک دل — تری سرد مہری اُسے کھا گئی
تری وہ رسیلی سریلی صدا — مرے دل کو کیا کیا نہ تڑپا گئی
کہاں خونِ عبرتؔ مرحوم میں — محبت کلیجہ مرا کھا گئی

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ

علم و تمدن کے ساتھ

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

اسلام کا آٹھواں اُصول

مصالح دنیا و آخرت کی جامعیّت

صحت اسلام میں حیات دین پر مقدم ہے۔ احکام اسلام اگر بندوں کو اپنے خالق کی طرف متوجہ کراتے ہیں۔ اُن کے دلوں کو اُس کے خوف سے دہلاتے ہیں۔ اُن کی امیدوں کو اُس کے احسانات یاد دلا کر تر و تازہ کرتے ہیں تو اُس کے ساتھ ہی اُن کو کسب معیشت سے محروم نہیں رکھتے دنیوی لذات کے تمتع سے نہیں روکتے اور زہد خشک اور ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتے۔

شارع اسلام نے یہ نہیں کہا ہے کہ "مال املاک بیچ دو اور میری اتباع کرو"، بلکہ جب آپ سے ایک صحابی نے صدقہ دینے کے متعلق مشورہ کیا تھا تو آپ نے فرمایا:

الثلث و الثلث کثیر انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعہم عالۃ یتکففون الناس۔	ثلث مال دو۔ ثلث بہت ہے اگر تم اپنے ورثہ کو مالدار چھوڑ دو تو بہتر ہوگا بہ نسبت اس کے کہ اُن کو لوگوں کی بھیک پر چھوڑ جاؤ۔

رخصت مسلمانوں پر روزے فرض کیے گئے ہیں لیکن اگر مرض کا خوف ہو یا مرض میں زیادتی متصور ہو یا روزے زیادہ بار گزرتے ہوں تو ان صورتوں میں اُن کا ترک کر دینا جایز ہے بلکہ اگر روزے سے نقصان کا ظن غالب ہو تو اُس کا ترک کرنا واجب ہے۔ وضو اور غسل صحتِ نماز کے شروط میں سے ہیں لیکن اگر اُن سے نقصان کا ڈر ہو یا پانی کے حاصل کرنے میں مشقت لاحق ہوتی ہو تو ان تمام حالتوں میں اُن کی شرط باقی نہیں رہتی ہے۔ قیام پر نماز کی صحت موقوف ہے لیکن اگر اُس سے مُصلّی پر ایسی تکلیف گزرے کہ گر پڑنے کا خوف ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جایز ہے۔ ادائے نمازِ جمعہ کے لیے مسجد کو جانا واجب ہے لیکن اگر رستے میں کیچڑ زیادہ ہو یا پانی زور سے پڑ رہا ہو یا کسی اور طرح کی تکلیف ہوتی ہو تو اِن صورتوں میں جمعہ ساقط ہو جاتا ہے اِن وجوہ کی بنا پر ایک عام قاعدہ یہہ مقرر کیا گیا ہے کہ

صحۃ الابدان مقدمۃ علی صحۃ الادیان (۱)۔

پس تم نے دیکھ لیا کہ دین اسلام نے اپنے احکام میں سلامتِ روح کے ساتھ سلامت بدن کا بھی پورا لحاظ کیا ہے۔

زینت اور خوشبوئی کا استعمال اسلام نے اپنے پیروؤں کے واسطے اقسام کی زیب و زینت کا استعمال جایز رکھا ہے اور لذاتِ دنیوی کے تمتع کو مباح قرار دیا ہے بشرطیکہ اعتدال اور میانہ روی اور حدودِ شرعیہ کا لحاظ رکھا جائے اور حسنِ نیت اور صفاتِ رجولیت کی حفاظت کے ساتھ اُن سے استفادہ کیا جائے۔

کتاب اللہ میں بیان ہوا ہے:۔

۱۔ بدن کی صحت دین کی صحت پر مقدم ہے۔

یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد و کلوا و اشربوا ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق قل ہی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ کذلک نفصل الایات لقوم یعلمون۔ قل انما حرم ربی الفواحش ما ظہر منہا و ما بطن و الاثم و البغی بغیر الحق و ان تشرکوا باللہ ما لم ینزل بہ سلطانا و ان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون۔
(سورۃ الاعراف)

اے بنی آدم اپنی زینت کی چیزوں کو مسجد میں جاتے وقت استعمال کرو اور کھاؤ اور پیو اور بیجا خرچ نکرو کیونکہ خدا بیجا خرچ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اے نبی اُن سے کہدو کہ اللہ کی زینت جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور پاکیزہ کھانے کس نے حرام کیے ہیں۔ کہدو یہہ سب چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی مسلمانوں کے لیے ہیں مگر قیامت کے دن خاص اُن ہی کے لیے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں بہ تفصیل بیان کرتے ہیں کہدو کہ میرے پروردگار نے بیحیائی کے کاموں کو حرام فرمایا جو اُن میں سے ظاہر ہوں اُن کو بھی اور جو اُن میں پوشیدہ ہوں اُنکو بھی اور گناہ کو اور ناحق سرکشی کو اور یہہ بھی حرام فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ اُس چیز کو شریک کرو جس کی اللہ نے کوئی سند نہیں اُتاری اور یہہ بھی حرام فرمایا کہ تم اللہ کی نسبت بات کہو جسکو تم نہیں جانتے ہو

ایک جگہ خدائے تعالیٰ اپنی نعمتوں کو گنا تا اور اُن کی حسن و خوبی اور زیب و زینت بتا کر اپنے احسانات جتا تا ہے تا کہ ہمارے نفوس میں اُس کی یاد اور اس کے شکر کی تحریک پیدا ہو اور ہم دل سے اُس کی طرف لو لگائیں۔ اور دنیوی آرام و آسایش میں پڑ کر اُس کو بھول نہ جائیں۔ وہ کہتا ہے:

والانعام خلقها لكم فيها دفء ومنافع ومنها تاكلون ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون وتحمل اثقالكم الى بلد لم تكونوا بالغيه الا بشق الانفس ان ربكم لرؤف رحيم والخيل والبغال لتركبوها وزينة ويخلق مالا تعلمون۔

(سورۃ النحل)

اور چارپایوں کو اُس نے پیدا کیا اُنمیں تمہارے لیے جاڑا دل کا سامان ہے اور دوسرے فائدے ہیں اور اُن میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور تمہاری اُن میں رونق بھی ہے جب تم انہیں چرا کر واپس لاتے ہو اور جب چرانے کو جنگل لیجاتے ہو اور وہ تمہارے اسباب کو ایسے شہر تک اُٹھالے جاتے ہیں کہ تم وہاں بغیر جانوں کی تکلیف کے پہنچنے والے نہ تھے بیشک تمہارا پروردگار شفقت کرنے والا مہربان ہے اور گھوڑوں کو اور خچروں کو اور گدھوں کو پیدا کیا تا کہ تم اُن پر سوار ہو اور آرایش کے لیے پیدا کیا اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

پھر کہتا ہے۔

وهو الذى سخر البحر لتاكلوا منه لحما طريا وتستخرجوا منه حلية تلبسونها وترى الفلك مواخر فيه ولتبتغوا من فضله ولعلكم تشكرون (سورۃ النحل)

اور وہی ہے جس نے دریا کو تمہارا تابع کیا تا کہ تم اُس سے تازہ تازہ گوشت مچھلیوں کا نکال کر کھاؤ اور اُس سے زیور یعنی موتی وغیرہ نکالو تا کہ اُنہیں پہنو اور اے شخص تو کشتیوں کو دریا میں چلنے والا دیکھتا ہے اور دریا کو تمہارا تابع اِس لیے کر دیا کہ تم اُس کا فضل یعنی روزی تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔

میانہ روی مال کی حفاظت اور اُس کے خرچ کرنے کے متعلق اسلام یہ قانون مقرر کرتا ہے:

وات ذا القربی حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطان لربہ کفورا ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ (سورۃ الاسراء)

اور قرابتدار کو اُس کا حق دے دو اور مسکین کو اور مسافر کو اور بے جا صرف کر کے فضول خرچی نکرو۔ کیونکہ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرہ ہے اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف جکڑا ہوا نہ رکھو یعنی بخل نہ کرو۔ اور نہ اسے بالکل کھولدو بلکہ توسط کی حالت اختیار کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو الزام اُٹھا کر پچھتانے ہوئے بیٹھ جاؤ گے۔

دین میں غلو کرنے سے ممانعت اسلام کو اس بات کا خوف ہوا کہ مبادا مومن طلب آخرت کے پیچھے لگ کر دنیا پر لات مار بیٹھے اور اپنے دنیوی حصے کو بھول جائے اس لیے اُس نے جتادیا کہ دنیا کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود بھی ہم آخرت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے:

وابتغ فیما اٰتاک اللہ الدار الاٰخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین۔

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اُس میں دار آخرت کی جستجو کر اور اپنا حصہ دنیا سے نہ بھول جا اور لوگوں کے ساتھ نیکی کر جیسے اللہ نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے اور زمین میں فساد کرنے کی خواہش نہ کر بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پس ظاہر ہے کہ اسلام نے جسم کو جسم کے حقوق عطا کیے اور روح کو روح کے۔ اسلام نے اپنے احکام میں انسان کے اجزائے حقیقت کا

لحاظ رکھا اور اُس کو حیوانِ ناطق سمجھا۔ اُس کو محض جسمانی یا محض ملکوتی نہیں قرار دیا۔ اُس کو اہلِ دنیا میں بھی شمار کیا اور اہلِ آخرت میں بھی وہ اگر اُس کو مقامِ روحانی کے حاصل کرنے کے لیے حکم دیتا ہے تو جہانِ فانی چھوڑ بیٹھنے کے لیے نہیں کہتا ہے۔ اُس نے "ہو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً" کہہ کر انسان کو یہ بتا دیا ہے کہ دنیا و ما فیہا اُسی کی ہے۔ اعتدال کے ساتھ وہ اُن میں جسطرح چاہے تصرف کر سکتا اور رفاہیت کے اسباب منتہائے حد تک مہیا کر سکتا ہے۔ اسلام کی یہ آزادی عین فطرت پر مبنی ہے۔ نفوسِ انسانی میں منافست اور مسابقت کی خواہش ودیعت کی گئی ہے۔ جس چیز کو وہ اپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں اور مفید و نافع خیال کرتے ہیں اُس کے حصول میں وہ ایک دوسرے سے بڑھنے اور بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

طبیعتِ انسانی میں یہ بات ہے ہی نہیں کہ وہ میدانِ طلب میں کسی حد پر آکر ٹھہر جائے۔ یا کسی نقطے پر پہنچکر اُس کی کوشش کی حرکت تھم جائے۔ خدا نے اُس میں اتنی قوت رکھی ہے کہ وہ ترقی کے مدارج طے کرتی چلی جائے اور کہیں دم نہ لے اور کمال کے تمام اطوار اور وجود حاصل کرے اور کبھی بس نہ کرے۔ (باقی آیندہ)

رباعیات لمعہ

شادی کی نہیں امید دنیا میں کبھی — باطن میں ہے رنج گو بہ ظاہر ہو خوشی
کس منہ سے ہم اے لمعہ ہنسی کا لیں نام — آنسو ہی نکل آتے ہیں ہنستے میں بھی

سمجھو نہ مقامِ عافیت دنیا کو — عشرت کو یہاں کی عین عسرت جانو
آغاز ہی سے لمعہ ہے ظاہر انجام — روتے ہوئے آئے ہیں جہاں میں ہم تو

رو دھو کے لڑکپن کا زمانہ گزرا — ایامِ شباب کو بھی جوں توں کاٹا
پیری کا گرا پہاڑ سر پہ ایسا — ہم جھک گئے لمعہ مارِ یہ اٹھ نہ سکا

بندر اور بچے کا فسانہ

کسی بندر سے اک بچے نے کہا — اے خرد مند زیرک و دانا
اے بشر صورت و نکو سیرت — تجھ کو حق نے دئے ہیں ست دیا
تیری چستی ہے شہرۂ آفاق — تیری چالاکیاں ہیں سب سے سوا
تجھ کو ممسوخ جانتے ہیں سب — اک زمانے میں تو بھی انساں تھا
اب بھی انساں سے تو مشابہ ہے — تجھ میں اور ان میں فرق ہے کتنا
اور کوشش بھی ہے تری یہہ مدام — ہو ترا رنگ ڈھنگ اُن کا سا
حرکتیں اُن کی سی تو کرتا ہے — تاکہ اُن میں شمار ہو تیرا
اُن کی نقلیں اُتارتا ہے تو — اُن کا ہر دم اُڑاتا ہے خاکا
لیکن افسوس کوئی کام مفید — اُن کے مانند تو نہیں کرتا
سب تو سب یہہ بڑا تعجب ہے — اِک مکاں تک نہیں بنا لیتا
تا ہو آرام سے بسر تیری — ہو نہ تکلیف و رنج شتا
دن کی دھوپ اور رات کی سردی — سہنی پڑتی ہے تجھ کو صبح و مسا
دامنِ کوہ و سایۂ اشجار — ہے یہی اوڑھنا بچھونا ترا
کبھی اِس شاخ پر کبھی اُس پر — خانہ بر دوش اور آوارا
مجھ کو دیکھو تو مشت پر ہوں میں — زور و قوت مجھے نہیں اصلا
ایک منقار سے بناتا ہوں — رہنے سہنے کو گھونسلا اپنا
تنکے چن چن کے کس مشقت سے — جوڑتا ہوں میں اُن کو سب یکجا
گھر بناتا ہوں میں کچھ اِس ڈھب سے — حیرت انساں کو ہوتی ہے بخدا
بام و در اُس میں ہے سبھی موجود — قصرِ شاہی ہے آشیاں میرا

کیسے آرام سے گزرتی ہے — غصہ کا ڈر نہ چور کا کھٹکا
مجھ کو اور میرے بال بچوں کو — گوشۂ عافیت ہے وہ ماوا
مجھ سے چھوٹی ہے شہد کی مکھی — ہے مکاں اُس کا بھی بہت اچھا

سُن کے بندر تمام یہ قصہ — ہو کے شرمندہ مُنہ چڑانے لگا
جب کہ سوجھا نہ کچھ جواب اُسے — کچکچایا بہت وہ ہو کے خفا
کٹکٹانے لگا وہ دانتوں کو — اُچھلا کودا اِدھر اُدھر ناچا
آخر الامر طیش میں آ کر — گھونسلا اُس کا نوچ کر پھینکا

ہیں زمانے میں بے ہنر جتنے — ہے یہی حال اُن سفیہوں کا
جملی باتوں کا وہ بُرا مانیں — شرم خلق اُن کو ہے نہ خوف خدا
باکمالوں کی گر کریں تقلید — تو پہن لیں فقط لباس اُن کا
وضع کا کچھ کریں نہ پاس و لحاظ — سمجھیں بھروپ کو کمال اپنا
کہے کوئی اگر کہ مشفق من — کیجے اُن کا کمال بھی پیدا
وضع اُن کی فقط بنانے سے — ہوگا حاصل نہ کچھ شرف اُن کا"
کہنے والے کے مُنہ کو یوں نوچیں — قصہ بندر کا جس طرح گزرا

چاہیے سیکھیں ہم ہر اک سے کمال
لمعہ تقلید ہے وہی زیبا

لمعہ ابن سقطا ابن شیعہ دہلوی

تخیل شعری

شعر کی تعریف اہل منطق نے اس طرح کی ہے" الشعر ہو القیاس المولف من المخیلات وہی قضایا تخیل بہا فتیاثر النفس قبضاً وبسطاً" یعنے شعر وہ قیاس ہے جو قضایائے تخیلیہ سے مرکب ہو جس کو سن کر نفس کو انبساط یا انقباض حاصل ہو۔ گویا شاعر بھی ایک مصور ہے۔ مصور قلم سے تصویر کھینچتا ہے اور شاعر خیال سے فوٹو اُتارتا ہے۔ پس جب کوئی تصویر کھینچی جائے تو اُس میں پہلے اصلی خوبیوں کو دکھانا چاہیے۔ فرضی خال و خط سے کچھ حاصل نہیں۔ یہہ عارضی آب و رنگ بہت جلد اُڑ جاتا ہے اور اپنے ساتھ اصلی خوبی کو بھی لے اُڑتا ہے۔ ع بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا اگر فرضی خط و خال ہو بھی تو بقول آزاد اتنا ہو کہ جتنا منہ پر غازہ یا آنکھوں میں سرمہ۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا ع جو خال اپنی حد سے بڑھا وہ مسا ہوا۔

تخیل کا یہہ مطلب نہیں ہے کہ محض خیالی پلاؤ پکایا جائے۔ اور جس چیز کا ذکر کیا جائے اُس کو اُن اوصاف سے متصف کیا جائے جو بالکل بے اصل اور خلاف عقل و عادت ہوں۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں اَن نیچرل شاعری کا خطاب دیا گیا ہے۔ ہم اُس کو نازک خیالی اور بلند پروازی سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ترقی معکوس ہے۔ بقول ناسخ مرحوم۔

مرتبہ کم حرص رفعت میں ہمارا ہوگیا آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہوگیا

خوبی وہی ہے کہ اصلیت کے سورج کو گہن نہ لگنے پائے اور واقعیت کی چمک دکھائی دے جائے۔ وہ پستی اِن بلندیوں سے ہزار درجے بہتر ہے

بقول حضرتِ ذوق ؎

نام پستی میں بھی روشن تر ہمارا ہوگیا جس طرح پانی کوئیں کی تہ میں تارا ہوگیا

بعض وقت تو بے اصل تعریف اُلٹا اثر دکھانے لگتی ہے۔ جیسا کہ ناسخ مرحوم معشوق کی نزاکت کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

بازو و ران و میان و گردنِ محبوب کا رشتۂ پیمائش اے ناسخ برابر ہوگیا

جائے غور ہے کہ جس کے بازو اور ران کی جسامت برابر ہو اُس مدقوق کی کیا ہیئت ہوگی۔ اس شعر کو پڑھکر میڈیکل کالج میں رکھے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے یاد آجاتے ہیں وہ بھیانک صورتیں نظر میں پھر جاتی ہیں۔ اسی پہ کیا موقوف ہے جو بات اصلیت سے دور ہو وہ کبھی لطف نہیں دے سکتی کسی پہلوان کی تعریف میں اُس کو رستم دلیر یا بے دم والا شیر کہدینے ہی بہتر ہے کہ اُس کے چوڑے سینے اور گول گول بازو اور بھرے ہوئے شانوں اور مضبوط کلائیوں کا ذکر کیا جائے جس کے سُننے سے اصلی حالت معلوم ہوسکے کسی امیر کی نازک دماغی کی تعریف میں یہ کہا جائے کہ اگر تیرے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ایک گلاب کی پنکھڑی آجائے تو اُس کے اثر سے تجھ کو زکام ہوجائے گا تو اس تعریف کو سن کر وہ کبھی خوش نہیں ہوسکتا۔ بقول حضرت سعدی رح ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسیٔ آسماں نہی زیر پائے قزل ارسلاں

چنانچہ سال گزشتہ میں نے کسی اخبار کے پرچے میں پڑھا ہے کہ جب امیر کابل ہندوستان تشریف لائے تھے تو کوئی شاعر اُن کی مدح میں ایک قصیدہ کہکر لے گیا تھا اُس میں ایسی ہی کچھ بھٹی کی تھی۔ امیر صاحب نے اُس قصیدے کو سن کر کہا کہ بھائی یہ قصیدہ اُس شخص کو لے جاکر دو جس میں یہ اوصاف ہوں۔ مجھ میں تو یہ اوصاف نہیں ہیں تم ایسا ہی کسی معشوق کے قد کو تاڑ اور سرین کو پہاڑ یا کمر کو بال کہدیتے

کچھ لطف نہیں آسکتا بقول شاعر ؎

حدیث سرین و میانت چہ گویم — کہ دیدہ است کو ہے معلق بکاہے

اس کے برخلاف کعب نے معشوق کے سرو کمر اور قد و قامت کی تعریف میں لکھا ہے۔

عجزاء مدبرۃ ہیفاء مقبلۃ — پیچھے سے بڑی سرین والی ہے اور آگے سے پتلی کمر والی۔

لا یشتکی قصر منہا و لا طول — قد نہ ایسا طویل ہو اور نہ ایسا قصیر کہ جس کی شکایت کی جائے

کسی کے زلفوں کو شب دیجور کی سیاہی یا روز قیامت کی درازی سے تشبیہ دینا اتنا بھلا نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ امرء القیس کے ان اشعار میں مزا آتا ہے۔

وفرع یزین المتن اسود فاحم — چوٹی اس کی پیٹھ کو زینت دے رہی تھی جو کھجلے کی سی کالی تھی۔

اثیث کقنو النخلۃ المتعثکل — اور وہ ایسی گھنی تھی جس طرح نخل کی گنجان ڈالیاں

غدائرہ مستشزرات الی العلی — اس کے گھونگر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے

تضل العقاص فی مثنی و مرسل — جس میں اس کے جوڑے کھلے اور گندھے بالوں میں چھپ رہے تھے

گھوڑے کی تعریف میں کسی نے لکھا ہے ؎

گردنی اوڑھ کے سوجا اگر کوئی سیس — رات بھر خواب میں ٹاپا کرے اتر دکھن

صبح کو ہو کوئی انگریز اگر اس پہ سوار — حاضری کھائے سپاٹو میں تو لنڈن میں ٹفن

گردنی اوڑھنے کے اثر سے رات بھر خواب میں اتر دکھن ٹاپتے پھرنا کس قدر خیال خام اور خواب پریشاں ہے اور اس پر سوار ہو کر سپاٹو میں حاضری کھانا اور لنڈن میں ٹفن اوڑانا کیسا بے مزہ خیالی پلاؤ پکایا ہے۔ اسی گھوڑے کی تعریف میں امرء القیس کہتا ہے۔

مکر مفر مقبل مدبر معا — حملہ کرنے والا اور ضرورت پر بھاگ جانے والا آگے بڑھنے والا اور فوراً پلٹ جانے والا

کجلمود صخر حطہ السیل من عل — مثل سخت پتھر کی چٹان کے جس کو سیلاب نے اوپر سے لڑھکایا ہو۔

مسح اذا ما السابحات علی الونا — تیز رو جب کہ دوسرے گھوڑے تھکن کے سبب سے

اثرن الغبار بالکدید المرکل — ٹاپ کر غبار اڑا رہے ہوں سخت زمین پر۔

میر مونس مرحوم نے بھی گھوڑے کی تعریف میں کیا خوب کہا ہے۔

معشوق ہے یہہ رخش فلک فر بلند سر — بے مثل ہاتھ پاؤں تو یکتا کفل کمر
پستی پہ جلوہ گر ہے کبھی گاہ فوق پر — اُڑ کر کبھی اِدھر گیا آیا کبھی اُدھر

پریاں ہوا پہ آنکھوں کو قدموں تلے ملتی ہیں
پٹھے یہہ صاف ہیں کہ نگاہیں پھسلتی ہیں

خلاصہ یہہ کہ تخیل شعری حد غلو تک نہ پہنچنے پائے جہاں خلاف عقل و عادت کوئی بات بیان کی گئی کلام بے اثر ہو گیا ——— جب اثر نہ رہا تو لطف سخن کہاں۔

بعض صورتوں میں علمائے فن نے غلو کو جائز رکھا ہے اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ وہاں غلو برا نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ صاحب تلخیص المفتاح لکھتے ہیں (و المقبول منہ اصناف منہا ما دخل علیہ ما یقربہ الی الصحۃ و منہا ما تضمن نوعاً حسناً من التخیل و منہا اخرج مخرج النزل و الخلاعۃ) یعنے غلو اُس صورت میں مقبول ہو جاتا ہے کہ اُس میں کوئی ایسا لفظ آجائے جو اُس کو قرین صحت کر دے یا کوئی عمدہ تخیل ہو یا کلام مقام ہزل و مجن میں واقع ہو اس کی مثال میں آیات قرانی اور اشعار عربی لکھے ہیں۔ ہم یہاں اردو ناظرین کے لیے اردو کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ لفظ گویا اس شعر میں۔ ذوق ؎

یہہ جوش نسرین و سمن یہہ لالہ و گل کا چمن — گلشن میں گویا چھا گیا نور سحر رنگ شفق

جوش نسرین و سمن اور لالہ و گل سے چمن میں نور سحر اور رنگ شفق کا چھا جانا اگرچہ خلاف عقل و عادت ہے۔ لیکن لفظ گویا کہہ دینے سے [illegible] ہو گیا

اسی طرح یہہ شعر ذوق ؎

کیا عجب حسن باری ہے کہ وقت باراں — ابر مردہ سے بھی قطرہ مثل آب زلال

ابر مردہ سے آب زلال کسی طرح قطرہ فشاں نہیں ہو سکتا۔ مگر لیا عجب

کہدیتے ہے وہ کہ قرینِ صحت ہوگیا اور غلو مقبول ہوگیا۔ "ماتضمن نوعاً حسناً من التخیل" کی مثال یہہ ہے جیسا کہ حضرتِ ذوق فرماتے ہیں ؎

طایرِ روحِ عدو کے لیے صیاد اجل — سبزۂ تیغ میں جوہر سے لگا رکھا ہے جال

یہاں جوہرِ تیغ کو جال سے تشبیہہ دے کر لطف پیدا کر دیا اس لیے یہہ غلو بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ ہزل و خلاعت کی مثال یہہ ہے جیسا کہ سودا نے گھوڑے کی سست روی کی ہجو میں کہا ہے ؎

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اُس کے نعل کا — لوہا گلا کے تیغ بنائے کوئی لُہار

ہے دل کو یہہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ — رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

یہہ امر بالکل خلافِ عقل و عادت ہے مگر چونکہ کلام بطورِ ہزل واقع ہوا ہے اس لیے یہاں صدق و کذب سے بحث نہیں ہے۔ غرض کہ تخیل میں غلو اُسی حد تک درست ہے جو حدِ امکان سے باہر نہ ہو جس شے کا حال بیان کیا جائے اُس کو اُسی طرح ادا کیا جائے کہ جو حالت اُس کے دیکھنے سے طاری ہوتی ہو وہی حالت اُس کا بیان سننے سے بھی پیدا ہو اگر ایسا نہو تو شعر محض زٹل قافیہ ہے اور کلام بیہودہ۔

لمعہ حیدرآبادی ابن حضرت شعلہ مرحوم

غزل

دل جلوں کا کوئی ارمان نکلنے نہ دیا — چرخِ ظالم نے کبھی پھولنے پھلنے نہ دیا

کوئی کلمہ بھی مرے مُنہ سے نکلنے نہ دیا — مجھ کو اتنا بھی تو قاتل نے سنبھلنے نہ دیا

وعدۂ وصل سے دی تم نے تسلی ناحق — یونہی فرقت میں دلِ زار کو جلنے نہ دیا

گلشنِ دہر میں اے شوخ ستمگر تو نے — نخلِ امید کبھی پھولنے پھلنے نہ دیا

حالِ بیتابیٔ دل آپ کو لکھتا کیونکر — شدتِ درد نے پہلو بھی بدلنے نہ دیا

کیا ہی مجبور ہوئے عشق کے ہاتھوں کوکب — اس محبت نے کبھی پھولنے پھلنے نہ دیا

عبدالرب کوکب (از کریم نگر)

چاہیے

شکرِ خدا فراغت و عشرت میں چاہیے
صبر و رضا مصیبت و عسرت میں چاہیے

جود و سخا و بذل، امارت میں چاہیے
رحم و عطا و عدل، حکومت میں چاہیے

فکر اپنی ہو تو خود غرضی کہتے ہیں اسے
سعیٔ بلیغ خلق کی راحت میں چاہیے

پہنچو گے تم بھی زینۂ اوجِ مراد پر
بال ہمت بلند عزیمت میں چاہیے

ایذا دہی و شر ہیں صفاتِ درندگاں
رحم و کرم بشر کی طبیعت میں چاہیے

دل صاف اگر نہ ہو تو نہیں دوستی کا لطف
صدق و صفا محبتِ الفت میں چاہیے

منہ دیکھے کی ہے جھوٹی محبت جتاؤ کیوں
سرمہ وفا کا چشمِ مروت میں چاہیے

اس کے بغیر ہو گی ترقی نہ قوم کی
کوشش ضرور صنعت و حرفت میں چاہیے

منت نہیں غرض ہے فراغت میں گر کیا
احساں کسی کے ساتھ مصیبت میں چاہیے

دنیا کے جاہ کی طمع و حرص ہے فضول
پائے ثبات راہِ قناعت میں چاہیے

تا حالتِ زوال میں فقر آ کے دکھ نہ دے
ہر ایک سے سلوک امارت میں چاہیے

اس زندگی کی فکر تو دن رات ہے مگر
سوچو کبھی کہ کیا تمہیں تربت میں چاہیے

راضی جو ہو رضائے خدا پر وہی ہے مرد
شکر عافیت میں صبر مصیبت میں چاہیے

کج طبع آئیگا نہ کبھی راہِ راست پر
کیا ہو گا تربیت سے کہ طینت میں چاہیے

رہتا نہیں یہ نشۂ دولت کبھی مدام
ثروت میں انکسار طبیعت میں چاہیے

بندہ کی اس سے بڑھ کے سعادت نہیں ذہین
ہر آن لو لگی ہوئی طاعت میں چاہیے

سید غلام مصطفیٰ ذہین حیدرآبادی

دیاسلائی

ضروریات زندگی میں آگ بھی ایک شدید ضروری چیز ہے۔ قدیم زمانے میں آگ سلگانے کے لیے چقماق استعمال کی جاتی تھی مگر زمانے نے جس طرح دوسری بہتیری قدیم چیزوں کو عدم میں پہنچا دیا۔ اسی طرح اس کو بھی کم از کم رواج عام کے بازار سے نکلوا دیا۔ اور اس کی دکان میں دیاسلائی کو جائے دے دی دیاسلائی چقماق سے بہتر اور آرام دہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر فرد بشر کو آگ سلگانے میں سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ دیاسلائی جہاں بھوکوں کے کھانا پکانے کا انتظام کرتی ہے۔ وہاں خوش طبعوں کو سگار، سگریٹ، بیڑی سلگانے میں کام آتی ہے۔ یہی دیاسلائی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امیروں کے گھروں کا چراغ جلاتی ہے اور غریبوں کو جاڑے میں گرمی پہنچا کر آرام سے سلاتی ہے۔

وہ اگرچہ پیسے میں سو سو ملتی ہے مگر وقت پر لاکھ سے زیادہ کی ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اس پر "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مقولہ صادق آتا ہے۔ اہل ہند و دکن جہاں اور اور چیزوں کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں اس دیاسلائی کے لیے بھی اہل یورپ و جاپان وغیرہ کے محتاج ہیں۔ اگر اہل یورپ دیاسلائی نہ بھیجا کریں تو اہل ہند کے چولھے سلگنے میں دیر لگ جائے اور چراغ جلنے میں ڈھیل پڑا کرے۔

ہندوستان میں چند روشن خیال اصحاب نے ملکی صنعت کو ترقی دینے اور بیکاروں کو کام پر لگانے کی غرض سے دیاسلائی کے تین چار کارخانے احمد آباد، شولاپور، برار، امرتسر میں قایم کیے ہیں۔

گو ابھی وہ دنی پیمانے پر ہیں اور ملک کی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر

مگر پھر بھی صنعت و حرفت کی ترغیب کے عمدہ نمونے ہیں۔ ہمارا ملک جس طرح اور باتوں میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ چلنے سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ دیاسلائی کا کارخانہ قایم کرنے میں بھی پیچھے رہ گیا ہے۔ ہمارے صوبہ جات و اضلاع میں بڑے بڑے وسیع جنگلات (محفوظہ و غیر محفوظہ) موجود ہیں اور معدنی سامان بھی بافراط مہیا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہاں اس کا کوئی کارخانہ قایم نہ کیا جائے؟ اور ہم اس اہم ضرورت کی جانب توجہ نہ کریں۔

ممالک محروسۂ سرکار عالی کی مردم شماری ایک کروڑ بارہ لاکھ نفوس کی ہے۔ گرنی کس ایک ہی کاڑی رکھی جاے (حالانکہ یہ تعداد بہت کم ہے۔ کیونکہ بعض اشخاص خصوصاً سگریٹ پینے والے دن بھر میں ایک ایک ڈبی سے زیادہ خرچ کرتے ہیں) تو روزانہ ایک لاکھ بارہ ہزار ڈبیاں ہوں گی۔ جن کی قیمت روزانہ ایک ہزار ایک سو چھیاسٹھ روپے دس آنے آٹھ پائی ہوگی ایک لاکھ بارہ ہزار ڈبیوں کی فراہمی کے لیے پچاس چھوٹے کارخانوں کی ضرورت ہوگی۔ ہر ایک چھوٹے کارخانے میں پچیس لڑکے کام کر سکتے ہیں اور فی لڑکا نو ڈبیاں بناتا ہے پس ہر ایک کارخانے میں دو ہزار دو سو پچاس ڈبیاں بنیگی اور پچاس کارخانوں میں ایک لاکھ بارہ ہزار سے پانچسو زیادہ بنیگی۔ ان پچاس کارخانوں میں ایک ہزار دو سو پچاس آدمی کام کر سکینگے اور ان کے ذریعے سے ان کے جتنے متعلقین پرورش ہوں گے وہ علیحدہ ہے اور ان کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے۔

ہر کارخانے کو دو ہزار روپیہ اور جملہ کارخانوں کو ایک لاکھ کا سرمایہ کافی ہوگا۔

ڈبیاں بیچنے والوں کو بھی اس سے زیادہ نفع ملیگا کیونکہ ملک ہی میں بننے کی وجہ سے ان کی قیمت ارزاں ہوگی اور کروڑ گری (علاقہ انگریزی و سرکار عالی)

لہ یہ تفصیل گھوکلے برادرز انجنیرس اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی سیوا جی ورکس دیوار اسے دریافت کی ہے۔

نیز کرایہ ریل وجہاز کی کفایت ہوگی۔ علاوہ بریں معدنیات اور چوبینہ کی فروخت سے سرکار و رعایا کو دوسرا معتدبہ فایدہ حاصل ہوگا۔

مفصلۂ ذیل اضلاع میں مندرجۂ ذیل رقبات کا جنگل موجود ہے جہاں یہہ کارخانے قایم ہوسکتے ہیں۔

نمبر	نام ضلع	محفوظ	غیر محفوظ	جملہ
۱-	ورنگل -	۲۳۷۰- مربع میل	۲۰۰۰ مربع میل	۴۳۷۰ مربع میل
۲-	کریم نگر-	۸۱۲ "	۲۲۸۲ "	۳۰۹۴ "
۳-	عادل آباد-	۲۱۱۳ "	۲۰۰۰ "	۴۱۱۳ "
۴-	نظام آباد-	۷۹۵ "	۵۹۳ "	۱۳۸۸ "
۵-	محبوب نگر	۸۰۰ "	۵۶۳ "	۱۳۶۳ "

نظام آباد اور ورنگل کے اکثر جنگلوں میں سے ریل گزرتی ہے اور جگہ جگہ پر اسٹیشن موجود ہیں۔ ان مقامات پر قیام کارخانہ میں بہت بڑی آسانی ہوسکتی ہے۔ یورپی طرز کے علاوہ جھاڑو کی کاڑیوں پر بھی دیاسلائی بنائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کی کاڑیاں شنبھاوین شولاپور میں بنتی ہیں۔ اور یہاں بھی ہر جگہ بن سکتی ہیں۔

جب ہمارے ملک میں لکڑی اور معدنی سامان موجود ہے تو صرف سرمایہ اور کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ کام سکھانے والے تو امرتسر، برار، احمد آباد، شولاپور سے مل جائینگے۔ یورپ تک جانے کی ضرورت نہیں۔

ممالک محروسہ کو روزانہ ایک لاکھ بارہ ہزار ڈبیوں کی ضرورت پڑے گی۔ ان ڈبیوں کی فراہمی کے لیے پچاس کارخانوں کا قایم کرنا ضروری ہوگا پچاس کارخانوں کے لیے ایک لاکھ کا سرمایہ کافی ہے۔ کیونکہ ہر ہر کارخانے کو مشین کے لیے ایک ہزار اور لکڑی اور معدنی سامان کے لیے ایک ہزار روپیے کافی ووافی ہیں۔

ورنگل، کریم نگر، عادل آباد، نظام آباد، محبوب نگر میں دس دس کارخانے یا ہر ضلع میں ایک بڑا کارخانہ قایم کرنا مناسب ہوگا۔ ہر ہر ضلع میں دس چھوٹے کارخانوں یا ایک بڑے کارخانے کے لیے بیس ہزار روپیے درکار ہونگے۔ جو ضلع کی شان سے کچھ بھی زیادہ نہیں ہیں۔

ہر ہر ضلع میں اکثر اشخاص خوشحال ہیں جن کی ادنی توجہ و ہمت پر کارخانوں کا سرمایہ بہم پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ خدا کے فضل سے ملک میں ایسے متمول حضرات بھی ہیں جو بذات خود تمام ممالک محروسہ میں کارخانے قایم کرسکتے ہیں۔ اگر بذات خود نہیں تو مشترکہ سرمایہ سے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ بہرحال توجہ و کوشش درکار ہے اور محنت و استقلال سے ہر کام کا بیڑا پار ہے۔

انجمن عروۃ الوثقیٰ جو تجارتی اغراض کے لیے قایم ہوئی ہے اور جس کی تین غلے کی دکانیں محبوب گنج، منیر گنج، دبیر پورہ میں قایم ہیں۔ بہتر ہوگا کہ وہ صنعتی اغراض کو تجارتی اغراض پر ترجیح دے کے دیاسلائی بنانے کی جانب ملتفت ہو۔

محمد عبدالسلام

غزل

پہلے ستم کے ساتھ ہی کیوں دوسرا نہ ہو — میری وفا کی حد نہ ہو جب انتہا نہ ہو
کچھ بچ رہے ہیں جور جو مجھ پر نہیں ہوئے — اللہ اب کسی پہ کوئی مبتلا نہ ہو
لطف عمیم میں کوئی لذت نہیں رہی — جی چاہتا ہے آپ کا وعدہ وفا نہ ہو
فرقت نصیب، کرنے کو فریاد تو کرے — لیکن خیال یہ ہے کسی کا گلا نہ ہو
اللہ! دو گھڑی کی ہنسی کو ترس گئے — ہم سا بھی بدنصیب کوئی ہے، ہوا نہ ہو
دنیا میں کیا ہے جس کی تمنا کرے کوئی — ہاں! تو ہے، بس ایک تو ہے اگر بیوفا نہ ہو
اپنی نظر میں آپ تسلی ذلیل ہے — ایسا بھی کوئی تیری نظر سے گرا نہ ہو

بعض رسالے

فصیح الملک (حجم ۴۸ صفحے ماہانہ قیمت سالانہ عصا مقام اشاعت ماہرہ ضلع ایٹہ) یہ پرچہ نیا نہیں ہے تین چار سال پہلے سے شایع ہو رہا ہے۔ لیکن درمیان میں بند ہو گیا تھا۔ جنوری ۱۹۰۹ء سے اس کی چوتھی جلد شروع ہوئی ہے۔ اور عمدہ کاغذ پر صفائی کے ساتھ چھپنے لگا ہے۔ ۸ صفحے فصیح اللغات کے بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لٹریری بحثیں چھڑی رہتی ہیں۔ یہ رسالہ بہ وجوہ قابلِ قدر دانی ہے کیونکہ زبان کی خدمت کرنی چاہتا ہے اور فن کے اصلاح کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

الاخوت (حجم ۶۴ صفحے قیمت عصر سالانہ مقام اشاعت لاہور) ۱۹۰۹ء سے بخشی حضور علی صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہوتا ہے۔ یہ انجمن اخوتِ اسلام پنجاب کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کا کاغذ نہایت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ مضامین بھی دلچسپ اور مذاقِ حال کے مطابق درج کیے جاتے ہیں۔ یہ پرچہ ضرور اس قابل ہے کہ اردو پبلک اس کی قدر دانی کرے کیونکہ قیمت کم اور مال اچھا ہے۔

جریدۂ اسلام (حجم ۴۸ صفحے ماہانہ۔ قیمت عصر مقام اشاعت جہلم) نومبر ۱۹۰۸ء سے مولوی نیاز محمد صاحب کی ایڈیٹری میں شایع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کے مقاصد یہ ظاہر کیے گئے ہیں:۔

"(۱) ہندوستان کی موجودہ مخالفانہ شورش سے مسلمانوں کو روکنا۔ (۲) اشاعتِ اسلام میں کوشش کرنا۔ (۳) قوم میں اتفاق و ہمدردی پیدا کرنا۔ (۴) قوم کو علوم و فنون تجارت کی طرف مایل کرنا۔ (۵) بیکار مسلمانوں کی تعداد حکامِ ضلع کو دکھانا۔ (۶) اسلامی مذہبی فرقہ بندی کے جھگڑوں کو دفن درگور کر کے قوم کو مثل یورپ اور امریکہ کے مشینوں کے ایجاد کی طرف مایل کرنا۔"

اصلاح (حجم ۶۸ صفحے ماہانہ۔ قیمت صمہ سالانہ۔ مقام اشاعت کھجوہ ضلع سارن) ۱۲ سال سے جناب سید نظیر حسین صاحب کے زیرِ اہتمام شایع ہو رہا ہے۔ فرقہ امامیہ کے متعلق زیادہ مضامین رہا کرتے ہیں۔ گویا اس کو مذہبی رسالہ تصور کرنا چاہیے۔ اگر اس کی بدولت مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں کسی طرح کا فساد یا بحثا بحثی نہ پیدا ہو اور اپنے فرقے کی اصلاح مدِ نظر ہو تو واقعی اصلاح ہے ورنہ افساد۔

اڈیٹر

مالوف و مانوس ہو گیا تھا۔ اور نہ دن کو جدا ہوتا تھا نہ رات کو۔ میں اُس کا دودھ پیا کرتا تھا۔ اور اُس کے ساتھ گھاس پات بھی کھاتا تھا۔ وہ مجھے جس آواز میں پکارتا تھا میں بھی اُس کو اُسی آواز میں پکارتا تھا۔ میں کبھی کبھی ایک خاص مقام میں روٹی کا ایک ٹکڑا اور کچھ ساگ پات پا لیا کرتا تھا۔

مجھے پہلا رنج و غم جو محسوس ہوا۔ وہ اُس بکری کی موت اور جدائی کا تھا اُس وقت تک نہ مجھے موت کا مفہوم معلوم تھا۔ نہ رنج و غم کا۔ مگر جب بکری مر کے ایک جگہ پڑ گئی اور میرے بے انتہا ہلانے جلانے اور اُلٹ پلٹ کرنے پر ذری بھی حرکت نہ کی تو بے اختیار میرا سینہ بھر آیا۔ اور میں چیخیں مار مار کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ کامل ایک دن ایک رات تک اُس سے جدا نہ ہوا۔ اور نہ کچھ زیادہ کھایا پیا۔ مگر پھر یہ کیفیت کم ہو گئی اور میں بدستور سابق، پھرنے چلنے، کھانے پینے، اور گھاس پات تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

وہاں مجھے سوائے ایک آدمی کے جس کو دیکھتے ہی میں مرعوب ہو کے بھاگ جاتا تھا کوئی اور انسانی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں جس باغ میں مقید تھا اُس میں ایک بڑی عمارت بھی تھی۔ اور میرے گرداگرد بہت اونچی دیوار محیط تھی۔ عمارت کا اکثر حصہ کھنڈر اور جا بجا سے ڈھا ہوا تھا۔ میں دنیا کو اپنی چار دیواری میں محصور سمجھتا تھا۔ کیونکہ میں اُس کے سوا کوئی چیز پاتا ہی نہ تھا۔

ایک دن میں عمارت کی بدر روسے باہر جھانکنے لگا۔ ایک پتلا دبلا سا نحیف الاعضا آدمی نظر آیا۔ وہ کبھی زمین کو دیکھتا تھا۔ کبھی آسمان کو، اُس کو دیکھنے سے میرا دل دھڑکنے لگا اور عجیب کشش سے اُس کی طرف کھچتا ہوا معلوم ہوا۔ میں باوجودیکہ آدمیوں کی صحبت سے متنفر تھا مگر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اُس کے قریب پہنچ جاؤں۔ اور اُس کے

گلے سے چمٹ جاؤں۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔
آدمیوں سے جان پہچان ہونے کے بعد، جب میں نے بچوں، ماؤں اور اُن کے باہمی لطف و محبت کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ جو محبت اُس وقت مجھے پیدا ہوئی تھی وہ صرف میری ماں سے تھی۔ میں نے اگرچہ اُس کو دو تین ہی دفعہ دیکھا۔ مگر اُس کی صورت میرے حافظے میں نقش ہو گئی۔ اور وہ مجھے خواب میں بھی نظر آنے لگی۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا دیے اور مجھے اشارہ کرنے لگی کہ گویا بُلا رہی ہے۔ اِس سے میرا دل اور بھی اُس سے متعلق ہو گیا اور اُس کی صورت اِس طور پر متخیلہ میں جم گئی کہ اب تک نہیں مٹ سکی۔ اگر میں اب بھی اُسے دیکھ پاؤں تو فوراً پہچان جاؤں۔

میں اِسی حالت میں تھا کہ اونچی دیواروں والے باغ میں گھاس پات کھاتا، درختوں پر چڑھتا، اور بارش کا پانی پیتا تھا کہ بلوغ کو پہنچ گیا اُس وقت مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر ایک اندرونی خوف وہیں ٹھہرنے پر مجبور کرتا تھا۔ ایک رات مجھے چند آدمیوں نے مل کے پکڑ لیا اور گاڑی میں بٹھا کے دور دراز فاصلے پر لے گئے اور ایک بازیگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ میں مدتوں اُس کے ساتھ رہا۔ وہ مجھے پھاڑ کھانے والے درندوں کی تیزی و درشتی سکھایا کرتا تھا اور کچا گوشت کھانے کو دیتا تھا میں اُس کو دانتوں سے چبا کے کھا جاتا تھا۔ اُس بازیگر نے مجھے ایک تماشہ اور مضحکہ بنا دیا تھا۔ مجھے اِس سے بڑی شرم معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میں قسمت پر صبر کیے بیٹھا تھا اور متنظر تھا کہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلوں۔

ایک رات وہ بدبخت شراب خواری اور رقص و سرود میں ایسا ڈوبا کہ میرے پنجرے پر قفل لگانا بھول گیا۔ میں نے یہ فرصت غنیمت جانی پنجرے سے نکلا اور سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا۔ راستہ بھر لجاتا تھا

ایک جھاڑی میں جا پہنچا۔ وہاں مجھے یک گونہ راحت و فرحت حاصل ہوئی اور میں مطلق العنان ہو گیا۔ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں پھرتے پھراتے "ماریل" کے گھنے جنگل میں داخل ہوا۔ یہاں مدت تک درختوں کے پتوں اور خود رو نباتات کے دانوں پر زندگی تیر کرتا رہا۔ پھر قسمت نے پلٹا کھایا اور میں پھندے میں پھانسا گیا۔ مگر اپنے سچے دوست جوب اور جیکب ولیم کی بیوی لیڈی کیاٹرن کے ہاتھوں رہائی پائی۔ اس رہائی کے بعد میں نے حضرتِ انسان سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کی کیونکہ مجھے ان حضرت میں قساوت و عداوت کے جذبات دوسرے حیوانات کی نسبت پرلے درجے میں دکھائی دیے۔ میں چھپتے چھپاتے نیلے ٹیلے میں پہنچا اور بالکل پوشیدہ رہنے لگا چند روز میں مجھے اطمینان ہوا کہ اب لوگ مجھے نہ پکڑ سکینگے تو اُن کے قریب قریب جانے لگا۔ میاں بیوی اور ماں بچوں کے تعلقات دیکھنے سے مجھے دل میں محبت کا مزا محسوس ہونے لگا۔ گو میں اُس وقت اُس کی حقیقت کو نہ سمجھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب ملکہ گڑھے میں گر رہی تھی تو میں نے اُسے اپنے ہاتھوں پر جھیل لیا۔ اور سینے سے لگا لیا تھا۔ یہی میرے عشق کی بنا تھی۔ اس کے بعد جو جو حالتیں گزریں وہ آپ پر روشن ہیں۔

اب میں آپ سے صرف ایک امر کا خواستگار ہوں وہ یہ کہ آپ مجھے اُس عورت کو دکھا دیں۔ جس کو میں نے سب سے پہلے دیکھا تھا اور جس سے جاکے میں لپٹ جانا چاہتا تھا اور اگر ہو سکے تو آپ مجھے میرے باپ سے بھی ملا دیں۔"

گیرڈی:۔ (دردِ دل کو بمشکل ضبط کرکے) نورِ نظر! صبر کرو صبر کا پھل میٹھا ہے۔ میں تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا جس کو پورا کر سکوں۔ مگر خدائے تعالیٰ مسبب الاسباب اور مدبر ہے۔ وہ ضرور

تمہارے سرور و راحت کے لیے عمدہ اسباب فراہم کر دے گا"۔
اس حرف و حکایت کے بعد دونوں اُٹھے اور ملکہ اور نواب بیگم کو (جو عنقریب سفر کرنے والی تھیں) رخصت کرنے کے واسطے چلے دونوں بیگمیں خود اُدھر سے ان کے ملنے کو آ رہی تھیں۔ جب چاروں کی چار نگاہیں ہوئیں تو ہر ایک کا دل سوزِ درد و فرقت سے پگھلنے لگا۔ نواب بیگم نے جنگلی انسان سے ایسا عنایت آمیز اور اُنس انگیز برتاؤ کیا کہ اُس کو آنسو ٹپک پڑے۔ ملکہ کو رخصت کرتے وقت اُس نے پورے صبر و شکیب اور جوانمردی سے کام لیا۔ مگر پھر بھی بجز رونے کے کوئی چارہ نہ تھا دونوں نے ہر چند ضبط کی کوشش کی لیکن ہچکی بندھ گئی۔ یہ سین بہت الم انگیز تھا۔ گیرڈی کا بھی دل بھر آیا۔ وہ ملکہ سے بولا: "پیاری ملکہ! تمہیں میرے وعدوں پر بھروسہ رکھنا چاہیے"۔ پھر جنگلی انسان سے مخاطب ہوا: "عزیز من! میں تمہارے صبر و شکیب اور استقلال کو دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ تم نے امید سے زاید مردی دکھائی اب تم بہت جلد خدا کے حکم سے اپنے متمدن ہمسروں سے فایق ہو جاؤ گے اور میرے اور اپنے سچے بہی خواہوں کی دلی راحت کا باعث بنو گے"۔

گیارہواں باب

جدائی

گزشتہ باب میں بیان ہو چکا ہے کہ نواب بیگم نے ملکہ کو ہمراہ لے کے اپنے محل کا رخ کیا تھا۔ جب وہ محل میں آ چکی تو دوسرے دن نواب نے آدمی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ "میں ملاقات کو آنا چاہتا ہوں"۔ ملکہ نے اجازت دی۔

نواب صاحب تشریف لائے اور بڑے احترام و کشادہ پیشانی سے آداب بجا لا کے بیٹھ گئے۔ بیگم نے سلام کا کوئی جواب نہ دیا صرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نواب صاحب فرمانے لگے: "بیگم! میرے اس اچانک چلے آنے پر تمہیں تعجب ضرور ہوگا اور شاید تم اسے پسند بھی نہ کرتی ہوگی مگر ملکہ کی صلاح اندیشی اور بہی خواہی کے لیے مجھے تم سے ملے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔"

بیگم: "(تھرتھراتے ہوئے، نہایت سرعت سے) ملکہ میری بیٹی ہے۔ تمہیں اُس سے کیا سروکار ہے؟"

نواب: "تمہاری بیٹی سہی! مگر آخر میری بھی تو بیٹی ہے۔ اب خدا کے فضل سے وہ ہوش سنبھال چکی ہے اور بمصداق ؎

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

اُس کی شادی بیاہ کا زمانہ آ پہنچا ہے۔ لہٰذا میں نے اُس کے لیے ایک پیارا شوہر تجویز کیا ہے۔"

یہ سنتے ہی بیگم کا کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا، گھبراہٹ سے سینہ پھٹنے لگا

چہرا لال بھبوکا ہو گیا اور گویا بدن کا سارا خون سمٹ کر چہرے کی جلد کے نیچے آ گیا۔ پھر بھی اس نے غصہ ظاہر نہ کیا اور متانت سے بولی :-

"اس معاملے میں تمہارے توجہ کرنے سے میں بہت حیران ہوں بہتر ہوتا کہ تم یہاں تک آ کے اپنے آپ کو زحمت میں نہ ڈالتے۔ مجھے رات دن اس کے سوا کوئی اور فکر نہیں کہ ملکہ کا بیاہ رچاؤں۔ جب وقت آ جائے گا تو مجھے ضرور ایک لایق شوہر سے اس کی شادی کر دینی پڑیگی"

نواب :- "بیگم تم نہیں جانتیں کہ ایک باپ کے اس کی اہل وعیال پر کیا کیا حقوق ہیں"

بیگم :- "بے شک جانتی ہوں مگر باپ باپ بھی تو ہو"

نواب :- "اس میں میری طرف سے کوئی قصور نہیں۔ تم ہی جدائی کا باعث بنیں"

بیگم :- "اب ان الم انگیز باتوں کے اعادے کی کوئی ضرورت نہیں کہیے"

نواب :- "میں بھی اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اصل مطلب بیان کرتا ہوں۔ میں نے ایک نہایت خوشرو، نوجوان، اور کئی ملین فرنک کے مالک کو ملکہ کا شوہر بنانے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ وہ برازیل کے ایک شریف خاندان کا ممبر ہے۔ اور "پیٹر گسٹری" کے نام سے پکارا جاتا ہے"

بیگم :- "ان باتوں کی جانب میں کوئی التفات نہیں کر سکتی، ملکہ کی شادی اسی سے ہو گی جس کو وہ خود پسند کرے اس میں نہ تمہارے انتخاب کو دخل ہے نہ میری پسند کو کوئی علاقہ"۔

نواب :- "ملکہ اس کو پسند کر چکی ہے اور جس طرح پیٹر اس کو

چاہتا ہے۔ وہ بھی اُسے چاہتی ہے۔"

بیگم: "تو پھر وہ خود ہی اس کا اظہار کرے گی۔ تمہارے واسطے کی کیا ضرورت ہے۔"

نواب: "میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت بیزار ہو۔ اس لیے میرے انتخاب کو بھی ناپسند کرتی ہو۔ لیکن جب تم اُسے بچشم خود دیکھو گی۔ تو میرے انتخاب کی داد دو گی اور مجھے اُس کی تعریف میں سچا پاؤ گی۔"

بیگم: "تمہاری ان باتوں کو سُن کے ایک غمگین سے غمگین عورت بھی جس کا بچہ مرگیا ہو ہنس پڑے گی، ملکہ کو بیاہکر میرے گھر سے کوئی شخص نہیں لے جاسکتا مگر وہی جس کے انجام کار پر اطمینان ہو۔ اور جس کی جانب سے کوئی خوف و خدشہ پیدا نہ ہوسکتا ہو۔ تم نے مجھے جیسا فریب دیا تھا ویسا اُسے کوئی نہیں دے سکتا۔ اور نہ کوئی مجھ پر اُس کی شادی کے بارے میں جبر کرسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اُس کی ثروت کو دیکھ کے اُس پر ریجھ گئے ہو۔ بلکہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم میں اور اُس میں کوئی شیطانی سمجھوتہ ہوا ہے۔ اور تم میری بیٹی کو اُس کے حوالے کرکے اُسے راضی کرلینا چاہتے ہو۔"

نواب: "تمہارے خیالات بالکل واہی ہیں۔ میں ملکہ کے لیے جو کچھ کوشش کررہا ہوں اُس کی غرض صرف یہ ہے کہ اُس کو اپنی آیندہ زندگی میں راحت حاصل ہو۔"

بیگم: "لیکن میں تمہاری کوششوں کی قایل نہیں۔ اِس شخص کو ملکہ جانتی نہیں نہ کبھی دیکھا ہے۔"

نواب: "نہیں دیکھا۔ تو کیا مضایقہ۔ کل دیکھ لیگی۔ میں نے اُسے لکھ دیا ہے کہ کل یہاں آجائے۔"

بیگم: "(گھبراکے) وہ کل یہاں آئیگا؟ تمہاری یہہ جسارت ہوگئی کہ میرے

بے اجازت میرے گھر میں حکم احکام چلاتے ہو۔"

نواب: "مجھے اس کا حق حاصل ہے اپنے کسی دوست کو اپنے مکان پر بلانے کے لیے مجھے تم سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بیگم: "کوئی ضرورت نہیں! تم یہ کہتے ہو؟ اور تمہارے حقوق اب تک ویسے ہی باقی ہیں؟"

نواب: "بے شک باقی ہیں۔ ابھی اتنا زمانہ نہیں گزرا کہ وہ متغیر ہو جائیں۔"

بیگم: "اس تو تو میں میں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اس کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

نواب: "نہیں! تم کو اجازت دینی پڑے گی۔ تم ایک خوش خلق اور مہذب خاتون ہو۔ تمہیں مہمان سے بے مہری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ اس کے سامنے کوئی ایسی حرکت ہونی چاہیے۔ جو اسے ہماری باہمی ناچاقی سے مطلع کر دے۔"

بیگم: "خیر اگر تم اس کی مہمانی پر مجھے مجبور ہی کرتے ہو تو مہمان نوازی سے مجھے دریغ نہ ہوگا۔ مگر شادی بیاہ کی نسبت جو کچھ ٹھانے ہوئے ہو وہ قیامت تک ہونے والی نہیں۔"

نواب: "بیگم! مجھے سوکھا جواب نہ دو۔ یہ آدمی نیک سیرت، نیک دل اور نیک نفس ہے ملکہ کی تصویر دیکھتے ہی، اس پر شیدا ہو گیا ہے اور مجھ سے اس کی خواستگاری کی ہے۔ میں نے اس کی استدعا منظور کر لی ہے۔"

بیگم: "تمہیں اس معاملے میں اپنی بے اختیاری کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ اب چونکہ تم اپنے وعدے کو ایفا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ایسے بھنور میں جا پڑے ہو۔ جو تمہیں ننگ و عار کی دلدل میں ڈبو دے گا۔"

نواب: "تم سے جو کچھ بن پڑے کر گزرو اور آپس میں یہ نفاق ڈالو۔"

بیگم :۔ اور تم بھی اپنی قوت آزما لو۔ دیکھوں تو کیسے کامیاب ہوتے ہو۔"
نواب :۔ "میں تمہیں دلیل سے قایل معقول کرتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ
میں اپنی تمام ملک املاک کھو چکا ہوں۔" ہے۔"
بیگم :۔ "کھویا کرو۔ اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ مال اگر آتا ہے تو جاتا بھی
نواب :۔ "اس آدمی کا بہت سا روپیہ میرے ذمے باقی ہے۔ اگر ملکہ کی
اس سے شادی ہو جائے تو اس رقم خطیر سے مجھے سبکدوشی
ہو جائیگی۔"
بیگم :۔ "بہت خوب! آخر وہی بات ظاہر ہوئی جو پہلے سے دل میں کھٹک
رہی تھی۔ جس طرح بازار میں کوئی بکاؤ مال بیچا جاتا ہے۔ اسی طرح
تم میری بیٹی کو روپیے کے عوض بیچنا چاہتے ہو۔ اور پھر یہ کتنی بڑی
بے شرمی ہے کہ اس کو مجھ سے بیان بھی کرتے ہو۔"
نواب :۔ "تم نے میری بات پوری نہ ہونے دی اور نہ مطلب سمجھا
اصل یہ ہے کہ آج کل قرضخواہ ہر وقت مجھ سے چمٹے رہتے ہیں
اور بے طرح میرا پیچھا کیے ہوئے ہیں۔ ان کے تقاضوں سے نجات
پانے کی کوئی صورت نہیں مگر یہ کہ تم اپنا مال ومتاع اور باغ و
زمین وغیرہ میرے حوالے کرو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کو ضرورت
کے وقت تم پر جبر کر کے میں پورا کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہارا شوہر
ہوں اور ابھی تک ہمارے مابین شرعی خلع نہیں ہوا ہے۔ نہ تم کو
یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ اسرار ظاہر کرو۔"
بیگم :۔ "تمہیں خدا کی سنوار۔ تمہارا جو جی چاہے کیے جاؤ۔ میرے پاس اگر
کچھ روپیہ ہے تو ان کا بھی خزانہ ہو تو میں تمہیں ایک حبہ نہیں دینے کی۔ میرے
پاس جو پیسا ٹکا ہے، وہ میرا ہے نہ میرے بچوں کا۔"
نواب :۔ "کیونکہ وہ میرا ہے۔ نہیں تو تمہیں بتاؤ کہ کس کا ہو گا۔

بغیر بتائے میں نہیں ماننے کا۔"

بیگم "سنو! تم نے مارکوئس چیمبری اور اُس کے بچے پر جو جو مصیبتیں ڈھائیں۔ اُن کے عوض یہہ نقد و جنس صرف اُن ہی کے لیے محفوظ ہے اور یہہ صرف اس لیے کہ میرے بچوں کی عزت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اس وقت میں بجز اس کے کہ مارکوئس کی وکیل ہوں اور اُس کے ظاہر ہوتے ہی یہہ سب اندوختہ اُس کو سونپ دونگی اور کچھ نہیں ہوں۔"

یہہ سنتے ہی نواب ادبدا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کو محسوس ہونے لگا کہ آسمان اُس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ فوراً وہاں سے چلنے لگا اور یہہ کہتے ہوئے کہ "کل سب کچھ معلوم ہو جائے گا" چلا گیا۔ نواب بیگم نے اُس کے جانے کے بعد، جی میں خوب گالیاں دیں اور تخیلاتِ رنج و غم میں ڈوب گئی۔

دوسرا دن نکلا۔ پیٹر آیا۔ نواب بیگم اور ملکہ نے خندہ جبینی سے اُسے لیا اُس کی گفتگو اور انداز سے معلوم ہوا کہ وہ ذی مروت، راستباز، خوش خلق اور باعزت آدمی ہے۔ نواب بیگم کو حیرت ہوئی کہ ایسا آدمی کیونکر اُس کے شوہر کی صحبت میں رہتا ہے۔ پھر سمجھی کہ جس طرح شادی کے پہلے اُس نے خود اس کو دھوکا دے دیا تھا۔ اُسی طرح اس بھولے آدمی کو بھی فریب دیا ہوگا۔ اُسے یہہ بھی اُمید بندھ گئی کہ اگر اُس کو ناراضامندی کا حال معلوم ہو جائے گا تو پھر خود استگاری کرنے سے اُس کی خودداری مانع ہوگی

نواب نے اس دن بھی شادی کے بارے میں گفتگو کی۔ مگر مخالفت کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ نواب نے اپنی ناکامی اور پوری کوشش کے صرف کرنے کا حال پیٹر سے بیان کیا۔ وہ بولا "دیکھو نواب! تم

میرے اس معاملے میں پوری جد وجہد سے کام نہیں لے رہے ہو ورنہ تمہارا ناکام رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اچھا ایک کام کرو۔ مجھے خود ملکہ سے ملا دو۔ میں اُس سے سمجھ لونگا۔ تم نے میرا ایک لاکھ فرنک کا نوٹ چُرا کر مجھے جو نقصان پہنچایا ہے۔ اُس کی تلافی یونہی ممکن ہے کہ مجھے اپنا مطلوب حاصل ہو جائے۔"

پیٹر کا یہ آخری جملہ نواب کے لیئے بجلی تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے سیف برہ اُس سے اُس کا سینہ شق کر دیا۔ اُس کی آنکھیں شدت خوف سے باہر نکل آئیں اور اُس نے اپنے آپ کو پیٹر کی غلامی میں قید پایا۔ پیٹر بھی اس حالت سے مطلع ہو گیا اور تسلی دینے کے طور پر بولا: "نواب تم ڈرو نہیں میں اس کو ظاہر نہیں کروں گا۔ تمہاری بیٹی بچوں کی رسوائی مجھے اس کے افشا سے مانع ہوتی ہے۔"

پیٹر کے سمجھانے پر نواب چپکا چلا گیا اور ملکہ کو تنہائی میں لے جا کے تمام ماجرا من وعن کہہ سنایا۔ اُس کی ماں کی مخالفت بھی گوش گزار کر دی۔ سب سُن سُن کے ملکہ بولی: "باوا جان! آپ کے ارشاد کی تعمیل میں دو باتیں مانع ہیں۔ اول یہ کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ دوسری یہ کہ اماں جان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتی۔"

نواب: "بیٹی! جب تم خود راضی ہو جاؤ گی تو وہ بھی چار ناچار ہار مان کے راضی ہو جائے گی۔ تمہاری شادی تو ایک نہ ایک دن ہونے والی ہے پھر اس میں تامل ہی کیا ہے! تم اگر اپنے کو میرے حوالے کر دو گی تو اس میں دونوں کی بھلائی ہے۔ میں قعرِ بربادی کے کنارے جا لگا ہوں اور میری بربادی گویا خاندان کی بربادی ہے۔ اس وقت خاندانی عزت و شرافت کے بچانے کا موقع ہے۔ صرف تمہارے

ارادے پر جہنم کے گڑھے سے مخلصی پانا موقوف ہے۔ اور فقط پیٹر ہی ایسا آدمی ہے جو ہمیں خطرے سے بچا سکتا ہے۔ اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت اگر کسی میں ہے تو وہ تم ہی ہو۔ میں کچھ اپنی ذاتی مصلحت کے لیے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کیونکہ ایک گولی میرا مغز پاش پاش کر سکتی ہے اور میں تمر ضحواہوں کے چنگال سے چھوٹ سکتا ہوں۔ مگر میری نظر تمہاری اور تمہاری ماں اور بھائی کے فائدوں پر ہے۔ میں ان کی شرافت کی نگہداشت سے خوف کھاتا ہوں۔ اور اپنے ٹھانے ہوئے ارادے سے باز رہتا ہوں۔ بس ملکہ خوب سوچ کر بولو کہ ہم سب کو خطرے کے گڑھے میں ڈھکیل دینے کے لیے تمہارا دل تمہاری اطاعت کرتا ہے یا کیا؟"

نواب ان الفاظ کو دلی درد و رقت کے ساتھ غم بھرے لہجے میں تیزی سے کہہ رہا تھا۔ اور آخر میں رو بھی پڑا۔ ملکہ سی رحم دل نازنین کا دل اس منظر کی کب تاب لا سکتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ دل دہل گیا۔ اور پٹ پٹ کر نسو گرنے لگے۔ نواب سمجھا کہ شاید اس کے غصے سے ڈر کے رو رہی ہے۔ شفقت اور پیار سے دیکھ کے نرم لہجے اور دبی ہوئی آواز میں بولنے لگا: "میری بیٹی! پیاری بیٹی! لاڈلی بیٹی! اب تو کہہ۔ کیا کہتی ہے! تیرے ایک لفظ پر میری موت و زندگی کے جھگڑے کا فیصلہ ہے۔"

ملکہ: "(کانپ کر اور اپنے جسم و جان سے بے خبر ہو کر) میں قبول کر چکی ہوں ابا جان! میں قبول کر چکی۔"

نواب: "(جوش طرب سے اٹھ کر، اور ملکہ کو گلے سے لپٹا کر) میں جی اٹھا بیٹی! میں جی اٹھا۔ دنیا کی تمام بیٹیوں کو تجھی سے سعادت کا سبق لینا چاہیے۔ تیرے پہلو میں شریف دل ہے اور رحم سے بھرا ہوا۔ تیرا

حوصلہ بہت بڑا ہے اور پہاڑوں سے زیادہ بلند، تیری عقل نہایت پختہ ہے اور باوجود کم عمری کے حل مشکلات میں رسا واقع ہوئی ہے۔ میں تجھ سی بیٹی پر جس قدر فخر و ناز کروں زیب دیتا ہے اور جتنی خوشی مناؤں سزاوار ہے۔ مگر بیٹی! یہ تو سن! تیری ماں عجیب قسم کی عورت ہے ذری ذری سی بات پر جھلا اٹھتی ہے اور برا مان جاتی ہے۔ اگر یہ خبر اُس تک پہنچی تو سمجھ لے کہ قیامت بپا ہو گئی۔ پس اِس بارے میں بہت احتیاط سے کام لے کہ اُس کے کانوں تک اس کی بھنک بھی نہ پڑنے پائے۔ ورنہ تیری میری خیر نہیں۔"

غریب ملکہ نے ہچکیاں اور سسکیاں بھرتے ہوئے اخفائے راز کا قول دیا اور خود غرض نواب اپنی غمزدہ بیٹی کو تنہا چھوڑ کے، دوڑتا ہوا پیٹر کے پاس آیا اور اُسے ملکہ کی رضامندی کا مژدۂ جانفزا سنایا۔ پیٹر بولا: "دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ تم اِس طریقے میں ہرگز ناکام نہیں ہو سکتے آخر مطلب نکل آیا۔ اب مجھے کم از کم ایک ہفتے کے لیے یہاں سے چل دینا چاہیے کہ اِس عرصے میں ملکہ اپنے مستقبل کو سوچ سمجھ لے اور میرے استقبال کو تیار رہے۔ جب میں لوٹ کر آؤں گا تو اُس کی دلجوئی میں پورے وسایل سے کام لونگا۔"

اِس غیر حاضری سے اُس کا منشا یہ تھا کہ نواب اور نواب بیگم میں خصومت کی جو بجلیاں کوندنگی اور عداوت کی جو تیز آندھیاں چلینگی اُنہیں وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے۔

شام کو سب آدمی دسترخوان پر جمع ہوئے، پیٹر نے اپنے روزِ آیندہ کے سفر کا اعلان کیا اِس سے نواب بیگم کو گونہ حیرت ہوئی۔ اُس نے پیٹر کا چہرہ بہ غور دیکھا، پھر نواب اور ملکہ پر نظر ڈالی۔ اُنکی صورتوں سے کوئی خاص بات نمایاں نہ ہوئی۔ اِس سے اُس کے دل میں خوف و تشویش

پیدا ہوگئی۔

کھانے سے فارغ ہونے پر نواب بیگم نے پیٹر کو علیحدہ بلا کے پوچھا۔
"جناب من! آپ نے بہت جلد واپسی کا تہیہ کرلیا۔ آپ کی مہمانی بھی ابھی پوری نہ ہونے پائی آخر اس کا کیا سبب ہے؟"

پیٹر:۔ "میں جس قصد سے آیا تھا وہ پورا ہو چکا اور امید بندھ گئی"۔

نواب بیگم:۔ "کیسی امید! مجھے نواب سے جو جو جھگڑے پیش آئے وہ آپ نے نہیں سنے؟"

پیٹر:۔ "سب سن چکا مگر میں امید رکھتا ہوں کہ اگر کچھ عرصے تک آپ سے ملتا جلتا رہونگا تو آپ کو میری غلامی سے اس وقت جو انکار ہے۔ وہ جاتا رہیگا"

نواب بیگم:۔ "آپ سے رشتہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں مگر اصل یہ ہے کہ ایک بڑا راز جو وقت آنے پر کھل جائیگا آپ کے حصول مرام میں سنگ راہ ہے"

پیٹر:۔ "جب پیاری ملکہ میرے قابل ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے دور نہیں کرسکتی"

نواب بیگم:۔ "لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ وہ آپ کو قبول نہیں کرتی"۔

پیٹر:۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس نے مجھ کو قبول کرلیا"

نواب بیگم:۔ "یہ کیونکر؟ محال۔ محال!"

پیٹر:۔ "نہیں بلکہ قول و قرار بھی ہوگیا۔!"

نواب بیگم:۔ "ائیں! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

پیٹر:۔ "جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ ہے"

نواب بیگم:۔ "کیا مجھے دھوکا دیا گیا۔ افسوس!"

پیٹر:۔ "اب آپ کو کچھ اور بھی فرمانا ہے؟"

نواب بیگم:۔ "جی نہیں۔ تشریف لے جائیے۔"

پیٹر نے جو حقیقتِ حال ظاہر کی، اس کے سننے سے نواب بیگم کو یقین آگیا کہ ضرور کوئی مقصدہ پردازی کی گئی۔ اس کے اعضا میں سنسنی سی پیدا ہوگئی اور غم کی ایسی حالت طاری ہوئی کہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اسے دیوار سے سہارا لینا پڑا۔ جی میں بولی:۔ "اے اس خبیث اس باجی اس مکار نے بھولی ملکہ کو کس فریب میں آتارا کہ وہ بالآخر راضی ہوگئی۔"

بعد ازاں وہ ملکہ کے کمرے میں گئی۔ اسے بھی اپنی طرح کرب و اضطراب میں پایا۔ پوچھنے لگی:۔ "ملکہ! تو پیٹر کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہوگئی؟ میں نے ابھی ابھی جو کچھ سنا وہ صحیح ہے یا غلط؟"

ملکہ:۔ "اماں جان آپ جو کچھ سن کے آئی ہیں درست ہے۔"

نواب بیگم:۔ "تعجب! حیرت!! میں خاص تیری زبان سے یہ لفظ سن رہی ہوں۔ کیا کوئی اور اس کا کہنے والا ہے؟ تجھے اس قسم کی خواستگاریوں کے قبول کرنے میں میری رضامندی کا بھی کوئی خیال نہیں؟ میں جانوں تو مجھ سے بیزار اور ناراض ہے اور غالباً مجھ سے الگ رہنا چاہتی ہے۔"

ملکہ:۔ "نہیں اماں جان! یہ آپ کا کیا خیال ہے۔"

نواب بیگم:۔ "پھر اس بارے میں تو نے اپنی خود مختاری کیوں بری؟ اور کیوں اپنے باپ کے دم جھانسے میں آگئی؟"

ملکہ:۔ "باوا جان کی اطاعت کے بغیر کوئی چارا نہیں۔"

نواب بیگم:۔ "افسوس ملکہ! کیا تو اس اجنبی کو دوست رکھتی ہے؟"

ملکہ:۔ "آج کل تو نہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ شادی کے بعد اس کو چاہنے لگوں۔"

نواب بیگم:۔ "یہ کبھی نہیں ممکن۔ تو اسے کیونکر چاہیگی؟ تیرے دل میں تو کوئی اور ہی بیٹھا ہوا ہے۔"

ملکہ:۔ ہائے! وہ کون اور ہے؟"
نواب بیگم:۔ "کیوں چھپاتی ہے؟ تو تو جنگلی انسان کی والدہ نہیں ہے"
ماں کی زبان سے یہ جملہ سن کے ملکہ آب آب ہو گئی اور اُس کے تن بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ دبی زبان میں بولی "مجھے اُس سے اس قسم کی محبت تو نہیں البتہ اُس کی نیکوکاری کی وجہ سے میرے دل میں جذبات شکر پیدا ہوتے ہیں"
نواب بیگم:۔ "جھوٹ، بالکل جھوٹ تو بناوٹ سے کہہ رہی ہے"
اس کا جواب ملکہ کی جانب سے خاموشی تھا اور ٹپکنے والے آنسو۔
نواب بیگم:۔ "یہ تیرے مغلوب ہونے کی علامتیں ہیں۔ اب تو قایل ہو گئی"
ملکہ:۔ "بہر طور پیٹر سے شادی کرنا ضرور ہے"
نواب بیگم:۔ "تجھے اس کا اختیار حاصل ہے۔ میں کون اور مجھے دخل دینے سے کیا علاقہ؟"
ملکہ:۔ "یہ کام آپ کی خوشنودی کے بغیر کبھی نہ ہوگا"
نواب بیگم:۔ "میری خوشنودی غیر ضروری اور ناممکن ہے۔ نہ جانوں تیرے خیالات کس طرح پلٹ دیے گئے۔ افسوس ملکہ! تو نے مجھے سخت آفت میں پھنسا دیا۔ نہیں معلوم تیرے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جو تو راضی ہو گئی میں اگر یہ تجھ پر اور تیرے باپ پر اپنی کوششوں سے غالب ہو جاؤنگی۔ اور تجھے موقع ہی نہ دونگی کہ میری مخالفت کرے مگر حیران ہوں کہ تجھے کسطرح دھوکا دیا گیا۔ (ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر اور زور سے ہلا کر) چپکی سانڈھے کیوں بیٹھی ہے۔ کہہ تو سہی کہ کیا ہوا۔ غالباً تجھے کسی بلائے عظیم کے خوف سے ڈرا دیا گیا"
ملکہ:۔ "اماں جان! کوئی بات بیان کرنے کے قابل نہیں"
نواب بیگم:۔ "ہاں میں سمجھ گئی۔ تیرے باپ نے تجھے منع کر دیا ہے کہ کسی سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر ۶ صحیفہ جلد ۴

آبادیٔ حیدرآباد کی تاریخ

رودِ موسیٰ کی صدیوں تک یادگار رہنے والی طغیانی، کی بدولت، اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ حیدرآباد کی آبادی، اور گزشتہ طغیانیوں کے متعلق مختصر تاریخی واقعات، منظرِ عام پر لائے جائیں جن سے نہ صرف دلچسپی پیدا ہو بلکہ آیندہ تجاویز، ذرایع انسدادِ طغیانی، تدابیرِ حفظِ ماتقدم، تعینِ حدودِ ممنوعہ، میں بھی ان سے ضروری مدد مل سکے۔

تاریخ آبادی

ہندوستان میں، فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ اُس کی آبادی مسلمان انجنیروں کے ہاتھوں کی ممنونِ احسان ہے۔

جب[۵۱] تخت گاہِ گولکنڈہ کا دایرہ، شاہانِ قطب شاہیہ کے دامنِ عاطفت میں اپنی روز افزوں آبادی پر تنگ ہونے لگا، اور اُس کی کثرت سے آب و ہوا بگڑ گئی تو خود بہ خود نئی نئی زمینیں آباد ہونے لگیں اور جہاں اب حیدرآباد بستا ہے اچھی آبادی ہو گئی۔

[۵۱] ماخوذ از تاریخِ فرشتہ و تاریخ قطب شاہیہ و تاریخ عزیزِ دکن ۱۲ منہ

پرانا پل باوجودیکہ باقاعدہ طور پر شہر کی بنا نہیں ڈالی گئی تھی لیکن آبادی کی کثرت اس سے اچھی طرح قیاس کی جاسکتی ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں جس کے عظیم الشان پبلک ورکس (مثل تالاب حسین ساگر، ابراہیم پٹن وکنکور وکتوہ بدویل وغیرہ) ہمیشہ اُس کا نام زندہ رکھینگے، ۹۸۱ھ ہجری میں پرانا پل تعمیر کیا گیا جس کو اس وقت تخمیناً ساڑھے تین صدیوں کا ممتد زمانہ گزرتا ہے اور جو دوسرے کارہائے تعمیر کی طرح اُس وقت سے لے کر اب تک اپنے بانیوں کی اعلیٰ حذاقت کو اپنی مضبوط بنا سے یاد دلا رہا ہے۔ اس پل کی تعمیر کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے سوا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتی کہ موسیٰ کی طغیانی سے خلائق کو مرور وعبور میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ لہٰذا اس رفاہ پسند بادشاہ نے، رفاہ عام کی غرض سے پل کی تعمیر کا حکم دیا۔

اس وقت کوئی ایسا مواد نہیں ملا جس سے یہ اندازہ لگایا جائے کہ پل کی تعمیر کے وقت حیدرآباد کی آبادی کتنی اور کس وضع کی تھی؟ لیکن جب اس امر پر غور کیا جائے کہ دو لاکھ[۵] ہن کی لاگت سے پل تیار کیا گیا تو بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس پل پر کافی آمد و رفت ہوتی ہوگی اور پل کے نہ ہونے سے کاروبار میں بڑا ہرج ہوتا ہوگا جس کے لیے یہ بڑا صرفہ گوارا کیا گیا۔

جدید پلوں کے مقابلے میں یہ پرانا پل، اپنی پائداری سے نہ صرف اپنے بنانے والوں کی اعلیٰ قابلیت کو ثابت کر رہا ہے بلکہ اس امر کا بھی اعلان کر رہا ہے کہ رفاہ پسند سلطنت قطب شاہیہ کے زمانے میں رفاہ عام کے لیے کس کشادہ پیشانی سے رقم صرف کی جاتی تھی۔ جو سچ پوچھیے تو اس روشن زمانے کے لیے بھی جس میں گورنمنٹ کا کانسٹیٹیوشن بجز رفاہ رعایا کے اور کچھ نہیں بتایا جاتا در اصل قابل تقلید ہے۔

حیدرآباد کا بسایا جانا پرانے پل کی تعمیر کے سترہ سال بعد ابراہیم کے فرزند محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں

[۵] یعنے معہ لاکھ روپیہ۔ ہر ہن مساوی ہے ساڑھے تین روپیے کے ۱۲ آنہ۔

(جس کو پبلک ورکس کا شوق بھی ترکہ میں ملا تھا) اُس وقت جب کہ سن ہجری کا پہلا الف قریب ختم تھا (یعنے سنہ ۹۹۸ھ) حیدرآباد باقاعدہ طور سے بسایا گیا۔
سرشتہ پبلک ورکس نے جو ابراہیم کے زمانے میں ایسے ایسے عالی شان کام کر چکا تھا اس وقت نمایاں ترقی حاصل کر لی تھی۔

حیدرآباد جس ماہر انجنیر یا محاسب کے زیر نگرانی آباد ہوا اُس کا نام بتانے سے تاریخ نے ہم کو محروم نہیں رکھا۔
میر ابوطالب خان ناصر الممالک وہ نامور شخص ہے جس کی مفصل رپورٹ کا حوالہ تاریخ قطب شاہیہ میں اس طرح موجود ہے:۔

"آنچہ در ایام سلطنت خاقان زمان خرج عمارات عالی شدہ سیادت پناہ میر ابوطالب ناصر الممالک بقلم در آوردہ مبلغ ہفتاد لک ہن است"

افسوس ہے کہ اس وقت یہ رپورٹ ہمارے پاس موجود نہیں ہے، جس سے بہت کچھ مفید معلومات حاصل ہو سکتے تھے۔
قطب شاہی خاندان چونکہ ایرانی النسل تھا لہذا عموماً اُن کے نظم سلطنت نیز تمدن میں ایرانی زبردست اثر موجود تھا اور یہی اثر اس زمانے کی تعمیرات میں صاف صاف نمایاں ہے۔ خصوصاً جب کہ وزراء ارکان سلطنت، انجنیر بھی ایرانی ہوں۔ دکن کے ملکی اثرات۔ شاہان اسلام ہندوستان کے تعمیری نمونے۔ ایرانی اثر ان سب سے مل جل کر کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاص جدت حیدرآباد کے تعمیرات میں پیدا ہو گئی جس کا نمونہ "چار مینار" ہے۔
تاریخ تعمیر عرب میں اس سے ایک مناسب اضافہ کیا جا سکتا ہے۔
آبادئ شہر جس مناسب انداز پر قایم کی گئی اس کا نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شہر کس باقاعدہ طریقے پر بسایا گیا تھا صحیح پیمایش۔ سیدھی اور کشادہ سڑکیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے

اور اُن تمام تفصیلات سے قطع نظر جو تاریخ قطب شاہیہ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ فرشتے کے سُنے ہوئے الفاظ یہہ ہیں :-

"در تمامی ہندوستان مثل آں در لطافت وصفا ہرگز یافتہ نمی شود۔ بازار ہا بخلاف سایر ہندوستان بطرح ۔۔۔ واقع شدہ در غایت وسعت وصفا آب وہوائے تندرست دارد و با مسافر و مجاور دم در موافقت و سازگاری می زند۔ اکثر بازار ہائے او از دو طرف جدولہائے آب رواں ست و در کنار جدولہا درختان سایہ دار نشاندہ و دکاکین را در کمال مطبوعی از گچ و سنگ ساختہ اند"

اِن الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد، کیا بلحاظ فن تعمیر اور کیا بلحاظ ذرایع آبپاشی اُس وقت ہندوستان میں منتخب گنا جاتا تھا یہاں کے بازار، اُن کی وسعت وصفائی۔ سڑکوں کے دونوں طرف پانی کی نالیاں اور ان کے کناروں پر درخت یہہ سب باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اُس زمانے میں بھی سررشتۂ پبلک ورکس نہایت قابل تعریف اور اعلیٰ درجے پر تھا۔ جب ذرایع آب رسانی اس قدر کثرت سے تھے تو اِس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ندی سے پوری طرح کام لیا جاتا تھا جس کی تصدیق اب حال کی طغیانی میں یوں ہوئی ہے کہ میر عالم کے تالاب کو جانے کی راستے میں ایک بڑی نہر کا وجود ثابت ہوا ہے۔ جب پانی سے سڑکوں پر اس قدر کام لیا جاتا ہوگا۔ تو اس زمانے کی آب وہوا میں بھی بہ نسبت اِس زمانے کے نمایاں فرق ہوگا۔

حیدرآباد کا یہہ دورِ ترقی اِسی طرح سلطان محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے زمانے تک مسلسل جاری رہتا ہے۔ جب کہ مکہ مسجد جیسی عالیشان عمارت کے ذریعے سے شہر کی پوری عظمت قایم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب آبادی بھی دور دور تک پھیل گئی تھی۔ سلطان نگر (قریب رنگمحل) سید آباد۔ منصور آباد۔ حیات نگر۔ خیریت آباد اسی کی یادگاریں ہیں اور اِن سب مقامات کی آبادی سے جو دور دور پھیلے ہوئے اور بلحاظ موقع کے

بھی اچھے ہیں۔ نہ صرف فن تعمیر کی اعلیٰ مہارت بلکہ اُصول حفظان صحت کا لحاظ ملحوظ رہنے کی بھی پوری تصدیق ہوتی ہے۔

اِس وقت تک جو کچھ آبادی اور پبلک ورکس تھے وہ سب حکومت کی طرف سے تھے لیکن سلطان عبداللہ قطب شاہ کے وزیر اعظم یا اُس زمانہ کی اصطلاح کے مطابق میر جملہ مرزا محمد سعید نے جو اپنی عجیب پولیٹکل قابلیتوں کی وجہ سے تاریخ دکن میں ایک انقلاب انگیز دور کا بانی ہے۔ پرایویٹ کوششوں کی یادگار باقی چھوڑی ہے۔ میر جملہ کا تالاب اُس زمانے میں ذرایع آب رسانی کے لحاظ سے اُسی قدر کارآمد تھا جس قدر اب وہ مضر گنا جاتا ہے۔ میر جملہ کے زمانے کی عمارتوں میں ایک خاص نزاکت کا پتہ چلتا ہے جس سے گویا اُس دور ترقی کے خاتمے کی خبر مل رہی تھی۔

رودِ موسیٰ کی پہلی طغیانی اِسی زمانۂ ترقی شہر میں رودِ موسیٰ نے بھی اپنا سیلابی اثر پھیلانے میں کوتاہی نہیں کی چنانچہ ۱۱۴۱ھ میں بتاریخ ۲۷ صفر پرانے پل کی تعمیر کے (۶۰) برس کے بعد موسیٰ کو شدید طغیانی ہوئی جس کا زور یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ پرانے پل کے اوپر پانی ایک نیزہ بلند ہو کر بہا۔ سرکاری دارالشفا اور بادشاہی عاشور خانے تک پہنچا تھا۔

آبادیٔ شہر کے بعد یہ پہلی طغیانی جس کا داخلہ تاریخ سے ملتا ہے اِس امر کو ثابت کرتی ہے کہ قبل از آبادیٔ شہر بھی ندی کی طغیانی بشدت ہوا کرتی تھی۔ اِسی لیے پل کی تعمیر میں مضبوطی اور استحکام کو بہت زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا۔

ناممکن تھا کہ ایسی شدید طغیانی سررشتۂ پبلک ورکس کو اپنی طرف متوجہ نہ کرتی۔ چنانچہ بقول جناب نواب فخر الملک بہادر "اِس کے آیندہ انسداد کے لیے ایک کتوہ ساکل ندی پر جو رود موسیٰ میں آکر ملتی ہے نہایت استحکام کے ساتھ بنوایا گیا اور اِس کتوہ سے ایک نہر نکالی گئی جو ملک کو سیراب کرکے

رودِ موسیٰ کی طغیانی کی حفاظت کرے۔"

رودِ موسیٰ | اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رودِ موسیٰ کے حالات بھی کسی قدر بتا دیئے جائیں۔ سید عبداللہ رضوی سوم تعلقدار جڑچرلہ نے رودِ موسیٰ کے متعلق دلچسپ اور ضروری حالات کی رپورٹ مرتب کرکے بھیجی ہے جس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے

"رودِ موسیٰ کا منبع تعلقہ پرگی میں واقع ہے اور موضع راکم چرلہ قطعۂ ناریہواں ریڈی سے اس ندی کی دو شاخیں ایک جانب شمال اور دوسری جانب جنوب نکل کر تقریباً چالیس میل کے فاصلے کے بعد گول کنڈے کے قریب اس مقام پر مل جاتی ہیں جو سنگم کے نام سے مشہور ہے۔ شمالی ندی گھوسی (ساکل) اور جنوبی موسی کے نام سے مشہور ہے۔ شمالی ندی میں ان دو بڑے نالوں کے علاوہ جن میں سے ایک وقار آباد کے قریب کوہِ انت گری سے نکلتا ہے اور دوسرا کوہیر ضلع بیدر سے آتا ہے (۲۶) اور چھوٹی چھوٹی شاخیں مختلف سمتوں سے آکر ملتی ہیں۔ جنوبی ندی میں (۲۹) شاخیں مل کر سنگم کے پاس دونوں کا تقاطع ہوتا ہے۔ جہاں موسی کی صورت کسی قدر بڑے پیمانے میں نمودار ہوگئی ہے اس طرح حیدرآباد سے آگے بھونگیر، سریا پیٹھ، دیول پلی ضلع نلگنڈہ میں سے گزر کر مقام واڑہ پلی رودِ کرشنا میں مل جاتی ہے۔"

سید حسین صاحب مہتمم بندوبست نے بھی ندی کے ضروری حالات اور دونوں ندیوں کا فرق اپنی رپورٹ میں قلمبند کیا ہے جس کا انتخاب یہ ہے

"موسی کی ابتدا حیدرآباد کے غرب میں تقریباً (۴۰) میل کے فاصلے پر وقار آباد (گنگوارم) کی متصلہ پہاڑیوں سے ہوئی ہے منبع سے حیدرآباد تک تخمیناً (۳۰۰) مربع میل کے نشیبی رقبے کا پانی بہ کر اس میں شامل ہوتا ہے مقام بھولک پور جو حیدرآباد سے تقریباً (۲۴) میل کے فاصلے پر ہے اس ندی پر ایک بند باندھا گیا ہے جس کا پانی سکندرآباد کے تالاب کو ایک چھوٹی سی نہر کے ذریعے سے آتا ہے اور اس مقام پر ندی کی حیثیت ایک

معمولی نالے سے زاید نہیں لیکن سنگم کے پاس دوسری شاخ ساکل آکر ملتی ہے یہ شاخ بھی تقریباً اسی کے قریب ہے۔ پرگی کی متصلہ پہاڑیوں میں ہوکر آتی ہے اس میں تقریباً (۵۰۰) مربع میل کا پانی شامل ہوتا ہے اس لحاظ سے اصل موسی سے ساکل کی وسعت زیادہ ہے۔ ساکل پر پالما کول کے قریب ایک بند ابراہیم پٹن کے تالاب کے واسطے تعمیر ہوا ہے اس میں بہت سا پانی ٹھہر جاتا ہے۔ نیز موضع اندور پہاڑ کے پاس میر ساگر کے انیکٹ سے ایک نہر میر عالم کے تالاب کو نکالی گئی ہے اس وجہ سے سنگم کے قریب دونوں شاخوں کی حیثیت قریب قریب ایک سی ہوگئی ہے۔"

غرضکہ ان ذرایع آبپاشی کو پیش نظر رکھ کر جو ابراہیم وغیرہ قطب شاہوں کے زمانے میں تعمیر ہو چکے تھے ساکل کا کتوہ تعمیر کیا گیا۔ اس کتوہ کی تعمیر بھی اس زمانے کے سررشتۂ تعمیرات کی اعلیٰ کارگزاری کی ایک قوی دلیل ہے۔

ساکل کا کتوہ سید جعفر حسین صاحب سوم تعلقدار اطراف بلدہ نے اس کتوہ کے متعلق نہایت مفید اور دلچسپ رپورٹ قلمبند کرکے بھیجی ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"ایک ایسے مقام پر جہاں دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے یہ ندی بہتی ہے ایک عجیب و غریب عمارت آثار قدیمہ سے اس وقت کھڑی ہوئی ہے جو بہ سبب مہتم بالشان ہونے کے خالی از ندرت نہیں۔ گولکنڈے کی کنجان پہاڑیاں اس جگہ پر ختم ہوتی ہیں اور یہاں ایک وسیع میدان واقع ہوگیا ہے اس عمارت کی تین ضخیم اور عظیم دیواریں ہیں جو یکے بعد دیگرے اٹھائی گئی ہیں۔ ہر دو دیواروں کے باہم تقریباً دو دو گز کا فاصلہ رکھا گیا ہے ان دیواروں کا ارتفاع تخمیناً ۲۲ گز ہے۔ یہ دیواریں قریباً ۱۴ گز عریض ہیں ہر دو دیواروں کے درمیان ایک ایک کمان کھینچی گئی ہے جس کے دونوں جانب دیواروں سے ملصق کیے گئے ہیں۔

تاکہ ہر ایک دیوار دوسری دیوار کی پشت پناہ رہے۔ اور تینوں دیواریں مل کر ایک ہی جسیم کی قوت پیدا کریں۔ یہہ دیواریں ایک پہاڑی سے شروع ہو کر دوسری پہاڑی پر نصف دایرہ کی شکل میں ختم ہو گئی ہیں۔ اور بے تکلف اس حصن حصین نے سالم ندی کو بند کر دیا ہے۔ اور ندی کے پانی کو ایک دریائے ذخار کی طرح اس وسیع میدان میں روک کر کھڑا کر دیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہہ دیواریں صرف عرض رو دمیں واقع ہیں اور باقی حصہ اس نصف دایرے کا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے زمین پر لیا گیا اور دوسری پہاڑی پر پہنچایا گیا ہے۔ یہہ حصہ مثل ایک تالاب کے کنٹہ کے نہایت ضخیم اور جسیم ہے جو بڑے بڑے تراشے ہوئے پتھروں سے اٹھایا گیا ہے اور پشت کو بھی سنگ بست کیا گیا ہے۔ اس کنٹے کے آخر یہ پہاڑی سے ملحق ایک پختہ اور سنگین موری تالاب کے توم کی طرح نکالی گئی ہے اور قلعۂ گول گنڈہ کی جانب تخمیناً (۱۲) میل تک زمین کے اندر اندر سے لے جا کر درک میں ڈالی گئی ہے اور وہاں سے ایک شاخ قلعہ کے اندر اور دوسری شاخ نیک نام پورہ میں پہنچائی گئی ہے جو زمانۂ قدیم میں نہایت آباد مقام تھا۔ اگرچہ یہہ موری زمین کے اندر سے چلی گئی ہے لیکن مادی آثار سے متجسس نگاہ کو اس کی روانی سطح زمین کے اوپر ہی نظر آسکتی ہے۔

محمد مرتضیٰ

رباعیاتِ لمعہ

رسوا ہوئے ہم جہاں میں بدنام ہوئے — مردودِ خواص و منکرِ عام ہوئے
اس حرص نے لمعہ دو جہاں سے کھویا — ہم کو نہ خدا ملا نہ بت رام ہوئے

امیدِ وفا بتوں سے اللہ کی پناہ — آہوش میں کیوں لمعہ ہوا ہے گمراہ
کیسی یہہ بری سمجھ ہے اللہ تیری — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

کرسمس ڈے

اور

یوم المیلاد

دنیا کے تمام مذاہب میں، تمام ممالک میں، تمام اقوام میں، بلا استثنا یہہ عادت جو خصایلِ فطری کے درجے پر پہنچی ہوئی ہے۔ رائج ہے کہ پیغمبرانِ مذاہب، مصلحانِ ملک، رہبرانِ قوم کی یاد، سال کے کسی خاص دن میں جو اُن کی ولادت، وفات، یا اور کسی مخصوص و مہتم بالشان واقعہ کا یادگار ہوتا ہے تازہ کی جاتی ہے، اور اُس دن عید منائی جاتی ہے۔

ایسی عیدوں کا اُصولی منشا اِس بات کو یاد کرنا ہے کہ کس طرح وہ لوگ تاریکی سے روشنی میں آئے۔ کس طرح جہالت سے نجات پاکر علم و تمدن کے میدان میں بڑھے۔ اور کس طرح زندہ زندگی بسر کرنے کے راستے میں چلنے لگے۔ اِس سے یہہ فائدہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ ترقی یافتہ قوم میں اپنی ترقی کے جاری و قایم رکھنے کا جوش و ولولہ تازہ رہے اور تنزل کردہ قوم میں عروج و ترقی کی امنگیں پیدا ہوں۔

ہندوؤں میں ہولی، دسہرہ، گنیش چوتھ، رام نومی وغیرہ، عیسائیوں میں کرسمس ڈے، گڈ فریڈے، ایسٹر ڈنس ڈے، مسلمانوں میں محفل میلاد جشنِ معراج، اعراس اور بزرگوں کے فاتحہ کے جلسے اسی قسم کی تقریبیں ہیں، جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ علی ہذا القیاس دوسرے مذاہب، ممالک اور اقوام میں اِس طرح کی سینکڑوں یادگار تقریبیں ہر سال منائی جاتی ہیں۔

گو کل مذاہب، ممالک اور اقوام میں یادِ رفتگاں تازہ کرنے کا،

ایک ہی متحدہ مقصد ہے لیکن جو فرق ترقی یافتہ اور تباہی زدہ ملکوں، قوموں، مذہبوں میں ہوا کرتا ہے وہی فرق اُن کے عید منانے، عرس کرنے اور جلسے رچانے میں بھی نظر آتا ہے۔

زندہ مذاہب، زندہ اقوام، زندہ ممالک ہیں اپنے پیغمبروں، مصلحوں، رہبروں کی یاد اِس طرح تازہ کی جاتی ہے کہ اُس سے زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت ملتا ہے اور سراسر نفع ہی نفع حاصل ہوتا ہے۔ برخلاف اِس کے مردہ یا یتیم جاں، مذاہب، اقوام اور ممالک میں اِس طرح کا عملدرآمد ہوتا ہے کہ اُس سے بالکل یا زیادہ تر جہالت، حماقت اور بیہودگی نظر آتی ہے۔

دنیا میں یادِ رفتگاں برقرار رکھنے کے لیے جو عیدیں منائی جاتی ہیں اُن کا تذکرہ بلاشبہہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن اُن کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ کر میں آج کرسمس ڈے اور یوم میلادِ نبوی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

کرسمس ڈے چند ہی روز پیشتر منایا گیا ہے اور یوم میلاد بالکل قریب آگیا ہے اِس لیے اِن دونوں کا موازنہ و مقابلہ نہ صرف ناظرین صحیفہ کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے بلکہ تمام سمجھ دار مسلمانوں کے غور و تامل کے قابل خیال کیا جا سکتا ہے۔

۲۵۔ ڈسمبر کا دن مسیحی روایات کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت کا دن ہے۔ مسیحی خیال کرتے ہیں کہ یہ دن روح القدس کے ظہور کا دن ہے۔ اور اس دن اُن پر سعادت اور نجات کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ اِن برکتوں کی یادگار میں تمام مسیحی ممالک اور مسیحی اقوام کم از کم آٹھ دن تک عید مناتے ہیں اور اِس دھوم دھام اور جوش و خروش سے مناتے ہیں کہ دنیا کی کوئی غیر مسیحی قوم یا ملک، یا مذہب

اپنے اعیاد و اعراس میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کرسمس کے استقبال کی تیاریاں عرصے سے شروع ہو جاتی ہیں ہر ایک عیسائی خواہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں، شمال میں ہو یا جنوب میں، حضر میں ہو یا سفر میں، شہر میں ہو یا جنگل میں، ہندیوں میں ہو یا وحشیوں میں، یگانوں میں ہو یا بیگانوں میں، مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا ادھیڑ، بچہ ہو یا بوڑھا، کیا تھیلک ہو یا پراٹسٹنٹ، میتھوڈسٹ ہو یا یونیٹرین، امریکن ہو یا یورپین، برٹن ہو یا جرمن، امیر ہو یا غریب اپنا فرض خیال کرتا ہے کہ کرسمس کے ہفتے کو خوشی مسرت اور زندہ دلی سے بسر کرے۔ اگر وطن میں ہو تو خاندان بھر کے ساتھ، ورنہ ہم مذہب دوستوں کے ساتھ اور یہ بھی نہ ہو تو تنہائی میں ہی اس امر کو ضروری سمجھتا ہے کہ سال بھر کی محنت کے بعد خدائے غفار و قہار کے سامنے عبودیت کا سر جھکائے۔ نیا اور عمدہ لباس پہنے، بچوں کو کھلونے، کتابیں دلائے، رشتہ داروں اور دوستوں کو تحفے، اور کرسمس کارڈ بھیجے۔ قومی اور مذہبی انسٹیٹوشنوں میں چندہ دے قومی اور ملکی صنعتوں کے فروغ میں مدد کرے۔ لذیذ و لطیف غذائیں کھائے اور اس طرح پر آرام و لطف کو حاصل کر کے نئے سال کے کاروبار کی انجام دہی کے لیے مستعد ہو جائے۔

ابھی کرسمس کو تین چار ماہ کا عرصہ باقی رہتا ہے کہ اُس کی تیاریوں کے لیے کل مسیحی دنیا میں ایک ہل چل پڑ جاتی ہے۔ تمام کارخانے ہر اُس چیز کی تیاری میں جس کی مانگ کرسمس میں ہوتی ہے مصروف ہو جاتے ہیں۔ کپڑوں کے کارخانے نئی وضع اور نئی طرز کے کپڑے بنانے میں مشغول ہوتے ہیں۔ فرنیچر والے فرنیچر بناتے ہیں۔ کرسمس کارڈ اور کرسمس میں دلچسپ معلوم ہونے کے قابل کتابوں، اور

اقتصادیہ کے لیے خاص اہتمام شروع ہوتا ہے۔ اخبارات و رسایل اپنے کرسمس نمبر نکالنے میں منہمک ہوتے ہیں، مٹھائیاں کثرت سے بنائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اور اور کارخانے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں کارخانوں سے سامان تیار ہوکر شاپوں اور دکانوں میں آتا ہے۔ یہاں اُن کے مالک، پوری سعی و محنت کرتے ہیں کہ اُس کو نہایت خوش اسلوبی سے سجائیں، قرینے سے آراستہ کریں اور خریداروں کا دل لبھائیں فیشن کی تراش خراش میں سینکڑوں دماغ لگے رہتے ہیں۔ اور سامان کو فروخت کرنے کے لیے ہزاروں طریقے سے اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ اُن کی عبارت آرائی میں صدہا اشخاص اپنی روزیاں کماتے ہیں۔ جب ہر قسم کا اسٹاک مہیا ہو جاتا ہے تو وہ دنیا کے اُن تمام حصص میں جہاں مسیحی آبادی ہے پہنچایا جاتا ہے اور اُس کے حمل و نقل کے لیے تمام جہاز راں اور ریلوے کمپنیاں اپنے اپنے نرخ میں کمی کرتی ہیں۔ ہر شخص کو اپنے وطن یا کسی دل فزا مقام میں آسانی سے کرسمس منانے کے لیے کرایۂ ریل و جہاز میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ رفاہِ عام کی سوسائٹیاں اور انسٹیٹیوشن کرسمس کے زمانے میں اپنے مقاصد کے ترقی دینے میں کوشاں رہتی ہیں مختلف کانفرنسوں، کمیٹیوں، سوسائٹیوں کے اجلاس ہوتے ہیں۔ ہمدرد و دولت مند مسیحی غریبوں، بیماروں، اور قیدیوں کو کرسمس منانے میں اعانت دینے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ نیز کرسمس کے زمانہ میں ملک و مذہب سے فیاضی و ہمدردی کا اظہار دولت کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔

جب کرسمس قریب آجاتی ہے تو دوکانوں اور شاپوں میں خریداروں کا ہجوم اس کثرت سے ہونے لگتا ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ اِدھر ریلوں، جہازوں، ہوٹلوں میں مسافروں کی اس قدر زیادتی ہو جاتی ہے

کہ اگر قبل از قبل انتظام نہ کر لیا گیا ہو تو جگہ نہیں ملتی، مکانوں، چرچوں کلیسیوں ہوٹلوں وغیرہ کی درستی و صفائی عمل میں آتی ہے۔ دعوتوں کی تیاریاں ہوتی ہیں اور ۲۴۔ دسمبر کی شام تک تمام تیاریوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

۲۵۔ دسمبر کو علی الصباح گرجا کے گھنٹے بڑے زور و شور سے کرسمس کا اعلان کرتے ہیں۔ ہر ایک مسیحی خواہ امیر ہو یا غریب، گرجا میں جانا فرض خیال کرتا ہے۔ اس دن تمام مسیحی چرچ فیشن، حسن، تمول کے جولانگاہ بن جاتے ہیں۔ گرجا میں مقتدایان مذہب کے وعظ و نصائح سنتے ہیں جس میں حضرت مسیح کے حالات اور دنیا و عقبیٰ کے متعلق نصیحتیں ہوتی ہیں یہ وعظ اس طرح نہیں ہوتے کہ پرانے واعظوں کے خطبوں کو کتابیں سامنے رکھ کر طوطے کی طرح چھرا دیں۔ بلکہ اقتضائے زمانہ کے موافق طبع زاد لکچر ہوتے ہیں اور ان میں فصاحت و بلاغت کا پورا زور دکھایا جاتا ہے۔ گرجا سے واپس آکر ہفتہ بھر تفریح و آرام میں گزارا جاتا ہے اور دعوتوں میں، دوستوں کی ملاقاتوں میں، تحف و ہدایا اور کرسمس کارڈ قبول کرنے میں، دوسروں کو تحفے بھیجنے میں، رفاہ ملک و مذہب و قوم کے جلسوں میں شریک ہونے اور چندہ دینے میں، قومی اور ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے میں اور اسی طرح کے بیسیوں مفید دنیوی کے مشاغل میں دن بسر کیے جاتے ہیں۔ اس ہفتہ بھر کے عرصے میں پبلک و پریوٹ دفاتر بند رہتے ہیں۔ اشد ضروری دفاتر مثلاً ٹیلیگراف، ریل وغیرہ کے صیغوں میں بھی دو دن نصف تعطیل رہتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر فرد قوم کو اس بات کا پورا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اس ہفتے کو مسرت و شادکامی سے بسر کرے۔

یہ مشہور مقولہ ہے کہ "الناس علی دین ملوکہم"۔ اس کا ثبوت کرسمس کی عید سے ملتا ہے۔ تمام ہندوستان میں (باستثنائے قلمرو ریاست ہندو) کل باشندگان ہند اصل عید کرسمس میں ہی مناتے ہیں

زمانۂ کرسمس میں ہی تعطیل کی طوالت اور کرایہ کی ارزانی کی بدولت مختلف حصص ہند کے وہ اشخاص جو ملازمت وغیرہ کے باعث وطن سے دور پردیس میں پڑے رہتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں سے ملتے ہیں۔ سیر و شکار کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" اور بیسیوں ملکی، قومی، مذہبی رفاہ کے کام اسی ہفتے میں انجام پاتے ہیں۔ موجبات تفریح مثل اسپورٹس، تھیٹر، سرکس، وغیرہ میں جو مسیحیوں کی خاطر مہیا کیے جاتے ہیں حصہ لیتے ہیں۔ کرسمس کے اختتام پر سرکاری خطابوں سے سربلند و سرفراز ہوتے ہیں۔

یہ ہے مختصر خاکہ پیدائش مسیح کی یادگار قایم رکھنے کا۔ جو مسیحیوں کے اظہار خوشی کے پُر لطف طریقہ سے کھینچا گیا ہے۔ کرسمس کے تذکرے کو ختم کرنے سے پہلے یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ کرسمس صرف خوبیوں ہی خوبیوں سے نہیں بھری ہوئی ہے بلکہ جس طرح گلاب کے پہلو میں کانٹا لگا رہتا ہے کرسمس میں محاسن کے پہلو بہ پہلو بہت ہی لغویات بھی ہوتی ہیں مے خواری، عیاشی، قمار بازی اور لہو لعب کی خوب گرم بازاری ہو جاتی ہے مگر آفرین ہے پیروان مسیح کی عقل و فرزانگی پر کہ ان بیہودگیوں سے بھی قومی تجارت میں ترقی دیتے ہیں پس انہیں جو منافع عمدہ کاموں کی بدولت نصیب ہوتے ہیں اُن کے مقابلہ میں یہ چنداں نقصان دہ نہیں ہوتے جن کی وجہ سے مجبور ہو کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ الحسنات یذہبن السیئات۔

اب آؤ! دیکھیں مسیحیوں کے مقابل پیروان ہادیٔ دو جہاں (یعنے اسلام کے نام لیوا) ماہ میلاد (ربیع الاول) میں عموماً اور (۱۲) ربیع الاول کو خصوصاً کیا کام کرتے ہیں۔

ماہ ربیع الاول اور خاصکر ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بلا تامل اس قابل ہے کہ تمام دنیا کے کروڑوں مسلمان جو خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش کرتے ہیں۔ علی العموم خوشی منائیں کیونکہ اسی مبارک ماہ اور اسی مبارک تاریخ میں فاران کی چوٹیوں پر صداقت، شائستگی، تہذیب، کا نور آج سے ۱۳۷۸ سال پیشتر ظاہر ہوا تھا۔ اور اُس نے تمام دنیا میں برقی روشنی سے زیادہ منور روشنی تمدن و تہذیب کی پھیلا دی تھی۔ یہی نور اور یہی روشنی تھی جس کے ظہور کی بشارت صدیوں پہلے سے انبیاء دیتے چلے آرہے تھے یہی نور اور یہی روشنی تھی جس نے اپنی شعاع تاباں سے صدیوں کی جہالت و تاریکی کو مٹا دیا۔ یہی نور اور یہی روشنی تھی جس کی بدولت اسلام کی تعلیم (جو سچا اور فطرتی مذہب ہے) بنی نوع انسان کو دی گئی یہی نور اور یہی روشنی تھی جس کی تجلی میں مسلمان ۱۳ سو سال تک پر جلال اور باعظمت حکومت تقریباً آدھی دنیا پر کر چکے ہیں۔ اور اب بھی دنیا کے بڑے حصے پر قابض ہیں یہی نور اور یہی روشنی ہے جس کی ضیا سے اب تک اہل یورپ کشور کشائی کیے جا رہے ہیں۔

وہ کون نور ہے اور کون سی روشنی ہے جس نے یہہ برکتیں پھیلائیں ہیں؟ یہہ نور اور یہہ روشنی ہادیٔ برحق رسول مطلق ختمی مآب رسالت پناہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بزم ہستی میں رونق افروز ہونا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اُن جذبات سے مجبور ہو کر جو نامعلوم زمانے سے کل مذاہب، کل ممالک، کل اقوام پر، یکساں اثر ڈال رہے ہیں۔ مسلمان بھی اپنے ہادیٔ برحق کی یاد صدہا سال سے ماہ ربیع الاول میں تازہ کرتے آرہے ہیں۔ اور تازہ کر رہے ہیں اور اگر خدا کی مرضی ہو تو اُس وقت کرتے رہینگے۔ جب تک اُن کا چراغ ہستی بزم عالم میں فروزاں رہیگا۔

حضرت رسالت مآب کے میلادِ مبارک کی خوشی منانے میں مسلمانوں کا مقصد بھی مثل اور اہل مذاہب کے یہی رہا ہے کہ اس سے اُن کی عقیدت حضرت رسالت پناہ کے ساتھ ترقی کرتی جائے۔ پیروانِ اسلام میں آپ کے احکامات کی حلقہ بگوشی کے لیے زیادہ توفیق پیدا ہو۔ غیر مذاہب والوں پر آپ کی ذاتِ بابرکات کے فضائل پوری طرح ظاہر ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ خوشی و مسرت جو عیدوں کا جزو لاینفک ہے حاصل کی جائے۔

محفل میلاد کے مقاصد یہی تھے جو اوپر بیان کیے گئے۔ لیکن جہاں انقلاباتِ زمانہ نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اُن کے مذہب، سلطنت، تمدن، تہذیب، رسم و رواج، کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے وہاں اُن کی اس عیدِ میلاد کو بھی اپنے اصلی منشا سے کوسوں دور ہٹا دیا ہے۔ بجز سرزمین مصر و عرب کے باقی بلادِ اسلامیہ میں گرمجوشی کا بہت کم اظہار کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں سے مقابلہ تو کجا اس قدر اہتمام بھی نہیں کیا جاتا جتنا دوسری عیدوں، اقامی عرسوں، اور متفرق میلوں کے لیے کیا جاتا ہے اور محفلِ میلاد میں حصہ لینے والے مسلمانوں کی تعداد ۲۵ فیصدی بھی نہیں نکل سکیگی۔

ہندوستان میں اس ماہِ مبارک میں یہ ہوتا ہے کہ بعض بعض مسجدوں میں اور کہیں کہیں مکانوں میں وعظ کیا جاتا ہے اور اُس میں صدیوں کی دُہرائی ہوئی احادیثِ میلاد اور معجزات اور حالاتِ وفات وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔ نعتیہ قصاید پڑھے جاتے ہیں۔ بعض بعض مقامات میں قوالی ہوتی ہے۔ آثارِ شریف کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ فاتحہ اور تبرک کے نام سے مٹھائی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے۔ اکثر گھروں میں نیاز ہوتی ہے اور چراغان کیے جاتے ہیں گو یہ چیزیں بظاہر خوشنما نظر آتی ہیں لیکن جب ان کا اعلیٰ نرخ نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو بلا تامل یہ کہنا پڑیگا

کہ ایسی چیزوں کے ہونے سے نہ ہونا اچھا ہے۔

عموماً وعظ و نصیحت کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ توحید و تہذیب اخلاق کا راستہ بتایا جائے اُس کے بیان کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر ہر مذہب و ملت کو ایک اُس کے سُننے کا کافی موقع دیا جائے اور ہر شخص بغیر ناگواری طبع کے اور بغیر اِس کے کہ اپنے اعتقادات کو صدمہ پہنچائے سن سکے۔ اور صراطِ مستقیم کو دریافت کر سکے۔ اِسی معنی کو مذہب کے الفاظ بیان کرتے ہیں "اُدع الیٰ سبیل ربک بالموعظۃ الحسنۃ" یہی سنت تھی پیغمبر اسلام کی اور یہی طریقہ تھا قرونِ اولیں کے ہادیانِ اسلام کا۔ لیکن رفتہ رفتہ امتداد زمانہ سے مسلمانوں کے مجالس وعظ بجائے موعظۂ حسنہ کے مجادلے و مکابرے کے اکھاڑے بن گئے۔ آج کل دنیا ترقی پر ہے اور ہر طرف فلسفہ و سائنس کی آواز کان میں آتی ہے معجزات و خرقِ عادات کا عموماً مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور اُن کا تذکرہ اِس وجہ سے غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ ہم

اُن سے صرف ایسے اشخاص کو دلچسپی ہو سکتی ہے جو عجائبات و خرقِ عادات کے ماننے والے ہوں اور اُس شخص کو جس سے یہ معجزات صادر ہوئے ہیں اور جس کے حالات بیان کیے جا رہے ہیں اپنا پیشوا جانتے ہوں۔

اس سے دوسرے مذہب اور دوسرے عقیدے کے ماننے والوں پر اپنے پیغمبر اور پیشوا کی افضلیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اُن کے پاس بھی اپنے پیغمبر اور پیشوا کے خرقِ عادات کی روایتیں موجود ہیں۔ اُس سے تہذیب و تزکیۂ نفس کا کوئی سبق نہیں حاصل ہو سکتا۔ فلسفہ و سائنس کے حملوں کا جو مذہب پر ہوتے ہیں کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اُلٹا معجزات پر سائنس و فلسفہ کے ماننے والوں کو مضحکہ اڑانے کا موقع ملتا ہے اُنکے وعظ سے بوجہ اِس کے کہ وہ صدیوں سے دُہرائے جا رہے ہیں۔

سامعین اکٹھا جاتے ہیں۔

اکثر روایات معجزات و خرق عادات موضوع اور من گھڑت ہیں اور زمانہ گذشتہ میں بعض پولٹیکل مصالح سے محافل وعظ و مجالس غم کو گرم کرنے کے لیے گھڑ لیے گئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے واعظ کو افسانہ گو اور سامعین کو افسانہ شنو بنایا جاتا ہے۔

بلحاظ وجوہ بالا دنیا کی مہذب اقوام کا طریقہ وعظ بھی بدل کر اقتضائے زمانہ کے موافق ہو گیا۔ مسیحی بھی اپنے وعظوں میں، خطبوں میں، لکچروں میں معجزات کا تذکرہ زیادہ نہیں کرتے۔ بلکہ اُن میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات، اخلاق، عادات کا ذکر کرتے اور اُن کو سائنس و فلسفہ سے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے خیال میں مذکورہ بالا وجوہات کے لحاظ سے محفل میلاد میں مروجہ طریقہ وعظ و معجزات و حدیث خوانی کوئی مفید نتائج نہیں پیدا کر سکتا نہ اس کے سننے سے کوئی ولولہ کوئی جوش پیدا ہو سکتا ہے۔

آنحضرت کی وفات کا تذکرہ بھی میرے خیال میں خوشی کے موقع پر کچھ موزوں نہیں نظر آتا۔ اور جو حالات وفات بیان ہوتے ہیں اُن میں بر بنائے روایات غیر صحیحہ در پردہ آپ موت سے ڈرنے والے۔ آپ کے اصحاب کبار جھگڑالو، گستاخ ثابت کیے جاتے ہیں۔ جو ہرگز بجائے خود صحیح نہیں ہیں۔ اور لطف یہ کہ اُس کو آپ کی اور آپ کے اصحاب کی تعریف خیال کرتے ہیں میرے خیال میں وہ بالکل ترک کرنے کے قابل ہیں۔

قصیدہ خوانی کی حالت وعظ سے بدتر ہے۔ بیس پچیس آدمی مل کر اُن کو اس انداز و لحن سے پڑھنے لگتے ہیں کہ بے اختیار اُن کی آوازوں پر انکر الاصوات کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ ان کے پڑھنے کی مثال ایسی ہے

ہوتی ہے جیسے چالیس پچاس گیدڑ کسی مردہ لاش پر لڑتے ہیں۔ ایک بھی حرف سمجھ میں نہیں آتا، اس پر طرہ یہ کہ عربی کی ٹانگ الگ توڑی جاتی ہے فارسی کی منی جدا پلید کی جاتی ہے۔ پھر مضمون تو ماشاء اللہ کچھ پوچھئے نہیں بجائے اس کے کہ حضرت سرورِ عالم کے اوصافِ جمیلہ یا ارشاداتِ حکیمانہ بیان کیے جائیں عشق و عاشقی کا مضمون آپ کی ذات پر منطبق کیا جاتا ہے قوالی کی بھی یہی حالت ہے۔ اس میں آلاتِ سرود کا اضافہ ہو جاتا ہے میں دعوے سے کہوں گا کہ قوالی یا قصیدہ خوانی مطلقاً فائدہ بخش نہیں ہیں۔ اس سے مسلمانوں کے دینی معلومات میں، مذہبی جوش میں۔ خدا اور رسول کی محبت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور اس کو سن کر وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس سے اسلام اور اہلِ اسلام کو نفع پہنچے بعض سامعین کو محفلِ سماع میں وجد آتا ہے۔ اس کی یہ حالت ہے کہ بسا اوقات مصنوعی اور خود ساختہ ہوتا ہے۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ سماع کے سامعین میں اہلِ دل بھی ہوتے ہیں اور ان پر حالت طاری ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ اکثر وجد بناوٹی ہوتے ہیں بعض کو تو محض راگ متاثر کر دیتے ہیں کوئی مذہبی یا روحانی اثر نہیں ہوتا۔ جو حضرات روحانی اثر سے بیخود ہوتے ہیں وہ اس قدر خدا رسیدہ ہوتے ہیں کہ انہیں ہر ہر ذرے میں نورِ خدا نظر آتا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ان باکمالوں کو بیخودی کے لیے محفلِ سماع کوئی ضروری چیز نہیں ہوتی ہر ہر چیز ان کو متاثر بنانے کے لیے راگ سے بڑھکر ہے۔ بہرحال قصیدہ خوانی یا محفلِ سماع بھی کوئی عمدہ طریقہ میلاد کی خوشی منانے کا نہیں ہے۔ وجد میں آنا اور بیخود ہو کر ناچنے لگنا اسلامی تعلیم کے بالکل منافی ہے مسلمانوں کا تو یہ مذہب ہے کہ ہوش میں رہیں اور دنیا و دین

دونوں کمائیں نہ یہ کہ خانقاہ میں بیٹھ کر بظاہر تو اللہ اللہ کرتے نظر آئیں۔ اور درحقیقت مفت کی نذر و نیاز سے جو مال حرام ہے بلا محنت و مشقت اپنا پیٹ بھریں اور اہل دنیا سے بڑھکر دنیا کمائیں۔

آثار شریف کی زیارت اگرچہ کوئی قابل اعتراض شے نہیں ہے کیونکہ دنیا کا ہر طبقہ اپنے پیشواؤں کی نشانیوں کو قدر و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن جس طریقہ پر مسلمان عمل پیرا ہیں۔ وہ شان سلام، ارشادات سرور کائنات، اور مسلمانان قرون اولی کے طرز عمل کے بالکل خلاف ہے۔

تبرک ایسے ناگوار اور ایسے مضحکہ آمیز طور سے تقسیم ہوتا ہے کہ اس کا ذکر کرنا چھوڑ دینا بجا معلوم ہوتا ہے۔

نذر و نیاز سے مسلمانوں کی غرض بجائے خود یہ ہوتی ہے کہ ثواب آخرت حاصل کریں اور ان کے کرنے والے اپنے آپ کو جنتی خیال کرنے لگتے ہیں مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس طرح مالدار اور تونگر لوگوں کو کھانا مٹھائی کھلانے یا خود کھانے سے یا ایسے مستحقوں اور متہدوں کو کھلانے سے جو ہر طرح محنت مزدوری کرنے کے قابل ہیں بجا لیکہ مفلس و محتاج و معذور دروازے پر چلا رہے ہوں اور بجائے کھانا کھانے کے مار کھا رہے ہوں، ثواب عقبیٰ حاصل ہو سکتا ہے؟ طعام نیاز کھانے کے لیے تونگروں کو جو دعوت دی جاتی ہے اس کے اصلی حالات بھی ناقابل بیان ہیں اس لیے ان پر پردہ ڈالدیا جاتا ہے۔

یہ ہے حالت مسلمانوں کے اس یوم العید کی جس میں ان پر راہ ہدایت کا دروازہ کھلا تھا اور ایمان کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور جس کو عمدہ اور شائستہ اسلوب پر لانے سے مسلمانوں کو دینی و دنیوی

فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اُمورِ متذکرۂ بالا کے سوا تمام مسلمانوں میں اس دن کاروبار کو بند کرنا نئے کپڑے پہن کر مسجدوں میں جانا اور شکرانۂ الٰہی بجا لانا۔ لطیف غذائیں کھانا (بخیال نیاز نہیں) دوست احباب سے ملنا، مسرت سے ہمکنار رہنا۔ ایسی وعظ کی مجلسیں منعقد کرنا جو درحقیقت مجالس وعظ ہوں اور جہاں نہ صرف ہر فرقے کے مسلمان جمع ہوں بلکہ مذاہب غیر کے ماننے والے آئیں۔ اور ایسا وعظ ہو جس میں حضرت سرورِ کائنات کی پاک اور بے عیب زندگی کے اصلی حالات۔ آپ کے انسانِ کامل ہونے کے ثبوت گرانمایہ و اعلیٰ ترین خصائل کا بیان۔ اسلام کے اصلی اصول کا اظہار، اور ایسے لکچر جن سے مسلمانوں کو صراط المستقیم پر چلنے کی توفیق اور غیر مذہب والوں کو اسلام پر غور کرنے کی ہدایت ہو۔ مسلمانوں کا اقرضوا اللہ قرضا حسنا پر عمل کرنا۔ اسلام کی ترقی خواہ انجمنوں اور مدرسوں کی مدد کرنا مریض اور غریب مسلمانوں کو عید میلاد بہ خوشی و مسرت منانے کا موقع دینا اور ایسے ہی دوسرے امور جن سے مسلمانوں کی زندہ دلی ظاہر ہو بالکل معدوم ہیں۔

غالباً اُن قابل اصلاح اُمور کی وجہ سے جو عید میلاد میں مروج ہو گئے ہیں فرقۂ اہل حدیث محفل میلاد کو شرک و بدعت بتا کر ناجائز ٹھہراتا ہے اور نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا طبقہ اُس کی شرکت غیر ضروری خیال کرتا ہے۔ لیکن دونوں غلطی پر ہیں اگر ہر اُس چیز کو اختیار کرنا جس کے متعلق حضرت رسالت مآب نے کوئی حکم نہ دیا ہو درست نہ سمجھا جائے۔ بلکہ بدعت میں شمار ہو تو میں خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں زندگی دشوار ہو جائے جس قسم کے مکانوں میں ہم رہتے ہیں جس قسم کی غذائیں ہم کھاتے ہیں جس قسم کے لباس ہم پہنتے ہیں جس قسم کے پیشے ہم کرتے ہیں کیا

وہ آنحضرت کے زمانے سے آج تک یکساں حالت میں ہیں؟ اور کیا وہ بدعت نہیں قرار دیے جا سکتے؟۔

اپنے اسلاف اور پیشواؤں کی یاد کا تازہ رکھنا ایک فطرتی خصلت ہے جو تمام دنیا میں نامعلوم زمانے سے بلا استثنا رائج ہے اور جب اس طرح یاد تازہ کی جائے کہ وہ شعار توحید اصول اخلاق کے منافی نہ ہو اس سے پیروان مذہب میں ایک تازہ روح پھونکی جائے تو پھر کسی طرح وہ بدعت حسنہ کے دایرہ سے خارج نہیں ہو سکتی۔ البتہ تقاضیں کا رفع کرنا ضروری ہے جس سے کوئی انسانی کام خالی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال جو کچھ ہو اب ضروری ہے کہ عید میلاد کو قابل استحسان اسلوب سے منانے کے لیے تمام سمجھدار مسلمانوں کی توجہ مبذول ہو۔

تقریباً چھ سال پیشتر میں نے بھی خیال اقبال کلب میں ظاہر کیا تھا اور مجھ کو بلا شبہہ فخر اور خوشی ہے کہ میری تحریک کے بعد دو تین سال ماہ میلاد میں کلب کی جانب سے حضرت سرور کائنات کے سوانح و اخلاق پر لکچر کا انتظام کیا گیا۔ ان لکچروں سے بتدریج یہہ خیال نشو و نما پاتا ہوا میرے محترم دوست مولوی ظفر علی خاں صاحب کے دماغ میں متمکن ہوا ہے آپ اس سال ماہ میلاد کے استقبال کی تیاریاں قبل از قبل شروع کر چکے ہیں۔ میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ میرے دوست کے تخیلات عملی صورت میں منتقل ہوں۔ اس موقع پر میں یہہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب اور ان کے اعوان و انصار بجائے تیز گامی کرنے اور موٹر یا ائر کی طرح زور دکھانے کے آہستہ خرامی سے کام لیں اور چینی کے تیر کی طرح بتدریج اپنی تحریک کو مستحکم کریں۔

سب سے پہلے وہ اپنا مرکز حیدر آباد تک ہی محدود کر لیں ابتدا میں

یہ کوشش کی جائے کہ تمام مساجد میں ماہ میلاد میں عموماً اور بارہویں کو خصوصاً وعظ کیا جائے۔ وعظ میں بجائے ذکر معجزات کے حالات و قات و خصائل و تعلیمات نبوی بیان ہوں۔ مسلمانوں کو ان کے اختیار کرنے کی ہدایت کی جائے۔ اس امر کا انتظام کیا جائے کہ مسلمان کثرت کے ساتھ وعظ سننے کو جمع ہوا کریں۔ بارہویں تاریخ کو تمام کاروبار بند کر دیے جائیں اور ہر شخص امیر و غریب وعظ سننے کے لیے مسجد میں جائے مسجدوں کے علاوہ مختلف مقامات پر انگریزی تلنگی مرہٹی وغیرہ میں لکچروں کا انتظام کیا جائے۔ اس میں آنحضرت کے مبعوث ہونے کی ضرورت آپ کے حالات آپ کے اوصاف جمیلہ آپ کے اصحاب کا میابی آپ کے دعوؤں کی تائید آپ کے مخالفوں کے اعتراضوں کے جوابات وغیرہ شرح و بسط سے بیان کیے جائیں اسلام کے فطرتی اور سچا مذہب ہونے کا ثبوت دیا جائے اس میں کامیابی ہونے کے بعد قدم آگے بڑھایا جائے۔ مذہب اسلام کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسالے غریب مسلمانوں اور بچوں میں تقسیم کیے جائیں۔ مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کرایا جائے کہ وہ عید میلاد میں بہ نسبت محرم، یازدہم و دوازدہم اعراس، میلوں ٹھیلوں اور جلسوں وغیرہ کے زیادہ دلچسپی لیں۔ بجائے ماہ محرم کے جو غم کا مہینہ ہے نئے لباس کی تیاری مکان کی صفائی وغیرہ ماہ میلاد میں کریں۔ دوستوں سے ملیں جلیں۔ بچوں کو دوستوں کو تحفے تحائف تقسیم کریں۔ مسلمانوں سے چندہ جمع کرایا جائے اور وہ ترقی مذہب میں صرف ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا پورا خیال رکھا جائے کہ منہیات و لغویات کا رواج کہیں نہ ہو جائے۔ حیدرآباد کے ساتھ اضلاع اور دوسرے ممالک ہند کے باشندوں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ بھی محفل میلاد کے متعلق غور کریں۔

امید ہے کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب کی کوشش رائگاں نہ جائیگی۔
میں اخیر میں پھر ایک بار حیدر آباد اور ہندوستان کے تمام روشن خیال حضرات کو اس اہم کام کے متعلق غور کرنے کی توجہ دلاتا ہوا دعا کرتا ہوں کہ:-

ربنا آتنا من لدنک رحمۃ و ہیئ لنا من امرنا رشدا

محمد مظہر

غزل

گھر کنا بے سبب بے وجہ دھمکی — کوئی حد بھی ہے اے ظالم ستم کی
طبیعت دیکھ لی اہل کرم کی — رہی خواہش زیادہ کی نہ کم کی
نظر میں ہے ترے لطف و کرم کی — طلب ساقی نہیں ہے بیش و کم کی
ستم یہ ہے کرو مجھ پر ستم بھی — مجھی سے ڈاہ پھر چاہو ستم کی
نہیں ملتے تو قیصروں سے نہ ملیے — ضرورت کیا مرے سر کی قسم کی
انہیں اس روز سے مشق ستم ہے — نہ تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
اسی نے ہم کو جنت سے نکالا — فریب ہے آگ دوزخ سی شکم کی
تامل سے جب اپنے دل کو دیکھا — حقیقت کھل گئی دیر و حرم کی
مدار زہد زاہد ہے اسی پر — طمع جنت کی یا دوزخ کی دھمکی
ہوں بے شک ابتدا سے میں گنہگار — نہیں ہے ابتدا تیرے کرم کی
اگر مل جائے کشکول گدائی — نہ ہو ہم کو ہوس پھر جام جم کی
ترے کوچے کو جب مسکن بنایا — زیارت کر چکے دیر و حرم کی
چلے ہیں لمعہ صاحب سوئے کعبہ — زیارت کر چکے بیت الصنم کی

لمعہ حیدر آبادی۔

جہاں اے برادر نماند بہ کس

یہہ جاہ و زر و مال کچھ بھی نہیں — یہہ دو روزہ اجلال کچھ بھی نہیں
ہمیشہ کسی کا نہیں ایک حال — یہہ اعزاز و اقبال کچھ بھی نہیں
یہاں کی نہیں نعمتیں دیرپا — دوشالے ہوں یا شال کچھ بھی نہیں
مآل اس کا سوچو تو معلوم ہو — کہ دولت ہے کیا مال کچھ بھی نہیں
ہے بیفائدہ مال و زر کی ہوس — مآل زر و مال کچھ بھی نہیں
جو اس سال تھیں بزم آرائیاں — صد افسوس اس سال کچھ بھی نہیں
یہاں کی ہر اک چیز کو ہے فنا — یہہ دنیا بہر حال کچھ بھی نہیں

جہاں اے برادر نماند بہ کس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

فریدوں کہاں ہے سکندر کہاں — کہاں جم ہے تیمور و اکبر کہاں
کہاں ہے وہ محمود، نادر کہاں — کہاں ہے وہ مامون، سنجر کہاں
کہاں ہے فلاطوں سا وہ فلسفی — ارسطو سا وہ علم پرور کہاں
کہاں ہے وہ بہمن سا جنگ آزما — وہ رستم سا ہے زور آور کہاں
کہاں ہے وہ لیلیٰ شیریں ادا — وہ شیریں ہی ہے ماہ پیکر کہاں
کہاں معن و حاتم سے باذل سخی — ولی تو ولی ہیں پیمبر کہاں
نشاں مٹ گئے ناموں کے دریغ — فقط نام ہے، نام آور کہاں

جہاں اے برادر نہ ماند بہ کس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

بقا ہے فقط ذاتِ حق کو ذہیں — کہ فانی ہے یہہ آسمان و زمیں
بھروسا کسی کا جہاں میں نہیں — وہ تھا چور سمجھے تھے جس کو امیں
زمانے کو ہے ہر گھڑی انقلاب — جو کل خوش تھا، ہے آج اندوہگیں
جو تھے آسماں مرتبت دہر میں — انہیں کھا گئی حیف آخر زمیں

فلک بام تھے جن کے قصر و محل — نشاں آج کچھ اُن کا ملتا نہیں
نہیں بیٹھنے کو بچھٹا بوریا — یہی لوگ اک دن تھے مسند نشیں
کوئی ہو اُسے ایک دن ہے فنا — فقیر و امیر و کریہ و حسیں

جہاں اے برادر نہ ماند بکس
دل اندر جہاں آفریں بند بس

جہاں بے وفا ہے شک اس میں نہیں — کیا کر تو یادِ جہاں آفریں
وہ کرتا ہے خالق کی طاعت مدام — جو دنیا میں ہوتا ہے انجام بیں
خدم اور حشم ہے فقط قبر تک — اکیلے ہی رہنا ہے زیرِ زمیں
مکاں کی تو ہے فکر حد سے سوا — مگر فکر اپنی ملیں کو نہیں
بدونیک رہتا نہیں کوئی یاں — مگر نام رہ جاتا ہے بالیقیں
کوئی ظلم سے قابلِ لعن ہے — کوئی عدل سے لائقِ آفریں
ذہین آج حق کی عبادت کرو — کہ کل کو نہ ہوں سب میں تم شرمگیں

جہاں اے برادر نہ ماند بہ کس
دل اندر جہاں آفریں بند بس

غزل

اپنے سایہ سے جھجکتے تھے جو پہلے پہلے — ساتھ غیروں کے وہ اب پھرتے ہیں اہلے گہلے
آپ کی راہ میں کب تک کوئی بے چین رہے — سانس آخر مرے سینے میں کہاں تک ٹہلے
جی کڑا کر کے رکھو صحنِ گلستاں میں قدم — دل نہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا سے دہلے
دم نکلتا ہے کہیں ہم سے گراں جانوں کا — روز ہوتے ہیں یونہیں ایک قضا کے دہلے
دل ناعاقبت اندیش کی خاطر کب تک — ہم وہاں اب سے نہ جائینگے جہاں جی بہلے
اب اُنہیں زعم اگر مہر و وفا کا ہے تو ہو — ہم کو کیا اس سے کوئی اپنی جگہ کچھ کہہ لے
یہ ہیں اُس کوچے کے آدابِ نشست و برخاست — رات بھر پڑ رہے دروازے پہ دن بھر ٹہلے

کیفی حیدرآبادی

سفر در وطن

ہانس بریلی (صوبۂ اودھ) میں جناب مولوی حافظ احمد رضا خان صاحب کی کوششوں نے تعلیم علوم دینیہ کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا ہے اس کا چوتھا سالانہ جلسہ پچھلے مہینے منعقد ہوا تھا اس جلسے میں ہمارے شہر کے مشہور واعظ و حافظ مولوی سید محمد عمر علی شاہ صاحب بھی بلائے گئے تھے اس تقریب میں صحیفہ کے قدیم معاون مولوی سید ضی الدین حسن صاحب کیفی نے بلحاظ اس کے کہ ایک علمی تقریب تھی اور باعتبار اس کے کہ ان کے پیر و مرشد کو دعوت دی گئی تھی یہ نظم دلی جوش اور قابل ستایش طریقے سے لکھی ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہینگے۔ اڈیٹر

اللہ اللہ کنج تنہائی میں وسعت اس قدر
مل رہا ہے مجھ کو اپنے شہر میں لطف سفر

خود فراموشی میں ہے اک خود فروشی کی جھلک
جلوہ زار عالم قدس آج ہے پیش نظر

بوستان قدس میں آتی ہے باد مشک بیز
نونہالان چمن کا ہو گیا ہے رخ ادھر

کوئی کہتا ہے کہ آیا ہے بلاوا دور سے
کوئی کہتا ہے کہ یہ لو آ گیا ہے نامہ بر

کوئی کہتا ہے کہ چلیے دیر اب اچھی نہیں
کوئی کہتا ہے کہ دم تو نو ذرا ہو لے سحر

کوئی کہتا ہے نہیں بس منہ اندھیرے ہی چلو
اب کوئی دم میں خدا چاہے تو بجتا ہے گجر

ہیں عجب تیاریاں روحانیوں کی بزم میں
دیکھیے اس ٹھاٹھ سے یہ آج جاتے ہیں کدھر

قصد بیت اللہ کا گر ہے تو یہ رستہ نہیں
ہاں مگر فردوس کی تفریح ہے مد نظر

کیونکہ باہم دیر سے یہ ہو رہی ہے گفتگو
دیدنی ہے گلشن قدرت کا ہر گل ہر ثمر

کعبہ یا بتخانہ ہو یا مدرسہ یا میکدہ
ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہیں وہ جاتے ہیں جدھر

ہم کہاں سے باتوں باتوں میں کہاں تک آ گئے
یہ سواد ملک تو دیکھا ہوا سا ہے مگر

ہو نہ ہو یہ ہو وہی جنت نشاں ہندوستاں
ہو بہو نقشہ وہی ہے یہ وہی دیوار و در

ہند میں ان قدسیوں کا کس طرح آنا ہوا
کیا سبب کیا وجہ کیا باعث ہی ہم کو کیا خبر

لکھنؤ سے اور آگے بڑھ چلا یہ قافلہ
دیکھیے اب تو بریلی پر ہوا اس کا گزر

آج ہے شہر بریلی پر عجب نورانیت
ہے نزول رحمت باری تعالیٰ بیشتر

آسمانوں سے فرشتے آرہے جوق جوق
اور کچھ پہلے سے بھی موجود ہیں باکر و فر

میزبانوں میہمانوں میں عجب اخلاص ہے
منتظر کوئی اِدھر ہے کوئی ہے مشتاق اُدھر

مولوی حامد رضا خاں دیر سے ہیں سربراہ
مولوی احمد رضا خاں دیکھتے ہیں سوئے در

فخر اِن دونوں پہ کرتی ہے بریلی ناز سے
اِس نے دیکھا ہی نہ تھا ایسا بدر ایسا پسر

مولوی احمد رضا خاں ہیں جو رخشاں آفتاب
مولوی حامد رضا خاں بھی ہیں اک روشن قمر

مذہبِ حق اہلِ سنت کی حمایت کے لیے
آپ نے قایم کیا ہے مدرسہ اک نامور

اُس میں دی جاتی ہے تعلیم درسِ دینیات
مصحفِ اقدس، فرایض، فقہ، تفسیر و خبر

فکر میں اِس مدرسہ کی رہتے ہیں دونوں برر
صرف کرتے ہیں گرامی وقت مثلِ سیم و زر

آج چوتھا اس کا سالانہ ہے جلسہ منعقد
اِس لیے ہے خاص رحمت کا بریلی مستقر

خاص رحمت حیدرآبادِ دکن سے آئی ہے
اے بریلی ناز کر اے ہند تو بھی فخر کر

مطلع ثانی

آئے ہیں کس کے قدم ہے کون اِس جا جلوہ گر
فیضِ گستر، بندہ پرور، خوش سیر، عالی گہر

حافظ و قاری و حاجی اور امام الواعظین
صدرِ بزمِ عارفین و رہنما و راہبر

ہم مفسر ہم محدث ہم ادیب و ہم فقیہ
جامعِ علم و عمل ہم منبعِ فضل و ہنر

مصدرِ فیضِ عمیم و صاحبِ لطفِ عظیم
دستگیرِ بے کساں مرہم نہِ زخمِ جگر

پیکرِ نور و مجسم خیر و سر تا پا خلیق
یعنے میرے پیر و مرشد حضرتِ سید عمر

قادری چشتی، نظامی و رفاعی، حنبلی
حق شنو، حق جو و حق گو، حق نما و حق نگر

یہہ جہاں رونق فزا ہوں اُس کا پھر کیا پوچھنا
کیوں نہ ہو ایسی جگہ پر رحمتِ حق بیشتر

بانیِ جلسہ کی خاطر اس سبب سے اہلِ دل
کرتے ہیں کرتے رہینگے۔ یہہ دعا شام و سحر

مولوی احمد رضا خاں یعنی عبد المصطفیٰ
حامیِ دینِ متین و ماحیِ بدعات و شر

آپ کے سارے مقاصد کامیابی خیز ہوں
آپ کے حامی رہیں کونین میں خیر البشر

آپ کا یہہ مدرسہ پھولے پھلے ہر طرح سے
آپ کا یہہ بے خزاں گلشن ہو دایم بارور

حاضرینِ جلسہ کرتے ہیں دعا اللہ سے
کہتے ہیں قدسی بحق حضرتِ سید عمر

اِس دعا میں بندۂ کیفی نہ اُترے یاد سے
دور اُفتادوں کی بھی للہ کچھ، لیجے خبر

استفسارات

جوابات

جناب اڈیٹر صاحب صحیفہ زید لطفکم

تسلیم۔ آپ نے صحیفہ میں استفسارات کا باب بڑھا کر اس پرچہ کا افادہ دوبالا کر دیا۔ اگر اس کے ساتھ باب معلومات بھی کھول دیا جائے تو یہہ پرچہ اوج کمال کو پہنچ جائیگا۔ یعنے اگر علم دوست اصحاب اس میں اپنے تجربات و معلومات کی اشاعت کیا کریں تو بہت ہی مفید ہوگا۔ آیندہ اہل علم کی جو رائے ہو۔

آپ کے استفسارات کے جوابات میں نے بھی کچھ عرض کیے ہیں ع۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جواب استفسار ۲۔

امریکہ سے کسی مقام پر سوراخ کر کے ایک پتھر کے داخل خارج کرنے کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا جواب یہہ ہے کہ جو پتھر امریکہ اور اس کے مقابل کی اقلیم سے سوراخ میں ڈالے جائینگے وہ دونوں پتھر مرکز تک پہنچ کر ٹھہر جائینگے۔ آگے نہ بڑھ سکینگے کیونکہ مرکز کی کشش اُن کو روکے رہیگی نہ اِدھر کا پتھر اُدھر نکلیگا اور نہ اُدھر کا اِدھر آسکیگا اس صورت میں حرکت متضاد لازم نہ آئیگی جو محل اعتراض ہو سکے۔ اسی طرح اگر ایک شعلہ کرۂ نار کے اوپر سے زمین کی طرف اور ایک شعلہ زمین سے کرۂ نار کی طرف جائے تو یہہ دونوں شعلے کرۂ نار پر آکر ٹھہر جائینگے۔ نہ نیچے کا شعلہ کرۂ نار سے اوپر جا سکیگا نہ اوپر کا زمین پر آسکیگا۔

جواب استفسار ۳۔ تلے اوپر جو گولے جماتے ہیں اُن کی جمع معلوم کرنیکا آسان طریقہ یہہ ہے کہ ایک ضلع میں جس تعداد کے گولے جمائے گئے ہیں اُس تعداد کو اُس سے ایک زیادہ میں ضرب دیں۔ حاصل ضرب کو اُسی تعداد ضلع کے دو چند میں ایک زیادہ کر کے ضرب دے دیں اور حاصل کو چھ پر تقسیم کریں۔ خارج قسمت جواب ہوگا۔

نوٹ۔ یہہ قاعدہ مربع شکل کا ہے مستطیل وغیرہ میں نہ چل سکیگا۔

مثال - ایک مربع کے ہر ضلع میں دو دو گولے جمائے گئے ہیں تو عمل اس طرح ہوگا۔
$\frac{۵ \times ۳ \times ۲}{۶} = \frac{۳۰}{۶} = ۵ - ۱$

اگر تین تین گولے جمائے جائیں تو $\frac{۷ \times ۴ \times ۳}{۶} = \frac{۸۴}{۶} = ۱۴$۔

اور چار چار گولے جمائے جائیں تو $\frac{۹ \times ۵ \times ۴}{۶} = \frac{۱۸۰}{۶} = ۳۰$ قس علیٰ ہذا البواقی۔

جواب ۴ - بلبل تصویر الخ اس شعر میں بلبل تصویر منادی ہے اور حرف ندا محذوف ہے یعنے اے بلبل تصویر - اور تھا کا فاعل (میں) یعنے میں تھا باوجود بال و پر بے بال و پر کوئی نہ تھا - یا میں تھا یا تو ہے - ہم دونوں کی ایک حالت ہے جو باوجود بال و پر طاقت پرواز نہ رکھتے ہیں - اس طرح کا ایک میں ہوں یا تو ہے -

فائدہ - اس شعر میں اگر تیری طرح کی جگہ میری طرح پڑھا جائے تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے یعنے باغ جہاں میں ایک بلبل تصویر ہی میری طرح تھا جو باوجود بال و پر طاقت پرواز نہ رکھتا ہو اور کوئی ایسا نہ تھا -

جواب استفسار ۵ - جا کے گلزار سے اخر یعنے صیاد باغ سے پلا گیا تھا اور پھر پلٹ کر باغ میں آگیا ہے اس لیے اے بلبل شیدا تیری کیسی بدقسمتی ہے اب تجھ کو صدمہ پھانسیگا - فقط **کمعہ حیدر آبادی ابن حضرت شعلہ مرحوم**۔

نوٹ - استفسار ۵ کا یہی جواب مولوی عبدالحی صاحب بارع نے بھی ہمکندہ سے روانہ فرمایا ہے
اڈیٹر

دیگر جواب استفسار (۳) مستطیل یا مربع ہر حالت میں طولاً و عرضاً جس قدر گولے ہیں - اُن میں سے ایک ایک منہا کر کے باہم ضرب دیدیا جائے تو وہ گولے دریافت ہونگے جو اوپر آسکینگے - پھر طولاً و عرضاً جسقدر گولے ہیں اُن کو باہم ضرب دے کر حاصل ضرب کے ساتھ اوپر کے گولے جمع کر لیے جائیں تو حاصل جمع کل گولوں کی تعداد کا مجموعہ ہوگا فرض کرو کہ طولاً پانچ گولے اور عرضاً چار گولے ہیں تو اس کا عمل حسابی اس طرح ہوگا -
$۵ - ۱ = ۴$
$۴ - ۱ = ۳$ $\} ۴ \times ۳ = ۱۲$ گولے اوپر آئینگے -
$۵ \times ۴ = ۲۰$ $\} ۲۰ + ۱۲ = ۳۲$ گولے - کل گولوں کا مجموعہ ہوگا - **محمد دستگیر خزانہ دار میدک**۔

سوالات

استفسار (۶) - ناسخ کے اس شعر کا کیا مطلب ہے۔ ؎

تین تر بھینی ہیں دو آنکھیں مری اب الہ آباد بھی پنجاب ہے۔

استفسار (۷) خواب کی اصلیت کیا ہے یعنے آدمی عالم رویا میں جو مختلف اشکال دیکھا کرتا ہے اُس کے کیا کیا اسباب ہیں اگرچہ یہہ بات مشہور ہے کہ آدمی کے جو کچھ خیالات ہوتے ہیں وہی خواب میں نظر آتے ہیں اُسی کا نام رویا ہے مثل مشہور ہے کہ بلی کے خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں جیسا کہ مرزا صائب نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ ع۔ ہر کہ خسپد تشنہ لب آب رواں بیند بخواب۔ لیکن ہر وقت یہہ مثل صادق نہیں آسکتی کیونکہ بسا اوقات ہم ایسی باتیں خواب میں دیکھا کرتے ہیں۔ کہ جن کا کبھی ہم نے خیال بھی نہیں کیا تھا پس فلاسفہ کی اس باب میں کیا رائے ہے۔ اُس سے مطلع فرمایا جائے۔

استفسار (۸) موتی کے چو بنانے کا کیا طریقہ ہے۔

استفسار (۹) گولوں کی قطار اگر مستطیل بنائی جائے تو اُن پر جس قدر گولے جم سکینگے اُن سب کی تعداد معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

استفسار (۱۰) مومن خان کے اس معمے کو کس طرح حل کیا جائے ؎

مرجا رقیب رشک سے گو بے صال یا ہے اُس کی چشم شوخ ادا میرے واسطے

محمد حسین علی (دیوڑھی راجہ راؤ رنجا بہادر)

زنگی اور آئینہ

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا
نظر آئی جب اُس میں شکل زشت اُس کی تو گھبرایا
وہ چپٹی ناک، وہ نتھنے کشادہ، ہونٹ وہ موٹے
وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا
ہوئیں یہہ دیکھ کر غصے سے اُس کی لال لال آنکھیں
تھا کالا کوئیلا پہلے بنا اب سُرخ انگارا
لگا مارنے کی طرح کھانے پیچ و تاب اُس دم
بُرائی اپنی صورت کی قصور آئینہ کا سمجھا
رہی بالکل نہ تاب ضبط جب اُس کو تو جھنجھلا کر
زمیں پر آئینہ پٹکا چڑھا کر ناک بھوں بولا
اسی سے کو کسی نے راستے میں اس کو پھینکا ہے
نظر آتی ہے اس میں کیا بُری ہیئت بُرا چہرا
جو اپنے عیب سے غافل ہیں اُن کی ہے یہی حالت
خدا اے لمعہ ہو، اُس سے بتائے عیب جو ان کا

لمعہ حیدر آبادی

ریویو

ادیب کا طوفان نمبر

ہماری نظر سے گزرا۔ اس میں سب سے پہلا مضمون ہمارے روشن خیال دوست جناب سید خورشید علی صاحب کے قلم کا نتیجہ ہے جس میں رودِ موسیٰ کی طغیانی اور حیدرآباد کی تباہی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور سرکار کی جانب سے باشندوں کی رفع تکالیف اور مصیبت زدگوں کی امداد میں جو کوششیں اور سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں۔ اُن کا بیان ہے۔ اگر کوئی شخص طغیانی کے حالات اور ریلیف ورک کی کل کارروائیوں سے کماحقہ واقف ہونا چاہے تو اُس کو ضرور ادیب کا یہ نمبر دیکھنا چاہیے جس میں جزئی جزئی واقعات تک استیعاب سے درج کیے گئے ہیں۔ چونکہ طغیانی کا واقعہ ابھی نیا ہے اور بلدے کے رہنے والوں نے اُسے اپنی آنکھوں دیکھا یا سُنا یا لوکل اخباروں میں پڑھا ہے اس لیے شاید انہیں واقعات طغیانی کی یہ تفصیل اہم اور دلچسپ معلوم نہ ہو لیکن کچھ عرصے کے بعد جب گزشتہ حالات کی یاد تازہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی اس وقت ایک مفید اور عمدہ مرجع ثابت ہوگا۔ باہر والوں کے لیے جنہوں نے بچشم خود ان واقعات کو شاہد نہیں کیا یا جن کے پاس یہاں کی لوکل خبروں کے پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں یہ نمبر خاصکر مفید ہے۔ وہ اس میں شروع سے لے کر اب تک کی کل کارروائیوں کو ایک جگہ مجتمع پائینگے اور کسی امر کو معلوم کرنے کے لیے انہیں اخبارات کے فائیل کو نہ اُلٹنا پڑیگا۔

ادیب ہمارے ملک کا لوسائٹی شدہ پرچہ ہے۔ اس سے پہلے اس کے ایک دو نمبر ظفریاب خاں صاحب کی زیر ایڈیٹری نکل چکے ہیں لیکن طوفان نمبر خصوصیت کے ساتھ سید خورشید علی صاحب کے اہتمام سے نکالا گیا ہے۔ اس میں صرف سید خورشید علی صاحب ہی کا ایک مضمون ہے جو ۱۹ صفحوں پر ختم ہوتا ہے ہمارے دوست لٹریری دنیا میں ایک خاص امتیاز پیدا کر چکے ہیں آپ نے جس جوش و خروش اور فصیح و دلسوز پیرائے میں یہ مضمون تحریر فرمایا ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل دکن میں بھی تحریر و تصنیف کی قابلیت پیدا ہو چلی ہے۔ اس مضمون میں ایک بڑی فروگزاشت یہ ہوئی ہے کہ ہمارے دوست نے واقعات کا صرف ایک ہی پہلو دکھایا ہے۔ انہوں نے جہاں ریلیف ورک کے انتظامات کی خوبیاں بتائی ہیں وہاں اس کی بعض بدنظمیوں کا اظہار اور اُن کے تدارک کی کوئی صلاح نہیں دی۔ انہوں نے جہاں گزشتہ کارروائیوں کی تفصیل لکھی ہے وہاں یہ نہیں بتایا کہ ابھی ریلیف کمیٹی کو جو نقصان کے لیے اور کیا کچھ کرنا باقی ہے اور ابھی ایسے کتنے اہم انتظامات ہیں جن کو برو کار لانے کی ضرورت ہے۔ مگر شاید ہمارے دوست کی طرف سے اس کا یہ جواب ہو کہ اس نمبر کے نکالنے کا مقصد یہ ہے کہ طغیانی رودِ موسیٰ کے متعلق اب تک جو جو واقعات گزرے اور جتنے کام ہوئے اُن کو یکجا یادداشت کی شکل روداد قلمبند کیا جائے۔ خیر جو کچھ ہو ادیب کا یہ حصہ نہایت دلچسپ ہے اور قابلیت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

اس نمبر میں ہم کو جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ اس کا حصۂ نظم ہے۔ نہ جانے ہمارے دوست نے اس پر جانچ پرتال اور دیکھ بھال کیے ایسی بے تکی اور رطب و یابس نظموں کو کیسے شائع کر دیا۔ سوائے مولوی علی حیدر صاحب اور دو ایک اصحاب کی نظموں کے ہمارے نزدیک کوئی نظم اس قابل نہ تھی کہ یہ پرچے میں درج کی جاتی اور اس سے شاعری کا مذاق گندہ کیا جاتا۔ کیا یہ عجیب بات ہے کہ مولوی محب حسین صاحب کے سے کہنہ مشق ناظم و ناثر سے کہ ایسا لغو قطعہ اُن کے قلم سے نکل گیا جس میں نہ الفاظ کی نشست کرسی درست۔ نہ معنی موزوں نہ قوافی چست نہ مضمون ہی ہے۔

محمد عبدالباسط

کچھ نہ کہے سنے، اور تو اس کا عہد و پیمان کر چکی ہے۔ یہ تیرا نہیں میری قسمت کا قصور ہے۔ ہائے تو نے میری قدر و قیمت کچھ نہ جانی "

ملکہ: "اماں جان میں آپ کو دل سے چاہتی ہوں اور آپ کی وقعت میرے دل میں ہے"

نواب بیگم: "دل میں رہا کرے لیکن افعال سے ظاہر ہوتا ہے کہ تو مجھے بلاؤں میں پھنسانے کی کوشش کرتی ہے"

ملکہ: "آپ کی ان باتوں کے سننے سے مجھے موت بھلی معلوم ہوتی ہے کاش میں مر گئی ہوتی"

(اس وقت ملکہ زور زور سے رونے اور ہچکیاں بھرنے لگی۔

نواب بیگم: "(ملکہ کو اپنی آغوش میں کھینچ کر) دیکھ تو سہی! تو کتنا غم و غصہ کھا رہی ہے اور کس قدر کوفت اٹھا رہی ہے۔ کیونکہ تجھے اپنی بدقسمتی کا علم ہو گیا ہے میں کیونکر تیری مدد کروں۔ جب تو کچھ کہتی ہی نہیں۔ آخر بیان تو کر کہ تیرے باپ نے تجھ سے کیا کہا؟"

ملکہ: "یہی تو نہیں ہو سکتا میں قول دے چکی ہوں کہ آپ سے کچھ نہ بولونگی لیکن اتنا کہتی ہوں کہ پیر سے شادی کرنا فرض ہے"

نواب بیگم: "وہی ایک ہی رٹ جب سے لگی ہوئی ہے۔ اری یہ تو کہہ کہ اس سے شادی کرنا کیوں فرض ہے؟ مجھے یہی تو پوچھنا ہے کہ فرض ہونے کا کیا سبب ہے؟"

ملکہ چپ ہو رہی اور حزین و غمگین ہو کے سر نگوں ہو گئی۔ نواب بیگم بہت پریشان و متردد تھی اور محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور جی میں کہہ رہی تھی "ہائے جی ملعون اس پاک اور سادے دل میں کیسا آلودہ زہر بھر چکا ہے۔ مگر خیر میں بھی اسے وہ پٹکی دیتی ہوں کہ برباد ہی ہو جائے دیکھوں تو میری بچی کو کس طرح پر مجھ سے چھپا کے لے جاتا ہے"

رات زیادہ آگئی تھی، دکھیاری ماں، بیٹی کو چھوڑ کے سونے کو چلی گئی کمرے میں آکے شب خوابی کے کپڑے پہنے، اور بستر پر پڑ گئی۔ اندرونی قلق سے رات بھر پلک نہ جھپکی۔ پچھلی پہر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی۔ اُدھر ملکہ کی بھی وہی حالت رہی۔ رات بھر آہ و بکا، نالہ و شیون سے کام تھا۔ وہ نواب کی باتوں کو صحیح تصور کیے ہوئے تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ جس خطرے کا اُس کے آگے اظہار کیا گیا۔ اُس پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا دینا ضروری ہے اُسے یہ بھی یقین تھا کہ دلی تمناؤں میں ناکامیاب ہونے اور حزن و غم کے غالب ہو جانے سے اُس کی زندگی زیادہ طول نہ کھینچیگی۔ اور اُس کا کام جلد تمام ہو جائے گا۔

چاشت کے وقت نواب بیگم بستر سے اُٹھی، کپڑے بدلے اور نواب کے بلانے پر اُس کے پاس گئی نواب بولا "بیگم! پیٹیر دیر تک تمہارا انتظار کر کے چلا گیا۔ تم آج خلافِ عادت دیر تک سوتی رہیں۔ پیٹیر تین دن کے بعد پھر آنے کا وعدہ کر گیا ہے"

نواب بیگم "اب وہ تنہا تمہیں کو یہاں پائے گا"

نواب "کیوں؟ تم کہاں جاؤ گی؟"

نواب بیگم "میں ملکہ کو لے کے یہاں سے چلی جاؤنگی"

نواب "کب اور کہاں؟"

نواب بیگم "آج سے چوتھے دن، ایک خاص مقام پر میں پہنچ جاؤنگی"

نواب (دل میں) اوہ، کچھ پروا نہیں۔ تدبیر کے لیے کافی مہلت ہے (بظاہر) اس سفر سے فائدہ؟"

نواب بیگم "یہ کہ تمہارے پنجے سے چھوٹ جاؤں"

نواب "کیا ہم پھر جدا ہو جائینگے؟"

نواب بیگم "جدا؟ تم تو یہی چاہتے ہو"

نواب :۔ میرا یہ منشا نہیں مگر خیر اب میں تم سے زیادہ تعرض نہیں کروں گا اور تمہاری خصومت کو مٹانے کے لیے، سردست آج کا دن باہر ہی بسر کرونگا۔"

اتنا کہا اور نکل کے باہر چلا گیا۔ نواب بیگم جی میں بولی :۔ "اب شاید کوئی نیا دام بچھانے گیا ہے مگر مجھے سفر سے تو نہیں روک سکیگا۔"

پہلا دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی آخر ہو گیا۔ نواب کا پتہ نہیں تھوڑی رات گئے وہ محل میں نواب بیگم کے پاس آیا اور بیان کیا کہ "یہاں کے کشادہ جنگلوں کی تفریح میں زیادہ وقت صرف ہو گیا۔"

دوسرے دن نواب بیگم کی جاگیرات کا مختار عام، بعض امور کے تصفیہ کو آیا۔ نواب بیگم اس کے کاروبار میں مصروف ہو گئی۔ چونکہ گرمیاں شدت کی پڑ رہی تھیں اور ہوا بند تھی، ملکہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی باغ میں جانے کا خیال آیا۔ ساتھ ہی وہ جھرمٹ یاد آ گیا۔ جہاں جنگلی انسان کے ساتھ ایک پر لطف سین گزرا تھا۔ اس یاد نے تمام پرانے غم تازہ کر دیے۔ وہ اٹھی اور ایک تنگ روش پر چلنے لگی۔ یہ روش گھنے درختوں میں ہو کے دور تک چلی گئی تھی اور باغ کی دیوار کو پہنچتی تھی۔ سو قدم بھی نہ گئی ہو گی کہ دفعتاً سامنے اپنے باپ کو کھڑا پایا ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی اور حیرت و دہشت سے بولی :۔ "باوا جان آپ یہاں کہاں؟"

نواب :۔ "بیٹی! یونہی اتفاقاً آ نکلا۔ میں نے اس راستے کو آج سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا اس لیے ادھر سے لوٹ کر آ رہا تھا۔ لے اب میرے ساتھ آؤ کہ تنہائی میں چل کر امور آئندہ کی بابت کچھ مشورہ کریں۔"

ملکہ نے طوعاً و کرہاً باپ کا ساتھ دیا۔ نواب نے پیٹر کا ذکر چھیڑ دیا اور مختلف وعدوں میں اس کو گتھا سے رکھا۔ دونوں چلتے چلتے باغ کے ایک چھوٹے سے دروازے پر پہنچے۔ نواب دروازہ کھول کے باہر

ہو گیا۔ ملکہ حیران تھی کہ وہ کیوں باہر جا رہا ہے۔ اتنے میں اُس کی نظر ایک بگی پر جا پڑی جو پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی ملکہ باپ سے پوچھنے لگی "ابا جان! یہ یہاں کس کی گاڑی ہے؟"

نواب: "تم آؤ تو سہی! ہم وہاں چل کے دریافت کر لینگے"

ملکہ گاڑی کے قریب آچکی تو نواب بولا "چل بیٹی! اب اِس گاڑی میں سوار ہو جا"

ملکہ: "(نہایت استعجاب سے) یہ کس کی گاڑی ہے؟ اور میں اِس میں کیوں سوار ہو جاؤں؟"

نواب: "یہ میری گاڑی ہے۔ میں تمہیں لے کے پیرس کو جانا چاہتا ہوں"

اِس وقت ملکہ کی نظروں میں دنیا تاریک تھی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور باپ سے سخت نفرت پیدا ہوئی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کے نواب نے اُسے پکڑ لیا اور جبراً و قہراً گاڑی میں چڑھا دیا۔ کوچمین نے چلنے کا اشارہ پاتے ہی گھوڑے تیز کر دیئے اور گاڑی دم بھر میں ہوا کے مانند یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گئی۔ ملکہ زور زور سے چیختی اور فریاد کرتی ہی رہی مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ نواب رستہ بھر کبھی ملاطفت سے پیش آتا تھا کبھی وعید و تہدید سے کام لیتا تھا۔

نین اِسی عالم میں دیوار کے پیچھے سے ایک صورت نمودار ہوئی اور یہ دردانگیز منظر غور سے دیکھتی رہی۔ جب گاڑی نگاہ سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی باغ میں پوشیدہ ہو گئی۔

نواب بیگم اپنے کاروبار سے فارغ ہو کے ملکہ کے کمرے میں گئی۔ وہاں کون تھا۔ کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ نوکروں سے دریافت کیا۔ اُنہوں نے

کہا کہ ابھی باغ میں ٹہلتی ہوئی گئی ہیں۔ نواب بیگم نے تمام باغ چھان مارا اور متعدد مرتبہ زور زور سے آواز دی۔ مگر پتہ نہ چلا۔ معاً ایک آدمی جس کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا ہے ظاہر ہوا اور تمام ماجرا جو دیکھا اور سُنا تھا بیان کر دیا۔ یہ آدمی وہی نوکر تھا جو گیرڈی کی جانب سے نواب کی جاسوسی پر متعین کیا گیا تھا اور جو بظاہر اُس کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

اس حادثۂ ہیبت افزا اور واقعۂ جانگزا کو سُن کے نواب بیگم کے ہوش اڑ گئے، اُس کے مُنہ سے بھیانک آواز میں ایک چیخ نکلی۔ جوڑ بند ڈھیلے پڑ گئے۔ دماغ چکرانے لگا۔ اور ایک حرکت، نزبوجی کے ساتھ غش کھا کے دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ گرنے کی صدا سُن کے نوکر چاکر اور لونڈیاں دوڑی آئیں اور اُس کو آہستگی سے کمرے میں اُٹھا لے گئیں۔

بارھواں باب

ڈاکٹر کی تدبیر

سرا منزل میں ہنا کو رہتے ہوئے کامل تین سال گزر چکے۔ اُس کے معالجے میں ڈاکٹر شب و روز وہیں مقیم ہے۔ ہم گزشتہ ابواب میں لکھ آئے ہیں کہ ڈاکٹر نے اُس کی صحت یابی کی تکمیل میں ایک منصوبہ گانٹھ رکھا تھا۔ وہ منصوبہ اِس باب میں ظاہر ہوتا ہے۔

جوب اور جیکب ولیم رخصت ہو چکے تھے اور اِس کو دس دن گزر چکے تھے

کہ ایک گاڑی آ کے سرا منزل پر ٹھہری - یہ گاڑی بیٹھنے والوں سے خالی تھی، ڈاکٹر ہنا کو لیے ہوئے اندر سے ۔۔۔۔ گاڑی کے قریب آیا - ان کے پیچھے ایک خادمہ بڑا سا بقچہ اٹھائے ہوئے آئی - ڈاکٹر نے ہنا کو گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور ارادہ ظاہر کیا کہ آج سیر و تفریح کے لیے دور تک چلنا چاہتا ہے - پھر خادمہ سے بولا "اب تم جا کر اُس لڑکی سے جو آج کل ہمارے زیر معالجہ ہے بہت باخبر رہنا اور اُس کی خدمت گزاری اور نگرانی سے غفلت نہ کرنا"

جس لڑکی کی نگرانی کے لیے اُس نے ضروری احکام صادر کیے تھے وہ نہ بیمار تھی نہ پاگل - وہ کسی خاص ضرورت سے اس ڈاکٹر کے پاس بھیجی گئی تھی کہ اُس کی موجودہ حالت کی جانچ پرتال کی جائے - اور اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ وہ اس حالت کو کیونکر پہنچ گئی -

چونکہ یہ ڈاکٹر نئے نئے امراض کی تحقیق و تشخیص کا فطرتی شوق رکھتا تھا - لہذا اُس نے اس کام کا بیڑا اُٹھا لیا تھا - اس عورت کا سرا منزل میں داخل ہونا اور رہنا کرنیل گیرڈی کی لاعلمی میں تھا - اس وجہ سے اُس کو مخفی ہی رکھا جاتا تھا -

ڈاکٹر پہلے سے ٹھان چکا تھا کہ ہنا کو لے کے انبیال جائے گا گاڑی سیدھے اسٹیشن پر پہنچی - ہنا کو باستے کے مختلف مناظر و عمارات سے بڑی بہجت حاصل ہوئی - اسٹیشن پر پہنچ کے اُسے پیاس لگی - پانی مانگا - ڈاکٹر نے بقچہ کھول کے گلاس نکالا - اسے آب آمیز شراب سے بھرا، پھر ایک چھوٹی سی شیشی جس میں پیلا عرق تھا نکالی شیشی سے دو تین قطرے گلاس میں ٹپکائے اور ہنا کو دے کے کہا "لو یہ مفرح شربت ہے اسے پی جاؤ"

پانچ منٹ نہ گزرے تھے کہ ہنا کو جمائیاں آئیں ۔۔۔ انگڑائیاں

لینے لگی اور اس کا ہاتھ پاؤں ٹوٹنے لگے۔ پلکیں جھپکیں اور خواب گراں سے مست ہو کے بے اختیار ہو گئی۔ ریل چلنے کو تھی، ڈاکٹر نے اٹھا کے اس کو اپنے بے میں لٹا دیا اور اوپر سے پوستین اڑھا دیا۔

ریل انبیالے کے اسٹیشن پر رکی۔ ڈاکٹر نے ایک گاڑی کرایہ پر لیکے ماریل کا رخ کیا۔ ماریل میں حبیب اور حبوب نے اپنے بڑھے ہوئے اشتیاق اور حد سے زیادہ بیتابی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ ہنا سو رہی تھی۔ جو دوا ڈاکٹر نے اسے پلائی تھی اس کے اثر سے چوبیس گھنٹے بیہوشی طاری رہا کرتی تھی۔ ہنا کو اس کے خاص کمرے میں لٹا دیا گیا اور کمرے کو اسی حالت پر آراستہ کر دیا گیا جو حالت اس رات تھی جس میں خبیث ریاول نے ہنا پر حملہ کیا تھا۔ ڈاکٹر نے جتا دیا تھا کہ ادھر کوئی بات نہ ہونے پائے۔ جو خلاف عادت معلوم ہو۔ نیز مرتھا صبح میں وہی کام کاج کرتی نظر آئے جو سابق میں کیا کرتی تھی۔

ہنا کے بالاخانے میں وہ کتا جو ہیمر کے مشابہ تھا اور جو پیرس کے عجائب خانے سے خریدا گیا تھا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ تمام تدبیریں اس غرض سے کی گئی تھیں کہ ہنا جس وقت بیدار ہو تو اس کی نگاہ انہی چیزوں پر پڑے جنہیں وہ پہلے دیکھ چکی تھی۔ وہی باتیں پیش آئیں جو پہلے پیش آئی تھیں۔ اور تمام چیزیں ویسی ہی معلوم ہوں جیسی پہلے تھیں تاکہ ہنا اپنی دیوانگی کی نسبت یہ خیال کرے کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ اس خواب سے بیدار ہوتے ہی تمام خطرے جاتے رہے۔

بڑے انتظار کے بعد صبح نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر، حبیب کے کمرے میں آیا اور دونوں چپکے سے کھڑکیوں کی آڑ میں چھپ کے درزوں میں سے دیکھنے لگے کہ ہنا کس طرح نیند سے جاگتی ہے۔

ہنا نے پہلے پہل ایک حرکت کی۔ پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر

کمرے میں چوطرف نظر دوڑائی، ہر ہر چیز کو اُسی موقع محل پر پایا۔ جو ریاض کے حملے کی رات میں رکھی ہوئی تھی۔ اتنے میں کہا آیا دم ہلانے لگا اور اُنست کی آواز سے پکارنے اور جیب نکالنے لگا۔ ان تمام باتوں کا اثر ہنا پر یہ ہوا کہ اُس نے اپنے جنون کو خواب و خیال ہی تصور کیا بستر سے اُٹھی۔ آئینے میں صورت دیکھی، بال درست کیے اور مسکرا کے غسل کے لیے غسل کی طرف بڑھی۔ اتنے میں اُس کی نظر دیوار پر پڑی دیوار سے گھڑی ٹنگ رہی تھی، پھر اُس نے اپنی میز کھولی اُس میں جتنی چیزیں اُس نے رکھ چھوڑی تھیں بجا لہ موجود تھیں۔ اُس کے مرصع زیورات بھی اپنی سابقہ حالت پر تھے۔ یہ دیکھ کے اُس کو گو نہ اطمینان ہوا۔ اُس نے مُنہ دھویا۔ سر میں کنگھی کی۔ بال سنوار کے جوڑا باندھا۔ اور اُس کرسی کے قریب آئی جس پر اُس کے کپڑے رکھے ہوئے تھے کپڑے بھی اُسی حالت پر تھے جو پہلے تھی۔ ابھی اُس نے کپڑے پورے نہ پہنے تھے کہ برابر کے کمرے سے جیکب نے آواز دی "بیٹی! کیا تو ابھی نہیں بیدار ہوئی؟" باپ کی آواز سنتے ہی اُس کے بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ اور وہ کھڑی ہو گئی۔ دوبارہ آواز آئی "دیکھ تو دن کتنا چڑھ آیا ہے۔ مرتھا دسترخوان پر ناشتہ چن رہی ہے تو نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے" ہنا جواب میں بولی "بابا جان! میں بیدار ہو چکی ہوں۔ اور کپڑے بدل رہی ہوں۔ کوئی دم میں وہاں آتی ہوں"۔

جیکب "ہنا بیٹی تجھے ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ بیٹا جوب دو مہینے کی رخصت لے کے تیرے دیکھنے کو آیا ہے۔ اب تو جلدی سے اُس کی ملاقات کو تیار ہو جا"

ابھی یہ الفاظ ختم نہ ہونے پائے تھے کہ نیچے خانہ باغ میں جوب کی آواز

سنائی دی، جو اب اس وقت وہی گیت گا رہا تھا جو اس نے ہنا کو بھی سکھایا تھا۔ ہنا نے سراپا شوق و اضطراب ہو کے بے اختیار نیچے نگاہ ڈالی، فوراً چار آنکھیں ہوگئیں اور جو ب کہنے لگا: "پیاری ہنا! صبح بخیر۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تمہاری پُر لطف نیند میں خلل پڑے گا تو میں تمہیں دو گھنٹے کے پہلے ہی بیدار کر دیتا۔ مجھے تمہاری دیدار کا جو اشتیاق ہے وہ تمہیں کیا معلوم!"

یہ سُن کے ہنا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر مسکرائی، اُس کی پیشانی سے فرحت ٹپک رہی تھی اتنے میں پیچھے سے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ہنا نے مڑ کے دیکھا جیکب آ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کے بولا: "ہنا! ناشتہ تمہارا انتظار کر رہا ہے اور تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ کیا تمہیں جوب دکھائی دیا؟"

ہنا: "جی ہاں باوا جان! وہ مجھے ابھی ابھی نیچے باغ میں نظر آئے تھے" (اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے بہ مشکل اپنے آپ کو سنبھالا)

جیکب: "بیٹی! میں اُس کا بہت مشتاق تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ وہ آ گیا۔ تم ہی دونوں میری زندگی کا لطف ہو اور تمہاری یکجائی پر ہی میری خوشی کا دار و مدار ہے۔"

اس وقت ہنا کپڑے اور زیورات پہن کے تیار ہو گئی اور جیکب کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ چند قدم پر اُسے مرتھا ملی اور حسب عادت دعائیں دیں، پھر جوب بھی آ پہنچا۔ دونوں نے آہستگی سے معانقہ کیا۔ سب آدمی دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ ہنا اس وقت بالکل خاموش تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر ایک خود رفتگی سی طاری ہے۔ اُس کی یہ خاموشی جیکب اور جوب کی پریشانی کا موجب تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کے سب آدمی حاضر باغ کی سیر کو نکلے۔ جوب ہنا کا ہاتھ پکڑے ہوئے درختوں کے اس جھنڈ میں داخل ہوا جہاں ان دونوں کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں جا کے جوب نے ہنا کو سبز پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ کے کہنے لگا: "پیاری! یہی وہ مقام ہے جہاں تم نے میری زبان سے اس محبت کا اظہار کروایا تھا جو ۔۔۔۔

ہنا: "ہاں پیارے! مجھے وہ دن یاد ہے۔"

یہ بولی اور اس خوشی میں پل گئی۔ جب ان دونوں کا غصہ چوپٹ کے خود بخود ان سے جاتا رہا تو اس وقت وہ اٹھ کے پھر باغ میں ٹہلنے لگے۔ ہنا اپنے قدیم باغ میں بہت سی چیزوں کو یاد کر رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک درخت کے نیچے ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی: "اس درخت میں ایک گھونسلا تھا وہ اب دکھائی نہیں دیتا۔"

جوب: "کیوں نہیں۔ وہ دیکھو اس ڈالی میں لٹک رہا ہے۔"

ہنا: "(سر ہلا کے اور متبسم ہو کے) وہ پہلے ادھر ۔۔۔۔ اس شاخ میں لٹکتا تھا۔"

پھر وہ چند قدم آگے بڑھ گئی اور اس پر ربودگی سی طاری ہو گئی۔ چند منٹ کے بعد اس نے جوب کا ہاتھ پکڑ کے کہا: "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" جوب چلنے لگا۔ بیکب بھی ساتھ ہو لیا۔ ہنا سیدھی اس جھرمٹ کی طرف چلی جہاں سے ابھی ابھی لوٹ آئی تھی۔ اس جھرمٹ میں داخل ہو کے وہ ایک جانب بیٹھ گئی اور دونوں کو اپنے دونوں بازو بٹھایا۔ کچھ دیر تک غور و تامل کرنے کے بعد سر اٹھا کے

نوٹ: دیکھو حصہ دوم باب اول جس کا عنوان ہے "بزدل عاشق"۔ ۱۲ مترجم

بولی:" اگر میں آپ دونوں بزرگوں سے اپنے متعلق کوئی بات دریافت کروں تو مجھے امید ہے کہ صحیح جواب دیا جائے گا"

جیکب اور جوب:" (متفق اللفظ ہو کے) کیوں نہیں ضرور دیا جائے گا"

ہنا:" تو بیان فرمائیے کہ مجھے جنون ہو گیا تھا اور میں عرصے سے دیوانی تھی یا نہیں"

اس سوال کو سن کے دونوں سٹ پٹانے لگے اور ان کی زبان رک گئی

ہنا:" نہیں نہیں! مجھ سے چھپاؤ نہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے اپنے آپ کو ندی میں ڈبو دیا تھا۔ بعد ازاں مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا"

جیکب:" (ایک لمبی سانس لے کے) ہاں بیٹی! تیرا خیال صحیح ہے مگر خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو پھر اصلی ہوش و حواس میں آ گئی۔ اب تیری صحت یابی کے بعد ہم کو اپنی زندگی میں کسی خطرے کے پیش آنے کا خطرہ باقی نہیں رہا"

ہنا:" وہ شخص جس نے مجھے ندی سے نکالا۔ کون تھا؟"

جیکب:" میں تم سے پورے واقعات بیان کرتا ہوں۔ تاکہ تمہارے تمام خلجانیں رفع ہو جائیں۔

تم اپنے کمرے میں سو رہی تھیں اور دریچہ کھلا رہ گیا تھا۔ اسی دریچے سے ایک چور اندر داخل ہوا۔۔۔۔"

ہنا:" (گھبرا کے) کیا وہ چور تھا جو میرے کمرے میں داخل ہوا تھا"

جیکب:" ہاں بیٹی چور تھا۔ مگر اس کے پیچھے ہی ایک دوسرا آدمی بھی داخل ہوا۔ جو ہمارا مخلص دوست ہے اور جس نے تمہاری آبرو کے ساتھ جان بھی بچائی۔ مگر افسوس ہے کہ اسی کے سر تہمت باندھی گئی"

ہنا:" وہ دوست جنگلی انسان تو نہیں"

جیکب :۔ "وہی وہی۔ اُس نے چور کو پکڑ لیا اور قتل کرنا چاہا۔ مگر پھر نہیں معلوم کیا خیال آیا کہ زندہ چھوڑ دیا۔ تم اُس وقت بے ہوش ہو چکی تھیں۔ جب تمہیں ہوش آیا تو تم نے رات کے واقعات یاد کیے۔ تمہارے خیالات میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ اسی حالت میں تم نے جنگلی انسان کو اپنے کمرے میں بیٹھا پایا۔ سمجھیں کہ اُسی نے تم پر حملہ کیا۔۔۔"

ہنا :۔ "میرے کمرے میں جو کچھ واقعات گزرے ہیں۔ وہ صرف اسی قدر ہیں یا کچھ اور بھی۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس کے سوا اور بھی واقعات ہوئے ہونگے"

جیکب :۔ "تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ تم کو کسی قسم کا جسمی نقصان قطعاً نہیں پہنچا۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تم اب تک ہر قسم کے عیب سے بالکل مبرا ہو"

ہنا :۔ "اچھا اس کے بعد کیا ہوا"

جیکب :۔ "جب تم نے اپنے آپ کو ندی میں گرا دیا۔ تو جنگلی انسان نے بھی تمہارے پیچھے پانی میں غوطہ لگایا۔ اور تمہیں صحیح سالم اوپر نکالا۔ مگر تم کو ہوش نہ تھا۔۔۔۔۔۔"

یہیں تک کہا تھا کہ مرتھا سامنے سے دوڑی ہوئی آئی۔ اس کو ڈاکٹر نے تفحص حال کے لیے بھیجا تھا۔ جیکب اُس کو دیکھ کے بولنے لگا :۔ "مرتھا! آؤ۔ اب خوف جاتا رہا۔ اور پیاری ہنا اپنی پہلی عقل و عافیت کے ساتھ ہمیں مل گئی ہے۔ اس لیے ہمارا پہلا سرور بھی ہمارے پاس لوٹ آیا ہے"

مرتھا قریب آئی۔ اشتیاق بھرا سلام کر کے دعائیں دیں اور بلائیں لیں۔ ہنا اپنی پہلی بشاشت و انست سے پیش آئی۔

مرتھا فوراً واپس چلی گئی اور ڈاکٹر سے تمام ماجرا کہہ دیا وہ بولا: "میں جس بات کا متوقع تھا وہ پوری ہو چکی۔ اب میں اُس کے سامنے جا سکتا ہوں" اتنا کہہ کے درختوں کے اُسی جھرمٹ میں چلا آیا جہاں ہنا۔ جیکب اور جوب بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کے آنے پر جیکب نے ہنا سے یہ کہتے ہوئے اُس کو انٹروڈیوس کرایا: "بیٹی! یہی وہ صاحب ہیں۔ جن کے ڈاکٹری تجربوں اور شبانہ روز کوششوں نے تمہیں تندرستی عطا کی"

ہنا: "جی ہاں! دادا جان! میں آپ کو بخوبی جانتی ہوں اور عمر بھر آپ کا احسان مانتی رہوں گی آپ نے جس محنت سے میرا علاج کیا۔ اُس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جا سکتا"

تھوڑی تہ و قال کے بعد مجمع برخاست ہوا۔ دوسرے دن علی الصباح بعض خاص ضرورتوں کی انجام دہی کے لیے ڈاکٹر سر امنزل کو سدھارا۔ اور ہنا، جیکب، جوب کو اس حال میں چھوڑ گیا کہ تینوں اُس کی مدحت میں رطب اللسان تھے اور اپنی دلی دعاؤں کو اُس کا حرزِ جاں بنا رہے تھے۔

تیرہواں باب

ملکہ اور سوسن

ہنا پیرس میں اپنے باپ کے پاس ایک قیدی کی طرح رہتی تھی۔ اُس کو باہر جانے کی مطلقاً اجازت نہیں تھی نہ بسبیل سیر و تفریح اور نہ بغرض ملاقات۔ اُس کے ملنے جلنے والوں میں پیٹر گسٹری کے سوا

کسی کو اجازت نہ تھی کہ اُس سے ملاقات کر سکے پیٹر کو بھی اس وجہ سے اجازت دی گئی تھی کہ ملکہ کو اُس سے تعلق پیدا ہو جائے اور وہ اُس سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کرے۔ ملکہ پیٹر کے ساتھ اگرچہ لطف و انست کا برتاؤ کرتی تھی لیکن خاص بشاشت نہ ظاہر کرتی تھی۔ نواب ہمیشہ ملکہ کی دلجوئی میں مصروف رہتا تھا اور دل خوش کن وعدوں سے اُس کو مسرور بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اُس سے کہا کرتا تھا "بیٹی! میں جو تم کو تمہاری ماں سے چھڑا کے یہاں لایا ہوں اُس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں کوئی برائی پہنچاؤں تم خوب سمجھ سکتی ہو کہ کوئی سنگدل سے سنگدل باپ بھی ایسا نہ ہوگا جو اپنی اولاد کی ایذا رسانی کے درپے ہوگا۔ مجھے تمہارے مستقبل کی بڑی فکر ہے۔ اور میں رات دن اسی اُدھیڑبن میں لگا رہتا ہوں کہ تم کو کن کن طریقوں سے آرام و راحت پہنچاؤں۔ تمہاری ماں پیٹر سے تمہاری شادی کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی لہذا مجبوراً مجھے یہ تدبیر اختیار کرنی پڑی۔ اب چارناچار اس کو میرے پاس آنا اور میرے قول کو ماننا پڑے گا۔ اُس کے تسلیم کرتے ہی تم مطلق العنان ہو جاؤ گی اور جہاں چاہو گی جا آ سکو گی۔"

ملکہ اپنے باپ کے احکام کو محض اُن مصائب کے خوف سے جن کا تذکرہ اُس سے کیا گیا تھا گوش دل سے سنتی اور عمل میں لانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ بہت آسانی سے نواب کی قید سے نکل سکتی تھی۔ کیونکہ کرنیل گیرڈی کا وفادار خادم فرڈرک ہمیشہ اُس کی خدمت کو تیار رہتا تھا۔ اور کبھی اُس سے غافل نہ ہوتا تھا اُس کی مدد سے بالکل ممکن تھا کہ وہ فوراً وہاں سے بھاگ نکلے مگر اس خیال سے کہ مبادا اُس کے ماں باپ میں کوئی نیا فساد کھڑا

ہو جائے۔ اس ارادے سے باز رہتی تھی۔ اور ایک فتنہ خوابیدہ کو جگا دینا پسند نہ کرتی تھی۔

ایک دن صبح کو پیٹر کے پاس نواب بیگم کا خط آیا۔ نواب بیگم ملکہ کے قید ہو جانے کے چوتھے دن پیرس میں آگئی تھی اور اپنے مختار عام مسٹر فلینی کے ہاں اُتری ہوئی تھی۔ خط میں نواب بیگم نے لکھا تھا کہ ایک خاص اور اہم معاملے میں گفتگو کرنے کے لیے اُسے پیٹر سے ملنے کی سخت ضرورت ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اُس کے گھر پر آ کے نہیں مل سکتی۔ بعض اسباب جن کا اظہار غیر ضروری ہے۔ وہاں آنے سے مانع ہیں۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ پیٹر ہی نواب بیگم کے مکان پر آئے۔

اس خط کو پڑھ کے پیٹر معینہ وقت پر نواب بیگم کے گھر گیا۔ نواب بیگم بڑی کشادہ پیشانی سے پیش آئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ نواب بیگم نے پیٹر سے کہا "جناب من! آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ آپ کی شادی کے لیے نواب صاحب نے اپنی بیوی اور بیٹی سے کیا سلوک کیا! اور اس بارے میں وہ کس حد تک راستی پر ہیں؟"

پیٹر "بیگم صاحب مجھے اس کی اطلاع ہو چکی ہے اور اس اطلاع پر افسوس بھی ہوا ہے۔ نواب صاحب اس معاملے میں بے شبہ حق پر ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں۔ وہ مجبور رہیں۔ اس لیے معذور ہیں۔"

نواب بیگم "وہ کیوں مجبور رہے اور کس وجہ سے معذور خیال کیا جاتا ہے؟"

پیٹر "وہ میری وجہ سے مجبور و معذور ہیں اور اُن کو جو کچھ کرنا پڑا ہے میری مصلحت کے لیے کرنا پڑا ہے۔ انہیں فقط آپ کی رضامندی کا انتظار رہا جب آپ کی خوشنودی کا اظہار ہوا کہ ملکہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئیں۔"

نواب بیگم :- میں نواب سے یا آپ سے شخصی مخالفت نہیں کرنا چاہتی جب آپ کا ملکہ سے نکاح ہونے لگیگا۔ تو میری مخالفت کا اثر ظاہر ہو جائیگا میری مخالفت جن اسباب پر مبنی ہے۔ اُن کا آپ کو علم نہیں ہے ورنہ آپ کبھی اپنے ارادے پر قایم نہ رہتے اور ہرگز اتنا اصرار نہ کرتے۔"

پیٹر :- میں پورے پورے حالات تو نہیں جانتا مگر مجھے بعض ضروری باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔"

نواب بیگم :- "آپ کو کن کن باتوں کا علم ہوا ہے۔"

پیٹر :- مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے شوہر نے آپ کی بڑی بے عزتی کی۔ آپ کی رفاقت و خبر گیری چھوڑ دی۔ اس پر آپ نے پیرس کی اقامت کو خیرباد کہی اور سنگین محل میں آکے رہنے لگیں۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ نواب صاحب کی آزادہ روی حد اوباشی کو پہنچ گئی اور دنیا بھر کی تھکا فضیحتی اُن کو راہ راست پر نہ لا سکی۔"

نواب بیگم :- "جب آپ نواب کی اتنی برائیوں سے واقف ہو چکے ہیں تو آپ کو ایسے شخص کی بیٹی سے شادی کرتے ہوئے ننگ و عار آنا چاہیئے۔"

پیٹر :- بے شک! مگر مجھے اس لیئے ننگ و عار نہیں آتا کہ ملکہ کی تعلیم و تربیت میں نواب کا کوئی دخل نہیں وہ آپ کی نگرانی میں پلی بڑھی ہیں اور آپ کے اخلاق شایستہ و آداب بایستہ سے آراستہ ہوئی ہیں۔ بلکہ اس وقت ایک بے بہا خزانہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔۔۔۔

بیگم صاحب! میں آپ سے بمنت و سماجت التجا کرتا ہوں کہ آپ میری خواستگاری کو رد نہ فرمائیں اور میری عیش زندگی منغص نہ کریں کیونکہ بصورت انکار مجھے جینا دشوار ہو جائے گا۔"

نواب بیگم :- "جناب عالی! میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں آپ کا عیش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر صحیفہ جلد ۴

(۵)

سدرن ٹین میں اسلامی آثارِ قدیمہ

"سواحلِ ہند میں مسلمانوں کے توطن" کا سلسلہ جو لٹریری دنیا میں غالباً سب سے پہلے صحیفہ میں ہی شروع کیا گیا ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ متجسس نگاہوں میں اپنا اثر پھیلائے بغیر نہ رہا۔ سفرِ مدراس میں ہمارے ایک نہایت مہربان سید شاہ محمد حبیب اللہ صاحب صبغۃ اللہی نے اس سلسلے کے متعلق نہایت بیش قیمت مزید واقفیت ہمارے لیے بہم پہنچائی اور اب انہوں نے جو تحریر سدرن ٹین کے متعلق قلمبند کر کے بھیجی ہے۔ وہ صحیفہ میں نہایت شکریہ کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ بفضل خدا صحیفہ نہ صرف دکن میں اکیلے ترقی کی روح پھونکنے والا پرچہ ہے۔ بلکہ وہ سب سے پہلا علمی رسالہ ہے جس نے جنوبی ہندوستان کی حالت کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اور خدا سے دعا ہے کہ اس کی کوششوں سے ہمارے جنوبی ہند کے مسلمان بھائی جن کو سب سے پہلے سرزمینِ ہند میں اسلام کی خدمت ادا کرنے کا شرف حاصل رہا ہے بیدار ہوں اور دیکھیں کہ ان کی اس طویل خوابِ غفلت کے زمانے میں دنیا کی رفتار کیا سے کیا ہو گئی ہے۔

سدرن ٹین کے ان آثارِ قدیمہ سے ہمارے اس قیاس کی قوی شہادت ملتی ہے

کہ مالک بن دینار کی مبارک کوششیں صرف ملیبار میں محدود نہ رہیں بلکہ کل ساحلِ کارومنڈل میں اس نہایت عظیم الشان سچے مجاہد و داعیٔ اسلام نے اپنا دورہ کیا تھا۔

محمد مرتضیٰ

سدرن ٹپن جس کو انگریزی میں "سٹدراس" (Madras) کہتے ہیں ساحل مدراس کی جانب جنوب کو لم کے آگے ۱۹ میل کے فاصلے پر زمانۂ قدیم کا ایک آباد و مشہور شہر سمجھا جاتا ہے۔ اب اُس کی حالت چنگل پٹھ کے ضلع میں ایک قصبے کی حیثیت سے زاید نہیں۔ ساحلی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں مچھلی کی تجارت ہوتی ہے ہندوؤں کے قطع نظر مسلمانوں کی آبادی جو سب کے سب لبا بین سے ہیں تخمیناً ۸۰ و ۹۰ کے مابین ہوگی۔ افسوس ہے کہ ان لوگوں میں مذہبی پابندی بہت پست حالت میں ہے۔

یہاں ڈچ والوں کا ایک قدیم قلعہ شکستہ حالت میں ہے۔ اُس کے عظیم الشان برج اور حصار اگرچہ انقلاب زمانہ سے بہت شکستہ اور کس مپرسی کی حالت میں ہیں لیکن ابھی تک اپنے دیکھنے والوں کے دل میں اپنی گزشتہ عظمت و استواری کا پورا پورا نقشہ کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ قلعہ بھی انہیں قلعوں میں سے ہے جن کو انگریزوں سے ڈچ نے بروقت معاہدہ توڑ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہاں ڈچ کو بلا امتیاز ہندو مسلمان اولندہ کہتے ہیں۔ یہاں دو مسجدیں ہیں ایک فتح خاں کی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی پتھر و چونے کی مسجد ہے۔ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹا گنبد ملتا ہے جس میں فتح خاں کی قبر ہے اور مسجد کے داہنے جانب گنبد نما رواق میں فتح خاں کے بھائی کی قبر ہے۔ یہ ہر دو گنبد مدراس کے حقہ بردار کے گنبد کے برابر ہوں گے۔ اس دوسرے گنبد کے بلند حصے پر کچھ عبارت فارسی خط میں کندہ ہے۔ بلندی اور نیز خود رو بیلوں کے ڈھک جانے سے اس کا کوئی لفظ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔ یہ گنبد اور مسجد اس قدر تباہ و شکستہ حالت میں ہے کہ اندر قدم رکھتے خوف ہوتا ہے کہ مبادا سانپ یا کوئی اور زہریلا جانور

کاٹ لے۔ مسجد کے ہر ایک حصے میں مصلیوں کے۔ عوض جنگلی خاردار درخت خدا کی یاد میں استادہ ہیں۔ دوسری مسجد جو زیادہ قدیم اور تاریخی طور سے قابل لحاظ ہے کسی قدر اچھی حالت میں ہے۔ مسجد میں ہر وقت ایک بوریا بچھا رہتا ہے جہاں ایک یا دو آدمی یا کوئی مسافر کبھی کبھی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اس مسجد کی وضع تعمیر ویسی ہی ہے جیسی کولم میں مسجد مالک بن دینار کی ہے۔ اور اس مسجد کے متصل ہی ایک قبرستان ہے۔ جس کے الواح مزار کی وضع تحریر و تراش بھی ویسی ہی ہے جیسی کولم میں مالک بن دینار کی مسجد کے متصل قبرستان میں۔ اس مسجد کے متولی مولوی نجم الدین صاحب مرحوم تحصیلدار کے برادر زادے ہیں۔ اور ان کی سکونت سدرن پٹن سے چند میل کے فاصلے پر کسی قریہ میں ہے کولم میں ان سے ملاقات ہوئی تھی انہوں نے بیان کیا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ سدرن پٹن کی مسجد بھی "مالک بن دینار" کی تعمیر کی ہوئی ہے۔ سدرن پٹن سے دو میل جانب شمال اور مہابلی پورم مشہور تاریخی مقام سے چار میل جانب جنوب ایک موضع موسوم بہ کلپاک ہے۔ وہاں آبادی سے بہت دور لب ساحل دو پکی قبریں ہیں عام طور سے ایک قبر کے مدفون کا نام نوربی مشہور ہے۔ اور ان کے پہلو میں ان کے فرزند کی قبر بیان کی جاتی ہے۔ نوربی بڑی صاحب کرامت مشہور ہیں ہر سال ان کا عرس بتاریخ ۲۱۔ ذیحجہ ہوتا ہے۔ یہ دونو قبریں باوجودیکہ ساحل پر ہیں اور بجز ایک مختصر تودہ ریگ کے اور کچھ نہیں۔ بااین ہمہ اپنی اصلی حالت پر قایم ہیں۔ میں نے ان مزاروں کے متعلق مزید تحقیق کرنی چاہی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ ان دونوں قبروں میں سے ایک قبر پر جو نوربی کی قبر کہلاتی ہے سرہانے اور پائین دو پتھر نصب ہیں۔ سرہانے کے پتھر پر شمال کے جانب کچھ عبارت کندہ ہے جو قدامت کے باعث نیز لوح مزار کے روغن آلود ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آئی شاید آیہ کل من علیہا فان الخ ہوگی اس پتھر کی وضع و تراش بھی ویسی ہی ہے جیسی کولم میں مالک بن دینار کے قبرستان میں ہے۔ **سید شاہ محمد حبیب اللہ** صبغۃ اللہی

قدرت کے راز

ایک دن بہرِ عبادت موسیٰ — گئے اک کوہ کی جانب تنہا
شوقِ طاعت میں بچھایا جا کر — اُس کے دامن پہ مصلیٰ اپنا
قربِ خالق کے لیے خلق سے دور — یہ مقام آپ نے تجویز کیا
تا رہے دل کو فراغت حاصل — دھیان کچھ آنے نہ پائے اصلا
اُس جگہ کوئی سوا میرے کے — نہ یگانہ تھا نہ بیگانہ تھا
تھی ہوا صاف نہ تھا گرد و غبار — سبزہ و شاداب تھا جنگل سارا
بار در نخل جھکے جاتے تھے — کرتے تھے سجدہ خالق کو یہ
جس طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھو — نظر آتی تھی اُدھر شان خدا
سبزہ کوسوں وہ سہانا جنگل — انبساط اللہ نشانا حد تھا
نہ کسی طرح کا تھا شور و شغب — شہر کا سا نہ تھا ہنگامہ بپا
طائروں کی تھی اگر نغمہ زنی — وہ بھی ہرگز نہ تھی جز ذکرِ خدا
سامنے اُسکے تھا اک چشمہ بھی — صاف جو صورتِ آئینہ تھا
تھے جہاں حضرتِ موسیٰ بیٹھے — تھا اُسی کوہ کا یہ اک جھرنا
اُس کا پانی تھا خنک اور شیریں — اور اُس پر سے گزرتی تھی ہوا
پاس چشمہ کے تھے گنجان درخت — دور تک سایہ تھا جن کا پھیلا
دیکھی جو گلشنِ قدرت کی بہار — بھا گئی دل کو بہت وہ فضا
اس لیے بعدِ فراغِ طاعت — ٹھہرے کچھ دیر جناب موسیٰ
دل میں تھی یادِ خدائے معبود — اور لب پاک پہ تھی حمد و ثنا
دیکھتے کیا ہیں کہ اُس چشمہ پر — ناگہاں ایک سوار آ پہنچا
اُس کی فتراک کا وہ بل وہ کجی — دے رہی تھی رگِ گردن کا پتا
تیوری اُسکی چڑھی خواہ مخواہ — آپ ہی آپ بل ابرو میں پڑا

کھائی ٹھنڈی جو ہوا آگئی جان
دیکھا پانی کو تو دل لہرایا

آیا تھا پا برکاب عجلت
غیظ کی طرح فرس سے اُترا

ڈگڈگا کر پیا پانی اُس نے
ہاتھ مُنہ دُھو کے وہیں بیٹھ گیا

آخر کار اُٹھا دم لے کر
مگر اُٹھنے کو نہ جی چاہتا تھا

ایک تھیلی میں تھیں سو اشرفیاں
بھولے سے اُس کو وہیں چھوڑ گیا

اتنے میں اور مسافر کوئی
اُسی چشمے کی طرف آ نکلا

اُس نے بھی آتے ہی دُھو کر مُنہ ہاتھ
پانی اُس چشمۂ شیریں سے پیا

پی کے پانی وہ لگا جب چلنے
تھیلی اشرفیوں کی دیکھی اُس جا

دیکھ کر پہلے تو اُس تھیلی کو
دہنے بائیں وہ نظر کرنے لگا

ہر طرف پایا جو خالی میداں
چل دیا لیتے ہی یہ جا وہ جا

جا چکا جب تو پھر اُسکے پیچھے
اک لکڑہارا قضا را پہنچا

ناتواں لاغر و پیر فرتوت
سر پہ رکھے ہوے بھاری گٹھا

تھی عجب ضعف سے حالت اُسکی
ہر قدم پر وہ گرا پڑتا تھا

تھا بہت پیاس سے مرنے کے قریب
سمجھا اُس چشمہ کو بس آبِ بقا

آتے ہی بیٹھ گیا چشمے پر
سانس پھولی ہوئی دم چڑھتا تھا

غرض اس طرح سے کچھ دیر کے بعد
ہوے مشکل سے حواس اُسکے بجا

دُھو کے مُنہ ہاتھ کو پانی پی کر
چھاؤں میں ایک طرف لیٹ رہا

تھا تھکا ماندہ بہت لیٹتے ہی
لگ گئی آنکھ کہ ٹھنڈی تھی ہوا

اب ذرا غور سے سنیے احوال
سو گیا جب وہ تو گزری پھر کیا

دیکھا موسیٰ نے کہ پلٹا وہ سوار
کیسۂ زر کو تھا جس نے چھوڑا

ہاتھ میں اُس کے تھی ننگی تلوار
خون ظالم کی تھا گردن پہ چڑھا

دیکھا چشمے پہ لکڑہارے کو
دی صدا چیخ کے ہاں مال بتا

چونک کر بولا وہ پیر فانی
مال کیسا تو یہ کہتا ہے کیا

ڈر خدا سے یہ ہے کیا غیظ و غضب
یوں کسی پر نہیں الزام اچھا

سن کے اس بات کو بگڑا وہ سوار
اُس کے انکار سے غیظ اور بڑھا

ہو گیا اُس کو گمان غالب
ہو نہ ہو چور یہی ہے میرا

مال دیگا نہ یہ آسانی سے
مول لوں منت کا میں کیوں بکرا

قتل کیجے اسے بہتر ہے یہی
ڈھونڈھ ہی لونگا میں پھر مال اپنا

سوچ کر یہ اُسے ماری تلوار
کر دیا سر کو وہیں تن سے جدا

پھر کمر خوب ٹٹولی اُس کی
جیب و دامن کو بھی دیکھا بھالا

کی تلاش اُس نے بہت کچھ لیکن
کیسۂ زر کا پتہ کچھ نہ ملا

ہو گیا ڈھونڈھ کے جب وہ مایوس
چھوڑ کر اُس کو ہوا واں سے ہوا

دیکھ کر حضرت موسیٰ یہ حال
ہوئے حیراں کہ ہے یہ سانحہ کیا

لے گیا مال تو اک شخص نلوہ
آگئی ایک ستم کش کی قضا

کون مارا گیا اور چور تھا کون
تھی خطا کس کی ملی کس کو سزا

کی دعا درگہِ حق میں یارب
ذات تیری ہے خبیر و دانا

مجھ کو اس راز سے کر دی واقف
مصلحت اسمیں تھی یارب تری کیا

پردۂ غیب سے آئی آواز
حکمتِ محض ہے جو ہم نے کیا

مصلحت اپنی ہمیں جانتے ہیں
دخل دینا نہیں اسمیں اچھا

خیر سن تجھ سے کہے دیتے ہیں
اس میں پوشیدہ ہے جو رازِ قضا

جس کو مظلوم سمجھتا ہے تو
ہے یہ اک ظالم مظلوم نما

جس نے قتل آج کیا ہی اس کو
باپ کو اُس کے تھا قتل اسنے کیا

یہ جوانی میں بڑا تھا رہزن
لکڑیاں پیری میں ہی چننے لگا

مارا تھا باپ کو اُس فارس کی
اُس نے اک دشت میں پا کر تنہا

ہم نے فارس کو مسلط کیا آج
باپ کا اُس نے قصاص اپنے لیا

دوسری بات کا بھی سُن لی بھید
مستتر اسمیں بھی تھا سرِ قضا

لے گیا آکے جو اشرفیوں کو — باپ کا اپنے یہ مال اُس کو ملا
مال سے اُسکے پدر سے یہ سوار — کیسۂ زر یہ چُرا لایا تھا
دونوں باتوں پہ اگر غور کرو — حق بہ حقدار رسید اے موسیٰ
جب سُنی حضرتِ موسیٰ نے یہ بات — بولے سبحانک لا علم لنا
سرِ حکمت ہے تجھی کو معلوم — تاج قدرت ہے تجھی کو زیبا

لمعہ واجب ہے یہ ہر انساں پر
رہے ہر حال میں راضی برضا

لمعہ ابن شعلہ ابن شہید دہلوی

غزل

رہے آوارا ہم برباد ہو کر بھی بیاباں میں — ہماری خاک کا دھبہ رہا صحرا کے داماں میں
بھریں آہیں تو شعلے اور بھڑکے قلبِ سوزاں میں — بہے آنسو تو دامن پڑ گیا سر دچراغاں میں
خلش پیدا ہو یارب اور بھی خارِ مغیلاں میں — ہمارے تلوے کھجلاتے ہیں پھر شوقِ بیاباں میں
جو وہ بے پردہ ہو مل چل پڑے گبر و مسلماں میں — پھنکے ناقوس کعبہ میں اذاں ہو دیر و بیاں میں
نہ مل کر خاک میں بھی ساتھ چھوڑینگے ترا ہرگز — غبارِ راہ بن کر ہم رہینگے تیرے داماں میں
عنادل کا چہکنا ہے نہ غنچوں کا چٹخنا ہے — حکایت رہ گئی ہے بلبل و گل کی گلستاں میں
نہ وحشت میں ہے جامہ اور نہ ہم دستار رکھتے ہیں — نہیں اک تار بھی باقی ہمارے جیب و داماں میں
چڑھائی آستیں کے ساتھ قاتل نے جبیں اپنی — شکن ابرو پہ ہیں جسطرح نابیں تیغ براں میں
نہ کیوں ہو خال سے حسنِ ملیح یار کی شورش — یہی تو کنکری اک رہ گئی ہے اس نمکداں میں
ترے تل سے ہی تنخالہ ہی نقشِ پا سی اک چھالا — لبِ عیسیٰ مریم پر کفِ موسیٰ عمراں میں

اُڑیگا رنگ روئے گل بزنگ بوئے گل آخر
ہم اے لمعہ سبق عبرت کا پڑھتے ہیں گلستاں میں

لمعہ حیدرآبادی

تصوّر

اے تصور! تیری خوبی کیا کسی سے ہو بیاں
تیری مضموں آفرینی کا ہی قائل اک جہاں

تو کرے دم بھر میں رنگا رنگ بزم آرائیاں
تو اگر چاہے بنا دے ایک گل سے گلستاں

تو اٹھائے آ کے دل سے رنج کا بار گراں
تو دکھائے اس جہاں میں سیر گلزار جناں

تو پہنچ جاتا ہے تا سرحدِ اسرار نہاں
شے ہر اک معلوم یا مجہول تجھ پر ہی عیاں

دور کی دیکھی ہوئی شے دم میں تجھ سے ہو عیاں
دور اندیشی میں اک تو ہی ہے یکتائے زماں

کھینچتا ہے اس طرح تصویر حسن دلستاں
دیکھکر صنعت تری ہوتی ہے گم تاب و تواں

تو دکھاتا ہے شگرف و نغز و نادر ارمغاں
تو سناتا ہے عجب دلچسپ قصے داستاں

جمع کر دیتا ہے تو اک دم میں گنج شایگاں
صرف کر دیتا ہے اک لمحہ میں دولت بیکراں

تجھ سے بنتا ہے سبکسر ایک دم میں سرگراں
تجھ سے بنتا ہے تو نگر دم میں مفلوک زماں

کیسی ہے خود اختیاری ذات میں تیری نہاں
کوئی مجبوری نہیں جو روک لے تیری عناں

کیوں نہ شاعر تجھ کو چاہیں شاعروں کی تو ہی جاں
کیوں نہ عارف تجھ کو مانیں تو ہی اُن کا راز داں

مونس خلوت کوئی تجھ سا زمانے میں کہاں
وقت بد میں تو ہے دایم غمگسار و مہرباں

تیری آمد ہے مبارک دل مصفا ہو جہاں
تو ہے بد باطن کے حق میں اک بلائے ناگہاں

عیب کو معیوب کے تو صاف کرتا ہی بیاں
جذبۂ باطن کا ہو جب فعل ظاہر ترجماں

مول لیتا ہی مصیبت تجھ سے ناداں ہر زماں
راحتیں پاتا ہے تجھ سے مرد عاقل بیگماں

تیری خیر اندیشیاں کرتی ہیں دل کو شادماں
تیری خیر آگاہیاں ہوتی ہیں تسکین بخش جاں

ہوتی ہے سچی خوشی اُس شخص ہی کو بے گماں
تو لباس صدق میں ہوتا ہی جس کا میہماں

تیری خوبی پر ہے دلدادہ ذہین تفتہ جاں
کر رہا ہے تو ہی اُس کی غمگساری ہر زماں

سید غلام مصطفیٰ ذہین حیدرآبادی

لطف انگیز کہانی

ابراہیم بن مہدی کی زبانی

بھائی ہارون کے انتقال کے بعد جب میرے بھتیجوں امین و مامون کی باہمی خانہ جنگیاں، بالکل ختم ہوگئیں اور اسلامی سکہ و خطبہ، مامون الرشید کے نام سے عزت پانے لگا۔ مجھے حکومت کی ہوس نے ورغلانا، اور کہیں دور جا کے پرچم بادشاہی بلند کرنے پر اُبھارا۔

میں نے خیال کیا کہ اگر قسمت یاوری کر جائے تو کیا عجب ہے کہ حکومت بغداد کا تاج و تخت میرے سر و پا سے عزت پائے۔

میں نے شہر "رے" کا رُخ کیا۔ اور وہاں کچھ معین و یاور بہم پہنچا کے سریر فرمانروائی پر جلوس آرا ہوا۔ ایک سال، گیارہ مہینے، بارادن تک حکومت کرتا رہا۔ اِس اثنا میں مامون اپنے فطری حلم سے کام لیتا اور اس امید میں بیٹھا رہا کہ میں آج کل میں آ کے بیعت کر لونگا۔ لیکن مجھے وہ نشہ نہ چڑھا تھا جو آسانی سے اُتر جاتا۔

رفتہ رفتہ مامون کی توقع نا امیدی سے بدل گئی۔ اور اُس نے مجبور ہو کے رے پر بذاتِ خود چڑھائی کی۔ چند روزہ محاصرے کے بعد، رے فتح ہوگیا مامون شہر میں داخل ہوا۔ اور میں جان کے خوف سے ایک طرف چل بھاگا مامون نے اشتہار دیا کہ جو شخص مجھے پکڑ لائیگا۔ ایک لاکھ درہم انعام پائیگا۔

میں چلتے چلتے بدبختی سے ایک ایسی گلی میں جا پہنچا جہاں آگے کو رستہ ہی نہ تھا۔ بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ کھڑا ہو کے سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ کچھ نہ سوجھا۔ نظر اُٹھا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک ایک آدمی پر نگاہ پڑی جو کسی مکان کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں جی میں بولا "شاید اِس سے کچھ مدد مل جائے۔ چل کے پوچھوں تو سہی" یہ سوچ کے آگے بڑھا

اور اُس سے کہا "تم مجھے تھوڑی سی جگہ دے سکتے ہو؟ جہاں میں دن کا کچھ حصہ بسر کروں؟"

اُس نے جواب دیا "مکان آپ کا ہے۔ خوشی سے تشریف لائیے" یہ کہکے دروازہ کھول دیا۔ میں اندر داخل ہوا اور حواس کچھ ٹھکانے لگے۔ گھر اگرچہ چھوٹا سا تھا۔ لیکن صاف ستھرا اور سہانا تھا۔ بوریئے پر شطرنجی اُس پر سوزنی بچھی ہوئی اور موقع موقع سے چمڑے کے عمدہ تکیے لگے ہوئے۔ میں اِدھر گھر میں داخل ہوا اُدھر اُس نے باہر سے دروازہ بند کر لیا اور کہیں چلتا بنا۔ معاً مجھے کھٹکا ہوا کہ شاید وہ اشتہار کے مضمون سے واقف تھا۔ اور مجھے گرفتار کرانے کو گیا ہے۔ یہ خیال آنا تھا کہ میرے ہوش جاتے رہے اور میں گویا آگ پر لوٹنے لگا۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ ایک حمال کو لیے ہوئے واپس آیا۔ حمال کے سر پر کھانے پینے کی تمام ضروری چیزیں گوشت، روٹی، میوے، صراحیاں، گھڑے، اور کوری ہانڈیاں وغیرہ وغیرہ تھیں۔

اِن چیزوں کو نیچے رکھ کے اُس نے حمال کو رخصت کر دیا۔ اور دروازے کو قفل لگا کے پاس آیا اور بولا "خداوند! آپ نہ جانتے ہونگے کہ میں کون ہوں اور کس ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں ایک حبشی غلام اور ذات کا حجام ہوں۔ میرے گھر کی چیزیں کھانے پینے سے آپ کو نفرت ہوگی اِس لیے میں بازار سے نئی چیزیں خرید لایا ہوں۔ اور اُنھیں ہاتھ تک نہیں لگایا اب آپ اُنہیں استعمال میں لائیے اور کراہیت نہ فرمائیے"

میں اِس وقت بہت بھوکا تھا اور کچھ کھانے پینے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا جلدی سے چولھے پر ہانڈی چڑھائی اور بذاتِ خود کھانا پکایا۔ عمر بھر میں کوئی ایسا بامزہ اور پُر لطف کھانا نہ معلوم ہوا جیسے آج کا یہ کھانا۔ جب میں خوب کھا پی چکا تو حبشی نے کہا "حضور! غم غلط کرنے کے لیے شراب سے بہتر کوئی نسخہ نہیں۔ اگر حکم ہو تو شراب صافی کی ایک گلابی حاضر کرتا ہوں۔

میں بولا "کیا مضایقہ! لاؤ! اُس کے بھی دو ایک گھونٹ پی لینگے۔"

حبشی جام و صراحی اُٹھا لایا اور بولا "میرے ہاتھ سے پینے میں تو کراہیت آئیگی۔ آپ ہی اپنے ہاتھوں پیالا بھر کے شوق فرمائیں۔"

میں نے اُس سے صراحی لے لی اور دیکھا تو ایسی نفیس و خوشرنگ شراب بھری ہوئی تھی کہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ متواتر دو پیالے پی گیا۔ پھر حبشی نے گزک اور میوے پیش کیے اور بولا "حضور! گستاخی معاف۔ اگر مرضیٔ والا کے خلاف نہو تو غلام بھی ایک گوشے میں بیٹھ کے تھوڑی سی پی لیتا ہے۔" میں نے اجازت دی اور دونوں الگ الگ شغل میں مصروف ہوے۔

تھوڑی دیر کے بعد غلام اُٹھا اور گودام میں جا کے ایک عود (عربی باجا) اُٹھا لایا۔ اور کہنے لگا "خانہ زاد کی تو مجال نہیں کہ راگ کے بارے میں سرکار سے کچھ عرض کر سکے۔ اس لیے اگر ناگوار نہ ہو تو خود ہی کچھ گا کے محظوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

میں "تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ مجھے گانا آتا ہے؟"

غلام "ماشاء اللہ! حضور اپنے آپ کو چھپانا چاہتے ہیں لیکن ممکن نہیں کہ چھپ سکیں۔ کیا آپ ہمارے آقا ابراہیم بن مہدی نہیں جو کل تک ہمارے خلیفہ تھے؟ کیا آپ کی گرفتاری کے لیے مامون نے ایک لاکھ درہم انعام دینے کا اشتہار نہیں دے رکھا ہے؟"

اُس کی زبان سے یہ الفاظ سن کے میں نقش حیرت ہو گیا۔ میرے دل میں اُس کی مروت اور وفا پرستی نقش ہو گئی۔ اور آنکھوں میں اُس کی بلند ہمتی پھرنے لگی۔ میں نے عود اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اُس کا ٹھاٹھ درست کرنے لگا۔ اِس وقت مجھے اہل و عیال کی جدائی، وطن کی مفارقت اور حکومت، کے سلب ہو جانے کا خیال آیا۔ اور میں بے اختیار ہو کے یہ اشعار درد بھرے لہجے میں گانے لگا۔

وعسیٰ[1] الذی ابدی لیوسف اہلہ واغزہ فی السجن وہو اسیر
ان یستجیب لنا ویجمع شملنا واللہ رب العالمین قدیر

میرا گانا سن کے غلام پر بیخودی چھا گئی۔ اور فرطِ طرب میں آکے کہنے لگا:۔
"میرے حضور! میرے آقا! آپ کا غلام اگرچہ گانے سے نابلد ہے۔ لیکن اگر اجازت ہو تو جو کچھ اس وقت دل میں آیا ہے گا کے سناتا ہے"۔ میں نے اجازت دی اور اُس نے چند بامحل اشعار سنائے۔ ان اشعار کے سننے سے میرا رنج اندوہ جاتا رہا۔ اور خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ میں بیخود ہو کے اونگنے لگا۔ اور میری آنکھ لگ گئی۔

جب تک عشا کا وقت نہ آگیا میں سوتا ہی رہا۔ بیدار ہوا تو غلام کی دفاپرستی شائستگی، اور نفاست مزاجی، نظر میں پھرنے لگی۔ اور میں محوِ حیرت بنا رہا۔ اس وقت مجھ سے اور کچھ تو نہ بن پڑا۔ اشرفیوں کی وہ تھیلی جو چلتے وقت سفر خرچ کے لیے ساتھ لے لی تھی اُس کو دے دی اور بولا:۔ "یہ لو! اس کو اپنے صرف میں لاؤ۔ اگر خدا نے مجھے ان مصیبتوں سے نکالا تو تمہیں اپنی مہربانیوں کا صلہ اتنا ملیگا کہ کبھی نہ بھولو گے۔ اب میں جاتا ہوں۔ خدا تمہارا ناصر رہے"۔

حبشی:۔ "حضور! آپ کا عطیہ میرے سر آنکھوں پر۔ لیکن میں اس کو بڑا کمینہ پن سمجھتا ہوں کہ ایسی مصیبت کے وقت میں آپ سے کچھ لوں۔ میرے لیے یہی کیا کم دولت ہے کہ حضور نے غربت کدے میں نزول فرما کے اُسے عزت بخشی اور مجھے قربت حاصل ہوئی"۔

میں:۔ "نہیں۔ تم انکار نہ کرو۔ اسے لے لو"۔

حبشی:۔ "حضور! اصرار نہ فرمائیں۔ ورنہ میں اپنی جان پر کھیل جاؤنگا۔ اور

---

[1] کیا عجب ہے کہ وہ (خدا) جس نے یوسف کو اس کے اہل و عیال سے ملا دیا۔ اور جیلخانے میں بحالتِ اسیری عزت بخشی۔ ہماری بھی (فریاد) سن لے۔ اور ہماری پریشانیوں کو دور کر دے۔ خدا تو ہر شے پر قادر ہے۔ اور دونوں جہان کا پروردگار ہے۔ ۱۲۔

اس وقت آپ سے کچھ نہ لونگا"

میں نے ناچار ہو کے تھیلی لے لی۔ مگر مجھے اُس کا لے چلنا بار ہو رہا تھا جب میں دروازے کے قریب پہنچا حبشی بولا "خداوند! ابھی مطلع بہت دھندلا ہے۔ اور زمانہ ناموافق۔ حضور کا باہر نکلنا عقل کے خلاف ہے۔ یہ مکان بہت محفوظ ہے۔ اور یہاں آپ کے قیام فرمانے سے مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ اگر چندے اور یہیں بسر کی جائے۔ تو مناسب معلوم ہوتا ہے"

میں نے کہا اگر تم یہ شرط منظور کرو کہ میرے اخراجات اس تھیلی سے نکالا کرو گے تو مجھے تمہارے ہاں رہنا پسند ہے"

حبشی نے بظاہر قول دیا اور میں کچھ روز بڑے عیش و آرام میں بسر کرتا رہا۔ لیکن اُس نے میری تھیلی کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اور اُسے ہاتھ تک نہ لگایا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اُس نے معاہدہ کا لحاظ نہ رکھا تو مجھے اُس کے گھر رہنا نہایت ناگوار ہو گیا۔ اور میں نے اُس پر زیادہ بار ڈالنا پسند نہ کیا۔ میں نے بغیر اس کے کہ اُس سے کہنے سننے پر التفات کروں عورتوں کا بھیس بدلا۔ اور رات کو اس سے رخصت ہو کے باہر نکلا۔ رستے میں مجھے بڑا ڈر معلوم ہونے لگا۔ میں تھوڑی دور آگے بڑھ کے چاہتا تھا کہ پل کو عبور کروں۔ دفعتاً ایک فوجی افسر کی مجھ پر نظر پڑی۔ جو دو چار دن کے پہلے تک میرا نمکخوار تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی شور و غل مچانا شروع کیا اور فوراً آ کے مجھ سے چمٹ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس وقت کچھ اور نہ سدھرا۔ اُس افسر کو میں نے زور سے ڈھکیل دیا۔ اور وہ پل کے نیچے جا پڑا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا۔ پل طے کر کے ایک شارع عام پر ہو لیا۔ رستے میں ایک بڑا سا مکان نظر آیا جس کی دہلیز میں ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ میں اُس کے پاس جا کے کہنے لگا "معزز خاتون! میری جان بچاؤ اور مجھے اپنے گھر میں پناہ دو" وہ بولی "آپ شوق سے تشریف لائیے۔

میں آپ کو پناہ دیتی ہوں۔" یہ کہکے مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ اور بالاخانے پر ایک کمرے میں فرش بچھا کے بٹھا دیا۔ پھر کھانا لائی اور بولی :۔" آپ یہاں اطمینان سے کھانا نوشجان فرمائیں۔ اس لیے کہ کوئی آنکھ آپ پر مطلع نہیں ہوئی۔"

ابھی وہ یہی کہہ رہی تھی کہ زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ خاتون دروازہ کھولنے کو نیچے گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہی افسر جسے میں نے پل سے نیچے گرادیا تھا دروازے پر کھڑا ہے۔ اُس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ وہ عورت اپنے شوہر کی یہ حالت دیکھ کے گھبرائی اور اضطرابانہ لہجے میں پوچھنے لگی :۔" اے ہے! یہ تم پر کیا مصیبت ٹوٹی؟"

افسر :۔" کیا کہوں! دولت قبضے میں آکے جاتی رہی۔ میں نے ابراہیم بن مہدی کو پکڑ لیا تھا۔ مگر ظالم نیچے سے چھوٹ نکلا۔"

پھر تمام ماجرا من وعن کہہ سُنایا۔ اُس عورت نے کپڑے کی بہت سی پٹیاں اُس کے سر سے باندھیں اور اُسے بستر پر لٹا دیا۔ جب اُس کی آنکھ لگ گئی تو میرے پاس آئی اور بولی :۔" میں سمجھتی ہوں کہ اِس جھگڑے کے بانی مبانی آپ ہی ہیں؟"

میں :۔" ہاں میں ہی ہوں۔"

عورت :۔" خیر! گزشت آنچہ گزشت۔ لیکن اب آپ ڈریئے نہیں اور خاطر جمع رہیے۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا آپ کو چھپانے کی کوشش کرونگی۔"

میں تین دن تک اُسی کے گھر رہا۔ چوتھے روز خاتون آکے کہنے لگی :۔" جناب عالی! میرا شوہر کچھ عجیب بدطینت اور مفسد واقع ہوا ہے۔ اُس کی طبیعت میں شر و فساد کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ چونکہ وہ اب تندرست بھی ہو چلا ہے۔ مبادا آپ کو دیکھ پائے۔ اور جا کے مخبری کر دے۔ پس میری رائے میں بہتر ہوگا کہ آپ بلا میں پھنسنے کے پہلے یہاں سے صحیح سالم تشریف لے جائیں اور کہیں اور رہنے

رہنے کا بندوبست کریں۔"

میں: "مہربان خاتون! مجھے رات آنے تک تو مہلت دو۔ بھلا اس وقت میں باہر کیونکر جا سکتا ہوں؟"

عورت: "اس کا چنداں مضایقہ نہیں۔ میں آپ کو اتنی مہلت دے سکتی ہوں۔"

رات آئی اور میں نے عورتوں کا بھیس بدل کے آگے کی راہ لی۔ چلتے چلتے ایک لونڈی کے گھر پہنچا۔ جسے میں آزاد کر چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔ اور میری سلامتی پر شکر بھیجنے لگی۔ میں اس کی اس نمایشی وفاداری پر پھولا نہ سمایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھی اور یہ ظاہر کر کے کہ میری ضیافت کے لیے بازار سے کچھ خرید لائیگی۔ باہر چلی گئی۔ لیکن دراصل وہ قطامہ دغا کا پھندا میرے گلے میں ڈالنے کو جا رہی تھی۔

چند منٹ کے بعد، مجھے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ اس ناسزائی کے ہمراہ ابراہیم ابن موصلی ہے۔ اور اس کے ساتھ کثیر التعداد سوار و پیدل کا ایک دستہ انہیں لے کے وہ نمکحرام اندر گھس آئی۔ اور اشارے سے مجھے بتا دیا اس وقت موت میرے سامنے مجسم بن کے کھڑی ہو گئی۔ سپاہیوں نے میرے ہاتھ پاؤں سنگین لوہے سے جکڑ دیئے۔ اور اسی ہیئت (زنانہ لباس) میں مامون کے پاس لے چلے۔

اب وہ سین نظر آتا ہے کہ کمسن بھتیجا سریر خلافت پر جلوہ آرا ہے اور معمر چچا عورتوں کے کپڑے پہنے طوق و زنجیر سے جکڑے ہوئے کھڑا ہے۔

جب مامون کو معلوم ہوا کہ میں قید کر کے لایا جا رہا ہوں۔ تو حکم دیا کہ دربارِ عام منعقد کر کے مجھے حاضر کیا جائے۔ میں حسب الحکم بیگاہ میں لایا گیا اور اس کو خلافت کا سلام کیا۔ مامون نے جواب میں کہا:

"خدائے تعالیٰ نہ تو تجھے سلامت رکھے۔ نہ زندہ۔ نہ تیری رعایت کرے۔"

میں: "امیر المومنین! ذرا سا صبر کیجیے اور بات سن لیجیے۔ مجرم حاضر ہے اور انتقام آسان۔ لیکن عفو نہایت مشکل ہے۔ یہ وہ کسوٹی ہے جس پر ہر شخص کا حوصلہ کسا جاتا ہے۔ (جوش میں آ کے) جس طرح میرا گناہ ہر گناہ پر فوقیت رکھتا ہے اسی طرح تیرا عفو ہر عفو پر ترجیح رکھتا ہے۔ میں نے اپنے حوصلے کے موافق جو کچھ کیا وہ ظاہر ہے۔ مگر اب دیکھنا چاہیے کہ تو اپنے حوصلے کے مطابق کیا کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کر دے تو بدلا ہے اور انصاف۔ لیکن معاف کر دے تو رحم ہے اور الطاف۔"

میری اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ مامون کے دل میں رقت پیدا ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بشاشت کی تازگی دوڑ گئی۔ اور حرکات سے رحم و الطاف ٹپکنے لگا۔ اس نے سر اٹھا کے اہلِ دربار کو ایک بار دیکھا اور عباس، ابو اسحٰق۔ اور بعض دوسرے ارکان سے متوجہ ہو کے پوچھا۔ "اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

ارکان: "(متفق اللفظ ہو کے) امیر المومنین! اس گناہ کا کفارہ صرف "قتل" ہے۔"

مامون: "(احمد بن خالد سے) تم کیا کہتے ہو؟"

احمد بن خالد: "خدا امیر المومنین کو سلامت رکھے! میرا خیال ہے کہ اگر آپ اسے قتل کر دیں تو آپ کی بہت سی نظیریں مل سکینگی۔ لیکن اگر معاف کر دیں تو کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔"

مامون تھوڑی دیر تک سرنگوں ہو گیا۔ پھر گردن اٹھا کے اس مضمون کا شعر پڑھا کہ "میرے بھائی کو میری ہی قوم نے قتل کیا۔ پس اگر میں اس (قوم) کو تیر ماروں تو وہ مجھی کو لگتا ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ میں نے سر سے چادر نکال کے دور پھینک دی اور مارے خوشی کے اس زور سے تکبیر پڑھی کہ سارا دربار دہل گیا۔ میری زبان سے

بے ساختہ یہ جملہ نکلا "واللہ! امیر المومنین نے مجھے معاف کر دیا"

مامون: "بے شک چچا اب تمہیں کوئی خوف نہ کرنا چاہیئے!"

میں: "امیر المومنین! میرا گناہ اتنا سنگین ہے کہ اس کی نسبت کوئی عذر نہیں پیش کر سکتا۔ اور تیرا عفو اتنا گراں ہے کہ اس کا کوئی شکر بجا نہیں لا سکتا"

مامون: "لا تثریب علیکم الیوم! چچا میں نے آپ کا قصور معاف کیا۔ اور آپ کی تمام جائداد و مال و املاک آپ کو بخش دی"

میں: "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

مامون: "مگر چچا! یہ تو دیکھیے کہ ابو اسحاق اور عباس نے آپ کے قتل کی رائے دی۔ کیا انہیں بھی زیبا تھا؟"

میں: "امیر المومنین! انھوں نے آپ کو صلاح نیک دی لیکن آپ نے وہی کیا جو آپ کو شایاں تھا"

مامون: "چچا! آپ کے عذرات کی گرمی نے میرے جوش انتقام کو سرد کر دیا اس لیے میں نے سفارش کی تلخی آپ کو نہیں چکھائی۔ خیر اب اسے چھوڑیئے اور یہ فرمائیے کہ روپوشی کے عالم میں آپ پر کیا گزری"

میں نے تمام ماجرا من وعن گوشگزار کر دیا۔ مامون نے سب کی حضوری کا حکم دیا۔ پہلے لونڈی حاضر کی گئی۔ وہ قطامہ الغمام کی امیدوار تھی۔ خوشی خوشی سامنے آئی۔ پوچھا "تجھے اپنے آقا سے ایسا برتاؤ کرنے کی کیا وجہ تھی؟"

لونڈی: "حضور! سوائے دولت کی خواہش کے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

مامون: "تجھے بال بچے اور شوہر بھی ہے؟ یا نہیں"

لونڈی: "جی حضور! میرا کوئی نہیں ہے"

مامون نے حکم دیا کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں۔ اور عمر بھر قید میں

رکھی جائے۔ پھر فوجی افسر اور اُس کی بیوی کی طلبی ہوئی۔ افسر سے پوچھا:۔
"بتا تو نے اپنے مالک سے ایسا برتاؤ کیوں کیا"

افسر نے بھی وہی جواب دیا جو لونڈی نے دیا تھا۔ مامون نے کہا:۔
"تو نے جو بزدلانہ حرکت کی ہے اُس کے لحاظ سے تو ہرگز افسری کے قابل نہیں تجھے حجام بننا سزاوار ہے۔ لہٰذا تیری املاک ضبط کی جاتی ہے اور تجھے عہدے سے برطرف اور بیوی سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ تیری بیوی اپنی شرافت کی وجہ سے حرمِ خلافت میں جگہ پائے گی اور تو ذلیل و خوار ہو کے دربدر پھرا کرے گا۔

اِس کے بعد حجام کی طرف ملتفت ہوا۔ اور بولا: "تجھ سے جو اخلاق و مروت ظاہر ہوئی ہے وہ تیرے اعزاز و اکرام میں اضافہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ فوجی افسر کا مکان مع اسباب تجھے انعام دیا جاتا ہے۔ اور اُس کی تنخواہ کے علاوہ ایک ہزار دینار کا سالانہ وظیفہ تیرے نام جاری کیا جاتا ہے۔" فقط

اڈیٹر غزل

بے گناہوں کا ہے قاتل تو؟ کہ میں؟ سینکڑوں کرتا ہے بسمل تو؟ کہ میں؟
میں نہ کہتا تھا کہ عشق اچھا نہیں اب مصیبت میں ہے ایدل تو؟ کہ میں؟
کس نے کل وعدہ کیا تھا غیر سے کون تھا محفل میں شامل تو؟ کہ میں؟
میں ہوں عاشق، پارسا اے شیخ تو دیکھیں جنت میں ہو داخل تو؟ کہ میں؟
شکوۂ ظلم و ستم سُن کر کہا ہے جفا کاروں پہ مائل تو؟ کہ میں؟
کہتے ہیں کس کی غرض اٹکی ہے آج وصل کا ہے کون سائل تو؟ کہ میں؟
باوفا مجبور عاشق میں؟ کہ تو؟ بیوفا سفاک۔ قاتل تو؟ کہ میں؟
آتے ہیں خنجر بکف وہ اے عدو دیکھوں اب ہوتا ہے بسمل تو؟ کہ میں؟
عشق اے ناصح بُرا ہے؟ کفر ہے؟ قتل کرنے کے ہے قابل تو؟ کہ میں؟
زلف بازغ کو دکھا کر کہتے ہیں۔ ہے گرفتارِ سلاسل تو؟ کہ میں؟

بازغ حیدرآبادی۔

آثارِ دکن

ہم نے اِس سے پہلے کچھ حال ہنرارستون کی دیول کا لکھا ہے۔ اب کچھ تذکرہ قلعۂ کھم کا کرتے ہیں۔ جو ایک قدیم اور یادگار عمارت ہے۔

جب تک اِس ضلع کا نام ورنگل نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ ضلع کھم مٹھ ہی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور اب ضلع ورنگل کے تعلقات میں درجۂ دوم کا ایک تعلقہ۔ اور دوم تعلقدار کا مستقر ہے۔

کھم کے قدیمی تاریخی حالات معلوم کرنے کے لیے ہم کو سنہ ۵۹۱ عیسوی کے گزشتہ حالات پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔

اُس وقت یہ ملک ہنمکنڈہ یا ورنگل کے ہندو راجاؤں کی ریاست کا ایک وسیع حصہ تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ (مہادیو شرما) جیسے عادل و باذل راجہ سے دادِ حکومت مل رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ نوسو برس کے پہلے یعنے مہادیو راج کے ایام حکمرانی میں (جو مہادیو شرما) سے نویں پشت میں تھا۔ رنگارڈی۔ لکھنارڈی۔ اَمنارڈی۔ نامی تین بھائیوں کو جو ورنگل کے ذی وقعت کاشتکار تھے قلیہ رانی کے وقت ایک دفینہ ملا جس میں سونے کے بڑے بڑے ٹکڑے اور بڑی بڑی اینٹیں تھیں۔

یہ سادہ لوح مگر ایماندار دہقان برآمد شدہ دفینے کو راجہ کے حضور میں لے گئے۔ اور بطورِ پیشکش اِس بیش بہا دولت کو داخلِ خزانہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

فیاض راجہ نے محض دیانت داری کے صلہ میں یہ خزانہ اُنہیں کو بخشدیا اور آزادی کے ساتھ مفید کاموں میں روپیہ خرچنے کی اجازت دیدی چنانچہ یہ تینوں کاشتکار بھائی رخزینۂ خداداد۔ لے کر کھم پہنچے اور وہیں بود و باش بھی

اختیار کرلی۔

ان کے عمدہ ترین کارہائے یادگار میں علاوہ تالابوں وغیرہ کی تیاری کے سب سے بڑا قابل قدر کام قلعۂ کھم کی تعمیر کا تھا۔ جو آج تک اپنی ناپرسانی حالت میں بھی ابتدائی شان و شوکت دکھانے میں قاصر نہیں ہے۔

اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان کام ان مدبر کاشتکاروں نے مونیر ندی کے انیکٹ کی تعمیر کا کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مناسب مناسب مقامات پر پانی کی روک زراعت کے لیے مفید تھی اور آج تک یہ انیکٹ ایک مستقل اور کارآمد ذریعہ آبپاشی کا ہے۔

اگرچہ محمد شاہ بہمنی کے مستقل ارادوں اور جوانمردانہ کوششوں نے ہندو راجاؤں کا قدیم پایۂ تخت ورنگل لے لیا تھا لیکن اس جنگجو بادشاہ کی وفات کے بعد فرماں روایان تلنگان نے پھر سرتابی شروع کردی۔ اطاعت شعاری کو بالائے طاق رکھ دیا اور قریب تھا کہ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوجائے مگر جانشین بادشاہ مرحوم سلطان قلی قطب شاہ نے ۱۵۱۶ء میں ان خود مختارانہ افعال کے انسداد کے لیے کھم کا رخ کیا جس کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ کھم فتح کرکے راجہ سیتاپتی کو اپنا مطیع کرے۔ جیسا کہ اس واقعے کی نسبت ایک مورخ نے اپنی فارسی تاریخ میں حسب ذیل حالات لکھے ہیں۔

باہمی جنگ وجدل کا نتیجہ نکلنے، یعنے کھم مٹھ کا قلعہ سلطان قلی قطب شاہ کے ہاتھ آنے کے بعد راجہ سیتاپتی۔ اپنے اسٹاف کے ساتھ شمال کی طرف فرار ہوگیا۔ اور اوڑیسہ کے راجہ کے لڑکے رام چندر کے پاس پناہ لی۔

اس زمانے میں اوڑیسہ کے راجہ کی حکومت کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس کی سلطنت دریائی کنارے سے حدود بنگال تک تھی۔ اس نے اپنی کثیر فوج کے بھروسہ پر مفرور راجہ کی اعانت کی اور مسلمان فاتح کے

ہزیمت دینے کو تمام امرائے ہنود اور اُن کی بے قاعدہ فوج کو بھی شریک کرلیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کل فوج کی تعداد تین لاکھ پیدل اور تیس ہزار سوار تھی۔

اِس مقابلے میں مسلمانوں کی حالت خطرناک اور جنگ کا نتیجہ مشتبہ تھا لیکن فاتحوں کے جوش میں بھرے ہوئے حملوں اور تائید ایزدی نے غنیم کو سراسیمہ کردیا۔ اور یک چشم زدن میں ہندو فرار ہوگئے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

آخر عاجز اور مفتوح راجہ نے صلح کی درخواست کی۔ اور برضامندی طرفین ایک عہدنامہ بدیں مضمون مرتب ہوا کہ آیندہ سے تلنگانہ کی اسلامی ریاست اور اوڑیسہ کی ہندو ریاست میں دریائے گوداوری حد فاصل سمجھی جائے۔

اِن اُمور سے فراغت کرنے کے بعد سلطان گولکنڈہ واپس ہوگیا ۱۶۶۷ء میں قلعہ کھم اور اُس کے متعلقہ دوگانوں جعفر بیگ خان قلعہ دار کے سپرد کیے گئے۔ مگر یہ شخص فرنچ لوگوں سے خفیہ خط وکتابت کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ اور اُس کی جاگیر ضبط ہوگئیں۔

یہ قلعہ مستطیل اور قصبۂ کھم کی پہاڑی پر بنایا گیا ہے۔ اس کی بلندی تقریباً (۲۰) فیٹ کی ہے۔ اگرچہ اس کی فصیل بڑے بڑے وزنی سلیپ کے پتھروں سے بنائی گئی ہے۔ مگر مثل دوسرے قلعوں کے اِس میں برجوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ یعنے دو تین ہی برجوں پر قلعہ محدود کردیا گیا ہے۔

جس پہاڑی پر یہ قلعہ ہے اُس کی چڑھائی سطح زمین سے بالاحصار تک تخمیناً (۲۰) فیٹ کی ہے۔ مگر فصیلوں کی بلندی (جو ایک قدرتی پہاڑ کو محصور کی ہوئی ہیں) ۴۰ سے ۸۰ فیٹ تک ہے۔

بانیانِ قلعہ نے اِس پہاڑ پر آمد ورفت کے لیے جو راستہ رکھا ہوگا

اُس کا صحیح پتہ اِس وجہ سے نہیں ملتا کہ زمانہ کے دست بُرد سے اکثر عمارات قلعہ کی نابود ہو چکی ہیں۔

اگرچہ اِس وقت ایک راستہ اور سیڑھیاں موجود ہیں اور لوگ بالا حصار تک آتے جاتے ہیں۔ مگر اوپر جانے والوں کو ناہموار راستہ کے نشیب و فراز کے باعث دشواری اُٹھانی پڑتی ہے۔ بالا حصار پر کس وضع کی کیا عمارت تعمیر ہوئی تھی اور کس قسم کے سامان جنگ سے یہ قلعہ آراستہ تھا۔ اُس کی کوئی صحیح کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

جب یہ قلعہ نواب ظفر الدولہ کے جیسے مشہور اور معروف شخص کی نگرانی میں دیا گیا۔ البتہ اُس وقت اور اُن کے زمانے کی بڑی بڑی توپیں اکثر اُن مقامات پر موجود ہیں جو اِس قلعہ میں مناسب سمجھے گئے۔

جو توپیں اِس وقت برجوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ اُن پر نواب ظفر الدولہ کے نام کا کتبہ مع سنہ و سال موجود ہے۔ یہ توپیں بہت بڑی ہیں جن کا عرض ۴ فیٹ سے فیٹ تک ہے۔

نواب ظفر الدولہ کے عہد حکومت میں قلعہ کی حفاظت کے واسطے بجانب سرکار عالی کچھ فوج کا حصہ بھی زیر کمانڈ نواب موصوف دیا گیا تھا۔ اور قلعہ کے اندر باہر فوج کی رہائش کے لیے مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔ جو اب بوجہ امتداد زمانہ بے نام و نشان ہو گئے ہیں۔

قلعہ کے بالا حصار کو اُس کی اصلی حیثیت کا تصور کر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بانیان قلعہ نے اُس پر نہایت پائدار اور بہت ہی موزوں عمارت بنائی تھی۔ مگر افسوس کہ اِس وقت سوائے اُس کی اُکھڑی ہوئی بنیاد کے کچھ باقی نہ رہا۔

ایک چبوترہ اِس وقت تک موجود ہے۔ جو زبان حال سے اِس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ پہلے اِس پر ایک خوشنما بارہ دری بنی ہوئی تھی۔

اس چبوترے پر کھڑے ہونے سے خوش منظر آبادی کا نظارہ باعث تفریح ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ آبادی سرسبز اور شاداب درختوں کی اوٹ سے اپنا عروسی چہرہ دکھا کر دیکھنے والی آنکھوں کو اس ندی کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جو اس کے متصل زور و شور کے ساتھ رواں ہے۔

اس چبوترے کے پاس ہی ایک چوبچہ بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ بانیان قلعہ نے اس کو صرف روغن زرد کا گودام قرار دیا تھا۔ اور یہیں سے ساری فوج کو بقدر ضرورت گھی تقسیم ہوا کرتا تھا۔

بالاحصار کے قریب ہی ایک ٹاکی ہے جس میں قدرتی پانی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

جانب جنوب ایک برج ہے جس میں سیاہ پتھر کی دو تصویریں ہیں۔ جن کی نسبت عام شہرت یہ ہے کہ یہ تصویریں محافظ قلعہ تھیں۔

اس مختصر قلعہ کے دو دروازے ہیں جنوبی دروازے پر ایک عبارت کندہ ہے جس کے حروف تلنگی سے مشابہ تو ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے۔

یہاں سے قریب ہی سنگ سلیپ کی تراشی ہوئی ایک پتلی ہے جس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بانیان قلعہ نے جب تعمیر قلعہ سے فراغت پائی تو جس قدر دفینہ خرچ ہو کر بچا وہ یہاں دفن کر کے اس پتلی کو بطور محافظ کھڑا کر دیا جو اس وقت تک اپنا فرض منصبی اطاعت شعار انداز پر انجام دے رہی ہے۔

یہاں ایک وزنی اور بہت بڑا پتھر کا گولا بھی موجود ہے جو غالباً توپ خانی کا ہے۔ یہ گولا اس وقت بآسانی اٹھ سکتا ہے جبکہ بارہ آدمی اپنی شہادت کی انگلیوں کو اس کے حصۂ زیرین پر لگا کر زور کریں۔ اور اس کو اکثروں نے آزمایا بھی ہے۔

فی زمانہ قلعہ کے اندرونی حصہ میں تھوڑی سی آبادی ہے اور ابوالخیر خاں صاحب

جاگیردار نے اپنا ذاتی مکان بھی تعمیر کیا ہے۔ جس میں اُن کے علاقہ کی کچہری ہوتی ہے۔

آبادی کے آخر حصے میں نواب ظفرالدولہ کے وقت کی بنی ہوئی ایک مسجد اور فصیل قلعہ کے اندر ایک باؤلی موسوم بہ ظفر حوض بھی موجود ہے اور اب یہ ظفر حوض رعایائے کھم کو آب نوشی میں پوری مدد دے رہا ہے۔

خاکسار ابوالحیات محمد عبدالحی بازغ حیدرآبادی

غزل

وہ دن ہو عیاں اور وہ روشن سحر آئے
خورشید جمال اپنا الٰہی نظر آئے

اتنا بھی ہے کافی مرے رونے پہ وہ ہنس دیں
کچھ تو مری زاری میں خدایا اثر آئے

اس آئینہ خانے میں جدھر ہم نے نظر کی
بس ایک ہمیں چار و نطرف ہی نظر آئے

ملنے نہیں دیتی کبھی تقدیر کی گردش
جب میں گیا گھر ان کے تو وہ میرے گھر آئے

اب دل سے فدا ہونگے جوانی پہ ہزاروں
گذرے ہوئے کیا ترے جوبن اُبھر آئے

کیا چال ہے کیا شوخیٔ رفتار ہے دیکھو
فوراً وہ مری آنکھ سے دل میں اُتر آئے

پیدا ہو مری آہ شرر بار میں تاثیر
اس پھولے ہوئے نخل میں یارب ثمر آئے

کچھ پھول چڑھائے ہیں مری قبر پہ لاکر
یاد اُن کو بہت جب مرے داغِ جگر آئے

کیوں خیر تو ہے کوچۂ دلدار سے عالی
تھامے ہوئے ہاتھوں سے جو اپنا جگر آئے

عالی حیدرآبادی

نوائے ثانی

مولوی محمد عبدالوہاب صاحب مخلص لیب حیدرآبادی، ناظر مدرسہ خانجات میدک اُن تعلیم یافتہ ہونہار ابنائے ملک میں سے ہیں۔ جو خوش طبعی کے ساتھ خوش مذاقی بھی رکھتے ہیں۔ اور خوش فہمی کے ساتھ خوش گوئی بھی۔ ان اوصاف کی بدولت جناب موصوف کو صحیفہ سے بھی سچی محبت اور دلی ہمدردی ہے اور وہ اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ اس کی خدمت کرتے رہتے ہیں افسوس ہے کہ اُن کی نوا سنجیوں سے صحیفہ کا گلشن اب تک خالی رہا لیکن خوشی کی بات ہے کہ اب اُنہوں نے ایسی لَے سے تلافیٔ مافات شروع کی ہے جو خوش آیند معلوم ہوئی ہے۔ محبوب فرمانروائے دکن کی سالگرہ کے موقع پر اُن کی یہ ترانہ ریزی بہت بھلی معلوم ہوگی۔

یہ نوائے دلاویز اس نمبر میں سب سے پہلے جگہ پانے کی مستحق تھی لیکن دیر میں پہنچی۔ مجبوراً یہیں درج کی جاتی ہے۔ کیونکہ ایسی ضروری چیز کو ہم آیندہ نمبر کے انتظار میں بیکار نہیں رکھنا چاہتے۔

اڈیٹر

ہوئی ہے فصل گل میں اب کے وہ گل کی فراوانی
کہ شمع بزم بھی کرتی ہے اظہار گل افشانی

بہار آئی۔ کھلے غنچے۔ ہنسے گل بلبلیں چہکیں
گھٹا چھائی۔ اُٹھے بادل ہوا سنگی۔ پڑا پانی

نصیب بادہ کش بنکر کھلے درہائے میخانہ
شکست توبہ ہی پیدا ہی شور تہنیت خوانی

نظر آتے ہیں دھبے دامن مفتی و قاضی پر
ہوئی ہی مشتبہ اب دختر رز کی پاکدامانی

نہیں ہے دختر رز یہ پری اتری ہی شیشے میں
اسی سے آج ساقی کو ہی دعوائے سلیمانی

یہ غل ہی میکشوں میں واہ اس اعجاز کی صدقے
کیا پیر مغاں نے آتش سیال کو پانی

بچھا ہی ہر طرف دام تملق دختر رز کا
تماشا طائر ہوش و خرد کی ہی پر افشانی

قدم رکھنے نہ پائے بے اجازت کوئی بھی اندر
در میخانہ پر ہے آجکل توبہ کی دربانی

خراباتی ہیں فارغ فکر این و آں سے عالم میں
نہ کچھ چہرہ پہ حیرانی نہ کچھ دل میں پریشانی

یہاں کا رنگ یہ گلشن کا ہی کچھ اور ہی عالم
شمیم گل مشام خلق کی کرتی ہی مہمانی

رنگے ہیں دست صناع ازل نے خوب ہی جو کے
گلابی کاکریزی آبی کاہی چمپئی دھانی

کوئی غنچہ اگر چٹکا تو یہ آواز دیتا ہے
ہے وجہ خندہ ہائے گل عنادل کی خوش الحانی

لگی رہتی ہے جھاڑ موتیوں کی دامن گل میں
چمن میں کرتی ہی شبنم ہی کا ہار مرصع کی

نہ اب وہ آہ سوزاں ہی نہ اب اشک عنادل میں
عنادل ہی نہیں جاکر بدل آئے ہوا پانی

مبارکباد دیکر بلبلیں خود لوٹی جاتی ہیں
گریباں گل نہ ہی ہلال عید قربانی

دکھاتی ہی تماشا صاف نیرنگ گلستاں کا
بنی ہی آئینہ اب دیدۂ گلچیں کی حیرانی

یہ ہی نشو و نمائے مبدء فیاض کی خوبی
ہے دلجمعی کا باعث اہل سنبل کی پریشانی

خدا یاد آگیا بھڑکی ہی ایسی آتش گل بھی
عنادل کرتے ہیں یا نالہ گلچیں کی دعا خوانی

شمیم گل نسیم اب جھولیاں بھر بھر کے لاتی ہی
چمن میں گل کی ان روزوں ہے ارزانی سی ارزانی

ہوا ہی لوٹ ہر سو سبزۂ خوابیدہ اٹھ اٹھ کر
بچھا صحن چمن میں ہر طرف مخمل ہی کاشانی

طبیعت میں امنگیں ہیں بھری بیحد و بے حد میں
جدھر دیکھو ادھر ہی عیش و عشرت کی فراوانی

بڑھا ہی ارتباط باہمی اس درجہ عالم میں
کہ رم کرتے نہیں انساں سے آہو ہے یا بانی

مسرت کی گھٹا چھائی ہوئی ہی دہر میں ہر سو
بجز اشک خوشی آتا نہیں اب آنکھ سے پانی

نصیب ایسی ہوئی جمعیت خاطر ہر انساں کو
نظر آتا نہیں لفظوں میں بھی رنگ پریشانی

سمٹ کر تیرہ بختی اس طرح بھاگی ہی عالم سے
کہ گویا شب تاریک قت تک ہی نورانی

خوشی ہی ہی خوشی ساز طرب کا شور برپا ہے
ہر اک جانب سے آتی ہے صدا تہنیت خوانی

زباں پر ہر کہ دمہ کے یہی ہی نغمہ شادی
زمانے میں ہی شاہ آصف جاہ کا ثانی

وہ آصف جاہ سادس جو سلیماں وقت کا اپنے
جسے کہتے ہیں سب بندے خدا کے ظل سبحانی

نظام الملک محبوب علی خاں آصف دوراں
سکندر منزلت شاہ دکن نوشیرواں ثانی

گرہ اس چہل و نہم آئی ہے سال ہمایوں کی
اسی باعث سے ہی رو سے مسرت کی درخشانی

لکھوں اب مطلع پرنور ایسا مدح حاضر میں
منور جسکے ہر مصرع سے ہو بزم مخمدانی

مطلع ثانی

دم صید افگنی گر ہو خیال گوہر افشانی
بنے ہر تیر کا پیکان رشک لعل یمانی

ترے منشور سے ہر زار کی وہ دست گیری کی
کہ چشم آبلہ کرتی ہے کانٹوں کی نگہبانی

مسخر کر لیا عالم کے دل کو جود و بخشش سے
ترا دست کرم ہے خاتم دست سلیمانی

در دولت کی رفعت کیا کسی کے ذہن میں آئے
کہ ہے سقف فلک درگاہ کی تیری بارانی

تو وہ پارس ہے کھا ایک بھی تیری اگر ٹھوکر
بنے ہر سنگریزہ رشک سنگ سلیمانی

تو ظل اللہ ہے سایہ بھی پڑ جائے ترا جس پر
کرے صبح و مسا بال ہما اسکی مگس رانی

نہیں ہے زخم کے بھی چور کا تو نشان باقی
جہاں میں ہے تری رعب سیاست کی نگہبانی

عمل تسخیر کا دست کرم میں ہے ترے بیشک
ہتھیلی کی لکیریں ہیں کہ ہے نقش سلیمانی

بلا تفریق مذہب لطف تیرا عام ہے سب پر
مسلماں ہوں کہ ہندو ہوں یہود ہوں کہ نصرانی

نہ کچھ شکوہ کسی کو ہے نہ کچھ جھگڑا کسی سے ہے
ہوئی ہے ختم تجھ پر سعدلت رانی جہانبانی

نہیں ہے میل تیرے عدل میں کچھ رو رعایت کا
نہ کیوں پھر دودھ کا پانی ہو دودھ اور پانی کا ہو پانی

لقب تیرا ہے حلال مہمات اس زمانے میں
جہاں کی مشکلیں حل ہوتی جاتی ہیں بآسانی

ترے دور ہمایوں میں ہے ایسا امن کا عالم
نگاہ مہوشاں میں بھی نہیں اب فتنہ سامانی

ہو اوج اسد رجہ بخشا نظم اردو معلی کو
زمین شعر کی۔ گردوں بھی کرتا ہے ثنا خوانی

زباں کا تیری سب اہل زباں لوہا ہیں مانتے
ہے تیرے قبضہ قدرت میں اب تیغ سخندانی

زمین شعر کو اس طرح تو نے کر دیا پانی
کہ جوئے شعر کو اب نظر آتی نہیں کوئی

شرر ریزی آب خنجر براں پہ حیرت کیا
ہوئے ہیں قبضہ قدرت میں یکجا آگ اور پانی

تن مجروح دشمن کو بنائے وہ کیوں گلشن
کہ ہے شمشیر براں میں ترے جوہر حیا بانی

دم قہر و غضب بھی ہے وہی شان کرم جس میں
کیا تھا اخالف کو بلا کر تیغ کا پانی

ہوا بھی نقش سم بن بن کے گو سو رنگنی پیچھے
ترے خنگ فلک پیما کی کچھ ایسی ہے جولانی

نظر آیا نہ اسکی سرعت رفتار کا عالم
ہوئی بیکار سب مرغ نظر کی اڑان فشانی

نہیں ممکن کہ تیری مدح پوری لکھ سکے کوئی
کہ یہ مضمون زلف خم بخم سے بھی ہے طولانی

دعائے عندلیب خوشنوا اللہ سے یہ ہے
رہے جب تک تبسم گل کا بلبل کی خوش الحانی

مشام خلق میں جبتک شمیم آفرینش ہو
سحاب رحمت حق کی ہو جبتک قطرہ افشانی

رہے راز و نیاز حسن و عشق اس دہر میں جبتک
مہ و خورشید سی صبح و مسا جبتک ہو نورانی

تہ چرخ کہن اے ذی حشم حاصل رہے تجھ کو
جہاں شاہی۔ جہانداری جہاں رانی جہانبانی

عندلیب حیدرآبادی۔

مصنوعات دکن

محبوب فرمانروائے دکن کی چہل سالہ جوبلی کے موقع پر (جس کی یادگار میں صحیفہ شایع کیا جاتا ہے) بمقام باغ عام ایک نمائش کھولی گئی تھی جس میں ہر قسم کے ملکی و غیر ملکی مصنوعات کا معتدبہ ذخیرہ جمع کیا گیا تھا۔

اس نمائش کی جانب سے اعلان کیا گیا تھا کہ مصنوعات ہند و دکن پر جو صاحب سب سے اعلیٰ درجے کا مضمون لکھینگے انہیں انعام دیا جائیگا۔

اس مقابلے میں، صحیفہ کے زیر دست قلمی معاون مولوی حافظ محمد مظہر صاحب کے ہاتھ میدان رہا۔

یہ مضمون اپنی اہمیت اور دلچسپی کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ الگ چھاپ کے شایع کیا جاے۔ لیکن صحیفہ کے صفحے اس کی تاب نہیں لا سکتے لہذا اس کا ایک ٹکڑا اس نمبر میں نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔

اگر اسباب فراہم ہو گئے تو بہت جلد یہ دلچسپ، معلومات افزا اور طویل مضمون کتابی صورت میں ناظرین کی جلوہ افروزی کا باعث ہوگا۔

ومن اللہ التوفیق و بہ الاستعانہ۔

اڈیٹر

اسباب تنزل مصنوعات :- اُنیسویں صدی کے آغاز سے جبکہ تجارتی معاہدہ سرکار کمپنی کے ساتھ ہوا (جس کا تذکرہ آئندہ کیا جائیگا) اور تجارت میں آزادی دے دی گئی۔ مصنوعات کا تنزل شروع ہوا ہے۔ اہل یورپ خام مال بڑی مقدار میں خریدنے لگے جس کی وجہ سے صناعان ملک کو خام اشیا تھوڑی مقدار میں گراں ملنے لگیں۔ پھر انگلستان میں سودیشی تحریک شروع ہوگئی۔ اور وہ اپنے ملک کے سوا دوسرے ممالک کی اشیا کے استعمال سے رُک گئے۔ ساتھ ہی سائینس اور برق و بخار نے وقت اور فاصلہ کی دشواریوں کو بالکل مٹا دیا۔ اس طرح تجارت یورپ کا دروازہ بخوبی کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں "انگریز مناد یسی" بننے کا فیشن پیدا ہوگیا۔ ریل اور دوسرے اکثر موقعوں پر اس سے جو عزت ہونے لگی اُس کی وجہ سے یہ شوق حدِ اعتدال سے بڑھ گیا۔ آج کل فیشن ایبل دائرے میں دیسی اشیا کا استعمال حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے فیشن آخر فرض سے بھی بڑھ گیا کہ ہر قسم کا سامان جس کی ضرورت پیش آئے۔ نہ صرف یورپ کا بنا ہوا ہو بلکہ ضرور ہے کہ یورپین تاجروں کے کارخانے ہی سے خریدا جائے۔ اُن کے خیالات نے ملک بھر میں اس فیشن کا شوق عام طور پر پیدا کرا دیا ہے۔ یورپ کے تاجرانہ حملوں کے مقابلے کے لیے ضروری تھا کہ ملک میں وہ تعلیم پھیلائی جاتی جس نے یورپ کو یورپ بنا دیا۔ صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی۔ تجارت کا طریقہ سکھایا جاتا حبِ وطن کا شوق پیدا کرایا جاتا مگر ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ اور اُس کا نتیجہ یہی ہوا جو آج نظر آرہا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر کی کوشش نہیں ہوئی کہ مشترکہ یا ذاتی سرمایہ سے وسیع پیمانے پر باقاعدہ کام کرایا جائے۔ اور تجارتی اُصول پر فروخت ہو۔ سرکار کی جانب سے مصنوعاتِ ملک کی ترقی کے لیے کئی بار کوشش کی گئی۔ متعدد نمایشوں (مثل لنڈن۔ گلاسگو۔ چکاگو۔ پیرس۔ کلکتہ۔ دہلی) میں مصنوعات ملک روانہ کیے گئے دو وقت حیدرآباد میں بھی نمایش کھولی گئی۔ اضلاع میں اکثر عرسوں جاتراؤں کے

موقع پر بھی مصنوعات کے لیے انعامات مقرر کیے گئے۔ چند دن تک محکمہ زراعت و تجارت بھی قایم کیا گیا۔ ان سب کوششوں سے بھی اگرچہ بعض صنعتیں مثل قالین بافی وغیرہ فنا ہونے سے بچ گئیں۔ مگر کوئی نمایاں نتایج پیدا نہیں ہوے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نمایشوں میں سامان وغیرہ روانہ کرنے کے پہلے جو جوش و سرگرمی دکھائی جاتی ہے۔ وہ بعد میں نہیں رہتی۔ اور نہ وہ نتایج شایع کیے گئے جو نمایش کی وجہ سے حاصل ہوے۔ کہ کون سامان پسند ہوا اور کیونکر ان کی ترقی کی تدابیر ہوسکتی ہیں۔ اور نہ ایسی رپورٹیں تیار ہوئیں جن سے مال بنانے والوں اور ان کی قیمتوں کا پتہ چلتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نمایشوں کے بعد اکثر اوقات سرکار اور مال روانہ کرنے والوں کا مالی نقصان بہت کچھ بسبب غفلت عہدہ داران ذمہ دار ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ادھر تو سرکار کی توجہ کم ہوگئی اور ادھر مال روانہ کرنے والوں کے دل سرد ہوگئے۔ دفتر تجارت و زراعت ایسے وقت جب کہ وہ کام انجام دینے کے قابل ہوچکا تھا۔ اپنے لایق و قابل ناظم (ڈائرکٹر) سید محمد حسین مرحوم کی وفات کی وجہ سے توڑ ڈالا گیا اور پھر اس سے کوئی فایدہ بھی نہ ہوسکا۔ + + + + + + +

فنون لطیفہ:۔ بت تراشی پتھر کے بت اور مجسمے (اسٹیچو) بنانے میں دکن بودھ اور جینیوں کے زمانے میں مشہور تھا۔ اس زمانے کے کمال کی شہادت اجنٹا۔ ایلورا کے غار۔ مامل پور کے بت دے رہے ہیں۔ جب مسلمان دکن کے فرمانروا بنے تو انہوں نے بہ سبب مذہبی موانعات کے کوئی توجہ اس ہنر کی طرف نہ کی۔ جس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ اب یہ صنعت بھی معدوم ہوگئی۔

مصوری بھی زمانۂ قدیم میں عمدہ ہوا کرتی تھی۔ اور زیادہ تر مذہبی تصاویر تیار کیجاتی تھیں۔ مسلمانوں نے اس صنعت پر بھی بہ سبب مذہبی ممانعت کے زیادہ توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں تنزل آگیا۔ اب پھر حیدرآباد میں تصاویر ہاتھ سے تیار ہونے لگی ہیں۔

فوٹو گرافی کا رواج بھی اب کثرت سے (یورپ کے اثر سے) حیدرآباد اور بڑے بڑے قصبوں میں ہو رہا ہے۔ مگر اس کے لیے تمام سامان باہر سے لانا پڑتا ہے۔

جلد بندی۔ حیدرآباد میں ابری۔ کیالیکو (رنگین اور روغنی کپڑا جو جلدوں کے کام آتا ہے) اور چمڑے کی بہت ہی عمدگی سے ہوتی ہے۔ اور یورپ کی جلدوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ طلائی و نقرئی نقش و نگار ٹھپہ سے کیے جاتے ہیں اور ہر زبان میں (یعنی ہندوستان کی مروجہ اور ملکی زبانوں میں) جلدوں پر طلائی و نقرئی نام لکھا جاتا ہے دوسرے بڑے بڑے قصبوں میں بھی جلد سازی ہوتی ہے۔ گزشتہ زمانے کی جلدیں بھی نہایت ہی اعلیٰ درجے کی ہوتی تھیں۔ اور حیدرآباد و اورنگ آباد وغیرہ میں تیار ہوتی تھیں۔ جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں۔ چونکہ اب فیشن بدل گیا۔ اس لیے اس وضع کی جلدیں نہیں تیار ہوتی ہیں۔

خطاطی و خوشنویسی و نقاشی وغیرہ کے ہنر اورنگ آباد۔ گلبرگہ۔ بیدر میں گزشتہ زمانے میں موجود تھے۔ مگر چونکہ ان ہنروں کی قدر سلطنت کے مرکزوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس لیے دارالسلطنت کے اٹھنے کے ساتھ ہی اہل کمال بھی فنا ہو گئے حیدرآباد میں پہلے بھی بڑے بڑے خوش نویس اور نقاش اور صاحب کمال موجود تھے اور اب بھی ہیں جن کا کمال نہایت ہی اعلیٰ درجے کا ہے۔

مطابع۔ حیدرآباد میں ٹائپ اور لیتھو کے پریس ہر زبان کے موجود ہیں۔ مگر سب کے سب پاٹھے چلائے جاتے ہیں۔ اورنگ آباد۔ وارنگل۔ گلبرگہ۔ رائچور۔ بیدر میں بھی پریس موجود ہیں۔ مگر سب کے سب معمولی حالت میں ہیں۔ کتابیں طبع ہونے کے لیے ہندوستان کے مطبعوں میں روانہ کی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ حکام کی بے توجہی اور تعلیم کی کمی ہے۔

مہر کنی۔ پیتل اور مینی (سنگ مینی) پر مہریں حیدرآباد میں کندہ کی جاتی ہیں اور اچھی ہوتی ہیں۔ مونوگرام بھی ہر قسم کے تیار کیے جاتے ہیں۔ جو خوبی میں تمام ہندوستان میں بے نظیر ہوتے ہیں خصوصاً عربی اور ترکی وضع (سلطانی دستخط اور مہر کی طرح)

نہایت اعلیٰ درجے کے بنتے ہیں۔ ربر کی مہریں بھی عمدہ بنائی جاتی ہیں۔

رنگ۔ نیل، کسم، چرانچی کے رنگ اکثر اضلاع میں تیار کیے جاتے ہیں۔ اور یہ رنگ ایسے پائدار ہوتے تھے۔ کہ برسوں تک رہتے تھے۔ قدیم زمانے کے جاجم پردے وغیرہ اس کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ مگر آج کل انگریزی رنگ نے قدیم طریقے کے رنگوں کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔

روغن۔ ارنڈی، تل، السی، کڑڑ، کاریلا، ناریل، گھانسی۔ سیاہ تل، سیم کی پھلی۔ دسہ۔ جھوہ۔ منولہ (پنبہ) سرسوں، وغیرہ کے تیل بذریعہ گھانوں کے ہر ایک بڑے گاؤں میں نکالے جاتے ہیں۔ انکے علاوہ آمیزشی خوشبودار تیل مثل چنبیلی، موتیا۔ گلاب، وغیرہ کے بھی پھولوں میں بسا کر نکالا جاتا ہے۔ اب حیدرآباد (سکندرآباد) ورنگل۔ رائچور۔ اورنگ آباد۔ فرخ نگر۔ اور چند دوسرے ریلوے اسٹیشنوں میں اسٹیم فیکٹریوں کے ذریعہ سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ان کی کلیں بھی ولایت وغیرہ سے آتی ہیں۔ اگر کوشش کی جائے تو یہاں بھی تیار ہو سکتی ہیں۔

عطر۔ حیدرآباد، اورنگ آباد میں ہر قسم کا تیار ہوتا ہے۔ حیدرآباد کا عطر کیوڑہ خصوصیت کے ساتھ تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں کیوڑہ بکثرت ہے اور اچھا اور سستا ملتا ہے۔

قند۔ شکر اور گڑ اکثر اضلاع میں بناتے ہیں۔ اور ہر جگہ قدیم طریقوں پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں ایک اسٹیم فیکٹری قایم ہے مگر کامیابی کے ساتھ اب تک نہیں چل سکی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پورا سرمایہ جمع ہونے سے پہلے کارخانہ قایم کر دیا گیا۔ اور جسقدر رقم مہیا ہوئی تھی وہ کلوں کے منگانے اور مکان کی تیاری میں صرف ہو گئی۔ اب کارخانہ چلانے کے لیے سودی روپیہ قرض لینا پڑا۔ اور اس سے ایک بہت بڑا بار پڑا۔ فروخت کے لیے بھی کوئی مناسب انتظام نہیں کیا گیا علاوہ ازیں جن کارخانوں سے اس قدر مصنوعی اور سستی شکر آتی ہے کہ بہ کیا کل ہندوستان کے کارخانے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدا میں سرکار کی جانب سے بھی امداد نہ مل سکی۔ محمد مظہر

مضمحل اور آپ کی زندگی تلخ کردوں۔ آپ ایک مہذب و شریف خاندان میں ہیں اور ہر قسم کی عزت و تکریم کے مستحق ہیں۔ مگر آپ نہیں جانتے کہ آپ سے ملکہ کی شادی ہونے میں کیا کیا نقصانات ہیں۔ ملکہ کی شادی اگر آپ سے ہوگئی تو سمجھ لیجیے کہ اس کی زندگی خاک میں مل گئی اور اس کی قسمت پھوٹ گئی۔ ملکہ کی ظاہری خوشنودی صرف اس بنیاد پر ہے کہ وہ ان مصائب سے اپنے خاندان کو بچائے جن کے پیش آنے کی اس کو دھمکی دی گئی ہے۔ وہ اپنے جی میں ٹھان چکی ہے کہ اپنی جان پر کھیل جائے مگر اپنے خاندان پر کوئی آنچ نہ آنے دے نواب نے اسے جن جن خطروں سے ڈرایا ہوگا وہ مجھے بھی معلوم ہو چکے ہیں وہ آپ کا مقروض ہے اور ایک خاص رقم کے ناجائز طور پر وصول کرنے سے آپ کا غلام بن گیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہے کہ ملکہ کو اپنے قرض پر بھینٹ چڑھا دے۔ مگر میں اس کا موقع نہ آنے دونگی اور اس کی تمام چالوں کو مات کر دونگی۔ میں آپ کو آپ کی شرافت، انسانیت، اور ہر عزیز چیز کی قسم دلا کے کہتی ہوں کہ آپ ملکہ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ ورنہ آپ ہی اس کی جان لینے والے ہونگے اور آپ ہی کے سر تمام گناہ عاید ہوگا۔ کاش آپ ہمارے اسرار میں سے کچھ بھی جان گئے ہوتے تو آج اس اصرار و انکار کی نوبت نہ آنے پاتی ۔"

نواب بیگم اسی طرح پیٹر کو دیر تک سمجھاتی اور بعض اسرار کی وجہ سے ہول انگیز حادثات سے ڈراتی رہی۔ پیٹر غور و فکر کرتا اور سوچتا رہا۔ آخر میں یہہ کہہ کے چلا گیا کہ "میں اس پر آیندہ غور کرونگا"

پیٹر کے چلے جانے کے بعد، فلینی آیا اور دریافت کیا کہ گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا نواب بیگم نے اپنی ناکامی کا اظہار کیا اور جذبات رنج و الم میں محو ہو گئی۔

عین اس موقع پر یہاں ایک نیا سین نظر آتا ہے۔ اس وقت مسٹر فلینی کی بیٹی سوسن، قریب سے گزری اور نواب بیگم کی کچھ گفتگو چلتے چلتے سن لی۔

معاً اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔ ایسا خیال جو عموماً ہمارے ملک کی ان بیاہیوں کے دل میں بہت کم (بلکہ نہیں) آتا ہوگا۔ وہ فوراً زینہ سے نیچے اُتری اور پیٹر کے بلانے کو پھرتی سے دوڑی، پیٹر پھاٹک کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اتنے میں سوسن نے اُسے آواز دی، پیٹر رُک گیا اور دیکھا کہ سوسن اُسے بلا رہی ہے۔ مڑ کے واپس چلا۔ سوسن قریب آ کے بولی: "جناب والا ایک ضروری مسئلے میں گفتگو کرنے کے لیے تھوڑی دیر تک آپ میرے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں؟"

پیٹر: "(تعجب سے سوسن کا چہرہ دیکھ کر) جی ہاں! میں خوشی سے بیٹھ سکتا ہوں۔"

سوسن اُسے خاص اپنے کمرے میں لے گئی اور ایک کرسی پر بٹھا کے خود روبرو بیٹھ گئی اور کہنے لگی: "آپ مجھے جانتے تو ہونگے۔ میرے والد کا نام مسٹر فلینی ہے۔"

پیٹر: "میں آپ کو جان چکا ہوں اور آپ کے اوصافِ حمیدہ سے واقف ہو چکا ہوں۔"

سوسن: "شاید مسٹر مارینی کی صاحبزادیوں نے جو میرے حق میں حقیقی بہنوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں آپ کے سامنے میری تعریف کی ہوگی اور ممکن ہے کہ آپ کو میری نسبت جو جو خبریں معلوم ہوئی ہونگی وہ نیک اور دل خوش کن نہ ہوں۔"

پیٹر: "ہرگز نہیں تمام آدمی آپ کے اوصافِ حمیدہ کے مداح و معترف ہیں۔"

سوسن: "پھر بھی مجھ میں کچھ کچھ سبکسری اور ڈھٹائی ہے جو عورتوں کے شایاں نہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ میرا دل پاک و صاف اور میری محبت سچی ہے آپ اگر میرے ظاہر پر حکم نہ لگائیں تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میرے مقاصد بعض اوقات مجھے ڈھٹائی سے پیش آنے پر مجبور کرتے ہیں اور میں اپنے جذباتِ نفسانی کی مطیع ہو جاتی ہوں۔ میری طبیعت میں بلا کی جلد بازی ہے جس کی بدولت مجھے صبر کا یارا نہیں۔ لیکن میری ظاہری سبکسری اس امر سے مانع نہیں کہ میں باطن میں متین و بردبار بنی رہوں۔ میں راہِ صواب کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں چلتی۔"

پیٹر ان باتوں کو ایک خود رفتگی کے عالم میں سن رہا تھا۔ گویا اس منچلی

نوجوان عورت نے اُس پر جادو پھینک دیا تھا۔ سوسن پھر کہنے لگی "میں شاید اپنی تعریف میں حد سے بڑھ گئی۔ میں نے آپ کو یہاں تک تشریف لانے کی تکلیف ایک خاص مصلحت سے دی ہے۔ سنیے نواب بیگم کے اور آپ کے مابین جو معاملہ ہو رہا ہے وہ مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے۔ میرا گزر ابھی ابھی اُن کے قریب ایسی حالت میں ہوا ہے کہ وہ ملکہ کی تباہ کن بربادی و ناکامی پر گریہ و زاری کر رہی تھیں۔ میں نے اور باوا جان نے اکثر اوقات آپ کی نسبت سُنا ہے کہ آپ شریف اور خلیق، اور عالی خاندان، اور بامروت، اور زندہ دل، اور نیک خصال اور صاحبِ عزت آدمی ہیں۔ اس لیے مجھے آپ کے ساتھ تخلیہ میں بیٹھنے اور باتیں کرنے سے کوئی خطرہ نہ پیدا ہوا اور نہ آپ کے دل میں کوئی بُرا خیال آیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنی سہیلی ملکہ کی نسبت، آپ کو بعض حالات سے آگاہ کروں۔ سنیے آپ ملکہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ کا میلان اُس کی طرف حد سے زیادہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ آپ کا سا جامع الاوصاف آدمی ملکہ کی ماں کا اس قدر بے انتہا اصرار دیکھنے کے بعد، کیوں اپنے ارادے سے باز نہیں آتا۔ اگرچہ آپ کی طرف سے کوئی نہ کوئی عذر ضرور پیش کیا جائیگا۔ مگر وہ عذر بیجا ہوگا۔ آپ کے ارادے کی تکمیل میں ایک عظیم الشان اور سربستہ راز مانع ہے۔ جسے میں اور میرے والد بھی با ایں ہمہ قربت و دوستی نہیں جانتے۔ اس سے قطع نظر ایک اور مانع جس کو میں جانتی ہوں اور جس کے بیان کرتے ہی آپ اپنے ارادے سے بلا تردد برگشتہ ہو جائینگے یہ ہے کہ ملکہ اپنا دل کسی اور ہی کو دے بیٹھی ہے ——"

پیٹر: "(دہشت زدہ ہو کے) تو پھر آپ اُن کی والدہ کو اس سے کیوں نہیں آگاہ کرتیں؟"

سوسن: "شاید وہ اس حال سے ناواقف نہیں ہیں"

پیٹر:۔ "کیا آپ یقین کے ساتھ یہ کہہ رہی ہیں"
سوسن:۔ "یقین اور کامل یقین کے ساتھ! — ملکہ اگرچہ اپنے اسرار کو بڑی حفاظت سے چھپا رکھتی ہے۔ مگر مجھ سے نہیں چھپا سکتی اور میں ضرورت کے وقت اُن کے افشا سے نہیں ڈرتی"
پیٹر:۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ میں اُس شخص سے واقف ہو سکوں جسے ملکہ چاہتی ہے؟"
سوسن:۔ "شاید آپ نے اُس آدمی کا ذکر سُنا ہوگا جس کا نام جنگلی انسان ہے"
پیٹر:۔ "جنگلی انسان! یہ کیسا عجیب نام! یہ کون آدمی ہے؟"
سوسن:۔ "یہ آدمی تخمیناً تین سال پہلے ماریل کی جھاڑیوں میں وحشیانہ طور سے رہا کرتا تھا۔ مگر آج کل وہ ایک ایسے عالی ہمت کے پاس ہے جس نے اُس کے پیچھے اپنا مال و زر برباد کر دیا اور پوری جد و جہد سے اُس کو متمدن بنایا لکھایا پڑھایا اور مختلف علوم و فنون میں دستگاہ پیدا کرائی۔
اگر آپ کی مرضی ہو تو میں اُس کے کچھ حالات آپ کے گوش گزار کروں"
پیٹر نے رضامندی ظاہر کی اور سوسن ایک موثر پیرایے اور دلکش انداز میں جنگلی انسان کے حالات بیان کرنے لگی کہ اُس نے ملکہ کو غار میں گرنے سے بچایا۔ پھر اُس پر عاشق ہو گیا۔ ملکہ کو بھی رفتہ رفتہ اُس سے اُلفت ہوتی گئی اور محبت کی چنگاریاں بڑھتے بڑھتے شعلۂ جوالہ بن گئیں۔ ملکہ کو اس بات پر افسوس ہوا کہ وہ ایک نامانوس وحشی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئی۔ نیز اُس نے کوشش کی کہ اس جنگلی کی آتشِ اُلفت کو دل میں بجھا دے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور عشق کا بھوت سر سے نہ اُترا وغیرہ وغیرہ۔
اس کے بعد وہ بولی:۔ "اس راز کو میرے سوا بہت کم کوئی جانتا ہے میں بھی صرف اس وجہ سے جانتی ہوں کہ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسری کی شریکِ حال ہیں۔ اور کسی کا کوئی راز دوسری سے مخفی نہیں ہے۔ اب

آپ فرمائیے کہ ان حالات کو معلوم کرنے کے بعد آپ کے کیا خیالات ہیں۔ کیا یہ درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

پیٹر: "بیگم صاحبہ! میں آپ کی اس عنایت کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا کہ آپ نے میرے ارادوں میں تزلزل ڈال دیا۔ اور بے بنیاد آرزوؤں کی خیالی لذت سے پردہ اٹھا دیا۔ مگر ضرور ہے کہ میں اس مسئلہ پر دوبارہ غور کروں۔"

سوسن: "گویا آپ کو امید ہے کہ ملکہ آپ کو دوست رکھیگی نہیں وہ آپ کو کبھی نہیں چاہ سکتی۔ بلکہ خود آپ بھی اس کو پسند نہ کرینگے کہ ایسی عورت سے آئندہ زندگی کا رشتہ جوڑیں جو آپ کو آپ کی طرح نہ چاہتی ہو اور آپ سے آپ کی طرح محبت نہ رکھتی ہو۔

یہ امر آسان اور ممکن ہے کہ آپ ملکہ کے سوا کسی اور عورت کو پائیں جو اکثر امور میں ملکہ کے طریقے سے موافقت رکھتی ہو اور بعض باتوں کے سوا باقی امور میں اس کی نظیر ہو!"

ان فقروں کو سن کے پیٹر کا دل دھڑکنے لگا اور وہ مبہوت ہو کے خاموش رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں بولا: "معزز خاتون! آپ نے اپنی سہیلی کی جانب سے اچھی مدافعت کی لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جب میں آپ کے کلام پر بھروسہ کر کے ملکہ سے قطع تعلق کر لونگا تو بڑی بڑی بلاؤں میں پھنس جاؤنگا پس کیا میری خوش قسمتی کا ثبوت اس طور پر مجھے مل سکتا ہے کہ اس زمانے میں آپ سے قربت حاصل رہے۔"

سوسن: "جس طرح مسٹر مارینی کے نزدیک آپ کا رتبہ بلند ہے۔ اسی طرح مسٹر فلینی کے پاس بھی آپ کی عزت رفیع رہیگی۔ اور اس بنا پر ہمیشہ ان کے دروازے آپ کے لیے کھلے رہینگے۔"

پیٹر: "آپ کی اجازت کی بنیاد پر میں ان سے التماس کرونگا کہ وہ مجھے اپنے مکان میں آنے جانے کی پروانگی دیں۔"

سوسن :۔ "وہ آپ کو ضرور اس کی پروانگی دینگے"

پیٹر :۔ "تو اب ہم میں عہدِ دوستی محکم ہوگیا۔!"

سوسن :۔ "بے شک! اور یہ عہد ہمیشہ قایم رہیگا اگر آپ اُس رستے پر چلنے لگینگے جو میں نے اس رازِ سربستہ کے انکشاف سے آپ کو دکھا دیا ہے"

پیٹر :۔ "بیگم سوسن! تمہارے بے بہا خلوص بھرے دل کی آزادی نے میری سُدھ بُدھ چھین لی۔ اِس لیے میں چاہتا ہوں کہ قبل اس کے تم کو خدا حافظ کہوں اپنی بھی آزادی کو ظاہر کر دوں جس سے تمہیں معلوم ہو جاے کہ میرا ظاہر و باطن ایک ہے۔ تم نے ابھی مجھ سے بیان کیا ہے کہ تمہارے پہلو میں ایک سچی محبت والا دل ہے (خاموش ہوگیا اور تھوڑی دیر تک ٹھہر کے رُک رُک کے کہنے لگا) نیز تم نے یہ کہا ہے کہ جب میں ملکہ کی خواستگاری سے باز آؤنگا تو مجھے کوئی ایسی عورت مل جائیگی جو مجھ کو چاہنے والی ہوگی ۔۔۔۔۔۔ پس کیا یہ ممکن ہے کہ وہ سچی محبوبہ تم ہی ہو۔!"

اِس وقت سوسن کے بدن کا خون تمام اعضا سے سمٹ کے چہرے کی جلد کے نیچے آگیا اور اُس کی صورت حیا سے لال ہوگئی۔ پیٹر کے آخری فقرے کو سُن کے وہ متبسم ہوئی اور رُک رُک کے بولنے لگی :۔ "پیارے پیٹر! جب ملکہ اپنی ماں کے پاس چلی جائیگی اور قیدِ مصیبت سے مخلصی پالیگی اُس وقت مجھے تم کو اپنا دل دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔"

اتنا سنتے ہی پیٹر کی پیشانی خوشی سے چمکنے لگی اور وہ یہ کہہ کے کہ "بہت مبارک وعدہ ہے" رخصت ہوگیا۔ ظہر کے بعد، پیٹر نواب کے محل میں داخل ہوا۔ نواب کو موجود نہ پا کر ملکہ کے کمرے میں گیا اور ملکہ سے بعض اہم سوالات پوچھنے لگا اور اُن کا جواب دینے کے لیے اصرار و الحاح کرنے لگا اس قیل و قال سے اُس کو کنایۃً معلوم ہوگیا کہ ملکہ مدت سے کسی اور ہی کو چاہتی ہے لہذا اُس نے عزم مصمم کر لیا کہ آیندہ سے کبھی اُس کی خواستگاری نہ کریگا۔

دوسرے دن پیٹر نے نواب کے پاس اس مضمون کی چٹھی روانہ کی: "میں نے نواب بیگم سے ملاقات کی مگر انہیں میری خواستگاری کے نامنظور کرنے پر اصرار کرتے ہوئے پایا۔ لہذا میں افسوس کے ساتھ اپنے پہلے ارادے سے عدول کرتا ہوں کیونکہ یہی انسانیت کا تقاضہ ہے"۔

نواب کو یہ چٹھی کیا پہنچی۔ گویا سر پر ایک بجلی گری۔ اس نے یقین کر لیا کہ اس کی ساری تمنائیں خاک میں مل گئیں اور وہ قعر ہلاکت میں جا پڑا۔ وہ حواس باختہ بت کے مانند بے حس و حرکت ہو گیا اس کے منہ میں کف بھر گیا۔ اور اس کے غصے کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑبڑانے، گالیاں دینے، اور پاؤں سے زمین کوٹنے لگا۔ وہ غصیلے شیر کی طرح ٹہلتا، ادھر ادھر دیکھتا اور میز کرسی وغیرہ کو زمین پر دے دے مارتا تھا۔ اس عالم میں جو الفاظ اس کی زبان سے نکل رہے تھے وہ یہ تھے: "نواب بیگم نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ یقیناً لڑنا چاہتی ہے۔ میں بھی اسے لڑائی کا مزہ ایسا چکھاؤنگا کہ عمر بھر یاد کرتی رہیگی۔ میں ملکہ کو عمر بھر اسے نہ دونگا۔ بلکہ اس کا ناخن تک نہ دکھاؤنگا"۔

جب اس کا جوش و خروش کسی قدر دھیما پڑ گیا تو میز پر بیٹھ کے یہ چند سطریں لکھیں:۔

"نواب بیگم! میرے اور تمہارے درمیان ایک معرکہ واقع ہوا تھا جس میں "کچھ مدت کے لیے تم بازی لے گئیں لیکن اب میرے ہتیار میرے قبضے میں "ہیں۔ تم مالدار ہو اور بخوبی جانتی ہو کہ میری حالت تباہ ہو گئی ہے۔ لہذا "ضرور ہے کہ تم اپنی دولت کے حصے بخرے کر دو اور دو جنتے کے اندر "میرے پاس کم از کم بیس لاکھ نقد بھیج دو۔ اگر تم نے اس حکم کی تعمیل کی "تو تمہاری بیٹی تمہارے پاس آجائیگی۔ ورنہ بصورت خلاف ورزی تم کو "معلوم ہو جائیگا کہ میں نے اپنے جی میں کیا ٹھان رکھا تھا"۔

خط لکھ کے نواب نے لفافے میں بند کر دیا اور نواب بیگم کے پاس

روانہ کر دیا۔ بعد ازاں نوکروں کو تاکید کی کہ ملکہ پر سخت پہرہ رکھا جائے۔
اینڈری (مصنوعی فرڈرک) نے جی میں کہا: "نواب اپنی حماقتوں سے باز نہ آئیگا جب تک اُسے اچھی طرح مزہ نہ چکھایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس گھر سے میرے نکلنے کے دن قریب آ گئے ہیں اور اب بہت جلد نواب کا کام تمام ہونے والا ہے۔"

چودھواں باب

یوسیا

کرنیل گیبرڈی، ایک دن بعض ضروری کاموں کی انجام دہی کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں اُس کے پاس ہنا کا ڈاکٹر آیا۔ گیبرڈی نے اس کا استقبال کیا اور صاحب سلامت کے بعد، گفتگو شروع ہوئی۔
ڈاکٹر نے کہا: "جناب عالی! آپ کی روانہ کی ہوئی دستاویز مجھے آج وصول ہوئی جس کی بنا پر سرما منزل میری ملک میں آ گئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک سالانہ وظیفہ جس کی مقدار دس ہزار فرنک ہے مجھے ملا کریگا۔"
گیبرڈی: "جی ہاں! جو کچھ کیا گیا وہ مجھ پر بمنزلہ فرض کے تھا کیونکہ آپ نے میرے مصالح کے متعلق جو جو محنتیں اُٹھائیں اور تین سال تک میرے مکان میں جو قیام فرمایا اُس کا یہی تقاضا تھا کہ میں آپ کے ساتھ اس سے زیادہ سلوک کرتا۔ ایسی حالت میں کیا مجھے اتنا بھی نہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ مکان آپ کی ضرورتوں کے لیے وقف کر دیا جائے جس کے باب میں آپ نے دو ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ یہ میری علمی ضرورتوں کے لیے بہت موزوں ہے اور میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی ضرور تھا کہ آپ چونکہ ایک فاضل آدمی ہیں اور علمی تجربوں میں زندگی بسر کرتے ہیں لہٰذا آپ کو

تلاش معاش کی زحمتوں سے سبکدوش کر دیا جائے اور اطمینان خاطر اور فراغ بال کے لیے کوئی وظیفہ مقرر کیا جائے۔"

ڈاکٹر:۔ "حضور عالی! یہ سب آپ کی عنایتیں اور مہربانیاں ہیں لیکن میں ان کی کوئی ضرورت نہیں خیال کرتا۔"

گیرڈی:۔ "میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میری ثروت و مقدرت کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ آپ جس طرح اپنی زندگی خلائق کی بہبودی میں صرف کرتے ہیں اسی طرح مجھ پر واجب تھا کہ اپنا مال آپ کی منفعت میں صرف کروں۔"

ڈاکٹر:۔ "چشم بد دور! معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑی دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔"

گیرڈی:۔ "میں اس بارے میں وہاب حقیقی کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے میری دولت، گویا میرے کاندھوں پر ایک پہاڑ ہے۔ میں اپنے کاندھے ہلکے کرنا چاہتا ہوں (غافلہ! تجارت کا یہی ثمرہ ہے) آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ عامۂ خلائق کو عموماً اور محتاجوں کو خصوصاً نفع پہنچانا میری عادت میں داخل ہے۔ میں اس وقت بہت خوش ہوتا ہوں اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں باقی رہتی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تکلیف زدہ اور فلاکت رسیدہ لوگ آسائش میں آ گئے ہیں۔"

ڈاکٹر:۔ "اس لحاظ سے اگر میں آپ کو ایک نئی چیز کی اطلاع دوں تو غالباً آپ کو بڑی مسرت ہوگی۔"

گیرڈی:۔ "ضرور ہوگی۔ بیان فرمائیے وہ کیا شے ہے؟"

ڈاکٹر:۔ "میں دو سال سے سنتا آ رہا ہوں کہ آپ ایک دیوانی عورت کے حالات بیان کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے ہر جگہ اس کی بہت کچھ تلاش بھی کی تھی۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا تھا۔ شاید آپ اب تک بھی اس کی ٹوہ میں ہوں گے۔ لہٰذا میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس کا کوئی سراغ ملا یا نہیں؟"

گیرڈی :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کے) بدقسمتی سے کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ بلکہ آج تو یہ ظاہر ہوا کہ میری آرزوئیں نا اُمیدی سے بدل گئیں"۔

ڈاکٹر :۔ "آپ نے مجھ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک انگلش لیڈی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی جس کے متعلق آپ بہت اہتمام رکھتے تھے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اُس کا نام کیا تھا؟ اور اُس کے شوہر کو کیا پکارا جاتا تھا اور وہ فرانس میں کیونکر آئی تھی؟ نیز اُس کے دیگر حالات (جو آپ کو معلوم ہیں) کیا ہیں؟"

گیرڈی :۔ (مضطرب ہوکے اور حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھ کے) آپ مجھ سے یہ سوالات کیوں دریافت کر رہے ہیں؟"

ڈاکٹر :۔ "اس لیے کہ ان کا جواب مجھے بہت فایدہ پہنچائیگا"۔

گیرڈی :۔ "کیا فائدہ! آپ کس چیز کو چھپا رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو یہ سننے سے کیا نفع پہنچیگا کہ اُس بیچاری کا نام "لوسیا" تھا اور وہ ہندوستان کے ایک انگریز تاجر کی اکلوتی بیٹی تھی اُس نے پٹاوی میں مارکوئس پال چیمبری سے شادی کی تھی اور اُسی کے ساتھ فرانس آئی تھی"

ڈاکٹر :۔ "آپ کے ان جوابات نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ سنیے کئی مہینے کے پہلے، میرے ایک دوست جو بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں مجھ سے ملے تھے۔ مجھ سے اُن سے فنِ طب کے بعض مسائل پر بحث ہوئی تھی۔ اُنہوں نے اثنائے گفتگو میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک دفعہ بلادِ برگونیا میں اُن کا گزر ہوا۔ اُنہوں نے ایک قصبے میں جس کا نام "سرجہ" تھا کسی خوبصورت عورت کو دیکھا جس کا سن چالیس اور پچاس سال کے درمیان ہوگا۔ اُس کے دماغ میں کسی وجہ سے سخت اضطراب پیدا ہوگیا تھا جو ایک قسم کا جنون تھا۔ وہ اُن تمام واقعات کو جو گزشتہ زمانے میں اُس پر واقع ہوئے تھے بھول گئی تھی۔ لوگوں نے اُس کو اِس

حالت میں پایا تھا کہ وہ تھکی ماندی، جاڑے سے ٹھٹھرتی ہوئی، ایک رستے پر جارہی تھی۔ اُس کو تھکن اور بھوک پیاس نے نحیف بنا دیا تھا۔ ایک کسان اُس عورت کو اپنے گھر لوالایا۔ اِس کو تقریباً اٹھارہ سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہہ عورت اُس کسان کے گھر میں کام کاج کرتی اور اُس کے خاندان کی خدمت بجالاتی تھی وہ ہر کام کو سلیقے اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی اور گھریلو کاروبار میں بڑی ماہر تھی، گھر کے سب آدمی اُسے چاہتے تھے اور اُس کا احترام کرتے تھے۔"

اس وقت کرنیل گیرڈی کی بے قراری بڑھ گئی اور اُس پر رعشہ طاری ہوگیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اِس خوف سے کہ قطع کلام ہوگا خاموش ہو کے دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے پھر کلام کا سلسلہ شروع کیا۔ لوگوں کو مطلق نہ معلوم ہوسکا کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے، پہلے پہل وہ کسی اور زبان میں باتیں کرتی تھی۔ مگر دو سال کے بعد، فرانسیسی بولنے اور سمجھنے لگی۔ لوگوں نے اُس کا نام، وطن، فرانس میں آنے کا سبب، اور دوسری بہتیری باتیں اُس سے دریافت کیں۔ ان سب کا جواب اُس کی طرف سے یہی تھا کہ "میں نہیں جانتی" کیونکہ وہ گزشتہ تمام واقعات کو بھول چکی تھی، کسان کے گھر میں داخل ہوتے وقت اُس کی عمر بیس سال کی تھی، لوگوں نے اُس کا نام "مریم" رکھا۔

جب میں نے اپنے دوست سے یہہ حالات سنے تو خواہش ظاہر کی کہ وہ اُس کو مجھ تک پہنچا دیں تاکہ میں اپنی طبی تحقیقات میں کوئی اضافہ کرسکوں اُنھوں نے میری خواہش کو دیکھ کے دوسرے دن برگونیا کا سفر کیا اور تین دن کے بعد اُس کو لیے ہوئے میرے پاس آپہنچے۔ وہ عورت اِس وقت میرے پاس میرے منزل میں موجود ہے۔"

گیرڈی: "میں سخت تعجب کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ سے اس کا ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ وہ عرصے سے آپ کے پاس موجود ہے۔"

ڈاکٹر: "میں نے چاہا کہ اس وقت تک انتظار کرتا رہوں۔"

گیرڈی :۔ "بیقراری کے ساتھ کھڑے ہو کر) میں اُس کو آج ہی دیکھنا چاہتا ہوں"

ڈاکٹر :۔ "آپ دور دیکھ سکتے ہیں۔ مگر مجھے بات تو پوری کرنے دیجیے۔ میں نے بڑے غور و خوض کے بعد، یہ معلوم کیا کہ اُس کا نسیان، خلل دماغ کا نتیجہ تھا اب وہ ہوش میں آچکی ہے اور بھلی چنگی ہے۔

مجھے اس کا سبب نہ معلوم ہوسکا کہ اُس کو خلل دماغ کیوں پیدا ہوا تھا آیا کسی صدمے سے، خوف سے یا کسی ہولناک منظر کو دیکھنے سے؟ اس راز کے انکشاف کی غرض سے میں نے اُس کے خوابیدہ حافظے کو جگانا چاہا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگر مجھے گزشتہ حالات معلوم ہوتے ہوتے تو اس قدر دقت نہ اُٹھانی پڑتی۔ میں نے اُس کی گفتگو سے، حرکات سے، نگاہوں سے یہ جان لیا کہ وہ کوئی معمولی طبقے کی عورت نہیں ہے۔ قرینے کی مدد سے میں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتی ہے۔ میں نے اُس کے سامنے مختلف زبانوں کی کتابیں رکھ دیں۔ اُس نے ایک انگریزی کتاب پڑھ لی پھر میں نے اُس کے آگے قلمدان رکھا۔ اُس نے دو سطریں لکھیں۔ میں نے مختلف شہروں کے نام لینے شروع کیے۔ مگر اس کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر میں نے ایک کتاب نکالی جس میں اُن تمام انگریزی مقبوضات کی تصویریں تھیں جو ایشیا یورپ میں واقع ہیں۔ میں بہت دیر تک اُس کو تصویریں بتاتا اور شہروں کے نام گناتا رہا۔ کہ دفعتہً کلکتہ کے نام پر وہ چونک پڑی اور اُس کی تصویر دیکھ کر اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ "کلکتہ، کلکتہ" کہہ کے پکارنے لگی"

اس وقت کرنیل گیرڈی کو ایسی سخت بیقراری پیدا ہوئی کہ وہ ضبط نہ کرسکا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا :۔ بس کیجیے جناب! بس کیجیے۔ اب مجھ میں زیادہ سننے کی تاب نہیں۔ آپ یہ جو کچھ بیان کر چکے ہیں کافی سے زیادہ ہے"

اتنا کہہ کے نوکر کو حکم دیا کہ فوراً گاڑی تیار کرو۔ پھر جلدی سے کپڑے بدل کر باہر نکل آیا۔ دروازے میں جنگلی انسان سے ملا۔ جنگلی انسان بھی بہت بیقرار ہو رہا تھا۔ گیرڈی نے اُس کی بیقراری کا سبب دریافت کیا۔ جنگلی انسان نے جواب دیا:۔ "ایک مشکوک مسرت ہے جس کی مجھے اُمید بندھتی ہے۔ ممکن ہے کہ میری اُمید بر آئے اور ہم دونوں اُس مسرت میں سچے شریک ہوں۔"

ڈاکٹر اور گیرڈی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی اُنہیں لے کے ہوا ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں سرمانزل نگاہوں کے سامنے تھی۔ دونوں محل میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے اُس کو کمرے میں ڈھونڈا۔ پھر نوکروں سے دریافت کیا کہ کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ وہ اور ہنا دونوں خانہ باغ میں بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں۔ گیرڈی نے کہا ہم وہیں جا کے دیکھینگے۔ مگر آپ مجھے تھوڑی دیر کے لیے مہلت دیجیے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور دھڑکنا موقوف ہو۔

تھوڑی دیر میں دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں ہنا اور لوسیا بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ گیرڈی نے لوسیا کو عجیب و غریب نگاہوں سے دیکھا۔ مسا اُس کی حالت بدل گئی وہ دبی ہوئی آواز میں بولا:۔ "یہی ہے۔ یہی ہے۔" پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دونوں کسی قدر قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے "مریم۔ مریم" کہہ کے پکارا۔ وہ کتاب بند کر کے کھڑی ہو گئی اور گیرڈی کو متحیر ہو کے ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگی۔ گیرڈی اُس کے روبرو جا کے ٹھہر گیا اور کہنے لگا:۔ "ہاں! مجھے ذرا غور سے دیکھنا اور پہچاننا کہ کون ہوں؟" لوسیا کا بدن تھرتھرانے لگا آنکھیں پھر گئیں۔ اُس سے بات کرنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر بات نہ کر سکی۔ گیرڈی نے "لوسیا لوسیا" کہہ کے بلایا۔ اُس وقت بھی وہ تھرتھرانے لگی۔ اور ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر بہ مشکل تمام بولی:۔

"لوسیا۔ میرا نام لوسیا ہے؟"

گیرڈی:۔ "لوسیا مجھے غور سے دیکھو اور میری صورت پر نظر جما دو۔"

لوسیا نے پیشانی پر ہاتھ پھرایا اور فقط "ہائے" کہہ کے چپ ہو رہی۔ گیرڈی نے کہا "بے شک تمہارا نام لوسیا ہے اور تم ولیم گیا لنڈی کی اکلوتی بیٹی ہو"

لوسیا: "گیا لنڈی۔ گیا لنڈی"

گیرڈی: "جب تمہارے والد انتقال کر چکے تو تمہارے ولی قلپ فنیری پٹا فیا میں تھے"

لوسیا: "پٹا فیا میں"

گیرڈی: "یہ قلپ تمہارے والد کے دلی دوست تھے۔ انہوں نے تمہیں اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا اور تمہاری شادی کر دی"

لوسیا: "میری شادی کر دی۔ بے شک بے شک میں نے شادی کی تھی"

گیرڈی: "لوسیا! تم اپنے شوہر کو بہت چاہتی تھیں اور وہ بھی تم پر والہ و شیدا تھا"

لوسیا: "میں اپنے شوہر کو بہت چاہتی تھی اور وہ بھی مجھ پر والہ و شیدا تھا"

گیرڈی: "تمہارا شوہر قلپ فنیری کا رشتہ دار تھا اور بجائے اس کے بیٹے کے رہتا تھا"

لوسیا: "بے شک بے شک"

گیرڈی: "بس پہچان لو لوسیا۔ پہچان لو۔ کیا تم نے اب تک مجھ کو نہ پہچانا میں اگرچہ بوڑھا ہو گیا ہوں مگر نہ اتنا کہ تمہاری آنکھیں میری صورت کو تمہارے کان میری آواز کو نہ پہچان سکیں۔ لوسیا! مجھے پہچان لو۔ میں تم سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں۔ میری نازنین بیوی! میں تمہیں بہت چاہتا ہوں اور میں ہی تمہارا پیارا شوہر مارکوئس پال جیمیری ہوں"

مارکوئس کا نام سنتے ہی لوسیا نے ایک چیخ ماری، اس کے اعضا سن پڑ گئی اور اب قریب تھا کہ وہ گر جائے مگر مارکوئس نے ہاتھوں کا سہارا دے کے تھام لیا اور گلے سے لگا کے پیشانی پر بوسے دینے لگا۔ اس منظر کے

دیکھنے سے ڈاکٹر متحیر و مبہوت ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ آسمان کی جانب بلند کر کے حیرت سے اوپر دیکھنے لگا۔

لوسیا:۔ (رکتی ہوئی آواز میں) ہاں، ہاں! تم ہی میرے پیارے شوہر ہو میں نے تمہیں پہچان لیا اور وہ گہرا غبار جو میرے حافظے پر چھا گیا تھا۔ دور ہو گیا۔ تمہارے بوسوں کی گرمی سے میری جان توانا ہو گئی۔"

مارکوئس:۔ "لوسیا! پیاری لوسیا! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آخر اس نے تم کو مجھ سے ملا دیا۔ لوسیا! سنو۔ تم نے گزشتہ زمانے میں جو جو آلام و مصائب سہے ہیں، وہ سب عنقریب بڑی بڑی مسرتوں، اور اچھی اچھی نعمتوں سے بدل جائینگی ایک قسموں سازِ بے رحم کی جنانتوں نے تمہیں ان بلاؤں میں پھنسا دیا تھا اور صعوبتوں میں ڈال رکھا تھا۔ یہاں تک کہ تمہیں جو بچہ پیدا ہوا تھا اُسے بھی تم سے چھین لیا تھا۔"

لوسیا:۔ "میرا بچہ! کیا مجھے کوئی بچہ بھی ہوا تھا؟"

مارکوئس:۔ "ہاں! ہمارا پیارا بچہ۔"

لوسیا ہچکیاں لے لے کے چھوٹ چھوٹ کے رونے لگی۔

مارکوئس:۔ (لوسیا کو پیار کر کے) لوسیا۔ اب تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں نے اپنا بچہ بھی پا لیا ہے اور اُسے بہت جلد تمہیں دکھاتا ہوں۔ انشاء اللہ تمہیں ایسی مسرتیں حاصل ہونگی جو عمر بھر بھولی نہ جائینگی۔"

ٹھیک اسی وقت حکمتِ الٰہی سے ان کے سروں پر ایک کوا آیا۔ اور "قاق قاق" کی صدا لگا کے اڑ گیا۔ اس صدا کو سن کے لوسیا بولی:۔

"غراب البین، غراب البین! ہاں ہاں! اب مجھے یاد آ گیا اب مجھے یاد آ گیا۔"

اتنا کہہ کے پھر رونے لگی۔ مارکوئس نے سمجھایا اور تسلین دینے کو کہا:۔

"لوسیا! یہ کیا رونا دھونا ہے۔ دل کو تسکین دو۔ اور استقلال سے کام لو اب مصیبتیں جاتی رہیں۔ اور مسرتیں آنے لگیں۔"

ڈاکٹر:۔ (مارکولس کی طرف بڑھ کے) جناب عالی! اب دیر ہوگئی ہے۔ مناسب ہوگا کہ آپ مکان میں تشریف لے چلیں۔"

مارکولس:۔ (مڑ کے اور حیرت سے نظر ڈال کے) جناب من معاف فرمائیے مجھے مطلق آپ کا خیال نہ رہا۔ اس غیر مترقبہ شادمانی نے آپ کو بھلا دیا کیونکہ اس وقت میری حالت ایک متوالے کی سی ہے۔ اب آپ کا مجھ پر اتنا بڑا احسان ہوگیا ہے کہ میں کبھی اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ چلیئے مکان میں چل کے بیٹھیں۔"

سب آدمی محل میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے اپنا کتب خانے والا کمرہ ان بچھڑے ہوئے میاں بیوی کی یکجائی کے لیے کھول دیا۔ اور مارکولس سے بولا "آپ تنہائی میں جی کھول کے باتیں کیجیے اور ان واقعات کو دہرائیے جو بیگم صاحبہ پر گزرے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی آپ سے ان حالات کو بیان کریں جو ان پر کسان کے گھر میں پیش آئے ہیں۔"

مارکولس نے لوسیا کے دونوں ہاتھ پکڑ کے وہ تمام حالات کہنے شروع کیے جو اس پر ابتدا سے اب تک گزرے تھے۔ ان حالات سے لوسیا کے حافظے میں نئی روشنی پیدا ہوتی گئی۔ مارکولس نے لوسیا سے بیان کیا کہ وہ جہاز جس میں یہ سوار تھا کیونکر غرق ہوا اور یہ کس طرح سے صحیح سالم نکل آیا۔ تو اب اس کے ماں و منال پر منہ جمانے کے لیے کیا کیا منصوبے عمل میں لایا۔ اور لوسیا کے پاگل ہو جانے پر اسے بیالنکور کے محل میں پانچ سال تک کس طریقے سے قید رکھا۔ وہاں اس کو جو بچہ پیدا ہوا اس کو نو برس تک کس طور پر پالتا رہا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ نہ بیان کیا کہ سلیمی اور ساڈڈ چاوری کو کیا کیا آفتیں اٹھانی پڑیں اور بالآخر وہ کس بیدردی سے مارے گئے۔ کیونکہ اسے خوف تھا کہ مبادا لوسیا کے دماغ پر پھر کوئی صدمہ پڑے اور پہلی حالت عود کر آئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۴ صحیفہ نمبر ۸

شعر کی خوبی اور اُس کی مقبولیت

فقط وہ سمع خراشی ہے۔ اُس سے کیا حاصل
ترے سخن سے نہ ہو گر دلِ بشر میں خراش

جس طرح پھول میں بو اور پھل میں ذائقہ دلذت ہوا کرتی ہے اُسی طرح شعر میں ایک کیفیتِ وجدانی ہوا کرتی ہے۔ جس سے نفوس انسانی متاثر ہوتے ہیں۔ مگر ایک ہی قسم کے دو پھول یا دو پھل (اگرچہ اُن کی صورتِ ظاہری میں بھی کچھ فرق نہ آیا ہو) اکثر رنگ و بو اور ذائقہ میں متفاوت ہوتے ہیں۔ اُسی طرح ایک ہی مضمون کے دو شعر باوجود عیوب سے پاک ہونے اور درستیٔ ظاہری کے تاثیر و تاثر میں کم و بیش ہوا کرتے ہیں شعر کسی مضمون کا کسی قسم کا ہو۔ اخلاقی ہو یا عاشقانہ۔ رندانہ ہو یا حکیمانہ

قصیدہ ہو یا ہزل۔ رباعی ہو یا غزل۔ ہم یہاں کسی خاص قسم اور مضمون کے متعلق گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ باقتضائے زمانہ ہر وقت خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ میدان کارزار میں اشعار کے ذریعہ سے تشجیع کی جاتی تھی۔ رجز پڑھی جاتی تھی۔ حسب ونسب بیان ہوتا تھا۔ ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرتا تھا۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ امرا وغیرہ کی مدح سرائی کرکے شعرا نے اُس کو ذریعۂ تقرب قرار دیا اور اُن کی قدردانی نے اور بھی ابھار دیا۔ عیش و عشرت کے جلسوں میں اُس سے نقل محفل اور معجون مفرح کا کام لیا۔ ایک وہ وقت ہے کہ نیچرل شاعری نیچرل شاعری پکار رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس بحث کو ترک کرتے ہیں۔ اور عموماً اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ شعر کسی مضمون کا ہو اُس کے اثر اور مقبولیت کے کیا اسباب ہیں اور اُس میں وہ کون سی قوت مقناطیسی ہے کہ سننے والے کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شعر سنتے ہی ہم بے ساختہ واہ وا کہنے لگتے ہیں۔ گو اُس شعر کا مضمون ہمارے مسلمات و عقاید کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے ایک بیخودی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ کونسا آلہ اور مشین ہے کہ جس کے ذریعہ سے یہ برقی قوت شعر میں داخل کیجاتی ہے۔

جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں تو بظاہر ذہن کئی باتوں کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ اول تو یہ کہ کوئی نیا مضمون ہو جو جان سخن ہے۔ یا کوئی وزن و قافیہ مخصوص ہو جس سے شعر کی صورت پیدا ہوتی ہے یا یہ کہ قواعد زبان کی اچھی طرح پابندی کی جائے جو اس صورت کا ہیولی ہے۔ یا کسی صنعت کا استعمال کیا۔ اے جو بمنزلہ زیور ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود ان تمام باتوں کے بھی اکثر شعر دلچسپ نہیں ہوتے۔ اس سے

معلوم ہوا کہ اس کے سوا کچھ اور خط و خال بھی ہیں۔ جو کہ اس صورت کو بارمنیت و زیب اور اس کا فر کو زاہد فریب بنا دیتے ہیں۔ مثلاً جسطرح ایک محبوب بمقابل دوسروں کے دلربائے عالم کہلاتا ہے گو باعتبار ظاہر اُس کے بھی وہی جسم و جان اور اعضا و جوارح اور ناک کان ہیں جو دوسروں کے ہیں مگر اس کے سوا ایک اور ادائے خاص بھی ہے جس کے سبب سے ہر شخص اُس پر فریفتہ و شیدا ہے۔

ے شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد۔ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اسی طرح شعر کا حال ہے کہ ہر شعر میں مضمون تو کچھ نہ کچھ ہوا ہی کرتا ہے اور جو اتنا بھی نہ ہو بلکہ محض وزن و قافیہ ہے تو وہ نرا زمل قافیہ ہے۔ البتہ یہ نظم تعریفِ شعر میں تو داخل ہے۔ مگر اس سے کیا حاصل۔ ے

گیرم کہ مار چوبہ کند تن بہ شکل مار کو زہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

یہ ایک جسم بیجان ہے یا صورتِ حیوان۔ اُس پر شعر کا اطلاق اُسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح مردے پر اطلاق انسان۔ ے

نہ ہر کہ داس صفت کج بود ہلال بود نہ ہر کہ مخ شیں نیستش بلال بود

ع۔ کہ جم جانے سے کچھ اولا تو گوہر ہو نہیں سکتا۔

کلام میں خوبی و اثر چاہیے۔ ے

خوبی جوہر سے پاتی ہے ہر اک شے اتیاز لعل بھی پتھر ہی ہیں لیکن وہ پتھر اور ہیں

اور اگر قواعدِ زبان کی پابندی نہ کی جائے تو ہماری زبان ہی کون سمجھیگا۔ رہی صنایع کی رعایت یہ ایک لباسِ عاریتی ہے۔ اور حلیۂ عارضی کو حسن ذاتی سے کیا علاقہ بلکہ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس زیور نے اس چاندسی صورت کو گھنا دیا اور جس قدر اس کا حسن اصلی تھا اُس کو بھی چھپا دیا۔

ے۔ تکلف سے بری ہے حسن ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
تصنع اور شے ہے۔ خوبی و جامہ زیبی اور شے بقول سوز ے
جامہ زیبوں کو تو زینت نہیں درکار اے سوز کیا ہی حاجت کوئی گل کا جو سنوارے دامن
حسین کی ایک سادگی پر ہزار بناوٹوں کو تصدق کیجیے۔ لاکھ زیوروں کا
بھی ایک زیور ہے۔ ممنون ے

بلند طبع نہ ہو محو چیز سلطانی برہنگی سر خورشید ہے تاج نورانی
اچھی چیز اچھی ہی ہے خواہ آرائش ظاہری ہو یا نہ ہو ے

والباز بازگو لو قطعت سوا یقہ والکلب کلب ولو طوقت بالذہب

اب ہم کہتے ہیں کہ وہ انداز و ادا کون سی ہے جو محبوبہ سخن کو چمنستان
مقبولیت کا گل سرسبد بنا دیتی ہے اور کلام میں جادو کا اثر پیدا کرتی ہے
وہ ادا ادائے بیان ہے وہ انداز انداز بندش اور الفاظ کی شان ہے
ان من البیان لسحرا۔ ادھر شعر زبان سے نکلا اور سامع پر جادو کا
اثر کر گیا۔ مضمون زبان سے نکلا دل میں اتر گیا جسطرح ایک شعبدہ
سحر العیون بن جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے حیرت
میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح شعر کا حال ہے کہ ایک بے اصل فرضی
مضمون بھی تھوڑی دیر کے لیے واقعیت کا جلوہ دکھانے لگتا ہے
اور شعر سے غرض بھی یہی ہے کہ ہم جو کچھ کہیں وہ دوسرے کے
دل میں اثر کرے اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ے

پہنچ سکی نہ کسی دل تلک شہید تو کیا اگرچہ تا بفلک آہ نے رسائی کی

جس کلام میں اثر ہے وہی دریائے مقصد کا گہر ہے۔ سوز ے

اپنے رونے میں گر اثر ہوتا قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا

شعر وہی ہے کہ سامع کو نہ سوچنے کی ضرورت۔ نہ غور و فکر کی
حاجت۔ ادھر صدف دہان سے یہ در بے بہا نکلا ادھر گوش سامع کا

آویزہ بن گیا۔ اور دل کے نگینے پر اُس کا نقش خوبی کندہ ہو گیا۔ ؎

تو شعر مگو کلام لایعنی را در شعر و سخن جانبود اعنی را

میر تقی میر کے شعر میں کسی لفظ کے متعلق ایک شخص نے کہا کہ حضرت یہ لفظ یوں نہیں چاہیے اُنہوں نے جواب دیا کہ بھائی لفظ کچھ ہی ہی ذرا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر دیکھ لے۔ میرے اس شعر کو لوگ مزے لے لے کر اور جھوم جھوم کر پڑھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منطقیوں کے نزدیک شعر وہ جملۂ تخیلہ ہے کہ نفس میں حالت قبض و بسط پیدا کرے۔ وزن ہو یا نہ ہو۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناموزوں شعر کہے جائیں۔ بلکہ ہمارا مقصود لطفِ سخن ہے یعنے جس میں اثر نہ ہو اُس نظم سے تو ایسی نثر بہتر ہے جو دوسرے کے دل میں اثر کرے۔ ؎

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ قبول خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

یہی ایک شے ہے کہ جس کا عامل جادو بیاں کہلاتا ہے۔ اُستادِ مسلم الثبوت کا مغز خطاب پاتا ہے۔ چار دانگ عالم میں اُس کی ایسی ہوا بندھتی ہے کہ بڑے بڑے عالموں کا اُس کے آگے چراغ گل ہو جاتا ہے نظم کرنا اور شے ہے اور ادائے بیان و لطفِ سخن اور شے ہے۔ دریا میں غوطہ تو ہر شخص کو لگا آتا ہے مگر موتی ایک آدھ ہی شخص نکال کر لاتا ہے۔ ؎

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

اس کی یہی ایک مثال ہے کہ اِس وقت آپ کے روبرو سود و سودا کے کہے ہوئے شعر ہماری تحریر میں بے تکلف زبانِ قلم سے نکل رہے ہیں حالانکہ دوسروں نے بھی ان مضامین کو بکرات و مرات کہا ہے۔ مگر وہ ایسے پھول تھے کہ کھلنے بھی نہ پائے یا کھلے ہی مرجھا گئے۔ اور یہ ایسے گل ہمیشہ بہار ہیں کہ ان تک کبھی بادِ خزاں نے بار نہ پایا۔

اُس زمانے میں نہ چھاپا تھا نہ عکس لینے کا طریقہ۔ پھر کس طرح اُن کی تصویر ہماری آنکھوں میں اور اُن کا نقش ہمارے سینوں میں اب تک محفوظ رہا۔ یہی مقبولیتِ عام کا شیرازہ تھا جو سینوں کے دفتر میں اُس کلام کی حفاظت کرتا رہا اور مقبولیتِ عام بے وجہ نہیں ہو سکتی جبتک کہ کلام میں اثر اور کوئی خوبی نہ ہو۔ اور وہ خوبی کیا ہے جو موجبِ تاثیرِ کلام ہے۔ یہی ادائے بیان ہے اسی ادا پر ہزار جانیں قربان۔ یہی ادائے بیان ہے کہ جس سے کلام میں اثر پیدا ہوتا ہے جو مقبولیتِ عام کا باعث۔ مضمون اگر بمنزلۂ جان ہے تو ادائے بیان اُس جان کیلیے بمنزلۂ عقل و شعور ہے۔ اگر عقل و شعور نہ ہو تو فاترالعقل کی زندگی بیکار ہے۔ وزن اگر شعر کی صورت ہے تو ادائے بیان اُس صورت کی چشم و ابرو اور خط و خال ہے۔ قواعد زبان کی پابندی اگر شعر کے اعضا و جوارح کا کام دیتی ہے تو ادائے بیان کو اُن اعضا کا تناسب سمجھو۔ اعضا کیسے ہی درست و صحیح ہوں جب تک اُن میں موزونیت نہ ہو کوئی خوبی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ صنائع کو اگر بمنزلۂ زیور فرض کیا جائے تو ادائے بیان کو اُس زیور کے استعمال کا سلیقہ قرار دینا چاہیے یعنے کوئی زیور ہو جس جگہ پہننا چاہیے اُسی جگہ پہنا جائے تو زیب دیگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کلام مقبول نہیں ہوتا جب تک کہ اُس میں اثر نہ پیدا ہو اور اثر جب ہی پیدا ہوتا ہے کہ اُس کی ادائے بیان درست ہو اس لیے اصلی خوبی ادائے بیان ٹھہری۔ اس کے لیے اساتذہ نے بعد تجربہ علم معانی کے قواعد مقرر کئے ہیں۔ مثلاً ایجاز اطناب انشا خبر وغیرہ جب تک ان کا برمحل استعمال نہ کیا جائے بیان درست نہیں سمجھا جاتا اور کلام میں خوبی نہیں آسکتی اور مقبول عام نہیں ہوتا اگرچہ شعر کے مقبول عام ہونے کے اسباب میں ادبائے عرب اور

حکمائے یونان اور عقلائے فرنگ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ایک آدھ کے قول کے سوا سب کے اقوال کا یہی خلاصہ ہے جو اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا گیا۔ اور ایک آدھ قول یہ ہے کہ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ شعر اعلیٰ درجہ کا ہے کہ اگر دوسری زبان میں اُس کا ترجمہ کیا جائے تو بھی اچھا معلوم ہو۔ لیکن میرے خیال میں یہ امر نوادرات سے ہے اس لیے کہ شعر کے واسطے خصوصیاتِ زبان کو بہت بڑا دخل ہے۔ مذاقِ زبان کا ایک لفظ برمحل آجانے سے شعر کے تیور کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں۔ کما لا یخفی علی من لہ ذوق سلیم۔

لمعۂ حیدرآبادی ابن حضرت شعلہ مرحوم

غزل

کہاں جائینگے بے کس بے وسیلے
ارے ظالم خبر عشاق کی لے

جو صورت اچھی دیکھی آگیا دل
نہ دیکھے ہونگے ہمسے بھی رنگیلے

یہ کس نے میرے دل میں چٹکیاں لیں
یہ کیسے پڑگئے ہیں داغ نیلے

بھلا میں جان دینے میں کروں گا
مجھے سمجھا ہے کیا تو لے ابھی لے

پیام وصل سُن کر اتنا غصہ
ہوا کیا؟ ہو گئے کیوں نیلے پیلے

وہ فرماتے ہیں کرکے وعدۂ وصل
بلا سے اور بھی کچھ روز جی لے

اُنہیں اچھی طرح سے جانتا ہوں
اڑا کا غصہ ور ضدی ہٹیلے

نہ آئے ہیں نہ آئینگے کبھی وہ
یونہیں کرتے رہینگے روز حیلے

اُبھر کر اُن کا سینہ کہہ رہا ہے
یہ نخل حسن کے پھل ہیں رسیلے

سبھی اوصاف سے موصوف ہیں وہ
حسیں نازک بدن رنگیلے سجیلے

چلیگی کچھ بھی رندوں سے نہ تیری
یہ غصہ تھوک دے اے شیخ جی لے

تجھے کس منہ سے دعوی شاعری کا
کہاں ہی عقل بالغ ہوش کی لے

تقلید بیجا

ہنر کان شرافت کا ہے جوہر ہنر دریائے عزت کا ہے گوہر
نہیں کچھ اعتبار دولت و مال کوئی دولت نہیں ہے اس سے بڑھ کر
فرنگی یا ہو رومی یا ہو چینی ہنر ہر ایک سے سیکھے ہنر ور
متاع خوش زہر دکاں کہ باشد زہر کانے کہ باشد نقرہ و زر
مگر اس کا نہیں ہرگز یہ مطلب کہ بدلیں ضع ہم اپنی سراسر
لباس عزت و غیرت کریں چاک پہن کر کوٹ ہوں جامی سے باہر
چرٹ منہ میں رہے اور پاؤں میں بوٹ عوض دستار کے ہلمٹ ہو سر پر
نہ زانوئے ادب تا ہو سکے تہ ہم اینٹھیں پتلون ایسی پہن کر
گر فتار محن ہو دست و گردن مگر نکٹی ہو کف ہو اور کالر
ہو حاصل ہم کو ایسی بد دماغی ملیں ہم عطر کے بدلے لونڈر
بھلا دیں ہم بزرگوں کے القاب پکاریں باپ کو کہکر ڈیر سر
نہیں ہے بات یہ ہرگز ضروری کریں ہم ترک ہیں جو کام بہتر
کوئی لیکر پھرے گر میم کو ساتھ نکالیں ہم بھی گھر والی کو باہر
کھلے بالوں رہیں وہ بال میں ساتھ اتاریں بیبیوں کے سر سے چادر
رہیں پردہ دری کی کوششوں میں محب قوم ہم در پردہ بن کر
کریں تقلید میں بند اپنی آنکھیں نظر رکھیں نہ کچھ نفع و ضرر پر
ہو گرمی سخت کیسی ہی بلا سے ٹوپی اوڑن مگر پہنیں مقرر
پئیں پھر وائن بھی دن میں کئی بار مزے لیلے کے مثل شیر مادر
کہ تا ہم کو بھی جنٹلمین کہیں لوگ ہوں ہم یورپ کے لوگوں کے برابر
نہ سمجھے یہ کہ کیا یورپ کیا ہند ہے بعد المشرقین ان میں سراسر
ہے اس اقلیم کی آب و ہوا سرد ہمارا ملک خط استوا پر

یہاں چلتی ہے لو واں برف باری — وہاں ہے برد کی شدت یہاں حر
ہوئے کالے تموزِ مہر سے ہم — نہ ہوں گورے لگا کر منہ پہ پوڈر
ہمیں بھر و پیا وہ جانتے ہیں — بنائیں رنگ روپ اُنکا سا بھی گر
ہے سب کو یاد اُس کوی کا قصہ — خجل تھا کبک کی جو چال چل کر
ہے مستی اور سراسر بے شعوری — بنے جمشید کوئی جام پی کر
رہے گو صورتِ آئینہ حیراں — نہ ہو آئینہ گر ہرگز سکندر
نہیں تقلیدِ کورانہ مناسب — کرے ہر کام کو انساں سمجھ کر

نہ بگڑے جس میں اپنا دین و ایماں
وہی تقلید ہے اے لمعہ بہتر

حکیم میر نوازش علی لمعہ حیدرآبادی

غزل

ترکِ اُلفت کا ارادہ قصدِ روپوشی بھی ہے — اور پھر دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہے
خود فروشی ہی نہیں یہ خود فراموشی بھی ہے — آپ کی باتوں میں گویا لطف خاموشی بھی ہے
کان میں اک بات سُن لو تاکہ دشمن تاڑ لیں — فاش گوئی بھی ہے یہ کسرِ سرگوشی بھی ہے
شیخ صاحب پی بھی لو اک بار کہہ کر یا غفور — زہد کا یہ زہر نوشی کی فراموشی بھی ہے
غیر کی خاطر سے ٹھہری ہے مری گردن زنی — یہ گرانجانی بھی ہے یارب سبکدوشی بھی ہے

قلت و کثرت ہے کیفی بات اپنے ہاتھ کی
مے نشاط افزا بھی ہے دارو بے ہوشی بھی ہے

سید رضی الدین حسن کیفی حیدرآبادی

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ

علم و تمدن کے ساتھ

(سلسلہ کیلیے دیکھو نمبر ۵ جلد ۲)

نتیجہ جب انسانوں کے لیے ہادیٔ برحق اور مرشدِ کامل نے متاعِ دنیا اور نعیم آخرت دونوں کا رشتہ باہم ملا دیا ہے اور اُن دونوں میں کسی قسم کا بیر نہیں رکھا تو جو شخص اِس ہادی اور مرشد کے احکام کی حقیقت کو سمجھیگا وہ کبھی اپنی استعداد سے فائدہ اُٹھانے اور اِس عالم کے منافع سے متمتع ہونے میں دریغ نہ کریگا۔ وہ دنیا کی سیر و سیاحت کریگا۔ وہ زمین کے ظاہری منافع پر ہی قانع نہ رہیگا۔ بلکہ اُس کے اندرونی فوائد کو بھی حاصل کریگا۔ وہ ہوا اور پانی کے کرشموں کا کھوج لگائیگا۔ اور اُن کے اسرار و غوامض کی چھان بین میں مصروف ہوگا۔ وہ ستاروں کی گردش اور اُن کی حرکات اور مداروں پر غور کریگا۔ اور اُن کے مواقع اور اُن کی استقامت و انحراف اور تغیر و تبدل سے آگاہی پیدا کریگا دنیا میں کوئی مفید علم ایسا نہ ہوگا جس کو وہ نہ سیکھ سکیگا۔ اُس کی علمی سرگرمیاں یا تو کسی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے ہونگی۔ یا کسی منفعت کو درجۂ تکمیل پر پہنچانے کے لیے۔ یا اُس لذت کو حاصل کرنے کے واسطے ہونگی جو علم میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ دین میں کوئی ایسا حکم نہ پائیگا جو اُس کو ان مشاغل سے روکتا اور ان مبارک ارادوں سے باز رکھتا ہو۔

ایک دین یہ بھی ہے اور ایک دین وہ بھی جس میں نجات ہے تو

اسی میں کہ اس عالم سے دوری اختیار کی جائے۔ اور اُس کی لذتوں اور نعمتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اور مال و دولت کو دین و ایمان کے درمیان ایک دیوار سمجھا جائے۔ جس کو ڈھائے بغیر آسمانوں کی بادشاہت مل سکتی ہی نہیں۔

مسلمان، خدا کے شکر سے اُس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس عالم کو غور و فکر سے نہ دیکھے اور اُس کے قوانین و شرایع سے واقف نہ ہووے۔ اور قدرت کے خزانوں سے مستفید اور منتفع ہونے کے لیے ہر ایک ممکن اور مناسب ذریعہ کو استعمال نہ کرے اگر وہ اس میں سستی کرے تو گویا اُس نے خدا کے شکر کو ادا کرنے میں سستی اور کہالت کی۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے اچھی طرح ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ عالم انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اُس کو عقل کے تصرف میں رکھے۔

مسلمانوں کا دین اُنہیں اُکسا اُکسا کر کہہ رہا ہے کہ بزرگی اور عزت حاصل کرنے کے لیے کوشش کرو۔ انہیں دین کی طرف سے کامل آزادی دے دی گئی ہے۔ کہ علم کو جس جگہ اور جہاں سے اور جس شخص اور جس زبان سے چاہیں سیکھیں۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ جس قوم سے وہ علم سیکھ رہے ہیں اُس کے عقاید کیا ہیں۔ اور اُس کا مذہب کیا ہے اُن کا عملدرآمد اس مقولے پر ہے کہ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدہا فھو احق بہا۔ (علم و حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے پس جہاں کہیں وہ اُس کو مل جائے وہ اُس کا حقدار ہے) خدائے تعالیٰ نے اپنی کتاب میں انہیں سمجھا دیا ہے کہ یوتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ (خدا جس کو چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی ہے اُس کو بہت بھلائی دی گئی ہے)

خدا نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کی توصیف یوں کی ہے۔ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ (یعنی مسلمان وہ ہیں جو ہر بات کو کان دھر کر سنتے ہیں اور جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں) حقیقت میں مسلمان ایسے ہی لوگ ہیں اور علم کے ساتھ (ان ہی مسلمانوں کا سلوک اچھا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے نبی برحق نے فرمایا ہے کہ اطلبوا العلم ولو بالصین۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ چین میں بھی اگر علم ہے تو مسلمان کو اس کے سیکھنے کے لیے جانا چاہیے۔ حالانکہ آنحضرت کے زمانے میں چین میں کوئی مسلمان نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں علم کے لیے اس کی کوئی قید نہیں کہ مسلمان ہو تو اس سے سیکھیں نہیں تو نہیں۔ اگرچہ اس حدیث کے سند لفظی میں کلام ہے لیکن معنوی حیثیت سے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن سے اس کے معنے کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ قرآن میں خدائے تعالیٰ نے علم اور اہل علم کی فضیلت کا بغیر کسی قید اور بغیر کسی تخصیص کے اقرار کیا ہے۔

سوائے علم کے کوئی شے ایسی نہیں جو شروع شروع میں مطلوب لغیرہ ہو۔ اور پھر رفتہ رفتہ نفس انسانی کے لیے بذاتہ لذت بن جائے ہم پہلے اہل علم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ معیشت پیدا کریں۔ یا اپنی مالی حالت درست کریں۔ یا اپنے یا اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کریں۔ لیکن بعد میں چل کر خود علم سے انسان لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے دقایق و نکات کے حل کرنے میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ خود اس کے لیے مقصود بالذات بن جاتی ہے۔ اور دوسرے تمام اغراض اس کے آگے کمزور اور ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم عقل کی جولانی کا میدان ہے اور عقل تمام قوتوں میں افضل ترین قوت ہے

پس جس طرح خدا نے اور قوتوں کے لیے کوئی نہ کوئی نعمت اور لذت عطا کی ہے اسی طرح عقل کی بھی ایک لذت پیدا کی ہے۔ بصر، سمع، شم، ذوق، لمس جتنی قوتیں ہیں اُن کی لذتوں میں حیوان بھی انسان کے ساتھ شریک ہیں۔ کیونکہ یہ قوتیں حیوان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ لذت جو اُس قوت سے پیدا ہوتی ہے جو نوع انسان کے ساتھ خاص ہے یعنی عقل اُس کے حصول سے انسان جیسا متلذذ ہوتا ہے ویسا اور کسی لذت سے نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیے مجہول اور نامعلوم بات کو معلوم کرنے سے جو لذت مل سکتی ہے وہ اُس کو کسی اور شے سے نہیں مل سکتی جب اس دنیا میں اسلام نے مسلمانوں کو میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ ہر ایک لذت سے متمتع ہونے کی اجازت دی ہے تو کیا وہ اُس کو علمی لذتوں سے محروم کریگا؟ جس طرح وہ مسلمانوں کو حصول رزق کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اُسی طرح اُنہیں علم حاصل کرنے کا حکم کرتا ہے کیونکہ ایک طرح سے علم بھی معاش کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کر چکے ہیں۔ ابتدا ابتدا میں تو وہ اور مقاصد کا آلہ اور ذریعہ سمجھ کر سیکھا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں بنفسہ مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک جلیل القدر امام نے فرمایا ہے کہ **طلبنا العلم لغیر اللہ فابی العلم ان یکون الا اللہ**۔ یعنی ہم نے علم کی تلاش غیر خدا کے لیے کی تھی لیکن علم نے انکار کیا۔ اور خدا کا ہی ہو کر رہا۔

(باقی آئندہ)

محمد عبد الباسط

تیر کی گرمی

بہت دیکھی ہے سوزِ آہِ پُرتاثیر کی گرمی
سہی برسوں شرارِ نالۂ شبگیر کی گرمی
اُٹھائی ہم نے شمعِ حسنِ پُرتنویر کی گرمی
سہی جاتی نہیں لیکن الٰہی تیر کی گرمی

پسینہ ہے کہ یہہ سیلابِ کوہِ آتش افشاں ہے
عرق کا جو ہے قطرہ وہ شرارِ سوزِ پنہاں ہے

ہوا ایسی گھٹی دم جس طرح گھٹ جائے سینے میں
حرارت کس غضب کی بڑھ گئی ہے اس مہینے میں
غذا کیسی بسر ہوتا ہے دن پانی ہی پینے میں
غضب ہے یا الٰہی یہ کوئی جنتا ہے جینے میں

اگر مرنا کوئی چاہے تو دم بھی کم نکلتا ہے
کہ دم لیتے ہوئے بیک قضا کا دم نکلتا ہے

ہوا کے گرم جھونکے پھونک دیتے ہیں جوانساں کو
جلائے دیتے ہیں تابِ تواں کو جسم کو جاں کو
نہ کوسیں کس طرح پی پی کے پانی مہرِ تاباں کو
جنابِ خضر میں سرمنڈ پی کر آبِ حیواں کو

بنا خمخانۂ ظلمات بھی حمام کی صورت
نہیں ہے اب زمانے میں کہیں آرام کی صورت

تمازت دوپہر کی ہے برنگِ گرمیٔ محشر
کہ چھپ جاتا ہے سایہ تک بھی تو زیرِ قدم آکر
نظر ڈر سے نکلتی ہی نہیں ہے آنکھ سے باہر
مگر ہاں پیاس کے مارے نکل آئی زباں گز بھر

عوض پانی کے منہ اشکوں سے ہر انسان دھوتا ہے
کہ پانی بھی تو ڈر سے سرد ہو کر برف ہوتا ہے

نکلتے ہیں شرارے دل سے ٹھنڈی سانس بھرنے میں
چڑھا جاتا ہے دم سائے کا کوٹھے سے اترنے میں
پڑے کانٹے زباں پر اس سیاں کے نظم کرنے میں
کہ آنکھوں میں تری باقی نہ اب پانی ہے جھرنے میں

خبر رہ رہ کے یہ ہر دم تہِ افلاک اڑتی ہے
جہاں دریا کی موجیں تھیں وہاں اب خاک اڑتی ہے

پریشاں گھر میں انساں ہیں تو طائر آشیانوں میں
وہاں خشکی لبوں پر ہے یہاں کانٹے زبانوں میں
حرارت آتش دوزخ کی پیدا ہی چٹانوں میں
نکلتا آگ دیپک کا ہی بلبل کے ترانوں میں
طراوت کے عوض شعلے عیاں ہیں آتش گل کے
دہک اٹھتے ہیں آتشگیر تک منقار بلبل کے

لپٹ کمبخت لوں کی شام تک جو آئی جاتی ہے
فسردہ ہوتے ہیں گل کلی مرجھائی جاتی ہے
کوئی تسکین کی صورت نہیں پائی جاتی ہے
زر صحن گلشن کی سب گرمائی جاتی ہے
شگوفے پھوٹتے ہیں اب گل نے نکلے ہیں
جو نکلے بھی تو وہ تقدیر کے پھوٹے نکلے ہیں

پرندے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں سایہ سر چھپانے کو
لگا کر آگ نکلے اپنی آشیانے کو
کچھ ایسا آتش گرمانے گھیرا ہی زمانے کو
اجل بھی ڈھونڈھتی ہی راستہ اب جی چرانے کو
لبوں تک روح آ کے پھر پلٹ جاتی ہی سینے میں
حرارت کے سبب چھٹتی ہی بن آتی ہی سینے میں

بنی ہے غنچہ پژمردہ ہر دیرو حرج کی صورت
تڑپتے ہیں دل و جاں طائر مذبوح کی صورت
بڑھی جاتی ہی شدت پیاس کی مجروح کی صورت
ہوئی خشکی میں طوفان جناب نوح کی صورت
تنور گرم ہی ملا سینۂ سوزاں بشر کا ہے
شرار اشک سے خاکستری دامن نظر کا ہی

الٰہی کس غضب کی آگ گردوں سے برستی ہے
کہ ہر دم شعلۂ نار سقر کا منہ جھلستی ہے
فزوں آتشکدے سے ہر میں ہر کاخ ہستی ہے
تری مخلوق کس کس طرح خنکی کو ترستی ہے
عوض سردی کے ہی عاشق کی آہ سرد میں گرمی
فزوں ہی آتش گلہائے تر سے ورد میں گرمی

قیامت سے فزوں دورہ ہی تپہ کی نظارت کا
نشاں سایہ کا عنقا نام تک گم ہی طراوت کا
پہاڑوں کی تپش صدقہ سورج کی تمازت کا
ستم پر ہی ستم ہی سامنا آفت پہ آفت کا
مکانوں میں کوئی راحت نہ ہی آرام ڈیروں میں

چار دن کو کیا ہم پر گئے قسمت کے پھیر دل میں
بیان سوز دل کیا ہو لب اظہار جلتے ہیں
زبان عندلیب زار سے شعلے نکلتے ہیں
مثال شمع انساں ایسے گرمی سے پگھلتے ہیں
پری کا بھی ملے سایہ تو کب ٹالے سے ٹلتے ہیں
یہی سب کی دعا ہے دور یہ شکل جلالی ہو
چمن ہو۔ ابر ہو، سبزہ ہو، فصل برشگالی ہو

محمد عبدالوہاب عندلیب حیدرآبادی

ناظر ٹپہ خانجات ضلع میدک

غزل

یہ ہے چمکا ہوا شاید کسی کی خاک مدفن کا
نہیں لے وجہ تیری طرح چمکنا تیرے دامن کا
یہ پاس ضبط تھا رک رک گئے آ آ کے آنکھوں میں
ہمارے آنسوؤں نے منہ کبھی دیکھا نہ دامن کا
وہ ٹھکرانا کسی کی قبر کو اور وہ چمک جانا
وہ تیرا دیکھنا جھک جھک کے سو سو بار دامن کا
بنا یہ ضبط کی رسوائی کا پردہ دم گریہ
بہت کچھ میری آنکھوں پر ہے احسان میرے دامن کا
خدارا ضبط مایوسی تو یہ دیکھی نہیں جاتی
کہ اشک آنکھوں میں منہ تک کو رہے ہیں دامن کا
کسی حسرت بھرے کی قبر کو ظالم نہ یوں ٹھکرا
غبار اٹھ کر کہیں بوسہ نہ لیلے تیرے دامن کا
تسلی اسکو پھیلانے نہ پائے غیر کے آگے
الٰہی پاس ہے اب تیرے ہاتھوں اسکے دامن کا

قطب الدین علی تسلی حیدرآبادی

قرضِ حسنہ

حیدرآباد کے مشہور شاعر مولوی سید رضی الدین حسن صاحب کیفی نے مجلس قرض حسنہ کے ساتویں سالانہ جلسہ کی تقریب پر جو نئی نظم سُنا کے حاضرین کو محظوظ کیا تھا وہ زیب صفحات ذیل کیجاتی ہے غالباً ناظرین ان کے خیالات، الفاظ، اشعار، کی قدر کرینگے اور اُن کے متاسفانہ لہجہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہینگے۔ اڈیٹر

آج پھر اپنے نہ رونے سے طبیعت ہے اداس
دل میں رہ رہ کے چلے آتے ہیں کیا کیا وسواس

ہائے جی کھول کے رونا بھی تو قابو میں نہیں
ورنہ کیا بات کہ آنکھوں پہ نہ آجائے اماس

بے غم و رنج کے ہنگام تولد رویا
اب غم ہر دو جہاں سے نہیں ہوتا ہے ہراس

ایک اک بات کا غم کیجے تو اتنا غم ہو
کر سکے جس کا احاطہ نہ کبھی وہم و قیاس

فکر دنیا ہے نہ اندیشۂ عقبیٰ ہم کو
اور پھر بند ہتی ہے دولت کی بھی جنت کی بھی آس

غیرت و شرم و حمیت تو رہی کوسوں دور
اب تو قسمت سے ندامت بھی پھٹکتی نہیں پاس

آہ بھی دل سے نکلتی نہیں رونا کیسا
قحط آنسو کا ہے اس درجہ بڑھا ہے افلاس

دے مجھے تھوڑے سے آنسو کوئی "قرض حسنہ"
کہ کسی طرح نکل جائے مرے دل کی بھڑاس

سود سے بھی کہیں مل جائیں تو آنسو لوں
گو ادائی کا ذریعہ نہیں کچھ بھی مرے پاس

کیونکہ اب کے علما سود کو کہتے ہیں روا
نفع اپنا ہو تو پھر کچھ بھی نہیں دین کا پاس

روپیہ بنک میں ہے سود کی امید پہ جمع
نام کو دل میں نہیں عرصہ گہ حشر کا پاس

ہائے جس قوم میں ایسے علما پیدا ہوں
کیوں نہ ہو جائے پھر اُس قوم کا سب شیرازہ اس

ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں چند خدا کے بندے
دستگیر ہمہ کس، خیر طلب، نیک اساس

مایۂ نازش اسلاف و دلیل اخلاف
جن کے ہر فرد کو کہہ سکتے ہیں ہم خیر الناس

انہیں حضرت کے قدموں سے زمیں قایم ہے
زندگی بخش دل مردہ ہیں ان کے انفاس

کوششیں کرتے ہیں بہبود خلائق کے لیے
کس سے ہی سے کبھی دل میں نہیں آتی یاس

چند احباب سے کچھ چندہ فراہم کر کے
ایک مجلس کی بنا کی ہے جواب آئی ہے راس

آج اس واسطے ہیں جمع یہاں لوگ کہ آج
ساتواں فضل الٰہی سے ہے اُس کا اجلاس

مقصد اُس کے ہیں مجموعۂ اوصاف نکو
قابل قدر ہیں ہر طرح سے وہ قدر شناس

نور ایمان سے باطن ہے منور اُن کا
ظاہر جسم پہ زیبندہ ہے تقوے کا لباس

سعی مشکور ہو دارین میں یارب اُن کی
اور ہو جائے ادا ہم پہ جو ہے حق سپاس

ہم سا ناشکرہ بھی ہوگا نہ زمانے میں کوئی
کہ منائے ہمیں گر کوئی تو ہم مانیں برا اس

لاکھ سمجھائیں سمجھتے نہیں آتا کچھ بھی
اچھے لوگوں کو بھی ہم کرتے ہیں اپنے پہ قیاس

سب کو بدظن بناتے ہیں اور ہیں خود خانہ خراب
دل ہو گندہ تو چلے آتے ہیں گندے وسواس

جن کے دل گندہ نہیں آنکھ کی پراگندہ دل
ہیں تھکاتے نہیں کب اُن کے تھکائے تھکیں حواس

منقسم دل ہیں تو کیوں ہیں ہم [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہم نے جب خالقِ مطلق کے نہ مانے احکام
اس کی غیرت نے لیا ہم پہ مسلط خناس

عطرِ اسلام کی باقی نہ رہے جب بو باس
بلکہ جاری ہو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[

ریویو

جیبیہ جنتری (قیمت ۸ر حجم ایک صفحہ) جناب محمد دستگیر صاحب خزانہ دار ضلع میدک سرکار عالی نے، یہ جنتری جس میں سنہ ۱۳۱۶ف سے سنہ ۱۳۱۶ف تک سنین فصلی درج ہیں۔ اور جو ایک سو ایک سال تک کار آمد ہو سکتی ہے۔ مرتب کی ہے اس میں تین نقشے ہیں اور مقررہ قاعدہ کو خیال میں رکھ کے ان نقشوں پر نظر ڈالنے سے تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

اگر آج کل نہ سہی تو چند سال گذر جانے کے بعد، گذشتہ تاریخیں دریافت کرنے کے لیے یہ جنتری بہت ضروری معلوم ہوگی۔ اور اس کی وقعت و ضرورت اسی وقت زیادہ ہوگی۔ قیمت کی زیادتی کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ جنتری بے شبہہ اس قابل ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہر پڑھے لکھے گھر میں کم از کم اس کا ایک نسخہ ضرور رہے۔

سنین عیسوی کی جنتری بھی اسی نمونے پر مرتب کی جائے اور اس کی قیمت واجبی رکھی جائے تو ہمارے خیال میں بہت مفید و مناسب ہوگا ہم مرتب صاحب کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ عیسوی جنتری بھی ضرور تیار کریں۔ یہ جنتری دفتر صحیفہ سے بھی مل سکتی ہے اور مرتب صاحب سے بھی۔

حالات پرگنی۔ (حجم ۴۰ صفحے قیمت ۴ر) ریاست آصفیہ کے ہر ضلع کے تفصیلی حالات عمدگی کے ساتھ اب تک نہیں مدون ہوئے ہیں۔ نہ اس ضرورت کی جانب کسی کی توجہ ہے۔ سرکاری طور پر بعض اضلاع کے گزیٹیر چھاپے گئے ہیں۔ لیکن اول تو ایسے گزیٹیر تمام اضلاع کے متعلق نہیں ہیں پھر جو کچھ بھی ہیں ان میں سے بعض انگریزی بھی ہیں۔

اس کمی کو پورا کرنے کی جانب دارالعلوم کے ہونہار طالب العلم محمد عبدالسلام صاحب نے توجہ کی ہے اور اس توجہ کا پیش خیمہ

"حالات پربھنی" کے نام سے پبلک میں نمودار ہوا ہے۔
اس رسالے میں ضلع پربھنی کی ترقی کے متعلق جو جو خیالات و ہدایات ظاہر کی گئی ہیں۔ اُن کی اہل پربھنی کو قدر کرنی چاہیے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ باشندگان پربھنی اس رسالے کو استحسان کی نگاہ سے دیکھینگے۔ اور اس کی خریداری میں حصہ لے کے مولف کی ہمت بڑھائینگے۔ یہ رسالہ دفترِ صحیفہ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

ورزش جسمانی (حجم ۴۸ صفحے قیمت ۴؍ جناب اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی، ہیڈ مولوی مڈل انگلش سکول نجیب آباد نے یہ مختصر رسالہ، ریاضتِ جسمانی کے متعلق تصنیف کیا ہے۔ ابتدائی اوراق میں طاقتِ بدنی قوتِ ارادی، ریاضتِ جسمانی وغیرہ کی بحثیں ہیں اور خاتمہ پر، ڈمبلس ڈنڈ، مگدر، لیزم، وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعد ازاں کشتی کے کچھ پیچ بھی لکھے گئے ہیں جو ناواقفانِ فن کی سمجھ میں، بغیر عمل کے مشکل ہی سے آئینگے۔

آج کل قوائے جسمانیہ کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں کے قوائے بدنیہ میں بھی انحطاط آتا چلا ہے۔ اس لیے ایسے رسالوں کا مطالعہ جو ورزشِ جسمانی کا شوق پیدا کرتے ہیں ہر مسلمان کو ضروری ہے مطالعہ سے عمل کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور عمل کے شوق پر حالتِ بدنی و قوتِ جسمانی کے درست ہونے کی امید بندھتی ہے۔

رباعیاتِ حکیم عمر خیام (حجم ۵۶ صفحے، قیمت ۴؍ جناب محمد شفیع الدین خان صاحب مراد آبادی، ممبر انیشیاٹک سوسائیٹی نے، مشہور ایرانی حکیم، عمر خیام کی ۱۷۲ رباعیاں مع مختصر حالاتِ زندگی کے

طبع کرائی ہیں۔ اور باعثِ طبع یہ لکھا ہے کہ حکیم موصوف کی رباعیوں کے جو مجموعے آج کل دستیاب ہوتے ہیں۔ اُن میں بہت سی رباعیاں دوسرے شاعروں کی بھی داخل ہو گئی ہیں۔ حالانکہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ خیام کی اصلی رباعیاں بہت کم ہیں۔ بعض انگریز مصنفین نے ایران جاکے تلاش کا حق ادا کیا ہے۔ اور اُنہی کی تلاش سے فایدہ اُٹھاکے یہ مجموعہ چھپوایا گیا ہے۔

رباعیاتِ خیام کا اس طرح پر منتخب کر کے طبع کرانا گو مفید سہی، مگر ہمارے خیال میں چنداں ضروری نہ تھا۔ اس کے بجائے کوئی اور مفید کام کیا جاتا تو بہتر تھا۔ خاصکر ایسی حالت میں جب کہ مرتب صاحب نے کوئی عمدہ اور جامع سوانح عمری بھی رباعیات کے ہمراہ نہیں الحاق کی دو ایک صفحے جو سیاہ کیے گئے ہیں وہ بھی غلطیوں اور نامربوط فقروں سے پاک نہیں ہیں۔

ٹائیٹل اگرچہ مطلا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی تیاری پر خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ مگر اس وجہ سے قابلِ اعتراض ہے کہ کتاب کا نام صرف "رباعیات" لکھا گیا ہے۔ نہ معلوم سحابی کی رباعیات ہیں یا حالی کی یا کسی اور کی۔

لکھائی چھپائی بھی معمولی ہے۔ باوجود اس کے کاتب صاحب اس کوشش بیفائدہ سے باز نہیں آئے ہیں کہ ہر ہر صفحہ کے آخر پر جلی حرفوں میں اُن کا نام یادگار رہے۔

یہ مجموعہ دفتر زمانہ کانپور کے پتہ سے مل سکیگا۔

دلسوز (حجم ۹۲ صفحے۔ قیمت ۸ر) جناب منشی محمد ضمیر حسن صاحب دل شاہجہاں پوری نے ایک انگریزی تاریخی ناول کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اُس کا نام دلسوز رکھا ہے۔ یہ ناول لکھنؤ کے مشہور رسالے "پیام یار" کے ساتھ سنہ ۱۹۰۸ء میں شایع ہوتا رہا ہے۔ زبان اس کی سلیس اور فی الجملہ صحیح ہے۔ طرز بیان بھی دلچسپ ہے مگر بعض بعض موقعوں پر ہندی بھاشا کے الفاظ آتے جاتے ہیں۔ جو بے ضرورت اور لایعنی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے استعمال سے یہ غرض تو پوری نہیں ہوسکتی کہ اصلی گفتگو کا چربہ اُتارا جائے۔ اس لیے کہ اصلی گفتگو گیارہ صدی کے پہلے اردو میں نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ ثابت ہوگیا اور جب ہم کو اردو میں فصیح و سلیس بہتر الفاظ مل سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بے ضرورت ہندی بھاشا کو اردوئے معلیٰ میں داخل کیا جائے۔

اس ناول کے مطالعہ سے ہنود کے رسوم میت وغیرہ بخوبی معلوم ہوتے ہیں اور تناسخ کے مشہور عقیدے کی نسبت بھی دلائل کا پتہ چلتا ہے۔

ناول کا پلاٹ ہندوستان کے مشہور مسلمان فاتح سلطان محمود غزنوی کے اُس حملے سے لیا گیا ہے جو سومنات کے مندر پر ہوا تھا۔ اس کے ذیل میں اُس اندرونی پراسرار زندگی کا خاکہ بھی کھینچا گیا ہے جو اس مندر کے مقدس نما پوجاریوں کی جانب سے پاک اور بے عیب دکھائی جاتی تھی۔ مگر حقیقت میں کچھ اور ہی رنگ رکھتی تھی۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس ناول کی انگریزی حقیقت کہاں تک حقیقت حال کے مطابق ہے اور وہ اشخاص جن کے دل میں سومنات اور اُس کے پوجاریوں کی وقعت ہے کہاں تک اس کو صحیح باور کرسکتے ہیں۔

ناول بہ حیثیت مجموعی دلچسپ اور پراسرار واقعات پر مشتمل ہے اور ۸ر کے مقابلے میں کچھ زیادہ گراں نہیں۔ پیام یار لکھنؤ کے دفتر سے مل سکیگا۔

رپورٹ انجمن عثمانیہ اورنگ آباد دکن:۔ دکن کا وہ مشہور شہر جو اپنی اس خصوصیت میں یگانہ ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان کی شاہنشاہی قوت کا مرکز تھا۔ دو سال سے ایک انجمن کے نشو و نما میں مصروف ہے جس کا نام "انجمن عثمانیہ" ہے۔ اس کے سال دوم کی رپورٹ ہمارے دفتر میں وصول ہوئی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کام اگرچہ ابتدائی حالت میں معمولی طور پر چل رہا ہے لیکن اس کی رفتار خوش آیند ہے۔ پانچ جلیل القدر مقامی حکام اس کے معاون ہیں اور ۷۲ اشخاص ارکان ہیں۔ سال زیر بحث میں جملہ آمدنی کی مقدار ۱۲ ہزار ہے۔ اور خرچ بھی اسی قدر ہوا ہے۔

کتب خانے میں جس قدر کتابیں ہیں ان کا اندازہ اس رپورٹ سے نہیں ہوتا۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سال گزشتہ ۲۶۱ کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔

ہم اس انجمن کی ترقی چاہتے ہوئے کارپردازان انجمن میں ہمت و استقلال پیدا ہونے کی دعا کرتے ہیں اور اس بات سے بہت خوش ہیں کہ مردہ دکن میں علمی ہلچل پیدا ہو چلی ہے۔

تحفۂ بے نظیر معروف بہ لباب براعظم ایشیا (تجم ۱۶ صفحے قیمت ۱ پائی) جناب کرم الدین صاحب ہیڈ ماسٹر ورناکلر اسکول میترانوالی ضلع سیالکوٹ نے یہ چھوٹا سا منظوم رسالہ پنجابی زبان اور اردو رسم الخط میں اس غرض سے تالیف کیا ہے کہ پنجابی دیہاتی مدارس کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے طلبا کو اس کے اشعار یاد کرنے سے ایشیا کا جغرافیہ حفظ ہو جائے۔ اس کے اشعار میں ایشیا کے حدود اربعہ، وجہ تسمیہ، ممالک، بحیرے، آبنائے، خلیجیں، راسیں، دریا، جھیلیں، پہاڑ، پیداوار، شہر، بندرگاہ، مذاہب

وغیرہ وغیرہ مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ پرائمری جماعتوں کے پنجابی طلبہ کو اس رسالے کا ازبر کر لینا غالباً مفید ہوگا۔

رہنمائے تعلیم بک ڈپو پری محل لاہور کے پتہ سے دستیاب ہو سکتا ہے

اخلاقی اور روحانی حقیقی امتحان کی تیاری (حجم ۳۲ صفحہ

قیمت ۲؍ جناب لیکھ راج صاحب مدرس اول ڈیرہ بخشیاں ضلع راولپنڈی نے یہ چھوٹا سا رسالہ تالیف کیا ہے جس میں طالب علموں کو مخاطب کر کے اس حقیقی امتحان کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ ہر شخص کو اس وقت معلوم ہوگا جب کہ عرصہ گاہِ حشر میں میزان عمل قایم کیا جائیگا۔ دراصل یہ رسالہ ایک متوسط مضمون ہے جو رسالۂ رہنمائے تعلیم لاہور کے لیے لکھا گیا تھا۔ لیکن اہم اور ضروری ہونے کے باعث، رسالہ کی شکل میں چھپوا دیا گیا۔

لایق مولف نے اس دقیق اور مشکل مضمون کو جس انداز سے طلبا کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیں بھلا معلوم ہوا۔ خشک اخلاقی اور مذہبی اصول کا سیدھے سادے پیرائے میں اس طور پر بیان کرنا کہ چھوٹے بچوں کی سمجھ سے بالاتر بھی نہ ہو، اور دلچسپ بھی معلوم ہو کسی قدر مشکل ضرور ہے۔

عبارت میں جا بجا موقع بہ موقع اردو اور فارسی عمدہ اشعار لائے گئے ہیں۔ جن سے دلچسپی اور بڑھ گئی ہے۔ "مضامین قابل تیاری" کے عنوان سے جو باتیں لکھی گئی ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے بے شبہہ اخلاقی حالت درست ہو سکتی ہے۔ خاتمہ پر "دلکشوں کی ڈبیہ" کے تحت میں چند قیمتی نصائح درج کیے گئے ہیں یہ نصائح بھی بہت مفید اور قابل حفظ ہیں۔

بہرحال رسالہ مفید اور ضروری ہے۔ اور اس لایق ہے کہ مدارس کے طلبا ضرور اسکی قدردانی کریں

تبرا اسلام مع رجم الشیاطین (حجم ۱۰۶ صفحے، قیمت ۵/) مولوی ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری اڈیٹر اخبار اہلحدیث امرتسر کی اڈیٹری میں ایک ماہواری رسالہ "مسلمان" نامی شایع ہو رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ چودھویں ہجری صدی کے نوزائیدہ مذہب آریہ سماج کے پیروں کی اُن دریدہ دہنیوں، بیجا نکتہ چینیوں، اور لغو اعتراضوں کا معقول و مدلل جواب بطرز احسن دیا جائے، جو فطرت کے سچے مذہب اسلام اور اُس کے معتقدین پر کیے جاتے ہیں۔ اس رسالے کے چار نمبر متحدہ طور پر شایع کیے گئے ہیں جن میں ایک نو آریہ دھرم پال کی دو کتابوں "نخل اسلام" اور "اساطیر الاولین" کا جواب دیا گیا ہے ان کتابوں کو اگرچہ ہم نے نہیں دیکھا لیکن اُن کے جو اقتباسات تبرا اسلام میں تردید کے مواقع پر لیے گئے ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دھرم پال کو اپنے سابقہ مذہب اسلام سے بغض للّٰہی ہے۔ وہ ایسی بدزبانی اور بیجا جسارت سے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام پاک زبان پر لاتا ہے کہ بے اختیار دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اگر آریہ مذہب میں تہذیب کا کوئی عنصر موجود ہوتا اور اس فاسد المذہب آریہ کو اُس کی ذرہ بھی ہوا چھو جاتی تو وہ ایک ایسے ہادیٔ برحق کی شان میں جس کے آستانۂ مقدس کی خاکروبی کو کروڑوں مسلمان اپنی نجات کا موجب سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے بیہودہ اور دل آزار الفاظ کبھی نہ استعمال کرتا۔ اس کی تحریریں بے شبہہ اس لائق ہیں کہ اُن کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے۔ اور ع

کلوخ انداز را پاداش سنگ است کا معاملہ برتا جائے۔ لیکن پاک مذہب اسلام کی سچی تعلیم اس برتاؤ سے باز رکھتی ہے۔ اور اُس کے اقتضا سے کوئی شریف مسلمان اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اپنی زبان پر ایسے کلمات جاری کرے جن میں لغویت اور بیہودگی کی بو ہو یہی وجہ ہے

کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے اس آریہ کے بیہودہ حملوں کا جواب، نہایت متانت و ثقاہت سے اس طور پر دیا ہے جس کو دیکھ کے کوئی شریف و مہذب داد دیئے بغیر نہ رہیگا۔

لیکن جس شخص کی آنکھوں پر ضلالت کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور جو ایک مرتبہ چشمۂ اسلام کا پانی پینے کے بعد، گمراہی کے گندے گڑھے میں خود بخود گر پڑا ہے اس کو ان ہدایات سے کیا نفع پہنچ سکتا ہے۔

اگر اس میں عقل سلیم ہوتی اور وہ چشم بصیرت سے اصول اسلام کا مطالعہ کرتا تو مرتد ہی کیوں ہوتا؟ اس کی حالت تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ جو کچھ کہتا یا لکھتا ہے دوسری مرتبہ اس کے خلاف بکنے لگتا ہے۔ **شاک فی انہ شاک**۔ اس کے خیالات میں نہ کسی قسم کا وثوق ہے۔ نہ کسی طرح کی راستی۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کی کوششیں جو انہوں نے اسلام کی جانب سے مدافعت کرنے میں صرف کی ہیں بے شبہ لائق تحسین ہیں۔ مگر ہمیں ایسے مرتدوں کے مقابلے میں ان کے کامیاب ہونے کی بہت کم امید ہے۔

صلائے عام دہلی (حجم ۴۰ صفحے ماہانہ قیمت سے سالانہ) یہ ماہواری رسالہ جناب [illegible] خان صاحب بہادر کی ایڈیٹری میں تقریباً ڈیڑھ سال سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو بولنے والوں کو صحیح و فصیح مکالمی زبان کی طرف توجہ دلائے اور آج کل کی اخباری اردو میں جو جو غلطیاں پیدا ہو گئیں اور ہوتی چلی ہیں ان کو رفع کرنے کی کوشش کرے۔ علاوہ بریں عام علمی و تاریخی مباحث پر بھی روشنی ڈالے۔

اس کے مضامین پڑھنے سے خاص قسم کا لطفِ زبان حاصل ہوتا ہے

اور بار بار پڑھ کے مزہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ اس رسالے کی زبان اور اس کے مضامین کسی اور رسالے میں نہیں پائے جاتے۔ اسی کے ساتھ خاص میں اگر اردو خوان اصحاب ایسے رسالوں کی قدر نہ کریں تو بڑے افسوس کا مقام ہوگا۔ اور صحیح اردو کی زندگی خطرے میں پڑ جائیگی ہم تعلیم یافتہ طبقہ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ضرور اس رسالے کو قدر کی نگاہ سے دیکھیگا۔ اور اڈیٹر صاحب کی کوششوں کی داد دیگا۔

اڈیٹوریل

خلافت کا خاتمہ:۔ وہ عظیم الشان ترکی انقلاب جس نے پچھلے تیرہ تمام اسلامی دنیا میں قیامت مچادی۔ تمام مسلمانوں میں ہلچل ڈالدی۔ تمام مغرور و سرکش سلاطین و رؤسا کو خوفناک عبرت دے دی۔ ایسا معمولی اور کم حیثیت جس کا اثر سالہا سال تک مسلمانوں کے دلوں پر باقی رہے۔

معزول سلطان عبدالحمید خان ثانی سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو خاص عقیدت تھی۔ جب انہیں سلطان موصوف کی معزولی کی المناک و متوحش خبریں پہونچیں تو ان کا صبر و قرار جاتا رہا۔ ہزاروں مسلمانوں کو اس حادثہ نے خون کے آنسو رلائے اور کروڑوں کو ملول و مغموم کر دیا۔

ہم کو اس سے بحث نہیں کہ یہ انقلاب مفید ہوا یا مضر لیکن اتنا ضرور محسوس ہو رہا ہے کہ شخصی حکومت کی حالت میں سلاطین ترکی کو بحیثیت خلیفۃ المسلمین ہونے کے جو عزت و وقعت حاصل رہتی تھی وہ شاید اب پارلیمنٹ کے دورے میں نصیب نہ ہو۔

اس انقلاب عظیم کے متعلق آئندہ نمبر میں بعض مضمون درج کیے جائینگے اور اسی نمبر میں اس مسئلے پر پوری روشنی ڈالی جائیگی۔ کیونکہ اس پرچہ میں گنجائش نہیں رہی۔

نصاب دار العلوم: سنا گیا ہے کہ دکن کے اس مشرقی کالج کا نصاب، جو پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہونے کے بعد، بلحاظ نصاب کے عالم فشار میں پھنسا ہوا تھا، تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور پنٹیگاہ سرکار سے منظور بھی ہو گیا۔

اس نصاب کی تیاری کے لیے شمس العلما مولوی شبلی نعمانی لکھنؤ سے طلب کیے گئے تھے اور حیدر آباد کے ممتاز علما کی ایک کمیٹی منعقد کی گئی تھی جس میں دار العلوم کے واجب التعظیم اساتذہ بھی شریک تھے۔ ان میں سے مولانا مولوی سید نادر الدین صاحب پروفیسر معقولات، اور مولانا مولوی محمد عبد القدیر صاحب صدیقی پروفیسر ادب و متفرقات نے اپنی اپنی رپورٹیں مستقل طور پر تحریر فرمائی تھیں۔ یہ رپورٹیں باستثنا بعض جزئیات کے نہایت مبسوط و مکمل تھیں۔ اور خاصکر اس وجہ سے قابل لحاظ تھیں کہ اُن میں تجربہ کا عنصر شامل تھا۔ غالباً ان رپورٹوں سے تیاری نصاب میں کافی مدد ملی ہوگی۔

سنا ہے کہ تحتانی تعلیم کے لیے چھے سال رکھے گئے ہیں۔ شاخ فارسی کے لیے پانچ سال، شاخ عربی کے لیے چھے سال، ان تمام مراحل کو طے کرنے کے بعد درجۂ تکمیل باقی رہتا ہے۔ اس کی مدت معین نہیں کی گئی ہے۔ اگر فرضی طور پر دو سال ہی رکھی جائے۔ تو ابتدا سے انتہا تک ۱۹ سال کی تعلیم ہوئی اگر سات سال کا لڑکا داخل مدرسہ ہوا اور کسی جماعت میں ناکام ہوئے بغیر تعلیم پاتا رہا تو جس وقت وہ فارغ ہو کے باہر نکلیگا۔ اس کی عمر بہ نہم کے ۲۶ سال گذر چکے ہونگے۔ اور اگر وہ دو ایک جماعتوں میں فیل ہو گیا تو اس کی عمر کا ۲۹ و ۳۰ سال تک پہنچ جانا کچھ بھی بعید نہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی مدت تک تعلیم پانے سے نہ اس کے قویٰ درست رہینگے نہ اس کو کار و بار زندگی کا کافی حصہ مل سکیگا۔ بلکہ اکثروں کو تو

اتنے طویل عرصہ تک ماں باپ کے گھر روٹی بھی میسر نہ آئیگی تو اخراجات تعلیم کیونکر فراہم ہونگے۔

نصاب کے اندرونی اثر کا مفید یا غیر مفید ہونا تو تجربہ پر موقوف ہے اس کی نسبت کوئی رائے نہیں لگائی جاسکتی۔ لیکن مدت کی نسبت بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت طویل ہے۔ اور اس میں گھٹانے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کمیٹی کے کثیر التعداد ارکان نے اس عرصۂ مدید کو درست اور قابل منظوری تصور فرمایا۔ اور تجربہ کاروں نے بھی اس پر سکوت اختیار کرلیا؟

انجمن معین المسلمین

دبیرپورہ حیدرآباد دکن بسکار و باز زندگی کو چلانے کے لیے ہر فرد بشر کبھی نہ کبھی دوسروں کی اعانت کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ فطرت نے اس کے تمدن کا مدار معاونت باہمی پر رکھا ہے یہ احتیاج مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ معمولی ضرورتوں کی احتیاج تو جوں توں رفع ہوجاتی ہے۔ مگر روپیہ کی احتیاج جس کو اُمّ الضروریات کہنا روا ہے۔ بڑی مشکل سے دور ہوتی ہے۔ بلکہ کوئی معقول معاوضہ دیئے بغیر اس کا پورا کرلینا شاذ و نادر کے حکم میں داخل ہے۔

مسلمانوں کے فضول رسم و رواج اور بے اندازہ اسراف تبذیر کی موروثی عادت نے اُن کے نخل دولت میں کیڑا لگا رکھا ہے جس کی بدولت انہیں قرض لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ قرض کی بلا ایسی عامۃ الورود ہے جس سے نی صدی دو مسلمان بمشکل بچتے ہونگے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس بلا نے مسلمانوں کی جائداد و املاک اور اور اشیائے مرہونہ کو صرف سود کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اور اصل کا بار و بسیاہی بلا کم و کاست سر پر پڑا رہا۔ سینکڑوں ہزاروں اشخاص اس کے ہاتھوں

تباہ ہوئے۔ ہزاروں لاکھوں گھر اس کے کارن اُجڑ گئے۔ کسی کو اس سے بچنے بچانے کا خیال نہ پیدا ہوتا تھا۔

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے محبوب البلاد شہر میں، ایک انجمن بنام "انجمن معین المسلمین" تقریباً سات سال سے قایم ہے جس کی غرض یہ ہے کہ اس کے شرکا کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً اشیائے تقریٔ وطلائی رہن لے کے بلا سودی قرض دیا جائے

اس انجمن نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں سد ہا مسلمانوں کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے اور انشاء اللہ آیندہ بھی کرتی رہیگی۔

زیادہ خوشی اس بات پر ہے کہ مشایخین کا طبقہ، جس کی نسبت بعض خیالات یہ تھے کہ وہ بالکل ناکارہ اور ضرر رساں ہے۔ اور سوائے مفت کے نذرانے اینٹھنے اور مریدوں کو گمراہ کرنے کے کچھ نہیں جانتا، وہ بھی اب بگڑی قوم کو سدھارنے کی طرف ملتفت ہوا ہے۔

چنانچہ اس انجمن کے بانی اور معتمد، جو گویا اس کے روح رواں ہیں اور جن کی پُرزور کوششوں سے یہ انجمن سرگرمی سے چل رہی ہے بلدہ کے مشایخ عظام میں سے ہیں۔ علاوہ بریں عالم متبحر ہیں اور علم کے ساتھ عمل بھی رکھتے ہیں۔

سنہ ۱۳۲۰ف میں اس انجمن کی بنیاد قایم ہوئی۔ سنہ ۲۶ف تک جو چندۂ اعانتی اس میں جمع ہوا اس کی مقدار "ما وعدہ" ہے جو اشخاص اس اثنا میں قرض بے سود سے مستفید ہوئے ان کا شمار ۵۲۰ تک پہنچا ہے۔ اور ان کے رقم قرضہ کی مقدار "ما وعدہ"۔

یہ اعداد نہایت مسرت آور، اور خوش آیند ہیں۔ اور امید دلاتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اس کی جانب توجہ کی اور کارپردازوں نے اس کو سرگرمی سے چلاتے رہنے میں ہمت نہ ہاری تو یہ انجمن آگے چل کر،

ایسا بڑا قومی بنک بن جائیگی جس کی نظیر سے بلادِ اسلامیہ خالی ہونگے۔
اس کے قواعد وضوابط شہر کا کو مفت اور غیر شہر کا کو اردینے پر ملتے ہیں ہم تمام مسلمانان حیدرآباد سے خصوصاً اور مسلمانان دکن سے عموماً اس بات کی پُرزور تحریک کرتے ہیں کہ وہ اس انجمن کی شرکت سے نہ صرف اپنی اور اپنے بھائیوں کی بہبودی کے اسباب فراہم کریں بلکہ ایک ایسی قومی بنیک کی بنیاد مستحکم کریں جو آیندہ زمانے میں دکن سے سود کا رواج مٹا دیگا اور ہر قسم کے مالی نقصانات کی بیخ کنی کردیگا۔

انجمن ترقی اردو حیدرآباد: تخمیناً دو سال کے پہلے اس انجمن کے قیام کی مسرت انگیز خبر ہمارے گوشگزار ہوئی تھی۔ اُس کے بعد اس کی زندگی کی خبریں اس طرح سنائی دیتی رہیں جن سے کوئی شگفتگی نہیں پیدا ہوئی۔ حال میں مقامی روزانہ اخبار کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کا ایک انتظامی جلسہ مسٹر حیدری بی اے معتمد فینانس کے دولت کدے پر منعقد ہوا تھا۔
یہ وہ انجمن ہے جس کے سر پر ابتدا ہی سے اقبال نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ یعنے خداوندان اقدس واعلیٰ کی سراپا خیر و برکت سرپرستی کا شرف اس کی آیندہ ترقی و کامیابی کا کفیل ہوگیا تھا۔ اور اس کے ہر دیکھنے والے کو یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ اب چمنستان اُردو میں بہار آجائیگی۔ اور وہ بے بضاعتی و کم مایگی کے اعتراضات کی مخالف ہواؤں سے بے خطر ہو جائیگا۔ لیکن اس وقت تک اس کی جو رفتار رہی ہے وہ دل خوش کن نہیں۔ اور وہ اس بات کا یقین نہیں دلاتی کہ انجمن کی آیندہ زندگی کامیاب ثابت ہوگی۔
چونکہ اس انجمن کے ارکان اعزازی و انتظامی میں یہاں کے

جلیل القدر اور صاحب اثر حکام وقت بھی داخل ہیں جن کے اقبال کے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ اور جن کی محض شرکت ہی اس کی کامیابی اور فیروزمندی کی ضامن ہے۔ اس لیے ہم اس کے کارپردازوں کی توجہ کو عملیات کی جانب منعطف کراتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس کے عملی نتائج کو پبلک میں پیش کرنے کی طرف التفات فرمائینگے۔

عثمانیہ ریڈنگ روم انڈ لائبریری چارمنار حیدرآباد دکن

یہ لائبریری چند سال سے نامِ شہر میں قایم ہے اور اس کے سالانہ جلسے اس کی زندگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ماہواری جلسے منعقد کرتی رہے اور کتب علمی و ذخیرہ ترقی کو فراہم کرے۔

حال میں اس نے ایک اپیل شایع کی ہے جس میں ابنائے ملک سے پانچسو کتابوں کے عطیہ کی استدعا کی گئی ہے۔ مصنفین، مولفین مترجمین، وغیرہ ارباب قلم سے اُن کی تصنیفیں اور کتابیں بطور خاص مانگی گئی ہیں۔ چونکہ لائبریری کا مقصد علمی اور فائدہ رسال ہے اور وہ حیدرآباد کے ایسے عظیم الشان و فیاض شہر میں واقع ہے۔ اس لیئے اس کو اپنی اپیل کا جواب کامیابی کے الفاظ میں پانا کچھ بعید نہیں صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر علمدوست باندازِ کانوں تک اس کی صدائے سوال پہنچ جائے۔

ہم اپنے علم پسند ناظرین سے امید کرتے ہیں کہ وہ اس لائبریری کے سرمایہ علمی کو زیادہ کرنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور دینگے۔

اڈیٹر

مارکوئس نے لوسیا کو اس امر کی اطلاع ضروری کہ رات کے وقت ان بدمعاشوں نے اُس کو گاڑی میں سوار کر کے ایک رستے کے کنارے پہنچا دیا اور وہاں اُسے تنہا بٹھا کے چلے گئے۔ لوسیا تھوڑے تامل کے بعد بولی:۔ "میرا حافظہ مجھے بتاتا ہے کہ اُنہوں نے مجھ کو ایک گھنی جھاڑی میں لا کے چھوڑ دیا تھا۔ وہاں مجھے بڑا خوف معلوم ہونے لگا۔ پھر مجھ پر ایک خود رفتگی سی طاری ہو گئی۔ اور میں مدت تک گمنام زندگی بسر کرتی رہی۔ اس بیہوشی کی نیند میں مجھ پر عقل کی روشنی چمکی اور نور فہم درخشاں ہوا۔ مجھے اپنے گزشتہ حالات یاد آئے۔ اور تمام عقلی قوتیں بحال ہوئیں گویا میں اُسی وقت پیدا ہوئی۔ مگر حافظہ کی حالت نہ بدلی ۔۔۔۔۔ آہ پیارے پال! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ابھی قبر سے نکلی ہوں۔ یا پہلے مر گئی تھی۔ اب زندہ ہو گئی ہوں۔ میرے دل میں اگلی محبت عود کر آئی ہے۔ اور اُس میں ایک اور محبت کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ جس کی قدر و قیمت سے اب تک میں ناواقف تھی یہ محبت محبت مادری ہے۔ پس مجھ سے بیان کرو کہ تم نے میرے بچے کو کہاں اور کیونکر پایا۔ اور اس اثنا میں اُس پر کیا کیا سختیاں گزریں؟"

مارکوئس: "لوسیا! میں آج تم سے جس قدر بیان کر چکا ہوں۔ وہی کافی ہے آئندہ فرصت کے وقت پورے حالات بیان کرونگا۔"

لوسیا: "میرا بچہ اس وقت تک جوان ہو گیا ہو گا۔ کیا وہ تم سا ہی حسین و خوشرو ہے؟"

مارکوئس: "ہاں! مگر اُس میں تمہاری شباہت زیادہ پائی جاتی ہے۔"

لوسیا: "اور وہ آج کل ہے کہاں؟"

مارکوئس: "پیرس میں۔"

لوسیا: "آہا! ہم سے بہت قریب ہے۔ میرے اچھے پال! تم مجھ کو اُس سے کب ملاؤ گے؟"

مارکوئس: "پیاری! میں آج ہی تم کو اُس سے ملا دونگا۔"

اس نوید مسرت کو سن کے بے اختیار لوسیا کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کے چپ ہو گئی۔

اس وقت ڈاکٹر نے آ کے دونوں کو ناشتے کے لیے بلایا۔ اور وہ اس کے ساتھ ہو لیے چلتے ہوئے مارکوئس نے ایک نوکر کو حکم دیا۔ کہ گاڑی لے کے پیرس کو جائے اور جنگلی انسان کو ساتھ لوائے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کے مارکوئس اور لوسیا، باغ میں ٹہلنے لگے۔ مارکوئس نے لوسیا سے بیان کیا۔ کہ اس کے بیٹے نے بیالنکور والے محل میں تین مرتبہ سوراخوں میں سے اسے دیکھا تھا۔ اور پہچان گیا تھا۔ یہ سن کے لوسیا بولی۔

"کیا وہ اب بھی مجھے دیکھ کے پہچان لیگا؟"

مارکوئس: "ہاں کچھ عجب نہیں کیونکہ اس نے غضب کا حافظہ پایا ہے لیکن پھر بھی ہم امتحان کر کے دیکھینگے کہ پہچانتا ہے یا نہیں۔ اب اس کے آنے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ تم جا کے صحن میں بیٹھ جاؤ۔ اور اس کا انتظار کرتی رہو۔"

مارکوئس کے کہنے سے لوسیا صحن میں جا کے بیٹھ گئی۔ پانچ منٹ کے بعد گاڑی آئی۔ جنگلی انسان مکان میں داخل ہوا۔ مارکوئس اس کے لینے کو آگے بڑھا۔ اور لے جا کے کتب خانے والے کمرے میں بٹھا دیا جنگلی انسان کہنے لگا "آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا میں حاضر ہو گیا۔ فرمایئے کیا خبریں ہیں؟"

مارکوئس: "کچھ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم سب کو آج شام کی دعوت دی ہے۔ اس لیے میں نے تمہیں اطلاع دی۔ تم ادھر صحن کی طرف چلو میں جا کے انہیں خبر کیے دیتا ہوں۔"

مارکوئس کے اس حکم کی تعمیل کو جنگلی انسان اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کے صحن کا رخ کیا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی اسے نظر آیا کہ ایک عورت

جس پر خود رفتگی کا سا عالم طاری ہے۔ بچوں بیچ صحن میں کھڑی ہوئی ہے یہ دیکھتے ہی وہ متحیر ہو کے دو قدم پیچھے ہٹا۔ بخلاف اس کے عورت جس کا دل دھڑک رہا تھا۔ پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور رنگ اُڑا جا رہا تھا۔ اُس کی طرف دو قدم اور بڑھ آئی۔ اِس منظر کو دیکھ کے جنگلی انسان پر بھی خود فراموشی چھا گئی۔ اُس کی حرکتِ قلبی تیز ہو گئی۔ اور وہ گویا ایک خواب سا دیکھنے لگا لوسیا نے دبی ہوئی آواز میں اُس کو "ہینی" کہہ کے پکارا۔ یہ سُن کے اُسکی بیقراری اور بڑھ گئی۔ اُس کے تخیلہ میں وہ صورت پھر گئی جس کو اُس نے بیالنکور کے محل میں دروازے کی درزوں میں سے دیکھا تھا۔ وہ فوراً پہچان گیا۔ اور فرطِ مسرت سے چیخ اُٹھا "وہ تمہیں ہو تمہیں۔ میں نے تم کو پہچان لیا۔ میری اماں! میری پیاری اماں"

اِس وقت لوسیا نے روتے ہوئے اور "میرے پیارے بچے" کہتے ہوئے اپنے آپ کو جنگلی انسان پر گرا دیا۔ + + + + + + + + + + +

اِن دونوں بچھڑے ہوؤں کے گلے دیر تک باہم ملے رہے۔ جنگلی انسان کی زبان سے فقط "میری اماں" نکلتا تھا۔ اور لوسیا کے مُنہ سے صرف "میرے بچے"

اِس اثنا میں ڈاکٹر اور مارکوئس بھی پہنچ گئے تھے۔ اور دروازے کی آڑ لے کے اِس پر لطف و موثر سین کا نظارہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مارکوئس آگے بڑھا اور متین و سکون آمیز آواز میں بولا "ہینی! اب میری طرف متوجہ ہو جاؤ اور واقعہ کی حقیقت سنو۔ ہمیں اِس بات کا انتظار کرتے ہوئے ایک طویل مدت گزر چکی ہے کہ کوئی مناسب موقع پا کے تمہیں واقعہ کی اصلیت سے مطلع کریں۔ آج ہمارے محسن دوست ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے ہمیں یہ مبارک موقع مل گیا۔ پس تمہیں معلوم کرنا چاہیے کہ اِس وقت تم اپنے ماں باپ کے روبرو کھڑے ہوئے ہو۔ ماں کو تو پہچان

ہی چکے ہو۔ باپ کو بھی جان لو جو تم سے واقعات بیان کر رہا ہے۔"

اس تقریر کو سُن کے وہ تمام جذبات درد و محبت جو نوجوان بیٹے کے سینے میں موجزن تھے باہر نکل پڑے۔ اُس نے بڑے زور کی ایک چیخ ماری اور اپنے آپ کو مارکوئس کے ہاتھوں پر ڈال دیا۔ اُس کی حالت مارے خوشی کے شادی مرگ تک پہنچ گئی تھی۔ دیر کے بعد جب کچھ حالت سنبھلی تو اُس نے کہا: "میں عرصے سے خیال کر رہا تھا۔ کہ آپ ہی سے میری نسبت ابنیت وابستہ ہو گی۔ لیکن مجھے اپنے دلی راز کے اظہار کی جرأت نہ پڑتی تھی شکر ہے کہ آج یہ خلش رفع ہو گئی۔"

ڈاکٹر نے ان تینوں کو اپنی مسرتوں کے مزے لینے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ مارکوئس ایک کرسی لے کے بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے بازو لوسیا تھی۔ لوسیا کے بازو اُس کا بیٹا بیٹھا تھا۔ مارکوئس نے بینی سے کہا: "بیٹا! میں نے ابھی تم سے تمام باتیں نہیں کہیں۔ نہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ تمہارے باپ کا اصلی نام کیا ہے۔ اور وہ کیا اعزاز و رتبہ رکھتا ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ جب تک وقت نہ آئے۔ تم مجھے گزشتہ نام ہی سے یاد کرتے رہو۔"

اس کے بعد رائے قرار پائی کہ تا اطلاع ثانی، مارشنس لوسیا ڈاکٹر کے ہاں رہے اور یہ دونوں اُس سے ملنے کو وقتاً فوقتاً آتے رہیں۔

دوسرے دن باپ بیٹے مل کے گاڑی میں بیٹھے اور پیرس سدھارے۔

پندرھواں باب

ایک خاص دعوت

اب ہمارا روئے سخن اُس گفتگو کے سیاق کی جانب رجوع ہوتا ہے جو نواب، نواب بیگم، کرنیل گیرڈی، پیٹیرز گسٹری، اور باقی اُن لوگوں کے درمیان دائر ہوئی تھی۔ جس پر اس ناول کا مدار ہے۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ نواب نے اپنی بیوی کے پاس ایک خط دھمکیوں سے بھرا ہوا بھیجا تھا اور اُس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا جب یہ خط نواب بیگم کی نظر سے گزرا۔ وہ فوراً کرنیل گیرڈی کے پاس دوڑی ہوئی آئی۔ اور اُس کو مضمون خط سے مطلع کر کے معاملے کی نسبت مشورت لینے لگی۔ گیرڈی نے جواب دیا "میری دانست میں رائے صائب یہ ہے کہ آپ نواب کو قطعاً کوئی جواب نہ دیں۔ اور فتنۂ خوابیدہ کو جگانے کی کوشش نہ کریں"

نواب بیگم "مگر جناب اُس وقت تک ملکہ کا کیا حال ہوگا؟"

گیرڈی "ملکہ کی جانب سے بالکل اطمینان رکھیے اور یہ تصور کیجیے کہ وہ آپ ہی کے گھر میں ہے"

یہ جواب پاکے اور گیرڈی کے وعدوں پر بھروسہ کر کے نواب بیگم خوشنود واپس آئی۔ گیرڈی اُسی وقت گاڑی میں سوار ہو کے پیٹیرز سے ملنے کو گیا۔ پیٹیرز بڑی تکریم سے ملا اور تواضع سے پیش آیا اور کہنے لگا "کل رات کو مسٹر فلینی نے کہا تھا کہ آج آپ کی ملاقات سے مجھے شرف حاصل ہوگا۔ شکر ہے کہ اُن کا قول درست نکلا"

گیرڈی :۔ "مجھے اس کے پیشتر آپ کی خدمت میں نیاز نہیں حاصل تھا لہذا مجھے ضرور تھا کہ قبل از قبل اپنے حاضر ہونے کی آپ کو خبر دے دیتا۔"

پیٹیر :۔ "آپ کا تشریف لانا میری عزت افزائی کا موجب اور خیر و برکت کا باعث ہے۔ غریب خانے کے دروازے ہر وقت آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ سے نیاز حاصل ہونے کو میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں آپ نہ صرف اپنی عالی طبعی کے لحاظ سے بزرگِ خلایق ہیں۔ بلکہ اخلاق و مروت کے اعتبار سے مشہور آفاق اور دولت و جاہ کی رو سے زباں زدِ عام و خاص ہیں۔ آپ اپنی دولت کو ایسے مفید و خیر رساں کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے بہتر کام تصور میں نہیں آ سکتے۔ میرے ہاں بھی خدا کا دیا بہت کچھ موجود ہے۔ لیکن مجھے نفع بخشی کے وہ مصرف نہیں معلوم جن سے آپ فایدہ اُٹھایا کرتے ہیں۔"

گیرڈی :۔ "آپ نے میری تعریف کی پینگ اتنی بڑھا دی ہے کہ مجھے خواہ مخواہ شرمساری ہو رہی ہے۔ انسان اگر دل سے چاہے تو خلایق کے کارہائے خیر میں روپیہ خرچ کرنا اُسے کچھ مشکل نہیں ہے۔"

پیٹیر :۔ "خلق اللہ کے دل میں آپ کی جو عزت و احترام ہے۔ اُس کی روایتیں میرے پاس کامل وثوق کے ساتھ پہنچی ہیں۔ اور اس وقت ذاتی تجربہ سے خود مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ میں کوئی ایسی مقناطیسی قوت ہے جس کی کشش ہر اُس شخص کی قوتوں کو آپ کی طرف مایل کر دیتی ہے جو آپ سے ملاقات کرتا ہے۔"

گیرڈی :۔ "میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ سے میرا رشتۂ مودت مستحکم ہو گیا۔ اس بنیاد پر میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ اُس شخص سے بھی پیمانِ اُلفت محکم کریں جس کا میں معین و یادر ہوں اور جس کا نام "جنگلی انسان" ہے۔"

پیٹیر:۔ "جناب کی دوستی کی بدولت مجھ پر فرض عین ہے کہ اُس کے ساتھ بھی طبعاً میری دوستی قایم ہو۔"

گیرڈی:۔ "یہ شخص امروز فردا میں اپنے اُس رتبۂ رفیع کو حاصل کر لیگا جس کو دغا پردازوں نے اُس سے چھین لیا تھا۔ دولت کی جانب سے اُسے بالکل بے فکری ہے۔ وہ عنقریب بڑی بھاری ثروت کا مالک و قابض ہونے والا ہے۔ البتہ چند یاران باصفا کی اُس کو سخت ضرورت ہے۔ اس لیے مجھے آپ کو تکلیف دینی پڑی۔"

پیٹیر:۔ "میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ مجھے ایک نیا دوست دے رہے ہیں۔"

گیرڈی:۔ "اس کے سوا مجھے بعض اور اُمور میں بھی آپ کی عنایت سے فایدہ اُٹھانا ہے۔"

پیٹیر:۔ "میں آپ کے حلقۂ ارادت کا اسیر اور آپ کا فرماں پذیر ہوں۔"

گیرڈی:۔ "میری خواہش ہے کہ جنگلی انسان سے لوگوں کی معرفی و ملاقات اس شہ نشین کے سوا جس پر ہم بیٹھے ہوئے ہیں اور کہیں نہ ہو۔ مگر اس مطلب کے لیے ضرور ہوگا کہ آپ مجھے اور میرے بعض دوستوں کو جنھیں میں نے اپنے جی میں ٹھان رکھا ہے پرسوں دعوت دیں۔ اس دعوت میں مسٹر فلینی بھی شریک رہینگے۔ اور اس موقع پر میری وہ رام کہانی جو کم از کم دو گھنٹے ضایع کریگی حاضرین کو سنائی جائیگی۔"

پیٹیر:۔ "بہت بہتر! میں بسر و چشم حاضر ہوں۔"

گیرڈی:۔ "میری ایک اور بھی استدعا ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس دعوت میں نواب صاحب کو ضرور شریک کریں۔ اُن ہی کی شرکت سب سے زیادہ اہم ہے۔ اور اُن ہی کے بلانے کو میں نے آپ سے دعوت کی درخواست کی ہے۔ آپ کی دعوت قبول کرنے میں اُنہیں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔"

پیٹیر:۔ "اگر بالفرض انہیں تامل ہوا۔ اور وہ شریک جلسہ نہو سکے تو ـــ"

گیرڈی :۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اُن کا حاضر ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق انہیں تامل بھی ہوا تو آپ کا اپنے احسانات کو یاد دلا دینا کافی ہوگا۔ خاصکر اس اغماض کا جو ایک لاکھ کا نوٹ چُراتے وقت آپ سے ظاہر ہوا تھا۔"

پیٹر :۔ "تعجب ہے کہ آپ کو اس کا علم کیسے ہوگیا؟"

گیرڈی :۔ "آپ تعجب نہ فرمائیے عنقریب آپ کو تمام حالات معلوم ہوجائینگے میں یہ بھی گزارش کرتا ہوں کہ آپ اس جلسہ میں ان لوگوں کے سوا جو میرے اور نواب صاحب کے ہاں آنے جانے والے ہیں کسی اور کو شریک نہ کیجیے۔"

پیٹر :۔ "مجھے اس پر بھی خواہ مخواہ حیرت ہوتی ہے۔"

گیرڈی :۔ "میں اس وقت آپ کے استعجاب و حیرت کو نہیں رفع کرسکتا مگر پرسوں کی رات تمام اسرار ظاہر ہوجائینگے اور آپ کا طلسم تعجب خود بخود ٹوٹ جائیگا۔ آپ اتنی مہربانی اور فرمائیے کہ میرے اور جنگلی انسان کے پہنچنے سے پہلے ہم دونوں کو یاد کیجیے۔ میں آپ سے تاکیداً دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ اسے فراموش نہ فرمائیے۔"

پیٹر :۔ "بہت اچھا! میں انشاء اللہ ایسا ہی کرونگا۔"

گیرڈی :۔ "بس اب یہ منصوبہ پورا ہوچکا۔ اب مجھے ایک اور موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ نواب کے ذمے آپ کی کتنی رقم واجب الادا ہے؟"

پیٹر :۔ "شاید پانچ لاکھ فرنک سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔"

گیرڈی :۔ "اس رقم میں وہ نوٹ بھی شامل ہے۔ جسے نواب صاحب چُرا لے گئے تھے؟"

پیٹر :۔ "اُن کی تمام واجب الادا رقموں کا حساب میرے پاس لکھا ہوا ہے۔"

گیرڈی :۔ "تو میں یہ رقمیں آپ کو ادا کیے دیتا ہوں۔"

پیٹیر:۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ اور نواب صاحب کا قرض آپ کیوں ادا کرتے ہیں؟
گیرڈی:۔ اس میں ایک خاص مصلحت ہے۔ میں دوسرے قرضخواہوں کا روپیہ بھی اسی طرح ادا کر چکا ہوں اور نواب کی تمام رہن شدہ املاک کو اپنے قبضے میں لا چکا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نہایت کریم النفس اور مستغنی المزاج واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی بلند حوصلگی سے میں اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں اور یہ بھی سن چکا ہوں کہ آپ خاتون ملکہ سے صرف اس لیے شادی کرنا چاہتے تھے کہ اس کے باپ کی عزت و شرافت میں کوئی داغ نہ لگنے پائے۔ اور آپ کی دولت کا ایک حصہ ملکہ اور ریاول کی بہبود میں صرف ہو۔ مگر بعض مجبوریوں سے یہ ارادہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ پھر آپ نے بی سوسن کو اپنا شریک زندگی بنانا پسند کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام حالات آپ کے فضایل نفسانی کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ہم کو مجبور ہو کے آپ کی ستایش کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجھے اس کارروائی سے صرف یہی مقصود ہے۔ کہ میں نواب صاحب کے تمام قرضوں کا خود ہی خود احاطہ کر لوں۔ تا بوقت ضرورت میرے سوا کوئی اور شخص اُن سے جھگڑا نہ کر سکے۔"
پیٹیر:۔ اگر آپ کا یہ ارادہ ہے تو میں اُن کے قرض کو آپ کی طرف تحویل کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں سمجھتا۔"
گیرڈی:۔ آپ کی بہت بڑی مہربانی۔ میں اس کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ اب چونکہ تمام امور طے ہو گئے ہیں۔ میں رخصت طلب کرتا ہوں۔ اور مقررہ وقت پر آپ کی تشریف آوری کا منتظر رہتا ہوں۔"
کرنیل گیرڈی پیٹیر سے رخصت ہو کے سیدھا گھر آیا۔ اس نے جوب اور ریاول کو خطوط لکھ کے دعوت دی تھی کہ چہارشنبہ کے دن ۲ سے ۴ بجے کے درمیان آ کے اس سے ملاقات کریں۔ یہ ٹھیک وہی دن اور وہی وقت تھا۔ چنانچہ گیرڈی کو گھر میں آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی اور گھڑی نے

بمشکل دو بجائے تھے کہ جوب کے حاضر ہونے کی اطلاع ملی۔ دونوں میں صاحب سلامت کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ گیرڈی نے پوچھا "کہو جوب! کیا خبریں ہیں؟ مسٹر جیکب اور ہنا کی کس حالت میں بسر ہوتی ہے؟"

جوب:۔ "جناب والا! خدا کی عنایت اور آپ کی نوازش سے دونوں آرام و اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیشہ آپ کی مہربانیوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔"

گیرڈی:۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری شادی کب قرار پائی ہے؟"

جوب:۔ "جی اس کا زمانہ بہت قریب ہے۔ یہی کوئی مہینے پندرہ دن میں ہونی بات ہے۔"

گیرڈی:۔ "تو تمہاری خوشی میں شریک ہونے کو میں بھی ایک گواہ بن کے آؤنگا۔"

جوب:۔ "یہ میرے لیے بڑا فخر ہے جو مجھے اب تک نہیں نصیب ہوا تھا۔"

اسی اثنا میں سیاول بھی آپہنچا۔ گیرڈی نے اس کا بھی خیر مقدم ادا کیا اور جوب سے اسے ملایا۔ کیونکہ اس وقت جوب اپنی فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ علی ہذا القیاس سیاول اور دونوں میں معرفی نہ تھی۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اور دو ایک مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی چکے تھے۔

جوب کا نام سن کے سیاول کا رنگ متغیر ہو گیا اور دل میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ جوب نے بھی اسے خشم آلود نگاہ سے دیکھا۔ اور اس کی گھبراہٹ سے جان گیا۔ کہ ہنا کے اس فضیحت ناک واقعہ کا مرتکب (جو پچھلی ورقوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے) یہی ہے۔

گیرڈی دونوں کے جذبات کو محسوس کر چکا تھا۔ دل میں کہنے لگا "دوستو! میرے غریب خانے میں جو لوگ ایک مرتبہ زحمت گوارا کر کے

تشریف لاتے ہیں۔ وہ پھر باہر نہیں نکلتے مگر ایسی حالت میں کہ ایک دوسرے سے پیمانِ الفت باندھتے اور عہدِ مودت محکم کر لیتے ہیں۔ میں اگرچہ جانتا ہوں کہ بعض رنجدہ اور ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے تم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے اب تک کدورت رہی مگر اب وہ حالات خود محو و منسی ہو گئے۔ اور وہ زمانہ جاتا رہا۔ لہٰذا اب وہ کدورت بھی رفع ہو جانی چاہیے۔ (ریاول سے مخاطب ہو کے) کہا جزادے! تم جوب کے حالات سے ناواقف ہو۔ یہ نہایت صاف باطن اور پاک طینت آدمی ہے۔ تم سے کبھی گزشتہ واقعات کا مواخذہ نہ کریگا علی الخصوص جب کہ تم نے اپنا رویہ بدل دیا ہے اور سابقہ بداعمالیوں پر پشیمان ہو کے اس تھوڑی سی مدت میں عمدہ چلن اختیار کر لیا ہے۔ میں تمہارے مزید اطمینان کے لیے تمہیں خوشخبری سناتا ہوں کہ برخلاف عوام کے خیالات کے اور برعکس عام شہرت کے ہنا نی رحلت نہیں کی بلکہ خدا کے حکم سے اب تک زندہ موجود ہے۔ اور عنقریب جوب سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

ریاول: "(انتہائے مسرت سے) خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہنا کی زندگی کا مژدۂ جانفزا میرے کانوں تک پہنچا۔ اور آپ نے یہ مژدہ سنا کے مجھے دلی راحت اور قلبی مسرت پہنچائی۔ ہنا کا واقعہ زندگی بسر میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ اور مرنے کے بعد عذابِ ابدی۔ اس سے مجھے چھٹکارا نصیب ہوا۔ میں اس کے صلے میں خدا سے چاہتا ہوں کہ وہ آپ کو بھی کوئی ایسی ہی عظیم الشان پائدار خوشی دکھائے جیسی آپ نے مجھے دکھائی۔"

اتنا کہنے کے بعد اس کا دل بے اختیار بھر آیا۔ اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اسی حالت سے جوب کی طرف مڑا۔ اور منت و سماجت کے ساتھ کہنے لگا: "مہربان والا! میں بے شبہ قصوروار ہوں۔ اور مجرم لیکن ساتھ ہی اپنے قصور پر پشیمان ہوں اور نادم۔ میرا کانشنس سچے دل سے

معذرت چاہتا ہے۔ اور معافی طلب کرتا ہے۔ آپ کو اختیار ہے چاہے معافی دے کے ہمیشہ کے لیے غلام بے دام بنالیں چاہے نفرت سے دھتکار کے کیفر کردار کو پہنچائیں۔"

یہ سُن کے جوب اُٹھا اور محبت سے اُس کا ہاتھ پکڑ کے کہنے لگا۔ "بھائی! جو ہوا وہ ہوا۔ اب اُس کا تذکرہ بے فایدہ ہے۔ میں اُسے بھول گیا۔ آپ بھی اُسے بھلا دیجیے۔ آپ سے جو لغزش ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اُس کو میں نے دل سے معاف کر دیا۔"

گیرڈی: "مرحبا! میرے پیارے دوستو! مرحبا۔ تم شریف ہو اور شرافت کا برتاؤ کرتے ہو۔ میں تمہارے اِس حسن سلوک پر آفرین کہتا ہوں۔ اب تمہارے مابین دوستی محکم ہوگئی جو کبھی نہ متغیر ہوگی۔" (ریاول سے مخاطب ہوکے) "تم اپنے والدین سے بھی ملے یا نہیں؟"

ریاول: "آپ کے فرمانے پر میں پہلے مسٹر فلینی کے ہاں گیا تھا۔ وہاں اماں جان سے ملاقات ہوئی۔ مگر باوا جان کو ابھی تک نہیں معلوم کہ میں یہاں آیا ہوں۔"

گیرڈی: "خوب ہوا۔ تمہاری والدہ نے تم سے وہ کیفیت بیان کی ہوگی جو اُن پر اور تمہاری ہمشیرہ پر گزری ہے۔"

ریاول: "جی ہاں! میں سب سُن چکا ہوں۔"

گیرڈی: "خیر اب تم یہ سمجھ لو کہ گویا تم نے کچھ بھی نہ جانا۔ کل صبح کو تم نواب کی ملاقات کو جاؤ اور بیان کرو کہ اُن کے دیکھنے کو آئے ہو۔ غالباً وہ تم سے کچھ نہ کہیں گے۔ تم بھی اُن سے کچھ نہ کہنا سننا۔ نہ اپنی ماں بہن کی بات پوچھنا۔ سمجھ گئے؟"

ریاول: "میں سب کچھ اچھی طرح سمجھ گیا۔"

اِس وقت گھڑی نے چار بجائے۔ اور مسٹر موریٹی، مسٹر فلینی، اور مسٹر میگیر گیری

ملاقات کو آئے۔ گیرڈی نے سب کا استقبال کیا۔ اور ریاول اور جوب سے اُن کی معرفی کرائی۔ اور بولا :" میں نے آپ صاحبوں سے وعدہ کیا تھا کہ کھانے سے پہلے ایک طول طویل کہانی سناؤنگا۔ یہ کہانی جنگلی انسان کی داستان ہے۔ اور اُس کے حالات نہایت گہرے اسرار ہیں۔"

یہ سُن کے ناظرین ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔ اور گیرڈی نے جنگلی انسان کے تمام حالات شروع سے لیکر آخر تک جب کہ وہ پٹانی میں آیا۔ اور جنگلی انسان کو پایا حاضرین کے گوش گزار کیے مگر نام نہ کسی کا بتایا نہ اپنا نہ لوسیا کا نہ نواب وغیرہ کا۔ نہ اُس واقعہ کا ذکر کیا جو ساڈڈ چاوری اور سلیمی پر گزرا تھا۔ کیونکہ اِس کے اخفا میں خاص مصلحت تھی۔

جب قصہ تمام ہو چکا تو حاضرین کے جذباتِ انتقام جوش میں آئے اور اُنہوں نے ایسے غدار خبیث و جعلساز بھائی سے بدلہ لینے کی رائے دی۔ جنگلی انسان کی طرف سے سب کے دل میں درد و رحم پیدا ہوا۔ (جنگلی انسان اس وقت تک یہاں نہ آیا تھا کیونکہ گیرڈی نے ممانعت کی تھی کہ مغرب سے پہلے نہ آئے) مسٹر موریني نے گیرڈی سے سوال کیا "کیا یہ ظالم و غدار بھائی اب تک زندہ ہے؟"

گیرڈی :" جی ہاں! زندہ ہے"

موزینی :" جنگلی انسان کا مربی اُس سے بدلہ لیگا؟"

گیرڈی :" غالباً لیگا"

موزینی :" اُس کے باپ کی ثروت بھی اُسے ملیگی؟"

گیرڈی :" مجھے امید ہے کہ ملیگی"

موزینی :" تو پھر اُس کو اُس کے اصلی نام سے موسوم کرنے میں کیا توقف ہے اور کیوں اُس کو اُس کا اصلی اعزاز نہیں دلایا جاتا ہے"

گیرڈی :" یہ سب انشاء اللہ عنقریب شنبہ کی رات کو ایک خاص مجلس میں ہو جائیگا"

پلٹیر:۔ صاحبو! یہ مجلس میرے ہی غریب خانے میں منعقد ہوگی اور میں ہی
بانی مجلس ہونگا۔ لہذا میں آپ صاحبوں سے التماس کرتا ہوں کہ شنبہ کی
رات کو شام کا کھانا وہیں تناول فرمائیں۔"

سب نے اس دعوت کو طیب خاطر سے قبول کیا۔ موزینی نے
پھر گیرڈی سے پوچھا:۔ "آپ نے جنگلی انسان کے ساتھ تو جو کچھ کیا وہ کیا
لیکن اُس کے ماں کے ملنے کی بھی کوئی امید ہے یا نہیں؟"

گیرڈی:۔ "مجھے اس کے ملجانے کی امید ہے۔"

موزینی:۔ "مگر وہ تو شاید دیوانی ہوگی۔ جیسا کہ آپ نے پہلے ارشاد فرمایا تھا"

گیرڈی:۔ "کسی زمانے میں دیوانی تھی لیکن عنایت ایزدی اور ایک لطیفہ غیبی
سے اب وہ بھلی چنگی ہے۔ اور مجھے مل بھی گئی ہے۔"

اس وقت جنگلی انسان، لباس فاخرہ پہنے، عمدہ ہیئت بنائے ہوئے
ایک عجیب شان و توزک سے کمرے میں داخل ہوا کہ ریاول اور جوب بھی
اُسے نہ پہچان سکے جنگلی انسان نے پہلے تمام حاضرین کو سلام کیا
پھر جوب کی طرف بڑھ کر آیا۔ دونوں آہستگی سے گلے ملے۔ سب لوگ
حیرت سے دیکھنے اور انقلابات زمانہ پر تعجب کرنے لگے۔

اس عرصہ میں نوکر نے اطلاع دی کہ "خاصہ تیار ہے" سب مہمان
کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے
کھانا کھانے لگے۔ اتنے میں برآمدے کی جانب سے شور و غل کی صدا
بلند ہوئی جس نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

تھوڑی دیر میں ایک خادم نے حاضر ہو کے اطلاع دی کہ
"ایک شکستہ حال بوڑھا در دولت پر حاضر ہو کے التجا کر رہا ہے
کہ وہ اسی وقت اپنے آقا کو خواہ وہ کسی ضروری ہی کام میں مصروف
ہوں دیکھنا چاہتا ہے۔"

گیرڈی :۔" (تعجب سے) وہ ہے کون؟ کچھ اپنا نام ونشاں بھی بتایا کہ نہیں؟"
نوکر :۔" بتایا ہے " بوڑھا چرواہا " نام ہے "
گیرڈی :۔" آہا! بوڑھا چرواہا۔ وہ میرا عزیز دوست ہے۔ خدا جانے کتنی دور دراز منزلیں طے کر کے آیا ہوگا۔ اُس غریب کے مجھ پر ہزاروں احساں ہیں مسٹر فلینی! میں نے ابھی ابھی جو قصہ بیان کیا تھا اُس کے اکثر حصے کا راوی یہی ہے۔ آپ اسے جانتے ہیں؟"
فلینی :۔" میں اُسے مدت سے جانتا ہوں اور ہیں ہی کیا، اس نواح کے اکثر باشندے اُس سے واقف ہیں۔"
گیرڈی :۔" اچھا تو آپ اور دوسرے اصحاب اگر کوئی مضایقہ نہیں خیال فرمائیے تو میں اُسے یہاں آنے کی اجازت دیتا ہوں "
حاضرین :۔" آپ بلا کھٹکے اُسے یہاں بُلا سکتے ہیں۔"
یہ گفتگو سُن کے نوکر باہر گیا۔ اور بوڑھے چرواہے کو اندر بھیج دیا بوڑھا دائیں بائیں سلام کرتا ہوا آیا۔ اور گیرڈی کو بہت سی دعائیں دیں۔ اُس کی وضع بلادِ فوجہ کے کسانوں کی سی تھی۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنے ہوئے اور ہاتھ میں موٹا سا لٹھ لیے ہوئے تھا۔ اُس نے اپنے آنے کا سبب یہی بتایا کہ اپنے محسن و مربی گیرڈی کے دیدار سے آنکھیں روشن کرے۔
اُس نے بیان کیا کہ "جس وقت وہ فلاکت و ناداری سے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو محتاج تھا۔ گیرڈی نے اُس کی ایسی دستگیری کی کہ وہ عیش و آرام سے بسر کرنے لگا۔ بلکہ خود دوسرے محتاجوں اور غریبوں کو مدد دیتا تھا۔"
مہمانوں کے رخصت ہونے پر یہ بوڑھا بھی جانے کو تیار ہوا چلتے ہوئے کہہ گیا کہ بعض دوستوں سے ملنے اور سیر و تفریح کرنے کو وہ اور

چند دن پیرس میں قیام کریگا۔ خاصکر سوسن سے ملنے کی اُسے سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ اکثر اوقات اُس پر مہربانی کیا کرتی تھی۔

بوڑھے کو یہاں چھوڑ کے اب ہم ریاول کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ اُس نے یہاں سے نکل کے کیا کیا؟ اُس نے ایک گاڑی کرایہ پر لی اور جیسا کہ گیرڈی سے قرار داد ہوا تھا۔ سیدھا باپ کے گھر کا رستہ لیا نواب اُس کے بے وقت اور بے اطلاع یکایک آجانے سے جز بز ہوا اور سرد مہری سے ملا۔ چنانچہ خفگی سے اپنے خاص کمرے میں اُترنے کی بھی اجازت نہ دی۔ بلکہ تحتانی منزل کے ایک حجرے میں جانے کو کہا باپ کی یہ کم مہری اور سرکہ چینی دیکھ کے ریاول کو سخت ملال ہوا اور اُس نے معذرت بھی چاہی۔ پھر بیان کیا کہ وہ اپنی ماں اور بہن سے ملاقات کرنے کو سنگین محل میں جاؤنگا (اُس کا یہ ظاہر کرنا بجا بلا نہ طور پر گیرڈی کے حکم سے تھا) نواب نے کہا سنگین محل میں اُس کی ماں اور بہن نہیں ہے۔ بعد ازاں یہ طے ہوا کہ ریاول تین دن تک پیرس میں رہیگا اور اپنے کسی دوست کے ہاں قیام کریگا۔

جب ریاول کپڑے بدلنے کو اُس کمرے میں آیا جو باپ کی طرف سے ٹھہرنے کیلیے اُس کو ملا تھا۔ تو اُس کا دل تنہائی پاکے اُس سے کہنے لگا "آج باوا جان کی عنایت و محبت کی قلعی اچھی طرح کھل گئی بھلا دنیا میں کوئی باپ اپنے بیٹے سے اس طرح پیش آتا ہوگا۔ خیر اسے جانے دو سُنا ہے کہ اب وہ اماں جان کے اندوختے پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ موروثی دولت کا تو صفایا کر بیٹھے اب پرائے مال پر دیدے لال کیے جا رہے ہیں۔ ادھر غریب ملکہ پر بھی عنایت کی خاص نظر ہے۔ مگر ان سے ہو کیا سکتا ہے۔ بھلا دیکھیں تو سہی کہ کیا کر لیتے ہیں"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر ۹ و ۱۰ صحیفہ جلد ۴

(۴)

دنیائے اسلام میں خونریز ہل چل

گزشتہ اپریل کی ۱۳ سے ۲۷ تاریخ تک دو ہفتہ کی قلیل مدت میں جو عظیم الشان خونریز حیرت انگیز انقلاب ترکان آل عثمان کی مملکت کو دیکھنا پڑا ہے اُس نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ کیا ہے۔ انقلاب تو ہوا تھا ینگ ٹرکش پارٹی کے زور کو کم کرنے اور سلطان عبدالحمید کی طاقت کو بڑھانے کے لیے، مگر انجام یہ ہوا کہ بہت سا انسانی خون بہنے کے بعد، صرف پندرہ روز میں وہ مدبر اور زبردست عبدالحمید جو کچھ کم ۱/۳ صدی سے خلیفۃ الاسلام اور وسیع ٹرکش امپائر کا فرمانروا تھا۔ جو لاکھوں مربع میل اور کروروں انسانی قسمتوں کا مالک تھا۔ جس نے سلطنتِ عثمانیہ کی بہبودی و ترقی کی خاطر سے مسلسل سخت ترین محنت اور جانسوزی کو اپنا ہمدم بنایا تھا۔ جس نے سلطنت کو وراثتاً ایسی حالت میں حاصل کیا تھا کہ وہ دیوالیہ تھی، جنگ و جدل، فتنہ و فساد، سازش و فریب کا مرکز بنی ہوئی تھی اور اُس کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جس نے

بہت سی بڑی اصلاحیں ملک میں کیں۔ جن کا پہلے نام و نشان نہ تھا جس نے سازشوں کے توڑنے کے لیے ملک کی مسلمانہ جماعتوں سے اور یورپین گورنمنٹوں سے ڈپلومیسی کے میدان میں عقل و قلم کے ذریعہ جنگ کی تھی جس نے ارمنی خونریزیوں کو مٹا دیا تھا جس نے یونان پر فتح مبین پائی تھی جس نے مملکت عثمانیہ اور دنیائے اسلام کی اخوت کے پراگندہ شیرازے کو مجتمع کرنا چاہا تھا۔ جو صالح اور مذہب پرست مسلمان تھا جس نے بغداد و حجاز ریلوے لائینوں کی تجویز و تکمیل شروع کر دی تھی جس کی نظر تلطف و نگاہِ عنایت کی جستجو میں یورپ کے ذوی الاقتدار مغرور تاجدار کوشاں رہتے تھے۔ جس کی مدبری، فرزانگی و سیاست کے ڈنکے دنیا کے ہر ہر گوشے میں بجے ہوئے تھے۔ جس کی محبت کا نشہ کروڑوں اسلامی دلوں کو سرشار بنائے ہوئے تھا۔ جس کے خطبے سی کلمہ گویوں کی ہر ہر مسجد مہینے میں چار مرتبہ گونجا کرتی تھی۔ جس کے ایک لفظ پر لاکھوں انسان دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت پر حملہ کرنے اور مرنے کٹنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ جس کے حریم مکنت میں دنیا کی ہر قسم کی شان و شوکت ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔ جس کی سکونت کے لیے دنیا کی منتخب ترین منظر پر سر فلک کشیدہ ایوان موجود تھے۔ جو دنیا کی تمام نعمتوں کو ایک اشارے سے مہیا کر سکتا تھا۔ جو ہزاروں خواجہ سراؤں سینکڑوں پری پیکروں بیسیوں سکرٹریوں اور وزیروں کے حلقے میں رہتا تھا جس کی حفاظت کے لیے ہزاروں سپاہی جان جوکھم میں ڈالے رہتے تھے۔ آج اپنے رفیع المنزلت، عظیم المرتبت اورنگِ حکومت سے ہٹا دیا گیا۔ اور ایک مقہور، مجبور، مظلوم، مغلوب، بے بس، بے کس، اسیر سلطانی بنکر وطن سے کوسوں دور، چھوٹے سے تنگ و تاریک شہر سلونیکا کے ایک معمولی مکان میں، ادنیٰ حیثیت سے تمام دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ نظربند ہے

اور گمنام رشاد آفندی جس کے نام تک سے اسلامی دنیا کا بڑا حصہ بیخبر تھا اور جو دستور سے پہلے سلطان عبدالحمید کا شاہی قیدی تھا۔ اب سلطان محمد خامس کے لقب سے ملقب ہو کے ترکان آل عثمان کا فرمانروا، عبدالحمید خان، اُن کی فیملی، اُن کی رعایا، اُن کی دولت اور اُن کی قسمتوں کا مالک بنا ہوا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یہ راز آشکار ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کا دوسرے ممالک اسلام اور خاصکر ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت کم وقار و احترام تھا۔ لیکن سلطان عبدالحمید نے اپنی اولوالعزمانہ، مدبرانہ، ہمدردانہ روش سے ایک نیا رنگ پیدا کیا تھا اور جو محبت و عزت تمام دنیا کے مسلمانوں میں ترکی سلطان ترکی سلطنت و ترکی رعایا، سے پیدا ہو گئی تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ جن دنوں ترکی کے انقلاب و شورش کی خبریں ہندوستان میں آرہی تھیں یہاں کے مسلمان مضطرب اور بے چین تھے اور جب برقی لہر نے اُن کو یہ سنسنی پیدا کر دینے والا پیام پہنچایا کہ "سلطان عبدالحمید خان معزول ہو گئے"، تو دفعتاً اُن کے دل بے قابو اور دماغ بیکار ہو گئے چہروں پر رنج و افسردگی پیدا ہو گئی۔ اس تغیر کو نہایت نامبارک سمجھا گیا اور اب تک یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس انقلاب نے نہ صرف عبدالحمید کا خاتمہ کر دیا بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کو قعرِ بربادی کے کنارے لگا دیا ہے۔

مملکت عثمانیہ کے اس انقلاب کے پہلو بہ پہلو تمام اسلامی دنیا میں ناخوشگوار ہلچل نظر آرہی ہے۔ چند ہی دن کے پہلے مراکش کے فرمانروا مولا عبدالعزیز کی قسمت کا بھی قریب قریب وہی انجام ہوا ہے جو اب عبدالحمید خان کا ہوا ہے۔ اور مولا عبدالحفیظ اُس کا قایم مقام بن چکا ہے۔ جرمن اور فرنچ گورنمنٹوں کے دندان آز اُن کی دلفریب دولت پر پورے تیز ہو چکے ہیں۔ ملک میں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہے

امن و امان کا بیج مرگیا ہے۔ ایران سیول وار کا گھر بنا ہوا ہی۔ شاہ و رعایا میں آزادی کے لیے کشاکش ہورہی ہے۔ ضابطہ اور قانون کی چولیں ڈھیلی ہوگئی ہیں۔ چھری کٹاری کا بازار سرد نہیں ہوتا۔ اُس کی اس ابتر حالت سے یورپین گورنمنٹیں واقف ہوچکی ہیں۔ اور اپنے اپنے فوائد کے اکتساب پر مستعد و آمادہ نظر آرہی ہیں۔ افغانستان میں ابھی ابھی ایک خوفناک سازش کا انکشاف ہوا ہے جو شاہِ خود مختار افغانستان کی جان لینے کے لیے کی گئی تھی۔ مصر میں بھی حصول آزادی کے لیے بے چینی اور کشمکش ہورہی ہے اور اہل مصر عرصے سے حرّیت کے راگ الاپ رہے ہیں مسلمانانِ ہندوستان سلف گورنمنٹ میں اپنے جایز و واجب حقوق سے زیادہ حصہ لینے کے لیے اپنے ہمسایہ ہندوؤں سے کاغذی جنگ کررہے ہیں حیدرآباد اپنی اندرونی آفتوں کے علاوہ مصائبِ طغیانی میں گرفتار ہے اور اپنی خوشحالی کو رو رہا ہے۔

اسلامی دنیا پر ان آسمانی بلاؤں اور آفتوں کی یورش دیکھکے تمام مسلمان بوجہ اُس مذہبی رشتے کے جسکو "کل مومن اخوۃ" کی گرہ نے ٹوٹنے سے مستغنی کردیا ہے بحد ملول ہیں۔ اور باغِ اسلام میں تازہ بہار آنے سے بالکل مایوس ہوگئے ہیں۔

کیا یہہ ملال و مایوسی درست اور حق بہ جانب ہے؟ کیا درحقیقت اب اسلام و اہلِ اسلام کا خاتمہ ہوچکا؟ کیا حشر ہونے والا ہے دولتِ عثمانیہ اور اُن دوسری اسلامی سلطنتوں کا جہاں ہلچل مچی ہوئی ہے؟۔

یہ سوالات ہیں جو اِس وقت ہر متجسس و انجام بیں دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے جائینگے۔ اِسی لیے ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ اُن کی نسبت میں اپنے خیالات ظاہر کرنے کی جرأت کروں۔

دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے اور نظریۂ ارتقا کے ساتھ اُس کو

مطابقت دینے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کی طرح اقوام و مذاہب بھی بتدریج وجود میں آتے، ترقی پاتے اور فنا ہو جاتے ہیں چونکہ قومیں افرادِ انسانی کا مجموعہ ہوتی ہیں اس لیے اُن کی عمریں افراد کی عمروں سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذاہب قوموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی عمریں قوموں کی عمروں سے کئی گنی طویل ہوتی ہیں۔ اگر اُن کی ماننے والی ایک قوم زوال پذیر اور فنا ہو جائے تو دوسری قوم اُس کی جانشین ہو جاتی ہے دوسری کے بعد تیسری، تیسری کے بعد چوتھی۔ اسی طرح اُس کی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مذہب دو قسم کے ہیں۔ غیر تبلیغی، تبلیغی۔ جو مذہب غیر تبلیغی ہوتے ہیں یعنے جن میں نئی قوموں کا داخلہ ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ وہ ایک زمانے میں اپنی معتقد اقوام کے عروج کا سہانا منظر دیکھ کر حالتِ سکون میں آجاتے ہیں۔ اور جو مذہب تبلیغی ہوتے ہیں اُن میں کثرت سے قومیں شامل رہتی ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً شامل ہوتی جاتی ہیں۔ اس لیے تا قیام حیثیتِ تبلیغی اُن کی بہار قایم رہتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی صرصرِ حوادث کے جھونکے تھوڑے عرصے تک اُن کی بہار کو بے لطف بھی کر دیتے ہیں لیکن نسیمِ تبلیغ کی فیض گستری پھر وہی بہار پیدا کر دیتی ہے۔ جو پہلے تھی اِس دعوے کی زندہ مثالیں دنیا میں موجود ہیں۔ بودھ، مسیحی اور اسلام تینوں کی یہی حالت ہے۔ تینوں تبلیغی مذاہب ہیں اور اِن کے پیرو اقوام میں سے ایک ایک قوم کو ایک ایک زمانے میں عروج و سربلندی حاصل ہوئی اور ہو رہی ہے۔ گو خاص خاص زمانوں میں بہار کے آفتاب کو گہن لگ گیا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اب تباہی کے دن آگئے۔ لیکن ادھر گہن دور ہوا اور اُدھر وہی بہار مزید رونق کے ساتھ نظر آنے لگی۔ مذکورۂ بالا مذاہب پر وقتاً فوقتاً بلائیں آتی رہیں۔ چنانچہ مسیحی مذہب پر حضرت عیسیٰ کے عروج و ارتفاع کے بعد اور پھر ازمنۂ مظلمہ میں، بودھ مذہب پر اُس کے

ہندوستان سے بدر ہونے کے بعد، اور انیسویں صدی میں، اسلام پر خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد، اور پھر تاتاریوں اور مغلوں کے پُر مظالم جہانکشائی کے زمانے میں آفتیں آئیں بلکہ اسلام پر تاتاریوں کے ہاتھوں جو قیامت آفرین ظلم و ستم برپا ہوئے وہ اب تک ہر شخص کو رُلانے کے لیے کافی ہیں۔ مگر جب حوادث کی گھنگھور گھٹائیں چھٹ گئیں اور آفتوں کے بادل پھٹ گئے تو عجب خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ کا جلوہ نظر میں پھرنے لگا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ دراصل کوئی وقفہ اُس بہار میں آیا ہی نہ تھا۔ جب فلسفۂ ارتقا اور تاریخ عالم دونوں بلند آوازی سے پکار رہے ہیں کہ تبلیغی مذہب فنا کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور جب کہ خلافتِ راشدہ کے درد انگیز خاتمے پر وہی بنی اُمیہ جو خونریزی کی بانی مبانی تھے تاریخ اسلام میں ایک زرنگار دور چھوڑ گئے ہیں جو فتوحات، وسعتِ سلطنت، دبدبۂ اسلام، ترقیٔ علم و ہنر، و تمدن و تہذیب کی اعتبار سے خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اور جب کہ تاتاری و مغل باوجود اس کے کہ سیلاب کی طرح کل اسلامی دنیا پر چھا گئے تھے اور اسلامی تمدن و تہذیب و علم و ہنر کے مٹانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا تھا۔ بلا امتیاز مرد و زن، صغیر و کبیر مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ اور کوئی امید اسلام کی زندگی کی باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم ان ہی تاتاریوں اور مغلوں نے حاملہ بگوش اسلام ہو کے از سرِ نو اُس میں جان ڈالی، نئے ممالک فتح کیے نیا تمدن قایم کیا اور وہی رنگ پیدا کر دیا جو گزشتہ صدیوں میں جھلکتا تھا۔ نیز جب کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں اور درحقیقت صحیح دعویٰ کرتے ہیں کہ مذاہبِ عالم میں اسلام ہی سب سے اعلیٰ و افضل اور تمدن و تہذیب کا حامی ہے۔ اور جب کہ ہم خدا کے اُن وعدوں پر جو اُس نے اسلام کی فتح و نصرت کے متعلق کیے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ جب کہ ہم میں ایسی

قومیں موجود ہیں جنہوں نے ابھی تک بلحاظِ فطرت اللہ گلزارِ عالم کے پھولوں سے اپنا دامن نہیں بھرا ہے اور جب کہ دوسری نئی قومیں اسلام کی خوبیوں کو پسند کرنے لگی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور اہلِ اسلام کی آئندہ ترقی سے جو یقیناً ہونے والی ہے اور بہت جلد ہونے والی ہے۔ ہم مایوس ہو جائیں بے شک بہ تقاضائے اُصولِ فطرت بہت سی اسلامی قومیں اور سلطنتیں تباہ ہوئی ہیں اور تباہ ہوتی جائینگی۔ لیکن ساتھ ہی نئی قومیں اور نئی سلطنتیں اُن کی جانشین بنی ہیں اور بن رہی ہیں اور بنتی رہینگی۔

اِس تھوڑی سی اُصولی بحث کے بعد میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مملکتِ عثمانیہ کا انقلاب حق بہ جانب ہے یا نہیں؟ اور جو ہل چل یہاں اور دوسرے اسلامی حصص میں ہوئی اور ہو رہی ہے اُس کا کیا انجام ہوگا؟۔

سب سے پہلے مملکتِ عثمانی اور اُس کے انقلاب کو لیجیے عثمانی گورنمنٹ کی عمر چھے سو سال سے زیادہ کی ہے وہ اپنے عہدِ شباب کو ختم کر چکی ہے اور کہولت کے دور میں چل رہی ہے۔ اور کسی طرح اُس گردشِ تقدیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جو تمام اقوامِ عالم کو چکر دیتی اور آخرِ کار تباہی کو پہنچا دیتی ہے۔ لیکن جس طرح ہزاروں انسان کہولت کی بیماریوں میں مبتلا ہونے پر بھی اپنے عمدہ قویٰ اور حاذق طبیب کی مسیحائی سے قبل از وقت نہیں مرتے اور عمرِ طبعی کو پہنچتے ہیں اُسی طرح ترکانِ آلِ عثمان کے لیے، جن میں ابھی سادگی سپاہ منشی، دلیری، استقلال، تحمل شدائد کی اعلیٰ ترین صفات جن سے قومیں بنتی اور بانی رہتی ہیں موجود ہیں یہ ممکن اور بخوبی ممکن ہے کہ اپنے تنزل کے اسباب کا صحیح علاج کر کے اُس کو مٹا دیں اور اپنی گورنمنٹ کی عمر کو دراز کر دیں۔

میرا خیال ہے (امید ہے کہ اس خیال کے آزادانہ اظہار پر جو اکثر مسلمانان ہند کے متخیلات کے بالکل مخالف ہے معافی دی جائیگی) کہ ترکش امپائر کا یہ نیا انقلاب جو عبدل کے عزل اور رشاد کے نصب پر ختم ہوا ہے ایک ضروری جلاب یا نشتر تھا جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اور جس طرح جلاب و نشتر، کے بعد بیمار کو معجونات و مفرحات استعمال کرائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ٹرکش امپائر کو اس جلاب و نشتر یعنی انقلاب کے بعد مفرحات و معجونات (اصلاحات) کی حاجت ہے چونکہ حاذق اطبا (زبردست کیبنٹ و پارلیمنٹ) اس کو مفرحات و معجونات (اصلاحات) دے رہے ہیں قوی امید پڑتی ہے کہ انجام بخیر ہوگا۔

چونکہ کوئی انسان غلط کاریوں اور خطاؤں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اس لیے سلطان عبدالحمید خان نے بھی اپنے سینکڑوں مفید کارناموں اور عمدہ اصلاحوں کے ساتھ ساتھ بہت سی خوفناک غلطیاں (بری نیت سے نہیں بلکہ خطاءِ اجتہادی کے طور پر) کیں جنہوں نے آگے چل کے بڑھتے بڑھتے ہیبت انگیز شکل اختیار کر لی اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ معزول کیے جائیں۔ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں تھا ینگ ٹرکش پارٹی نے جو کام انجام دیا ہے وہ بالکل بجا اور درست معلوم ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کی نوعیت اور ان انقلابوں پر نظر ڈالنی ضرور ہے جو بغرض اصلاح اس وقت عمل میں لائے جا رہے ہیں۔

ترکی مملکت کا پورا یورپین حصہ اور بہت سا مشرقی قطعہ ایسا ہے جو خون بہا بہا کر عیسائیوں سے لیا گیا ہے۔ نیز اس کا اکثر حصہ خاصکر

دار الخلافہ (قسطنطنیہ) ایسے موقع پر واقع ہے کہ یورپین دل عموماً اور شہنشاہِ زار خصوصاً اُس کو قبضہ کرنے کی آرزو پر مرتے اور تدابیر میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ امر فطرتِ انسانی بلکہ طبیعتِ حیوانی تک میں داخل ہے۔ کہ وہ اپنی چیز کو غیر کے قبضے میں ٹھنڈے دل سے بے رنج و ملال نہیں دیکھ سکتی۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ مسیح کا کلمہ پڑھنے والے ایسے وقت میں جب کہ وہ سائنس کے، تمدن کے، تہذیب کے مالک ہیں نچلے اور خاموش بیٹھ سکیں۔ تاوقتیکہ اُن کا جواب اُن ہی کے ہتھیاروں سے نہ دیا جائے اور رعایا کو بالاتحاد مذہب و ملت اس قدر امن چین نہ ملے کہ سب کی سب بالاتحاد اُس کو اپنی سلطنت سمجھنے لگے۔

جب سے ترکوں نے دانیال کی دیواروں کے نیچے شکست کھائی عیسائیوں کا آفتاب گریہن سے چھوٹنا شروع ہوا اور وہ میدانِ ترقی میں قدم بڑھانے لگے۔ ادھر ترک ترقی تو درکنار حالتِ سکون میں آ گئے۔ بلکہ پیچھے ہٹنے لگے۔ کبھی کبھی تلوار نیام سے نکلی تو اپنے ہی بھائی بندوں کا گلا کاٹنے کے لیے اپنوں اور یگانوں کا خون بہانے کے لیے۔ ترک تعصب اور غرور سے سر نیچا ہی نہ کرتے تھے دربار سازش کا جولانگاہ بنگیا تھا شیرازۂ انتظام پراگندہ ہو گیا تھا۔ ابتری اور بدنظمی دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اِس حالت سے مسیحی فائدہ اُٹھانے لگے۔ تلوار سے، تفنگ سے، سائنس سے، ڈپلومیسی سے ترک کی طاقت کو بتدریج گھٹانے لگے۔ دو تین صدیاں اسی طرح گزر گئیں۔ اس نے اپنی طاقت بڑھا لی اور دیرینہ آرزو کو پورا کرنے کے سامان کرنے لگا۔ ترکی فرمانرواؤں میں سب سے پہلے سلطان سلیم ثالث شہید نے اپنی گورنمنٹ اور قوم کے نازک حالات کو محسوس کیا اور کوشش کی کہ فوج یورپین ہتھیاروں سے آراستہ ہو اور یورپین اصولِ جنگ کی تعلیم پائے۔ انتظامِ مملکت میں جو جو نقص پیدا ہو گئے ہیں

وہ رفع کیے جائیں اور سلطنت کو از سرِ نو ترقی پر لایا جائے۔ بدقسمتی سے سلطان سلیم کو کوڑ مغز سپاہیوں اور پرانی لکیر کے فقیروں سے سابقہ پڑا جو ہمچو من دیگرے نیست کے نشے میں مست تھے اور جو دشمن سے سلامتی کی صورت اسی میں سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھکر آنکھیں بند کرلیں اور بس اس لیے سلیم کو اپنے نیک خیالات اور اُن ارادوں میں کماحقہ کامیابی نہ ہوسکی۔ اور آخر کار اُس کو اپنے چچازاد بھائی سلطان مصطفیٰ خان رابع کے لیے تخت خالی کرنا پڑا۔ سلطان سلیم ثالث تخت و تاج کا بھوکا نہ تھا بلکہ وہ قوم کا عاشق تھا۔ اُس نے بلا تامل سلطنت پر لات ماردی اور اپنا تمام زور مصطفیٰ رابع کے چھوٹے بھائی نوجوان محمود کو اُمورِ مملکت و رموزِ سیاست سکھلانے میں صرف کیا۔ مصطفیٰ رابع بالکل احمق اور کمزور سلطان ثابت ہوا۔ اور سلیم کی بےقصوری اور اصلاح کی ضرورت روز بروز محسوس ہونے لگی۔ بدبخت سلطان گھبرا گیا اور سلیم کو شہید کرکے جھگڑا ہی مٹا دینا چاہا۔ لیکن خونِ ناحق رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ وہی روز بد جو سلیم کو دیکھنا پڑا تھا مصطفیٰ کے آگے آیا۔ اور سریرِ خلافت پر نوجوان سلطان محمود ثانی متمکن ہوا۔ محمود سمجھ گیا تھا کہ خود سر ینگ چریوں کا خاتمہ سیدھی طرح ناممکن ہے۔ اُس نے چپکے چپکے ایک زبردست فوج جو یورپین فنون و سامانِ جنگ سے واقف و مسلح تھی تیار کی اور پھر ایک ہی دن ینگ چریوں کا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے ایک سخت خونریز لڑائی کے بعد جو قسطنطنیہ میں پرچم اسلام لہرانے کے بعد نہ ہوئی تھی اور نہ پھر آج تک ہوئی خاتمہ کردیا اور بے کھٹکے مدبری دفرزانگی کے ساتھ اصلاحات کو عمل میں لانے لگا ان اصلاحات کو دیکھکے روس اور آسٹریا جو ٹرکش امپائر کے حصے بخرے کرنے کی مدت سے تیاری کر رہے تھے دفعتاً چونک پڑے اور اندرونی سازشوں سے عیسائی رعایا کو برانگیختہ کرنے لگے۔ محمود کی زندگی بھر تو

کوئی منتر چل نہ سکا۔ لیکن اُس کی موت کے بعد کمسن عبدالمجید کو فرمانروا دیکھکر زار کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے موقع کو غنیمت جانا اور آسٹریا کی خفیہ امداد کے برتے پر زبردستی اعلان جنگ دے دیا۔ یورپ اگرچہ مسیحیوں کا گھر ہے اور اس قدر طاقت رکھتا ہے کہ اگر اُن میں اتفاق پیدا کردے تو دنیا کا نقشہ کچھ سے کچھ ہو جائے لیکن قادر مطلق نے روز ازل ہی سے "بینہما العداوۃ والبغضاء" کا ناطق فیصلہ کر دیا ہے۔ اس لیے گو یورپین دولتیں کاغذی طور پر متحد نظر آتی ہیں لیکن در پردہ ایک دوسری کے قلع وقمع پر تلی رہتی ہیں۔ اسی بنا پر جب یہ دیکھا گیا کہ روس و آسٹریا کی گدیں ترکی کا گوشت نوچنا چاہتی ہیں تو فرانس و انگلنڈ اُس کی حمایت پر آمادہ ہوئے اور تینوں کی متفقہ فوجوں نے نامور جنرل عمر کے زیر کمان اُس کو نہایت سخت شکست دی۔ اس فتح و ظفر سے ترکوں کو کچھ کچھ وقار حاصل ہوا۔ یورپ کی بازاروں میں اُس کا اعتبار ہو گیا اور یورپی اقوام اُن سے ڈرنے لگیں ضرورت تھی کہ عبدالمجید موقع کو غنیمت جانتا جو اصلاحیں ادھوری رہ گئی تھیں اُن کو پورا کرتا۔ اُن سازشوں کا جو اُس کی نیم رضا یا کو سرکش بنانے اور حلقۂ اطاعت سے نکال دینے کے لیے کی جاتی تھیں انسداد کرتا لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ عبدالمجید عیش و نعم میں پڑ گیا۔ اور داد عشرت دینے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبل از وقت دنیا کو رخصت کرنا پڑا۔ اُس کے بعد اُس کے بھائی سلطان عبدالعزیز کو تخت و دیہیم ملا۔ عبدالعزیز ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور اگرچہ اُس کی دلی خواہش تھی کہ سلطنت کو فلاح و رفاہ حاصل ہو اور ابتدا میں اُس نے کام بھی عمدگی سے چلایا۔ لیکن یورپ کو جاکر اُلٹا سبق پڑھ آیا۔ اُس کے دل میں یہ خیال جم گیا کہ جہاں تک ممکن ہو زندگی آرام و راحت سے بسر کی جائے

عظیم الشان قصر تعمیر ہوں۔ بیش قیمت یورپین فرنیچر خریدا جائے۔ خوبصورت عورتیں محل میں بڑھائی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ سامانِ عیش کے لیے روپیہ کافی نہ ہوا تو یورپ کی بنکوں سے کروڑوں پونڈ گراں ترسود پر لیا گیا۔ عیش و آرام کی خواہش کے ساتھ خود مختاری مطلق العنانی میں بھی اضافہ ہو گیا بھائی بند جو وارثِ سلطنت تھے اسیرِ سلطانی بنائے گئے۔ انتظامِ سلطنت سے غفلت برتی گئی "روپیہ روپیہ" کی پکار ہر طرف بلند ہوئی رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا۔ آخرش نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خزانہ خالی ہو گیا تحصیل مالگزاری کم ہو گئی۔ ہر طرف ظلم کی فریاد مچنے لگی۔ فوج وسیول ڈپارٹمنٹوں کی ماہواریں چڑھ گئیں۔ قرضوں کی ادائی تو درکنار سود تک نہ دیا جا سکا۔ بدمعاش خائن سازشی وزرا و حکام سلطان کے گرد محیط ہو گئے۔ اس ابتر حالت نے یورپ کی ہمدردی کو بھی کم کر دیا۔ اور رعایا تو پہلے سے غضبناک ہو گئی تھی۔ روشن خیال ترک جن میں مدحت پاشا کا نام خصوصیت سے تاریخ میں نمایاں رہیگا۔ یہ محسوس کرنے لگے کہ تمام یورپ میں تو رعایا کو کم و بیش امورِ سلطنت میں دخل ہے۔ اور اس کی بدولت یورپ تیز پا ترقی کر رہا ہے اس کے مقابل مملکت عثمانیہ میں ایک خود مختار حاکم اور اس کے خود غرض حاشیہ برداروں کی بدولت اندھیر مچی ہوئی ہے۔ ترکی کا کچومر نکلا جا رہا ہے سلطان اور اس کے منظورِ نظر رعایا کا پیٹ کاٹ کاٹ کے اور کلیجہ نوچ نوچ کے دولت نکال رہے ہیں اور بیفکری سے اڑا رہے ہیں۔ جاں باز ملازم بھوکوں مر رہے ہیں۔ تعلیم اور امورِ رفاہِ عام کا مطلق کوئی لحاظ نہیں کیا جا رہا ہے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ترکش امپائر میں سلف گورنمنٹ رعایا کو نہ ملے اور سلطان کی مطلق العنانی اور اس کے حاشیہ نشینوں کی بدمعاشی کا استیصال نکر دیا جائے ان خیالات کی بنا پر وہ آزادی کے نعرے لگانے لگے اور حریت کے

راگ گانے لگے۔ سلطان عبدالعزیز کو عشرت پسندی نے اور اُن حوالی موالی کی مکاری و گزبری نے اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ اِن اعلیٰ اور پاکیزہ احساسات پر غور و تامل کرتے وہ روز بروز زیادہ خود رائے اور متلون المزاج ہوتے گئے اب مجبوراً محبِ وطن مصلحوں کو ضرورت پڑی کہ خفیہ کارروائیاں شروع کریں سلطان نے تمام مشکلات سے گھبرا کر روسی گورنمنٹ سے یارانہ پیدا کیا۔ جو اپنی دیرینہ آرزو کو پورا کرنے اور اُس نقصان و توہین کا انتقام لینے کے لیے جو سلطان عبدالمجید کے عہد میں اُس کو اٹھانی پڑی تھی چشم براہ تھی۔ شہنشاہِ زار اور اُس کے اعوان و انصار اِس موقع پر خوب کھل کھیلے۔ ایک طرف تو مکارانہ روباہ صفت دوستی سے عبدالعزیز کو رام کیا۔ دوسری جانب تمام عیسائی رعایا کو بغاوت و سرکشی پر اکسا کر ہر ایک ممکن سامان سے مدد دی۔ اِن سب پر مستزاد یہ کہ خود کامل ساز و سامان سے جنگی تیاری کرنے لگا۔ اِس نازک حالت میں بجز اِس کے چارہ نہ تھا کہ عبدالعزیز کے زہریلے اور بیکار وجود سے تخت خالی کرایا جائے۔

روشن خیال اور محب وطن لیڈروں نے ڈپلومیسی مردانگی کے ساتھ فوج کو متفق کر لیا۔ اور شیخ الاسلام کے فتوے پر بلا کسی خونریزی کے عبدالعزیز کو معزول کر کے عبدالمجید کے بیٹے مراد کو سلطان ترک بنایا۔ عبدالعزیز کی بدقسمتی یہیں پر ختم نہیں ہو گئی اُسے سلطنت کے ساتھ جان بھی کھونی پڑی۔ معزولی کے ایک ہفتے بعد ہی اُس کے قدیم ہوا خواہوں کے اور روسی سازشوں کے اندیشے سے گھبرا کر اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا اُس کے قتل کرنے والوں کے پاس اگرچہ اُس کے اِس انجام غم کے لیے بہت سے کافی وجوہ تھے لیکن پھر بھی بلحاظ شریعتِ اسلامیہ یہ خون ناحق ہوا اور قاتلوں کی گردن پر رہیگا جس کا بُرا نتیجہ آگے چل کر

نہ صرف حامیان سلف گورنمنٹ کو بھگتنا پڑا۔ بلکہ خود کانسٹیٹوشن کا وجود عرصہ تک معدوم رہا۔ اور اس کے لیے از سر نو تمام انتظامات کا کفارہ دینا پڑا۔

عبد العزیز کے عزل کی خبر باستثنائے ہندوستان اور ان دور دراز ممالک کے جہاں اصلی حالت کا علم نہ تھا کل ترکی قلمرو اور دنیا کے دوسرے حصص میں بڑی خوشی کے ساتھ سنی گئی اور نیز سلطان مراد کے جلوس پر دلفریب امیدیں بندھ گئیں۔ اور خیالی پلاؤ پکنے لگے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد نظر آگیا کہ نیا سلطان اول تو کمزور طبیعت کا فرمانروا ہے۔ دوسرے خود مختاری کا شایق ہے۔ اس پر ایک اور انقلاب کی تیاری کی گئی عبد الحمید خان سے جو مراد کا بھائی تھا قیام کانسٹیٹوشن کے حلف اور وعدے لیے گئے اور بالآخر امن و امان کے ساتھ سلطان عبد الحمید خان ۳۱ اگست ۱۸۷۶ء کو ٹرکش امپائر کے مالک بن گئے اور سلطان مراد نامراد پھر اسی محبس میں مقیم ہوا جہاں سے چند ماہ پیشتر چھٹکارا پا چکا تھا۔

اس وقت مملکت عثمانیہ بدامنی، بدنظمی، خونریزی کا مرکز بن گئی روس سے لڑائی ٹھن گئی۔ خزانہ پہلے سے خالی تھا۔ یورپ کے ساہوکاروں کا تقاضا حد سے بڑھ چکا تھا۔ نیا قرض ملنا ناممکن تھا۔ ایسی حالت میں نئی سلطان کا جلوس امید و بیم کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا لیکن ہر منصف مزاج اور مبصر کا فرض ہے کہ سلطان عبد الحمید خان کی ان مساعی جمیلہ کا نہایت کشادہ پیشانی سے اعتراف کرے جن کی بدولت وہ گتھی کو سلجھائیں جو کل مملکت عثمانیہ کو تہ و بالا کر دینے کے لیے پھیل چکی تھیں صرف یورپین ٹرکی کے بڑے حصے کو سلطان کی عملداری سے خارج کرا کر دور ہو گئیں۔ اور اطمینان و امن و امان کی صورت نظر آئی۔ ساتھ ہی یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اگر ٹرکش جنرلوں کی بے ایمانی اور سلطان عبد الحمید خان کی زیادہ حد اعتدال

احتیاط پسندی جو درحقیقت کمزوری کے درجے میں آچکی تھی نہ ہوتی جس کی بدولت غازی عثمان مرحوم ایک بڑے جانباز لشکر کے ساتھ عرصے تک بیکار رہے اور پھر پلونا کے سے ناموزوں مقام میں لڑنے مرنے پہ مجبور ہو گئے تو یورپین ٹرکی کے مقبوضات میں اس قدر قلت نظر نہ آتی جو اس وقت نظر آرہی ہے نہ وہ اس طرح ناتوان و کمزور رہتی۔

سلطان عبدالحمید خان نے جلوس کے ساتھ ہی ملک کو پارلیمنٹ عطا فرمادی لیکن اُس طرزِ عمل سے جو آگے ظاہر ہوا اُن کا خیال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (غلطی سے) خود مختار حکومت کو ہی ملک کے حق میں مفید و مناسب سمجھتے تھے۔ اسی کے تقاضے سے سلطان عبدالعزیز کی خون بہا کے نام سے بتدریج اُنہوں نے مدحت پاشا اور سرگروہان جمہوریت کو جلاوطن کردیا۔ ایسی حالت میں جب کہ خونریزی کی آگ بھڑک چکی ہو اور گورنمنٹ ہر قسم کے مشکلات میں گھری ہوئی ہو۔ پارلیمنٹ کو اپنے حامیوں کی جلاوطنی پر کمزور ہو جانا لازمی تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر سلطان عبدالحمید خان نے لطائف الحیل سے ۳۳ سال تک ملک کو دستور کے بابرکت وجود سے محروم کردیا۔

مشکلات کے سلجھنے پر سلطان نے اصلاحات کا آغاز کیا لیکن تمام اصلاحات سے جوہرِ اصلی یعنی حکومتِ خوداختیاری و دستور بالکلیہ خارج کردیا گیا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا سلطان خود مختارانہ حکومت کے زیادہ عادی ہوتے گئے اور آخر میں اس بارے میں عبدالعزیز ثانی بن گئے انتظامِ سلطنت کو جزئیات سے لے کر کلیات تک اپنے ہاتھ میں لے لیا وزرا تک عضوِ معطل بن گئے۔ آزادی کا نام قلمِ عثمانی سے حرفِ غلط کی طرح مٹادیا گیا۔ مدارس کے نصاب سے ایسی کتابیں خارج کردی گئیں جن میں حریت و جمہوریت کا شائبہ تک پایا جاتا تھا۔ ایسی اخبارات جن میں

معمولی خبروں کے سوا آزادی و حریت کا ذکر ہو بالکل معدوم تھے۔ نہ ترکی ٹپہ خانے ممالک غیر سے انہیں آنے دیتے تھے۔ یہی کتابوں کا بھی حال تھا اس پر طرہ یہ کہ جب تک مسودۂ اخبار و کتب گورنمنٹ کے محکمہ تفتیش مطبوعات میں معاینہ ہو کر اجازت نہ حاصل کرے طبع ہی نہ ہو سکتا تھا۔ آزادی کی انجمنوں اور کلبوں کا تو کیا ذکر ہے اس قسم کی باہمی گفتگو بھی جرم سمجھی جاتی تھی۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک خفیہ پولیس پھیلی ہوئی تھی کہ وہ مدارس میں، معابد میں، محافل میں، مساکن میں آزادی کے تذکرہ کی خبر رکھے اور خفیہ ہی خفیہ حریت کے نام لیوا کی مرمت کر دے۔ جو شخص آزادی کا نام ہی لے لیتا یا تو اس کو ملازمت یا سرکاری نوازشات کی بارش سے رشوت دی جاتی کہ آزادی سے توبہ کرے یا فرمان سلطان و حکم مشیران سلطانی سے باسفرس کی مچھلیوں کی خوراک بنتا۔ خوش قسمت ہوتا تو یورپ میں بھاگ کر پناہ لیتا۔ اس آزادی کے خون پر تو صبر کر لیا جاتا لیکن غضب تو یہ ہوا کہ کل چھوٹے بڑے کام سلطان نے اپنے ذمے لے لیے۔ اس سے ادھر تو ان وزرا و افسروں سے جو انتظام مملکت کا فطرتی جوہر رکھتے تھے بلحاظ مسلمات علم الاقتضاد قابلیت سلب ہوتی گئی ادھر اکیلے سلطان کے لیے لامحالہ ناممکن ہو گیا کہ ایسی عظیم الشان سلطنت کا انتظام اکیلے ہی اکیلے کر سکیں۔ اس لیے ناگزیر طور پر سکریٹریوں کی تعداد بڑھائی گئی اور ایسے لوگ ان عہدوں پر مقرر ہوئے جن کی ترقی کا مدار حرم کی سازشوں یا اور طرح کی مکاریوں اور روباہ بازیوں پر تھا۔ ان بدمعاش خاتنوں نے سلطان عبدالحمید کو یقین دلایا کہ تمام رعایا آپ کی دشمن ہے۔ آپ کی خیر اسی میں ہے کہ قصر یلدیز کو قلعہ کی طرح مستحکم بنا کر اس میں رعایا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں رفتہ رفتہ یہ بدمعاش الصلی سلطان بن گئے۔ ایک طرف خزانۂ شاہی سے گھر بھرنے لگے تو دوسری طرف

عہدوں کی عطا جرایم کی معافی، ٹیکسوں کی تخفیف اور ہر ایک کام کے معاوضہ میں رشوت لینے لگے اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے کہ سلطان کے جواری خزانہ کو کس طرح جونک کی طرح چوس رہے تھے صرف شیخت پناہ سید ابوالہدیٰ کی نظیر کافی ہے جن کے گھر سے دستور کے بعد معتوبی سے مرجانے پر چار لاکھ روپیہ نکلا جب مرشد کی یہ حالت ہو تو مقتدی کیسے ہونگے۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ رشوت دینے والے رشوت کا عوض حاصل کرنے کے لیے رعایا پر ظلم ڈھانے لگے۔ ظلم وستم کی کثرت سے رعایا چیخ اٹھی لیکن عبدالحمید خان کی کان پر جوں تک نہ رینگی۔ عبدالحمید خان سکہ انگلستان، منہ، دست و بازو، جو کچھ تھے یہی تھے جس کا فتوا چاہتے پیش کرتے اور جس کو چاہتے ڈال رکھتے۔ سلطان ثانی مقام شیخ الاسلام کو متحد کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے ملک اپنی رعایا کا [illegible] مقدس سرپنچوں تک [illegible] رفیق اعلیٰ راتب فیضی نے غدر مچا رکھا تھا لیکن مظلوموں کی داد رسی نہ لگتی تھی۔ آزادی کی انسدادی تدابیر میں، ملک کی تعلیمی، تمدنی، زراعتی، صنعتی اصلاحات پس پشت ڈالدی گئی تھیں۔ خفیہ پولیس، محکمۂ تفتیش مطبوعات و مطابع، قصر یلدز کی قلعہ بندیوں کے مصارف، کثیر التعداد مشیروں کی ماہواروں اور حرم کے فرمائشوں اور یورپین بنکوں میں اپنے ذاتی نام سے روپیہ جمع کرنے کی بدولت خزانہ میں اس قدر رقم موجود ہی نہ رہتی تھی کہ وہ ایسے مفید کاموں میں کما حقہ خرچ ہو سکتی۔

انیسویں بیسویں صدی کے دور میں جب کہ یورپ بھر میں کم و بیش کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ موجود ہو اور ایسے ممالک مشرق تک میں آزادی اور حکومت خود اختیاری کی صدا بلند ہونے لگی ہو جو اس کو جانتے تک نہ تھے

ناممکن تھا کہ نام یورپ میں ازمنۂ مظلمہ کی حالت قائم رہتی۔ ترک جو چالیس پچاس سال سے آزادی و حریت کے خواہاں ہیں اور اس کی خاطر جان جوکھوں میں ڈال کر دو سلطانوں کو بآسانی معزول کر چکے ہیں سلطان عبدالحمید کے دور حکومت میں اس فرق کو محسوس کرنے لگے جو ان کی ہمسایہ یورپین مملکتوں میں اور ان کے ملک میں بین طور پر نظر آتا تھا۔ وہ سلطان کی غلطی اور جابرانہ افعال سے تنگ آ گئے اور از سر نو انقلاب کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان ارادوں میں ان کو غیر سلطنتوں کے ڈاکٹر خانوں سے بہت کچھ مدد ملی جن کے ذریعے آزادی کی ترغیب دینے والا کم مزاحمت کے ساتھ آ سکتا تھا۔ وہ یورپ میں تعلیم کے لیے بکثرت جانے لگے اور وہاں ان جلاوطنان ترک سے بآزادی ملنے لگے جو آزادی اور حب وطن کی خاطر وطن سے دور، پردیس میں غریب الوطنی کے مصائب جھیل رہے تھے۔ سب سے پہلے عیسائی رعایا نے کچھ تو اقتدار سرکاری کے مظالم سے اور کچھ حصول آزادی کے خیال سے یورپین گورنمنٹوں کی امداد اور سازشوں کے بل بوتے پر فساد شروع کیا اور جب ترکی فوجوں نے ان کی مزاج پرسی کی تو تمام یورپ کو سر پر اٹھا لیا۔ اس طور پر یورپین دول کی مداخلت شروع ہوئی۔ یونان سے جنگ چھڑ گئی اور باوجود فتح کے کریٹ جو دراصل جنگ کا مبدء تھا۔ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور عملاً یونان کے قبضہ میں آ گیا۔ مقدونیا میں یورپین مداخلت شروع ہو گئی۔ مفسدین کی ان شورشوں اور یورپین مداخلت کی روک تھام میں عبدالحمید خان نے ہمیشہ کمزوری دکھائی ہے اور اس امید پر کہ شہنشاہ جرمن (جو درحقیقت دنیا میں سب سے زیادہ امن کا دشمن ڈپلومیٹ اور خود غرض ہے) دوست بنیگا۔ نہایت اہم مراعات بالکل زار کے ترخ پر جرمن گورنمنٹ جرمن رعایا کے ساتھ کیے۔ اس سے ادھر دوسری گورنمنٹوں کو دشمن بنا لیا اور ادھر وقت پر ہمیشہ جرمن دغا دیتا رہا۔

سلطان عبدالحمید خان اور اُن کے مشیر یہ بالکل بھول گئے تھے کہ ملک کی اصلاح اصلی اُسی صورت میں ممکن ہے کہ رعایا حب وطن کے جذبات سے متاثر کی جائے وہ سلطنت کی ذمہ داریوں میں شریک بنائی جائے اور اُس کو اُس لا انتہا دولت سے جو ترکش امپائر میں قدرت کی فیاضی سے جمع ہے کام لینے کے قابل بنایا جائے۔ سلطان و رعایا میں دوری نہ رہے اُس کی شکایات پر فوراً توجہ کی جائے۔ یورپ و ہندوستان کی طرح تدریج حکومتِ خود اختیاری رائج کی جائے۔ پریس کی مسلوبہ آزادی واپس دی جائے۔ اگر یہ کام کیے جاتے تو ۲۷۔ اپریل کا روزِ سیاہ کبھی بھی عبدالحمید خان کو نہ دیکھنا پڑتا۔ اور نہ اُن کے اعلیٰ کارنامے اس ایک اہم غلطی کی وجہ سے ناقابلِ اعتنا ہو جاتے مگر ما تدری ما ذا کسب غداً قدرت کو کچھ اور ہی گل کھلانا منظور تھا۔ عبدالحمید خان اپنے مشیرانِ خاص کے کرتوتوں کی بدولت اپنی خفیہ پولیس اور محکمہ تفتیش کے گھمنڈ میں پڑے رہے رعایا کے دل غضب آلود ہوتے گئے۔ جاپان کے فتوحات سے اور مظفرالدین آں جہاں کے اپنی رعایا کو حکومت میں شریک و سہیم بنانے سے اور اُن مراعات سے جو اُن کی ہمعصر عیسائی رعایا کے ساتھ ہونے لگے نوجوان ترک جوش میں آتے گئے اور انقلابِ طرزِ حکومت و استحصالِ حُریت پر تل گئے۔ خوش قسمتی سے اُنہوں نے ہنرا کسلنسی حسین حلمی پاشا کی سرپرستی حاصل کی جو اُسوقت مقدونیا کے انسپکٹر جنرل تھے اور اب صدرِ اعظم ہیں۔ ہنرا کسلنسی ترکوں کے نہایت قابل تجربہ کار، بیدار مغز، ہمدرد ملک، مستقل مزاج، منتظم سلطنت، افسر ہیں، اکثر صوبجات اور نیز حجاز میں گورنر جنرل رہ چکے ہیں۔ اس لیے اُن تمام ابتریوں سے جنہوں نے عثمانی حکومت کو داغدار کر دیا ہے واقف ہیں۔ آزادی و جمہوریت کی بُری گت دیکھکر اُن کا دل بیٹھ گیا تھا۔ نوجوانوں کے جوش کو دیکھکر

ہمت آئی۔ ان کی تجاویز کو اندر ہی اندر اس طرح مکمل ہونے دیا کہ خفیہ پولیس کو مشیران سلطانی کو، اور خود سلطان تک کو مطلق خبر نہ ہونے پائی۔ مقدونیا کی پوری فوج ہمدرد و مشورہ بنائی گئی اور گذشتہ جولائی میں دفعتاً تمام طلسم سے پردہ اٹھا کر عبدالحمید خان کو بتایا گیا کہ یا تو وہ حکومت خود اختیاری عطا کریں یا خونریز لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقت عبدالحمید خان کی آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ ان کی غلط پالیسی نے ملک کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ کیسے خائن و بدمعاش سکریٹریوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے مصلحت شناسی و انجام بینی سے پارلیمنٹ کی طلبی کا اعلان (جس کو برسوں سے ہو گئے ۳۲ سال گزر چکے تھے) دیدیا اور ان تمام ممنوعات کو اٹھا دیا جو آزادی کی مزاحمت کر رہے تھے۔

عبدالحمید خان کی اس فیاضی نے ترکی مملکت میں ایک مبارک اور خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ مختلف المذاہب، مختلف الاقوام، مختلف الممالک رعایا جو اب تک دشمن یا کم از کم اجنبی بنی ہوئی تھی بالکل متحد ہو گئی اور روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ یہی مہربانی اگر دس برس کی لڑائی کے بعد بھی ملتی تو آج عثمانی مملکت میں اس طرح کی کمزوری نہ آئی ہوتی۔ تمام دنیا اس حیرت انگیز مرحمت سے انگشت بدنداں ہو گئی۔ کیونکہ کسی ملک میں بلا خون خرابے اور جاں ستانی لڑائیوں کے آزادی اور حکومت خود اختیاری اس طرح آناً فاناً حاصل نہیں ہوئی۔

پارلیمنٹ کی طلبی پر صلح و امن کے ساتھ مبعوثین کا انتخاب ہوا اور پارلیمنٹ کا دھوم دھام کے ساتھ افتتاح ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ظاہر ہونے لگا کہ پارلیمنٹ کو عبدالحمید خان سے اور عبدالحمید خان کو پارلیمنٹ سے بدگمانی ہے اور اس بدگمانی کی بدولت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں۔ پارلیمنٹ اور ینگ ٹرکش پارٹی اس امر سے بخوبی واقف تھی کہ ۳۲ سال کے پیشتر بھی

ایک مرتبہ اسی طرح ملک کو آزادی مل چکی تھی لیکن عبدالحمید خان کے خیالاتِ شخصیت و خود مختاری نے اُس کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔ اور ۳۳ سال تک مکمل سے مکمل عذاب مجاز وطن کو جھیلنے پڑے تھے۔ اب بھی ممکن ہے کہ دفعتاً کسی مناسب موقع پر عبدالحمید خان اپنی خود مختاری و شخصیت کو اُن برطینت مشیروں کی مدد سے پھر قائم کر لیں جن کا ذریت کی بدولت ناس ہو چکا ہے۔ اور جو کسی قابو کی تاک میں ہیں۔

ینگ ٹرکش پارٹی کے خیال میں اس اندیشے سے اسی صورت میں نجات مل سکتی تھی کہ کیبنٹ میں صرف وہی لوگ بار پا سکیں جو اپنے افعال و اعمال سے حریت پسند ثابت ہو چکے ہوں۔ اور عبدالحمید خان جو اب تک اپنے زعم میں خود مختاری کو ہی موزوں ذریعۂ حکومت سمجھتے تھے ڈرنے لگے کہ کہیں ینگ ٹرکش پارٹی کی بدولت اُن کا بھی وہی انجام نہ ہو جو چچا اور بھائی کا ہو چکا ہے۔ اس کے انسداد کی تدبیر وہ یہی مناسب سمجھتے رہے کہ کیبنٹ میں نیز تمام ذمہ دار عہدوں پر وہی لوگ قابض رہیں جنہیں وہ معتبر و معتمد سمجھتے ہوں۔ یہ بدگمانی رفتہ رفتہ کامل پاشا کے ان احکام سے جو درحقیقت عبدالحمید خان کے فرامین تھے کھلم کھلا اختلاف و مخالفت کی صورت میں بدل گئی۔ اسی وجہ سے وزیر جنگ علی رضا پاشا کو جو دستور پسند تھے مصر میں امپریل کمشنری کے عہدے پر جانے کا حکم دیا گیا۔ اور اُن کے عوض ناظم پاشا جو سلطانی پارٹی کے ممبر تھے مامور کیے گئے۔ بعض بڑے بڑے سرغنے مثلاً انور بک وغیرہ یورپین ممالک میں ترکی سفارت گاہوں پر متعین کیے گئے۔ اس کارروائی پر پارلیمنٹ نے باستثنائے ۷ ممبروں کے کامل پاشا پر بے اطمینانی ظاہر کی ناچار انہیں مستعفی ہونا پڑا اور حسین حلمی پاشا جن سے زیادہ کوئی مستحق اور قابل ترک موجود نہیں ہے صدارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے اب علانیہ ینگ ٹرکش پارٹی پر اُس کے مخالف

اخبارات میں تبرا ہونے لگا حسین حلمی کے اس ارادی کی کہ فرانسیسی قوانین پر اصلاح مناسب ترکی میں رائج کیے جائیں برے پہلو سے اشاعت کی گئی اس کے انتقام میں کسی منچلے ینگ ٹرک نے ایک اخبار نویس کا خاتمہ کر دیا بلا شبہہ یہ ایک ناجائز اور ظالمانہ فعل تھا لیکن ایک خاص شخص کی خطاؤں کی ذمہ دار جو اشتعال طبع پر برانگیختہ ہو چکا تھا پوری ینگ ٹرکش پارٹی کیونکر ہو سکتی ہے؟۔

۱۳۔ اپریل کو قسطنطنیہ کی فوجوں نے ایک سارجنٹ میجر کے زیر سرکردگی ایسے خوفناک طریقے سے حسن فہمی اڈیٹر اخبار طنین کے قتل کا جواب دیا کہ ایک وزیر کی جان گئی ایک زخمی ہوا ایک قید کیا گیا۔ صدر اعظم اور چند وزرا پریذیڈنٹ پارلیمنٹ احمد رضا مستعفی ہو کر جان بچانے کو، جہاں سینگ سمائے بھاگ گئے۔ سرغنے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر منزل عدم کو پہنچائے جانے لگے، بظاہر یہ معلوم ہونے لگا کہ ینگ ٹرکش پارٹی کا زور مستاصل ہو چکا ہے۔ دار الخلافہ کے ہنگاموں نے اورنہ وغیرہ مقاموں میں متعصب مسلمانوں اور مسیحیوں کو سرود بہ ستان کا مضمون یاد دلا دیا۔ ان ظالموں نے ہفتہ بھر میں زبردستی ہزاروں عورتوں اور مسلمانوں کی جائیں لے لیں۔ اس فوجی شورش کے متعلق ابھی تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ عبد الحمید خان کا ہاتھ بھی شریک تھا یا نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ اپنے مشن میں کامیاب ہونے کے بعد انقلابات پیدا کرنے والی فوج شاہی انعامات سے مالا مال ہو گئی۔

ایک ہندوستانی مسلمان اخبار مؤید عبد الحمید خان کا خیال ہے کہ جو روپیہ اس فوج کے پاس نظر آیا وہ آستانہ عالیہ کے متمول یونانیوں کا عطیہ ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یونانیوں کو ایسی کیا حماقت سوجھ گئی تھی کہ وہ دیدہ و دانستہ جمہوریت کے مخالف بن کر اپنے پیر میں آپ کلہاڑی مارتے؟

اور پھر روپیہ دیں تو کس لیے دیں؟ شخصیت کے قیام کے لیے جس کے وہ سخت دشمن تھے؟ اور کس کو دیں؟ اُن کو جو متعصب مسلمان مولویوں کی مقتدی سپاہ کہلاتے ہیں۔ جن کو یونانی روزِ ازل سے اپنا مخالف جانتے ہیں؟۔ بہرحال اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ عبدالحمید خان کا ہاتھ اِس فساد میں نہیں تھا تاہم اِس سے تو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن کے قدیم حاشیہ نشینوں نے شاہی نوازشات کے حصول کی امید میں اپنے ناجائز منافع کے کم ہو جانے پر یہ آگ سلگائی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بغیر کسی زبردست پوشیدہ ہاتھ کے اِس قدر کثیر لشکر صرف کسی سازجنٹ کی احکام پر اِس طرح اپنے وزرا سے برسرِ پرخاش ہو جائے اور اُن پر حملہ کر سکے۔ غرض جو کچھ بھی ہو فوج انقلاب میں کامیاب ہو گئی مگر آٹھ دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ہزارہا ترکوں کا لشکر سالونیکا سے حیرت انگیز مستعدی و عجلت کے ساتھ قسطنطنیہ کے گرد و نواح میں پہنچ گیا اور تین ہی دن میں پایہ تخت کے کثیر حصہ لشکر کو ملا کر باستثنائے سرائے یلدز و سلیمیہ بارکس قسطنطنیہ پر قابض ہو گیا اور اپنے تمام مخالفوں کو گرفتار کر لیا بعدازاں دو دن کے بعد یعنی آغازِ انقلاب سے دو ہفتے کے اندر سلطان محمد رشاد ۳۳ سالہ قید سے نکل کر فرمانروائے مملکتِ عثمانی بن گئے اور عبدالحمید خان کو چار ایسے آدمیوں کی زبانی جن میں تین آزادی و حریت کے استحصال کی خاطر اُن کے اور اُن کے وزرائے سابق کے ظلم و ستم کا شکار بن چکے تھے حکم معزولی سُننا پڑا اور اِس کے بعد سلونیکا کو صرف دو بیٹوں اور ناکتخدا لڑکیوں اور بیویوں کے ساتھ اُسی طرح نظر بندِ سلطانی ہونے کے لیے جانا پڑا جس طرح اب تک وہ اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو رکھتے آئے تھے

ان فی ذلک عبرۃ لمن اعتبر۔

عبدالحمید خان کے ہندوستانی ہمدرد خواہوں کا یہ خیال ہے کہ ینگ ٹرکش پارٹی کے لیے ہی مناسب تھا کہ وہ خان کو بدستور خلیفۃ المسلمین بنا رکھتی۔ لیکن ذرا بھی غور و تامل سے کام لیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ ینگ ٹرکش پارٹی کو روز روشن کی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ باوجود اس کے کہ آزادی اور حریت کا چرچا ابھی زوروں پر ہے۔ پارلیمنٹ اجلاس کر رہی ہے اور اس میں اس کی پارٹی کا پلہ بھاری ہے اس کے ہم نوا وزارت اور اعلیٰ ترین خدمتوں پر مامور ہیں پھر بھی اس کے لیڈر لاابالی الجیل سے دور دراز ممالک میں متعین کر دیے جاتے ہیں۔ فوج صرف سازشیں کرتی ہے۔ یہاں ایسا فساد برپا کرتی ہے کہ اس کی پارٹی میں رہنے والے وزرا اور اعلیٰ افسر مقتول، مجروح، مقید کر دیے جاتے ہیں یا مفرور ہو کر جان بچانے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں ینگ ٹرکش پارٹی کے پاس کیا ضمانت تھی کہ جب پارلیمنٹ کے اجلاس ختم ہو جائیں، وزرا پایہ تخت کے گرد و نواح میں خاموشی سے کام کرتے ہوں۔ رستہ کا چرچا کسی قدر پرانا ہو گیا ہو تو غفلت سے فائدہ اٹھا کر عبدالحمید خان کی حمایت کے بھروسہ پر حریت کا اسی طرح خاتمہ نہ کر دیا جائیگا جس طرح آج سے ۳۳ سال پیشتر کیا گیا تھا۔ دوسری جانب عبدالحمید خان سے ناممکن تھا کہ ایسے وزرا اور افسروں اور فوج پر بھروسہ کرتے جنہوں نے کھلم کھلا ان سے لڑائی کی اور جن کے رحم پر ان کی اور ان کے خاندان کی جان سلامت رہی۔ ایسی حالت میں بجز سلطان کردی کے اور کوئی علاج نہ تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ آزادی کی مزاحمت کرنے والے فرمانرواؤں ان کے خاندان والوں، ان کے حامیوں کا انجام آزادی کی فتح پر بخیر نہیں ہوا ہے۔ ینگ ٹرکش پارٹی نے جس طرح کھوئی ہوئی دولت کو حاصل کر دیں

بے نظیر مستعدی کا اظہار کیا۔ اُسی طرح اُس نے صرف خطاواروں کو سزا دینے اور عبدالحمید اور اُن کے خاندان سے نیک سلوک برتنے میں اپنی فیاضی سے نام پیدا کیا۔ اِس موقع پر بلاشبہ عبدالحمید خان کی اُس امن پسندی کا بھی اعتراف کرنا چاہیے جس سے خونریزی بہت جلد ختم ہو گئی۔

عزل حمیدی کے ساتھ ہی اُن کی دولت کو گورنمنٹ کے خزانے میں داخل کرنے اور کورٹ مارشل کے ذریعہ سے سنگین سزاؤں کے دینے پر بھی ینگ ٹرک عبدالحمید کے ہندوستانی ہواخواہوں کی بدولت نشانۂ سہام ملامت بن رہے ہیں۔ لیکن انصاف اور بصیرت کی نگاہوں میں یہ افعال جایز نظر آتے ہیں۔ تمام دنیا کے فرمانرواؤں کا مال ومنال اُن کی گورنمنٹ کی ملکیت میں داخل ہے اور ایک فرمانروا کے عزل و مرگ پر اُس کے جانشین کے قبضہ میں آتا ہے۔ عبدالحمید خان کی جو کچھ آمدنی اور دولت تھی۔ وہ سلطنت اور رعایا کی تھی جو اُن کو فرمانروائی کے معاوضہ میں دی گئی تھی جب وہ سلطنت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیے گئے تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اُن فراواں خزاین سے بلا معاوضہ متمتع ہوں۔ جو قوم کا مال تھی۔ خاصکر ایسی حالت میں جب کہ عبدالحمید خان کے طرز حکمرانی سے خرچ کا پلہ آمدنی سے بڑھ گیا ہو اور اصلاحات افواج بر و بحر، نظم و نسق، اور امور رفاہ عام کے لیے روپیہ کی شدید تر ضرورت ہو۔ روپیہ لے کر ترکوں کی نئی گورنمنٹ نے عبدالحمید خان اور اُن کی فیملی کو مفلس و محتاج نہیں بنا دیا۔ عبدالحمید خان اور اُن کے اُن بچوں کو جو سلونیکا میں موجود ہیں قریب قریب ڈھائی ہزار پونڈ (۳۴ ہزار روپیہ کلدار) ماہوار گزارے کے لیے منظور کیے گئے ہیں۔ اور یہ موجودہ حیثیت میں زندگی بسر کرنے کے لیے کافی و وافی ہیں۔ اِس وظیفہ کے ماسوا جو اولاد دار الخلافہ میں ہے اُس کے لیے بھی بیش قرار ماہوار مقرر کر دی گئی ہے۔ اب رہیں وہ سزائیں جو مخالفان دستور کو دی جا رہی ہیں

اُن کے متعلق معترضین کسی ملک یا قوم یا مذہب کا کوئی ایسا قانون پیش کر سکتے ہیں جس میں قاتلوں، باغیوں، غداروں کی سزا قتل یا شدید حبس دوام نہ ہو؟ قسطنطنیہ کی نئی گورنمنٹ باضابطہ فوجی عدالتوں کے ذریعے اُن مجرموں کو سزا دے رہی ہے جنہوں نے ۱۳- اپریل کو ہنگامہ و غدر برپا کیا تھا اور بیسیوں بے گناہوں کی جانیں لی تھیں یا دورِ استبداد میں سخت ترین جرائم اور بدمعاشیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ بلاشبہہ فاتح فوج نے قبضۂ قسطنطنیہ کے ساتھ ساتھ تمام مقابلہ کرنے والی فوج اور تمام اُن فوجی و سیول خیلوں کو جن کا سازش میں گمان تھا جنگی قواعد کے لحاظ سے نظربندی میں لے لیا جو سزائیں کورٹ مارشل کے ذریعہ دی گئی ہیں اُن کو بھی ہندوستانی ہوا خواہان حمیدی نہایت ہیبت ناک شکل میں پبلک کے سامنے پیش کر رہے ہیں لیکن جن لوگوں نے اُن اخباروں کو بالاستیعاب پڑھا ہے جو اودر لینڈ میل میں ہر ہفتے وصول ہوتے ہیں بخوبی جانتے ہیں، کہ سزاؤں میں ممکن سے ممکن رعایت کی گئی ہے۔ ہزاروں سپاہی آیندہ نیک چلن بننے کے حلف پر رہا کر دیے گئے جن لوگوں کی صریح شرکت ۱۳- اپریل کے ہنگامے میں ثابت ہوگئی اور جنہوں نے خود خونریزی میں حصہ لیا تھا بمقتضائے "فی القصاص حیوۃ" وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچائے گئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بمشکل ڈیڑھ دو سو ہوگی۔ اِسی تعداد مناسبت سے کم درجے کے مجرموں کو حبس و جلاوطنی کی سزا مختلف میعاد کے لیے دی گئی یا جائداد ضبط کی گئی۔ دنیا کے کسی کانسٹیٹوشنل ملک کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملیگی جہاں مخالفانِ حریت کو حریت کی فیروزی پر اس قدر کم سزائیں دی گئی ہوں۔ بدکردار علما و مشایخین، وزراو معتمدین کو جو سزائیں دی گئی ہیں وہ بھی قابلِ استعجاب نہیں۔ جس طرح ہندوستان کے مولوی و مشایخ علم و تقدس کے پردے میں جامۂ تزویر کو

پہنے ہوئے ہیں، دیسی ریاستوں کے امراء حکام اپنی قابلیت و لیاقت کے ساتھ سازشیں کرتے اور ریاستوں کو تباہی میں ڈالتے ہیں۔ اسی طرح کے مولوی، مشائخ، وزراء، حکام، قسطنطنیہ میں بھی موجود ہیں۔ اور ان ہی بزرگواروں نے دورِ استبداد کو قایم رکھا تھا۔ چنانچہ ابو الہدیٰ جو مرشدِ سلطان تھا اس کے گھر سے چار لاکھ روپیہ نکلا اور اسی طرح تحسین، احمد، راتب، راغب وغیرہ کے پاس سے لاکھوں روپیہ برآمد ہوا۔ اور بہت سی سازشیں ظاہر ہوئیں اور اسی بنا پر خود عبد الحمید خان کے حکم سے اکثر ایسے حضرات گرفتار اور زیرِ تحقیقات تھے۔ اب عدالتہائے فوجی نے ایسے بدمعاشوں کو بعد ضبطی جائداد جلاوطن کر دیا ہے۔ اور یہ بالکل جایز سزا ہے نئی ٹرکش گورنمنٹ کے معترضین اُن سلوکوں کو بھول جاتے ہیں جو ایماندار عہدہ داروں اور وزراء کے ساتھ کیے گئے ہیں۔ توفیق پاشا وزیرِ خارجہ طرحان پاشا وزیرِ اوقاف، احمد مختار پاشا امپیریل کمشنرِ مصر، وغیرہ جو عبد الحمید خان کے عہد میں اپنی لیاقت و وفاداری قوم پرستی کے لیے مشہور تھے اور اعلیٰ ترین ذمہ داریوں کو کامیابی سے انجام دے رہے تھے۔ وہ اب بھی سفارت وغیرہ کے جیسے ذمہ دار عہدوں پر مامور ہیں۔ مجرموں کی سزاؤں کو ظلم خیال کرنا اور نکوکاروں کی قدردانیوں اور عمدہ سلوکوں کو ظاہر نہ کرنا منصف مزاجی اور شانِ اڈیٹری کے لیے سنگین عیب ہے۔

سلطان محمد خامس کے متعلق بہت سی بیہودہ باتیں مشہور ہونے لگی ہیں۔ ترکی فرمانرواؤں کے اُس ناپاک رواج کے کارن کہ ولی عہد اور دوسرے شہزادے معزز اسیرِ سلطانی کی طرح دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے جائیں جس پر عبد العزیز خان اور عبد الحمید خان نے سخت تعصب، تشدد اور اصرار کے ساتھ عمل کیا۔ اور جو خوشی کی بات ہے کہ دستور کی برکت سے اب نیست و نابود ہو گیا ہے۔ ترکی ولیعہد سلطنت

وملکداری کے لیے بجز شاذ حالتوں کے جب کہ فطرتاً زبردست اور حکومت کرنے والا دماغ لے کر آتا ہے عموماً نالائق امرا، وزرا کے بھروسے پر سلطنت چلانے والا ہوتا ہے۔ نیز دنیا کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کس دل و دماغ کا شخص ہے۔ اس لحاظ سے سلطان محمدؒ کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے اگر بالفرض سلطان محمدؒ خامس بہ تقاضائے عمر و حبس دوام عبدالحمید خان کی کہ دماغ والے نہ ہوں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کانسٹیٹوشنل گورنمنٹ کے فرمانرواکا کام صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک سے محبت رکھے رعایا سے مل جل کر ان کی وفاداری، عقیدت اور ہمدردی حاصل کرے رسمی تقاریب کو انجام دے۔ اپنی گورنمنٹ کے لیے ممالکِ غیر کے فرمانرواؤں اور جلیل المرتبت افراد کی دوستی پیدا کرے۔ باقی تمام ڈپلومیسی اور ملکداری کینیٹ کے ذمے رہتی ہے۔ سلطان محمدؒ نے اپنے طرزِ عمل سے دنیا کو بتا دیا ہے کہ وہ کانسٹیٹوشنل فرمانروا کے فرائض کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ایسے پبلک مقامات میں جہاں ایک لشکر کا لشکر ساتھ لے کر جاتے ہوئے سلطان عبدالحمید خان کا زہرہ گداز ہوتا تھا۔ صرف ایک اردلی کے ہمراہ بلا تامل پہنچتے ہیں۔ رعایا کے ڈیپوٹیشنوں سے ملتے ہیں۔ ممالکِ غیر کے سفرا سے اخلاق برتتے ہیں اپنی سلطنت کا دورہ کرنے والے ہیں۔ کانسٹیٹوشن کے قیام کا حلف اٹھا چکے ہیں شاہی اخراجات میں اپنی خوشی سے بہت بڑی تخفیف کر چکے ہیں۔ ملک کی صنعتی و تجارتی تحریکوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

اب رہی کینیٹ اس میں حسین جلمی اور سابق صدر اعظم فرید پاشا کی شرکت ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ اس انقلاب کا انجام بخیر ہوگا چنانچہ ابھی سے کینیٹ کی دانشمندی کا ثبوت ملنے لگا ہے۔ کینیٹ اخراجات میں کفایت شعاری کر رہی ہے۔ تخفیفِ مصارف میں بہت کچھ کامیاب ہو چکی ہے ملک میں امن و امان قایم کر چکی ہے۔ بجز خطا کاروں کے کسی سے تعرض نہیں کرتی

پارلیمنٹ اور ملک کا اعتماد حاصل کر چکی ہے۔ شورشوں اور بغاوتوں کو تیزی کے فرو کر رہی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کو پارلیمنٹ کی بدولت جو برکتیں حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے منجملہ وہ مالی فوائد جو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ہیں۔ شاہی سیول لسٹ میں معتدبہ کمی۔ اخراجات میں تخفیف یورپ کے بنکوں اور قصر یلدز میں بیکار پڑی ہوئی کثیر دولت کا کام پر لگایا جانا، بلکہ یا وہ اسٹریا کا بیان قرار دیا جا سکتا ہے کہ قومی خزانے کو ان چیزوں سے کافی مدد ملیگی اور امید کی جا سکتی ہے کہ موجودہ مالی مشکلات بہت کچھ رفع ہو جائینگی۔

ترکی کا یہ انقلاب سلطان کردی کی پہلی مثال نہیں ہے بلکہ اس سے بھی نازک تر حالات میں سلاطین معزول کیے گئے ہیں۔ باوجود اس کے اب بھی سلطنت عثمانی موجود ہے۔ خود عبدالحمید کے جلوس کے وقت دنیا کو ان پر اس قسم کا اطمینان کب تھا کہ وہ مشکلات کو سلجھا سکینگے لیکن ۳۳ سال تک انہوں نے حکومت کی۔ صرف ان میں یہی عیب تھا کہ آزادی کے مخالف تھے علی ہذا القیاس نئے سلطان کے جلوس پر جو کانسٹیٹوشنل فرمانروا کے فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ باوجود زبردست کیبنٹ اور محب وطن پارلیمنٹ کی موجودگی کے یہ خیال خام پکانے کی کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام کانسٹیٹوشنل گورنمنٹوں کے برخلاف ترکوں کو کانسٹیٹوشن سے فائدہ نہ پہنچیگا اور نقصان ہی نقصان ہوگا۔

عبدالحمید خان کے ہندوستانی مسلمان بہی خواہ جن کی آنکھوں پر محبت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کو جہاں مختلف المذاہب و مختلف الاقوام باشندے بکثرت رہتے ہیں۔ جو اب تک حلقہ اطاعت نکال ڈالنے کے لیے ہر قسم کی ریشہ دوانیاں کرتے رہے ہیں سلف گورنمنٹ عطا کرنی بالکل خلاف مصلحت ہے اور اس سے

اسلامی حکومت پر غیر اقوام کا غلبہ ہو جائیگا۔ اور وہ اس کو نقصان پہنچا کر رہینگی۔ اس کی تائید میں وہ آسٹریا اور بلگیریا کی کارروائیوں کو، اور فوج میں غیر قوموں کے داخلہ کو اور ایک عیسائی ممبر کی اس تقریر کو جو اس نے پارلیمنٹ میں گورنمنٹ کا مذہب اسلام نہ قرار دینے کے متعلق کی تھی پیش کرتے ہیں۔ میں زور کے ساتھ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تخیلات سرتاپا غلط ہیں۔

اس خیال کی بے بنیادی کہ مختلف الاقوام اور مختلف المذاہب باشندوں کے پارلیمنٹ میں موجود ہونے سے سلطنت پر مضر اثر پڑتا ہے خود اس طرز عمل سے بخوبی ثابت ہو جاتی ہے جو دستور کے بعد تمام عثمانی رعایا کا رہا ہے تمام غیر اقوام کی وہ سازشیں جو گورنمنٹ کی مخالفت میں زور سے ہو رہی تھیں حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ مسلمان، مسیحی، اسرائیلی سب کے سب اپنی گورنمنٹ اپنے ملک کی محبت میں اور دستور کے احترام میں اسی طرح متحد ہو گئے جیسے کہ کانسٹیٹوشنل ممالک میں ہوا کرتے ہیں۔ مقدونیا تک میں جو فساد کا منبع تھا کسی شورش کا نام نہ رہا۔ اور جب دستور معرض خطر میں آگیا تو تمام قوموں نے یکساں متحدہ طور سے ظاہر کر دیا۔ کہ وہ دستور کو چھوڑ نہیں سکتیں انتخابات مبعوثین میں کسی قسم کے تعصب یا پولیٹی سے کام نہیں لیا گیا مسلمان و غیر مسلمان دونوں نے بلا رو رعایت ایک دوسرے کے لائق امیدواروں کے لیے ووٹ دیئے۔

اس متحدہ استقبال دستور کے ماسوا خود دستور کی نوعیت پر لحاظ کرنا ضروری ہے تمام دنیا کی سلف گورننگ باڈیز کا تعلق زیادہ تر ان چیزوں سے رہتا ہے جو کل ملک اور کل رعایا پر یکساں موثر ہوتی ہیں۔ مثلاً قوانین عدلت کا اجرا، ٹکسوں کی کمی زیادتی، بجٹ کی منظوری، اوقاف کی نگرانی، تعلیم کی اشاعت، حفظان صحت کا انتظام، تجارت و صنعت کی ترقی،

استحکام ملک کی تدابیر وغیرہ وغیرہ ان چیزوں میں سب قوموں کا یکساں تعلق، یکساں نفع، یکساں نقصان رہتا ہے کسی قسم کے تعصب یا طرفداری کو مطلق دخل نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ غیر مذاہب کے ممبر تعصب کو دخل دے کر مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنے پر مستعد ہو جائینگے تو اُس وقت بھی کسی اندیشہ کا محل نہیں کیونکہ سلطان ٹرکی کی رعایا میں حصۂ غالب مسلمانوں کا ہی ہے اِس مناسبت سے اُن کے ممبر بھی زیادہ ہونگے وہ ایسے پاگل نہیں ہیں نہ ہو سکتے ہیں کہ اپنے نقصان پہنچانے والوں کے ساتھ مل کر ووٹ دیں۔ علاوہ ازیں گو غیر اقوام کے مجموعی ممبروں کی مجموعی تعداد معتد بہ ہے۔ لیکن مسیحیوں اور اسرائیلیوں کے جدا جدا اغراض ہیں۔ پھر مسیحیوں میں گریک، رومن پراٹسٹنٹ ارمن چرچ وغیرہ بھی ہیں اور اِن سب کی جدا جدا جماعتیں پارلیمنٹ میں ہیں۔ اِسی طرح اسرائیلیوں کے مختلف طبقے ہیں۔ نظر برآں ہر ہر فرقے کے ممبروں کی پارٹی جداگانہ ہو گی۔ اور کسی طرح وہ مسلمان ممبروں کا مقابلہ نہ کر سکینگی۔ دنیا کے دوسرے کانسٹیٹوشنل ممالک میں بھی اِسی طرح رعایا کے مختلف الاقوام، مختلف المذاہب ممبر پارلیمنٹوں میں آتے ہیں لیکن سلطنت کے ہم مذہب ممبروں کے سوا کسی اور پارٹی کی طاقت نہیں ہوتی کہ اپنے اغراض و مطالبات کو پورا پورا منوا لے۔ مثلاً انگلستان کو لیجیے۔ اس کی پارلیمنٹ میں عیسائی، اسرائیلی دونوں مذہب کے ممبر منتخب ہوتے ہیں۔ زید دشتی بھی دو مرتبہ اِس اعزاز کو حاصل کر چکے ہیں اسرائیلیوں کو چھوڑ کر خود مسیحی ممبر ایک فرقے یا ایک طبقے کے نہیں ہیں بلکہ مختلف فرقوں، مختلف طبقوں، مختلف پارٹیوں کے ممبر منتخب ہوتے ہیں ہر ایک کے اغراض جداگانہ ہیں پراٹسٹنٹ، رومن کیتھلک، آئرش انگلش، مزدوری پیشہ، تجارت پیشہ، امرا، عوام سب ہی شریک ہیں۔

اور ان میں سخت اختلاف مخالفت کی حد تک موجود ہے۔ باوجود اس کے ممالک برطانیہ کی پارلیمنٹ صدیوں سے کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہے اور کبھی ایسے احکام و قوانین نافذ نہیں ہوتے جو کسی ایک طبقہ کو ضرر پہنچائیں۔ برطانی پارلیمنٹ کے علاوہ برٹش انڈیا میں بھی ایک عرصہ سے سلف گورنمنٹ کا ایک حصہ لوکل میونسپل بورڈس اور لیجس لیٹیو کونسلوں کی حیثیت میں موجود ہے اور ان کی توسیع عنقریب ہونی والی ہے۔ ہندوستان میں مملکت عثمانیہ سے زیادہ مختلف قومیں اور مذاہب موجود ہیں۔ ان میں ذاتی اغراض و مصالح کے علاوہ متعصب اور تنگ نظر لیڈروں کی بدولت اختلاف، مخالفت کی صورت میں موجود ہے اور آج کل بھی ان ہی بزرگواروں کی بدولت صفحۂ قرطاس پر جنگ چل رہی ہے، باوجود اس کے اگر کاغذی حملوں، لفاظیوں اور فصاحت و بلاغت کو چھوڑ کر سلف گورننگ باڈیز کے کاموں کو جو آج تک انجام پائے ہیں دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ درحقیقت ان کو صرف ایسے امور سے تعلق رہا ہے اور رہیگا جو کل ہندوستان کے مذاہب و اقوام کے مصالح سے متعلق ہیں۔ اور ان سلف گورننگ باڈیز کے منتخب ممبر بلا استثنائے احدے بلا لحاظ مذہب و ملت روشن ضمیری اور وفاداری کے ساتھ ان میں ملک کی خدمت کرتے رہے اور کرتے ہیں اور یقیناً کرتے رہینگے۔ اگر ہندو مسلمانوں کے عملاً مابہ اختلاف امور ڈھونڈھے جائیں۔ تو مشکل سے صرف گورنمنٹ کی قربانگاہ ملیگی جس کی زمین بوسی کی تمنا میں دونوں مستعد نظر آتے ہیں اور ہندو بلحاظ کثرت آبادی و تعلیم حق پر بازی لے جاتے ہیں۔ اس کے سوا کبھی کبھی گاؤکشی وغیرہ پر جہلا سے کسی اشتعال طبع کے باعث لڑ پڑتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ میں غیر مسلمان رعایا کی سازش گورنمنٹ کے برخلاف، صرف اسی حکومت قہری اور مظالم حکام ترکی کے علی الرغم ہوتی تھی

اصلی مابہ الاختلاف امور رفع ہو جائیں تو کسی اندیشے کا محل حکومتِ خود اختیاری اور حریت کی بدولت نہیں ہے۔

آسٹریا کے ساتھ بوسینیا، ہرزی گوینا کے دوامی الحاق اور بلگیریا کی خود مختاری پر ینگ ٹرکش پارٹی کو مطعون کرنا بالکل ناحق شناسی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اس سے سلطنت عثمانیہ کا فائدہ ہوا ہے صوبجاتِ بوسینیا، ہرزی گوینا و بلگیریا کی علیحدگی کی اصلی ذمہ دار سلطان عبدالعزیز خان کی غفلت و عیاشی، سلطان عبدالحمید خان کی حد سے زیادہ احتیاط، وزرا اور جنرلوں کی رشوت ستانی ہے۔ یہ صوبے آج سے ۲۳ سال پیشتر خود عبدالحمید خان کے حکم سے علیحدہ ہو چکے ہیں عبدالحمید خان ان کو واپس لینا تو درکنار وہ مالی معاوضات تک حاصل نہ کر سکتے تھے جو از روئے عہد نامہ برلن ٹرکش گورنمنٹ کو آسٹرین و بلگیرین گورنمنٹوں سے واجب الوصول تھے۔ آج اگر ٹرکش پارلیمنٹ اور ینگ ٹرکش پارٹی کی بدولت صرف الفاظ کی خفیف تبدیلی سے عثمانی گورنمنٹ کو کثیر معاوضہ اور کچھ حصہ ملک واپس ملا۔ کئی کیپی چولیشن مسترد ہوئے۔ کئی نئی رعایات اُن ممالک میں اس کو حاصل ہوئیں تو کیا بُرا ہوا۔ اس نقصان کے مقابل جو الفاظ کی تبدیلیوں سے ہوا ہے یہ کیا کم فائدہ ہے کہ مقدونیہ کے فساد فرو ہو گئے۔ اس کے انسداد کے گراں تر مصارف سے سبکدوشی ملی۔ یورپین گورنمنٹوں کے مطالبات جو مقدونیہ کو مثل کریٹ خود مختار کرنے کے لیے شد و مد سے ہو رہے تھے ملتوی رہ گئے۔

بلگیریا کے ساتھ نیا عہد نامہ کرنے میں سلطان عبدالحمید کی عجلت قابلِ ملامت ہے۔ عہد نامے پر دستخط ایسے زمانے میں ہوئے ہیں جب کہ انقلاب پسند لشکر پایہ تخت کے گرد و نواح میں جمع ہو چکا تھا اور عبدالحمید خان نے بلگیرین و جرمن گورنمنٹوں کو خوش کرنے کے لیے فوراً عہد نامہ پر

دستخط کر دیئے۔ اگر کچھ دن تامل کیا جاتا اور پارلیمنٹ سے بھی مشورہ لیا جاتا تو یہ ممکن تھا کہ حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے زیادہ مفید شرائط پر معاہدہ کا استقرار ہوتا۔ اب مسئلہ کریٹ تصفیہ طلب رہا ہے اس کی نسبت امید ہے کہ گورنمنٹ عثمانیہ کے اعزاز اور حقوق کے مناسب اس کا تصفیہ ہوگا۔ کیونکہ خود ٹرکش کیبنٹ کے فارن منسٹر نے علی الاعلان ظاہر کر دیا ہے کہ یونان کی ساتھ کریٹ کے الحاق پر گورنمنٹ عثمانیہ راضی نہیں۔ اور وہ اپنے حقوق کی حفاظت کریگی۔ تاہم اگر بلگیریا، بوسینیا، ہرزی گوینا کی طرح اس کا بھی فیصلہ ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بھی عبدالحمید خاں پر ہے جنہوں نے تقریباً دس سال پیشتر عملاً اپنی کمزور پالیسی سے اس کو عثمانی گورنمنٹ سے علیحدہ کر دیا تھا علاوہ بریں کریٹ سے دول یورپ کی فوجوں کو واپس بلا لینے کا اعلان متفقہ دستور کے چھ چھے سے پیشتر دورِ استبداد میں ہو چکا تھا۔

دو چار ممبران پارلیمنٹ کا یہ خیال ظاہر کرنا کہ گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہ ہو اس وقت تک ناقابل بحث ہے جب تک پوری تقریر مع نتیجہ کے ہندوستانی پبلک کے پیش نظر نہ ہو جائے۔ ممکن ہے کہ ممبروں کی تقریر کا یہ مدعا ہو کہ گورنمنٹ عثمانی مثل دیگر ممالک کے اپنی کل رعایا سے یکساں انصاف کرے اور اس میں وہ کسی مذہب کی پابند نہ ہو جو درحقیقت سلطنت عثمانیہ کا طرزِ عمل ہے۔ لیکن اگر ان کا مطلب یہ ہو کہ وہ لامذہب گورنمنٹ سمجھی جائے تو ان کی تحریک تا وقتیکہ پارلیمنٹ مسلمانوں کی معدوم نہ ہو جائے ناقابل اعتنا ہے۔ انگلستان، فرانس وغیرہ کی پارلیمنٹوں میں بھی بڑے زور سے بحث ہوتی رہتی ہے کہ گورنمنٹ کو ملحد ہو جانا چاہیے اور کسی قسم کی مذہبی امداد یا کوئی مذہبی سرپرستی گورنمنٹ کو نہ کرنی چاہیے لیکن کبھی یہ تحریک منظور نہیں ہوئی تو پھر عثمانی پارلیمنٹ میں جہاں بفضل خدا، مسلمانوں کی کافی تعداد موجود ہے اور موجود رہیگی ایسا منصوبہ کیونکر پورا ہو سکتا ہے؟

ان سب کے ماسوا مملکتِ عثمانیہ میں ٹرکش گورنمنٹ اپنی رعایا کے ساتھ ایک قسم کا برتاؤ برتتی ہے اور سب کے ساتھ رعایات کرتی ہے۔ اگر قانون میں بھی اس عمل کا تذکرہ کیا جائے تو کیا ہرج ہو سکتا ہے۔

یہ الزام کہ فوج میں غیر مسلمانوں کا داخلہ جائز قرار دیا جائے کوئی الزام نہیں بلکہ درحقیقت ایک مبارک ارادہ ہے جس سے بجز فائدہ کے نقصان نہیں ہو سکتا۔ اب تک مملکتِ عثمانی میں سیول عہدے بلا امتیازِ قوم قابلیت و لیاقت و رسوخ کی بنا پر بلا تعصب دیے جاتے ہیں۔ لیکن کل فوج میں باستثنائے جرمن معلمین صرف مسلمان ہی شریک ہیں۔ غیر اقوام اس خدمت سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمانانِ ترک کے حصہ غالب کی وجہِ معیشت کا انحصار ملازمتِ سرکاری پر ہے اور غیر قوموں نے تجارت و صنعت پر اپنا قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن اس تجویز کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ترکوں کو اور دوسری مسلمان رعایا کو زندگی بسر کرنے کے واسطے مجبوراً تجارت، صنعت و حرفت کے میدانوں میں بھی قدم رکھنا پڑیگا۔ وہ یہاں ان لوگوں کی جگہ لینگے۔ جو ملٹری سروس میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان و غیر مسلمان دونوں کی وجہِ معیشت کے پلڑے مساوی ہو جائینگے۔ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ غیر مسلم ہتھیار پا کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑینگے۔ کیونکہ سلطنتِ عثمانی کا غیر مسلم عنصر بزدل قوموں کا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ جنگجو عنصر ہے جس کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھیار موجود ہیں اور وہ ان کا استعمال اچھی طرح جانتا ہے۔ گورنمنٹ کی اس پر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے سر تھا اور فتنہ و فساد مچاتا رہتا تھا۔ اب ملٹری سروس میں شریک ہونے سے وہ ڈسپلن کے تابع ہو جائیگا۔ گورنمنٹ اور مسلمانوں کی نگرانی پوری طرح رہیگی۔ جب ہندوستان میں ۶۵ ہزار گورے جنگی تعداد کی ہندوستانی فوج پولیس امپیریل سروس ٹروپس اور ۳۰ کروڑ ہندوستانیوں پر نگران ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ترک تھوڑے سے غیر مسلمان لشکر پر اپنا قابو نہ رکھ سکیں۔

سلطنتِ عثمانیہ کے انقلابات پر بحث ختم کرنے سے پہلے اس امر کا لکھنا ضروری ہے کہ جمہوری حکومت اور حریت کوئی زمانۂ حال کی یورپین پیداوار نہیں ہے بلکہ زمانۂ قدیم سے موجود ہے۔ خود اسلام نے شد و مد سے جمہوریت و حریت کی تعلیم دی ہے۔ آنحضرت سرورِ کائنات اور خلفائے راشدین کا دور حریت و جمہوریت کا دور رہا ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں مقامی امور کے بارہ میں اس مقام کی غیر مسلم رعایا سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا۔ گویا یہ لوکل سلف گورنمنٹ تھی۔ پھر شخصی اور استبدادی دور دورہ ہو گیا۔ لیکن چند جابر و ظالم حکمرانوں کے سوا عموماً تمام مسلمان فرمانروا، علما، امرا، سپہ سالاروں سے انتظامِ مملکت میں مشورہ لیتے تھے۔ اور مقامی امور میں مقامی سربرآوردہ رعایا سے بھی وقتاً فوقتاً رائے طلب کی جاتی تھی۔ ہر ایک رعیت کو شاہی دربار میں استغاثے کا حق تھا۔ غرض اسلامی لحاظ سے بھی پارلیمنٹ اور حریت کوئی ممنوع چیزیں نہیں ہیں۔

جس تفصیل سے بحث کی گئی ہے وہ غالباً اس امر کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ انقلاب خوش آیند ہے اگرچہ قانونِ فطرت کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ دوبارہ عالم میں نہیں آسکتی اور نہ وہ ایک وقت تباہ اور فنا ہونے سے بچ سکتی ہے لیکن اب بلحاظ اس کے کہ رعایا کے اختلافات مٹ چکے ہیں اور تیزی سے مٹائے جا رہے ہیں۔ دستور پسند فرمانروا، زبردست محبِ وطن کیبنٹ و پارلیمنٹ ملک پر حکمران ہے۔ یورپین گورنمنٹوں کے مصالح کے لیے یہ ضروری ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ خاصکر قسطنطنیہ پر اسلامی قبضہ بدستور رہے۔ کل مسلمانوں کو امید کرنا چاہیے کہ بفضلِ خدا اس انقلاب سے عثمانی سلطنت قبل از قبل تباہ اور فنا ہو جانے سے بچ گئی ہے۔

اب مملکتِ عثمانیہ کو چھوڑ کر ان دوسرے ممالکِ اسلام پر مختصراً نظر ڈالی جاتی ہے جہاں ہل چل ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے۔

مراکش کی قدیم اسلامی حکومت جہاں پرانا سلطان معزول اور نیا جانشین ہوا ہے بلحاظ اس کے کہ وہاں مغربی تعلیم کچھ بھی نہیں ہے۔ مغربی تمدن، مغربی سائنس سے سطحی واقفیت بھی نہیں ہے۔ جہاں اسلامی سلطنت صدیوں سے قایم ہے اور روز بروز زردی حالت میں پہنچ رہی ہے۔ جہاں کے باشندے جاہل ہیں اور جہاں یورپین گورنمنٹوں کے دندان آز تیز ہو چکے ہیں اور جہاں سے کوئی ترقی کی علامت نظر نہیں آتی۔ اب بمقتضائے قانون قدرت زوال پذیر ہو چکی ہے اور یقیناً بہت جلد مثل بخارا، خیوا، ٹونس اور والیان ریاست ہند کے فرنچ گورنمنٹ کے زیر اثر ایک زمینداری کی حیثیت میں آجائیگی۔ گو ہم سب کو اس کا رنج ہے لیکن یہ سمجھنا چاہیے "کہ نتواں کرد با تقدیر پیکار"

ایران کی حالت پھر کچھ کچھ اصلاح پذیر نظر آتی ہے۔ پارلیمنٹ از سر نو طلب ہوئی ہے۔ اگر اس کا قدم جم جاے تو بلحاظ اس کے کہ سلطنت قاچاریہ کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی ہے کسی ایک یورپ کی گورنمنٹ کا قبضہ دوسری گورنمنٹوں کے مصالح کے مخالف ہے۔ بہت سے محب وطن ایرانی ملک کی غمخواری کرنے لگے ہیں۔ یورپین ممالک کے حالات سے واقفیت ہے دنیا کی تجارت میں ایرانی بھی کچھ نہ کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ یہ ناممکن نہیں کہ ایران کی سلطنت فنا نہ ہو اور مثل ان یورپین گورنمنٹوں کے جو بہار ترقی دیکھکر اب سکون کے ساتھ سلطنت چلا رہی ہیں۔ ایران میں بھی قاچاری حکومت زیادہ عرصہ تک باقی رہے۔ لیکن اگر پارلیمنٹ کا قیام نہ ہو سکا تو یہ سلطنت بھی کسی زبردست یورپین طاقت کے زیر حمایت آجائیگی۔

مصر اور باقی ماندہ اسلامی دنیا کی جو حرکتیں آزادی یا ترقی کے لیے ہیں وہ ابھی ناقابل اعتنا ہیں۔ میں اس کے متعلق تفصیل سے پان اسلام ازم کے مضمون میں بحث کر چکا ہوں۔

ہندوستان میں مسلم لیگ کے معدودے چند ممبر ہندوؤں کے خلاف بالکل بیجا اور متعصبانہ ناروا مخالفت کرتے نظر آرہے ہیں۔ میں اُن تمام لیڈروں کے متعلق جو اس آرگنائزیشن میں حصہ لے رہے ہیں یہ خیال کرتا ہوں کہ اُن میں سے اکثر اپنے ذاتی اغراض کے حصول کے لیے دانا دشمنوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر شور مچاتے ہیں اور بعض نیک نیتی سے اپنے غلط مزعومات کی بنا پر اس کے موید بن گئے ہیں۔

میں نے اپنے مضمون میں ادعا کیا ہے کہ درحقیقت کوئی مابہ الاختلاف امر ہندو اور مسلمانوں میں بجز کشمکش ملازمت کے نہیں ہے۔ لیکن مسلمان حصول ملازمت سے اور کونسل یا میونسپل بورڈوں میں زاید ممبریاں پالینے سے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے تو چاہیے کہ وہ یونیورسٹی کی ڈگریاں اس قدر کثرت سے حاصل کرنے لگیں کہ ہندوؤں سے بڑھ جائیں۔ اس وقت یقیناً اپنا واجبی حصہ لینگے۔ آج کل مسلمان ڈگری یافتوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابل بمشکل فی صدی پانچ ہوگی حالانکہ لحاظ مردم شماری پچیس ہونی چاہیے تھی باوجود اس کے گورنمنٹ نے اپنی مہربانی سے مسلمانوں کو ملازمت میں اُن کی تعلیمی لیاقت سے زیادہ حصہ دیا ہے۔ لیکن اگر اعلیٰ عہدوں یا کسی خاص ڈپارٹمنٹ میں اُن کی تعداد کم ہو تو گورنمنٹ قابل الزام نہیں کیونکہ اس کے لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی ایم اے ہندو کے مقابل مسلمان مٹرکیولیٹ کو ترجیح دے۔ بفرض محال اگر مسلمان کونسلوں، میونسپالیٹیوں میں زیادہ ممبریاں حاصل کرنے کی، بدولت اپنی پرسنٹی سے زیادہ ملازمت میں حصہ لے سکینگے۔ اور چند ہزار مسلمان روزی پا لینگے تو کیا اس سے لاکھوں بے روزگار اور کروڑوں مفلس مسلمانوں کی ضروریات رفع ہو سکتی ہیں؟ اور کیا میدان ملازمت کے سوا اور ذرایع معاش موجود نہیں ہیں۔ باقی رہا یہ خیال کہ مکمڈ الکٹورل کالجوں کی بدولت وہ ہندوؤں کے رحم پر زندگی بسر کرنے لگینگے بالکل غلط اور

بے بنیاد خیال ہے کیونکہ سپریم و پراونشل کونسلوں، میونسپل و لوکل فنڈ بورڈوں کو اُن ہی مسایل سے تعلق رہتا ہے جو کل ہندوستان پر بلا استثنا حاوی ہوں آج تک کسی کونسل و بورڈ کے کسی ممبر نے کسی اجلاس میں کسی مسئلہ پر کبھی ایسی رائے نہیں دی ہے جو باشندگان ہندوستان کے لیے مضر ہو۔ ہاں بعض نامزد ممبروں نے نمکحرامی سے گورنمنٹ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ تعلیم کی اشاعت اور سلف گورنمنٹ، پبلک اور پریس کی آزادی کو روک دے۔ لیکن ایسے ممبروں سے ہندو مسلمان دونوں نالاں ہیں۔

مسلم لیگ کے لیڈر لفاظی تو بہت کرتے ہیں۔ لیکن ابھی تک انہوں نے بجز فرضی اوہام کے واقعات سے، اعداد سے، صحیح دلایل سے یہ نہیں بتایا ہے کہ کمسٹا لکٹوریل کالج میں کیا نقصان ہے۔ اور وہ اب تک کیا نقصان سلف گورننگ باڈیز کے ہندو ممبروں سے اُٹھا چکے ہیں؟ اور کیوں اُن کی تعداد کے تناسب سے زیادہ ممبریاں اُن کو ملیں۔ البتہ بعض ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں مسلمان امیدوار کے مقابلے میں ہندو اُمیدوار کامیاب ہوگیا۔ لیکن اس کے مقابل ہندو بھی ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن میں خود ہندوؤں نے مسلمان امیدوار کو ووٹ دیکر منتخب کرا دیا ہے۔ جن میں آنریبل جسٹس سید محمود، آنریبل راجہ علی محمد خان آنریبل ہمایوں نجاہ، آنریبل نواب سید محمد کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں ایسے ممبروں نے سلف گورننگ باڈیز میں اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بلا لحاظِ مذہب وملت ہندوستان کی خدمت کرتے ہیں چند روز پیشتر صوبجاتِ متحدہ میں کونسل کی ممبری کے لیے جو مقابلہ آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر عبدالمجید بیرسٹر اور آنریبل رائے سری رام اور آنریبل فیاض علی خاں میں ہوا ہے اور جس میں آنریبل مدن موہن اور آنریبل سری رام کامیاب ہوئے ہیں اُس پر ہندو مطعون کیے جاتے ہیں

اور کہا جاتا ہے کہ مکمڈالکٹوریل کالج کے نتیجے اسی طرح ہوا کرینگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پنڈت صاحب اور رائے صاحب ہندوستان کے اُن نامور لیڈروں میں ہیں جو بلا لحاظ مذہب وملت خدمتِ ملک کو فرض سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر رائے صاحب کے مقابل خود ایک ہندو امیدوار ناکام رہا اور پنڈت صاحب کے مقابل بھی اگر کوئی ہندو رہتا تو یقیناً ناکامیاب ہوتا۔ اور اس کے برخلاف جو مسلمان اُمیدوار تھے اُن میں مسٹر عبدالمجید سے واقفیت شاید صوبجاتِ متحدہ کو ہو تو ہو ورنہ باقی ہندوستان نہ اُن کے نام سے واقف ہے نہ اُن کے پبلک کاموں سے۔ البتہ مسٹر فیاض علی خان کو مسلمانانِ ہندوستان بحیثیت پریسیڈنٹ علی گڑھ کالج جانتے ہیں۔ گو وہ اسم بامسمی فیاض امیر ہیں لیکن پبلک کاموں میں آپ کی آزادی کی یہ حالت ہے کہ خود مسلمان آپ کی پریسیڈنٹی کالج سے نالاں ہیں اس حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ یہ دونوں مسلمان کامیاب ہو سکتے۔ اسی لیے ہندو دکنا اکثر مسلمانوں نے بھی اپنے ووٹ دونوں کامیاب ممبروں کو دیکر انہیں کامیاب کرایا۔

اسی طرح مسٹر رفیع الدین احمد بیرسٹر ہر مقام، ہر ایک اسپیچ ہر ایک مضمون، ہر ایک رزولیوشن میں پونا اور ایک دو بمبئی پریسیڈنسی کی اُن میونسپالٹیوں کے تذکرے کو بڑے زور سے پیش کرتے رہتے ہیں جہاں مسلمان ممبر منتخب نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ ظاہر ہے اُن مقاموں میں مسلمان بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں اُن کا حصہ تعلیم میں اور پبلک اسپرٹ میں بھی کم ہے۔ اس کے برخلاف وہاں پارسی ہندو آبادی کثرت سے ہے۔ جو تعلیم یافتہ ہے۔ ملک کی خدمت کے لیے تن من دھن سے تیار ہے۔ اور ان ہی لوگوں میں آنریبل مسٹر گوکھلے اور اُن کے جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ، ملک کی حالت سے واقف ایثار نفس کرنے والے

حضرات موجود ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے بلند پایہ اور عالی مرتبت جگر گوشگان ہند کے مقابل کم تعلیم یافتہ اور پبلک اسپرٹ نہ رکھنے والے مسلمان ممبر میونسپالیٹیوں میں ملک کی حالت سے وکالت کرنے کو انتخاب کیے جاسکیں۔ ان دو تین مقامات کے ماسوا بمبئی پریسیڈنسی میں مسلمان سلف گورننگ باڈیز میں اپنے واجبی حصہ سے زیادہ حصہ رکھتے ہیں۔ ہز اکسلنسی سر جارج ٹرنہم کلارک نے واقعات و اعداد سے اس کے متعلق کافی ثبوت اس اڈریس کے ثبوت میں پیش کیا ہے جو مسٹر رفیع الدین احمد کی سرکردگی سے ہز اکسلنسی کی خدمت میں باریاب ہوا تھا۔

اگر بمبئی پریسیڈنسی کے چند میونسپالیٹیوں میں مذکورہ بالا وجوہ سے انتخاب کی یہ حالت ہے تو اس کے جواب میں صوبجات متحدہ کو پیش کرسکتے ہیں جہاں دونوں قوموں کے متحدہ انتخاب سے مسلمان ممبر ہندوؤں کے قریب قریب مساوی تعداد میں موجود ہیں۔ حالانکہ یہاں بلحاظ مردم شماری و تعلیم کے مسلمان اور ہندوؤں میں ایک اور چار کی نسبت ہے۔

ان سب مثالوں کے قطع نظر اگر فرضاً یہ تسلیم کرلیا جاوے کہ متحدہ انتخابات میں ہندو پرسلنٹی سے کام لیتے ہیں تب بھی مکسڈ الکٹوریل کالج کے برخلاف کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس طریقے میں منتخب شدنی مسلمان و ہندو ممبروں کی تعداد پہلے ہی سے لازمی طور پر مقرر کردی جائیگی پھر کوئی وجہ شکایت ہی باقی نہیں رہیگی۔

ہندوستان کے گزشتہ فرمانروا ہونے سے مسلمانوں میں جنگی جوش موجود رہنے اور تاج برطانیہ کی حفاظت میں ان کے سپاہیوں کے شریک ہونے کے عوض خاص رعایات کا طلبگار رہونا کسی طرح انہیں زیب نہیں دیتا سکھ، مرہٹے۔ گورکھے بھی ان ہی دلائل سے خاص

رعایات کے طلبگار ہو سکتے ہیں۔ نیز پارسی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تاج برطانیہ کی تجارتی خدمات بجا لانے اور متمدن سٹیزن ہونے کی حیثیت سے نیز اپنی قلت تعداد سے خاص مراعات کے سزاوار ہیں۔ پس ایسی رعایتیں اس گورنمنٹ کے شایان شان نہیں ہیں جو میزان انصاف میں تمام رعایا کو مساوی حقوق دینا چاہتی ہے۔

افسوس ہے کہ مسلم لیگ کی آواز کو جس کے پردہ میں دوسرے مشرق کام کر رہے ہیں اور جو مسلمانوں کو ایک غلط راہ پر لیجا رہی ہے اور ہندوستان کی ترقی میں ہندو مسلمانوں کے مابین ایک آگ کی خندق بنا رہی ہے انگلو انڈین اخبارات نے اس قدر بلندی دے دی ہے کہ وہ اپنے مطالبات میں کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کر لیگی ساتھ ہی آگے چل کر زمانہ بتائیگا کہ ع ایں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است۔ اور معلوم ہو جائیگا کہ ہندوستان میں جب تک ہندو مسلمان اقتصادی و سیاسی امور میں متحد نہ ہو جائینگے کبھی رعایا کی حیثیت سے بھی ترقی نہیں کر سکینگے۔

اب صرف ایک اور اسلامی حصہ پر نظر دوڑانی ہے اور وہ سرزمین افغانستان ہے جہاں حال میں ایک سازش ہز مجسٹی سراج الملۃ والدین اور ان کے جواں بخت جواں سال پرنس کو منزل عدم پہنچانے کی غرض سے کی گئی تھی مگر خوشی کی بات ہے کہ سازش کا مواد پھوٹ نکلنے سے پہلے آسانی سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔

ابتدائے مضمون میں اجمالاً اصول ارتقا سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام بلحاظ اپنے تبلیغی اور اعلیٰ و اکمل مذہب ہونے کے کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کی ایک پیرو قوم حضیض تنزل میں بہ تقاضائے اصول فطرت پھنس گئی ہے تو دوسری قوم اس کی قایم مقام بن کر مذہب کی شوکت و عظمت کا سلسلہ باقی رکھتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے اور رہیگا

پان اسلام ازم کے مضمون میں مَیں نے رجماً بالغیب یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام کے جاہ وجلال کو ترقی دینے کا سہرا قوم افغان کی سر بندھیگا کیونکہ اب تک اُس نے گلزارِ عالم کی بہار نہیں دیکھی ہے۔ اور اُس کو دیکھنے کے قابل ہو چکی ہے۔ موجودہ سازش سے جو فرمانروائے افغانستان کی جان لینے کے لیے کی گئی اور اُن اُمور سے جو مضمون مذکور کی تحریر کے بعد واقع ہوئے ہیں اِس خیال کو رتبۂ ایقان حاصل ہو رہا ہے تعلیم کی اشاعت روبہ ترقی ہے۔ اصلاحات جاری ہیں۔ تجارت وحرفت کا میلان بڑھ رہا ہے۔ جہالت کم ہو رہی ہے۔ کل افغانی ایک مذہب وملت کے پیرو ہیں۔ افغانی شاہزادے بجز ایک دو مستثنیات کے رفتارِ زمانہ سے ماہر ہیں۔ ہز مجسٹی امیر کی زبردست طاقت کی یہ حالت ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی گورنمنٹیں اُن کی بغیر استرضا کوئی معاہدہ افغانستان کے متعلق نہیں کر سکتی ہیں۔ اور جو کر بھی لیتی ہیں تو ہز مجسٹی کی رضامندی درکنار دو روسال تک جواب بھی نہیں حاصل کر سکتیں۔ باوجودیکہ افغانستان میں فرمانروا کو خود مختارانہ اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن وہ اپنی خوشی سے رعایا کو شریک وسہیم حکومت بنا رہے ہیں۔ اِسی سازش کے موقع پر بآسانی ممکن تھا کہ سازشیوں کی فوراً گردن اڑا دی جاتی۔ لیکن اُنہوں نے تمام ذی اثر سرداروں کے سامنے پبلک طور پر تحقیقات کی اور بقدرِ جرم سزا دی۔ تاجدارِ افغانستان تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اُن کے حالات کا علم رکھتا ہے۔ اُن کے دکھ درد سے ہمدردی کرتا ہے۔ ایک تازہ مثال وہ امداد ہے جو مصیبت زدگانِ طغیانیٔ جہلم آباد کے لیے بلا کسی درخواست کے دی گئی۔ جب افغان جیسی بہادر قوم پر ایسا عالی دماغ، مدبر، ہمدرد فرمانروا حکمران ہو اور اُس کی شاہی خاندان میں اُسی کے جیسے شاہزادے موجود ہوں تو بلاوہ

اپنی چمک دمک سے کل دنیائے اسلام پر ضیا گستری کیوں نہ کریگی یہ ممکن بلکہ یقینی ہے کہ بہت ہی جلد افغانی جاہ و جلال عظمت و شان کی دھاک صفحۂ گیتی پر بیٹھ جائیگی۔ اسلام میں ایک نیا زرنگار دور پیدا ہوگا اور دہلی، غرناطہ، بغداد، سمرقند وغیرہ کی شان و شوکت و علم و ہنر کا سراغ کابل میں ملیگا۔

یریدون لیطفیوا نور اللہ بافواہہم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۵۔

محمد مظہر

معزول شدہ سلاطین ٹرکی

سلطان عبدالحمید خان ثانی سے پہلے ٹرکی کے دس سلاطین معزول ہو چکے ہیں جنکی تفصیل یہ ہے:

۱۔ سلطان مصطفیٰ اول۔ سادہ مزاجی اور عدم قابلیت کی وجہ سے معزول ہوئے۔

۲۔ سلطان عثمان خان ثانی۔ فوج کی مرضی کے خلاف حج کو جانا چاہتے تھے شیخ الاسلام نے حج ساقط ہونیکا فتویٰ دیا۔ مگر نہ مانا اور تیاری کردی اس پر تخت سے اتارے گئے۔

۳۔ سلطان مصطفیٰ اول دوبارہ تخت نشین ہوئے مگر پھر معزول کیے گئے۔

۴۔ سلطان ابراہیم ضعفِ دماغ کے الزام سے معزول کیے گئے۔

۵۔ سلطان محمد چہارم اس لیے معزول کیے گئے کہ سیر و شکار میں سے زیادہ مصروف رہتے تھے۔

۶۔ سلطان مصطفیٰ ثانی جنگ پطرس میں شکست کھائی اس لیے فوج نے معزول کیا۔

۷۔ سلطان سلیم ثالث شیخ الاسلام کے فتوے پر معزول کیا گیا۔

۸۔ سلطان مصطفیٰ چہارم کو سلطان سلیم کے قتل کے باعث معزول کیا گیا۔

۹۔ سلطان عبدالعزیز فتورِ دماغ کے باعث۔

۱۰۔ سلطان مراد بھی خللِ دماغ کے سبب معزول ہوئے

ٹرکی کا نیا دورِ حکومت

عربی میں ایک ضرب المثل ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ "اگر تمہارے پاس کوئی شخص فریاد لائے جس کا ایک کان کٹا ہوا ہو تو تم معاً اس کی طرف فیصلہ نہ کر دو کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے کے دونوں کان کٹے ہوئے ہوں" ہندوستان کے اخبارات نے ینگ ٹرکش پارٹی کی طرف سے اس قدر بدظنی پھیلا دی تھی کہ ٹرکی کے واقعات سے جہالت کا پردہ اُٹھنے کے قبل ہم اس جماعت کو مجسم عیب اور شر و فساد کا مجموعہ خیال کرتے تھے۔ کبھی ہم نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ فریقِ مخالف کے دعاوی پر کان دھریں اور اُن کے بیانات کو بھی سنیں۔ لیکن سانچ کو آنچ کہاں۔ آخر کار صداقت نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا۔ اور واقعات کے آئینہ میں راستی کا اصلی خط و خال نظر آنے لگے۔

ینگ ٹرکش پارٹی کا عوام الناس کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کرنا اور جمہورِ انام کو اپنا پیرو اور حامی و معاون بنا لینا صاف اس امر کو ظاہر کر رہا ہے کہ اُن کی تحریکات اور اُن کے مقاصد اور خواہشات بالکل پبلک احساسات اور عام جذبات کے مطابق ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ پبلک اُن کا ساتھ دیتی اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاتی۔ ینگ ٹرکش کے مطالبات چونکہ عام فائدوں پر مبنی تھے۔ اس لیے جمہور نے اُن کی تائید کی اور اُن کو اپنے اغراض میں کامیابی نصیب ہوئی اور اُنہوں نے دم کے دم میں وہ کر دکھایا جو بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں اور زبردست تاجداروں سے برسوں میں بھی بن نہ آتا۔ ینگ ٹرکش پارٹی کا جمہور کو اپنے موافق بنا لینا اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ ان میں رفارم اور آرگنائیزیشن کی

بڑی اعلیٰ قابلیت موجود ہے۔ ورنہ ایک مختلف المذہب اور متبائن الافکار قوم کو ایک متحد مرکز پر لے آنا اور اُن میں کسی قسم کی پھوٹ اور ناچاقی پیدا نہ ہونے دینا کچھ ہنسی کھیل نہیں۔ ہمارے سامنے انڈین نیشنل کانگریس کی مثال موجود ہے جس کا پروگرام اور نوجوان ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کا پروگرام قریب قریب یکساں ہے مگر بمقابلہ اس انجمن کے کانگریس کو کچھ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ابھی اس کو اُس اسٹیج پر جس پر کہ اب انجمن اتحاد و ترقی ہے پہنچنے کے لیے دقی دور ہے۔

جو لوگ نوجوانانِ ترک کو نالائق اور ناقابل سمجھتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں جس طرح ہندوستان میں پولیٹیکل لیڈر وہی لوگ مانے گئے ہیں جنہوں نے جدید تعلیم پائی ہے اور یورپ کی پالیٹکس کا گہرا مطالعہ کیا ہے یہی حال ترک کا ہے۔ ترکوں میں وہی لوگ آجکل پولیٹکل لیڈر سمجھے جاتے ہیں جن کے دل و دماغ نے جدید روشنی میں تربیت پائی ہے سالہا سال یورپ میں رہنے سے اُنہیں اُصولِ حکمرانی و سیاست کا ایسا صحیح تجربہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ پالیٹکس کی شاطرانہ چالوں سے پورے ماہر اور سیاسی جوڑ توڑ سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا جو حال میں انگلستان ہو آئے ہیں اور قسطنطنیہ کی سیر کر چکے ہیں اپنے سفرنامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اُس گروہ میں بعض لوگ نہایت اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ہیں۔ اور بلادِ یورپ میں برسوں کی رہائش نے اُن کے تجربے میں بہت سے مفید اضافے کیے ہیں۔ اگر یہ لوگ کبھی اپنے وطن کو واپس بُلائے گئے اور اُن سے کچھ خدمت لی گئی تو بہت کچھ کارآمد ہو سکتے ہیں"۔ نوجوانانِ ترک کے نام سے کسی شخص کو یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ گروہ چند نوعمر اور نوجوان افراد کا مجموعہ ہے۔ نہیں اُن میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کی عمریں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس کی ہیں۔

اُن کو بلحاظ اُن کے خیالات کی جدت اور اُن کے جذبات کی حدت کے نوجوان کہا جاتا ہے ورنہ اُن میں سے اکثر باعتبار عمر کے بوڑھے کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اس جماعت کی نشوونما اور عروج کی داستان بہت طویل ہے اور اردو و انگریزی اخبارات میں اس کی بالاجمال کیفیت شایع ہو چکی ہے۔ ان حالات کو پڑھ کر آنکھوں کے سامنے اُس حالت کا نقشہ کھچ جاتا ہے جو تین صدی قبل یورپ کی تھی۔ جبکہ وہ مذہبی شکنجہ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کشمکش اور جدوجہد کر رہا تھا۔ آہ ٹرکی میں اس تیس سال کے اندر اندر کتنے ایسے نوجوان تھے جن کو آزادی کا نام زبان پر آتے ہی حبس دوام کی سزائیں نہیں دی گئیں۔ کتنے ایسے محب وطن اور فدایان قوم نہ تھے جن کو وطن پرستی اور حب قومی کے جرم میں دور دراز مقامات پر جلا وطن نہیں کیا گیا۔ کتنے ایسے مصنف اور شاعر نہ تھے جن کو ایسی کتابوں کی تصنیف پر جو آزادی، اصلاح و ترقی کی محرک تھیں مقید اور ہمیشہ کے لیے اُن کا مال و اسباب قرق نہیں کر دیا گیا لیکن حق میں اور محض حق میں یہ صفت ہے کہ خالص کندن کی طرح اُس کو جس قدر کریدینگے اُتنا ہی وہ چمکیگا۔ یہ پابندیاں اور سختیاں رعایا کی اسپرٹ کو اور بڑھاتی گئیں اور آگ پر تیل ڈالتی گئیں آخر کار وہ شعلہ جو ایک مدت سے دبا ہوا تھا یکایک بھڑک اُٹھا اور سلطان کو اُس کے دبانے کا بوتا نہ رہا۔ اس انقلاب کی پیشین گوئی ینگ ٹرک قبل از قبل کر چکے تھے۔ اور انہیں خوب معلوم تھا کہ عنقریب اُن کی مساعی بار آور ہونے والی ہیں حال میں انگلستان سے اورینٹل ریویو نامی ایک رسالہ شایع ہوا تھا جو بوجہ قلت سرمایہ کے دو ایک مہینے نکل کر بند ہو گیا اُس میں ایک ینگ ٹرک کا مضمون قسطنطنیہ کی اُس وقت کی حالت کے متعلق

چھپا تھا۔ اِس مضمون کا لکھنے والا مشہور اہلِ قلم خلیل خالد تھا جس کے اکثر مضامین آئے دن نین ٹینتھ سنچری میں چھپا کرتے ہیں۔ اِس مضمون میں اُس نے صاف الفاظ میں لکھ دیا تھا کہ "مجھے اپنے دوستوں کے خطوط سے جو قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اور وہاں کے سیاسی حلقہ کے ارکان ہیں معلوم ہوا ہے کہ عنقریب دستوری حکومت کے لیے ایک عظیم الشان انقلاب ہونے والا ہے" کوئی سات آٹھ ماہ کے بعد ہی حرف بحرف یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

افسوس ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں شخص پرستی اِس قدر سما گئی ہے کہ وہ قومیت اور جمہوریت کے معنی کو دل سے بھلا چکے ہیں۔ حالانکہ اسلام جمہور پرستی کی ہدایت کرتا ہے اور اسلام کے اکثر اُصول و ہدایات قومیت کی پشت پناہی اور شخصیت کی بیخ کنی کر رہے ہیں اسلام نے وشاورہم فی الامر کا حکم دے کر پنچایتی حکومت کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان سُنی سُنائی تعریفیں سُن کر سلطان سابق کی طرزِ حکومت اور اُن کی ذات کے اِس قدر والہ و شیدا ہو گئے ہیں کہ اُن کو حقیقت اور واقعات سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا۔ حال کی فوجی بغاوت میں سلطان خواہ کسی وجہ سے سہی جب معزول کر دیے گئے تو یہاں کے باشندے سمجھے بیٹھے ہیں کہ اب خلافتِ اسلامیہ دنیا سے اُٹھ گئی۔ گویا وہ خلافت اور سلطنت کو سلطانِ سابق کی ذات سے وابستہ اور اُن کے دم سے قایم سمجھتے ہیں اور یہ خیال کر رہے ہیں کہ جس طرح آنحضرت خاتم المرسلین تھے اُسی طرح سلطانِ سابق بھی خاتم الخلافۃ والخلفا ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک اِس بیہودہ اور مہمل غلطی میں نہ صرف جُہلا ہی مبتلا ہیں بلکہ اچھے اچھے واقف کاروں اور پڑھے لکھوں کا بھی یہی خیال ہے جس کی وجہ محض یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو ٹرکی کے اندرونی حالات کی مطلق خبر نہیں اور ہو کیسے جب کہ وہاں مطبوعات اور اخبارات پر شدید سے شدید اور سخت سے سخت

روک ٹوک کی جاتی اور کوئی خبر باہر جانے نہیں پاتی تھی۔

سلطان عبدالحمید خان کے تختِ خلافت سے اُتار دیئے جانے پر یہ خیال کرنا کہ خلافت کا خدانخواستہ خاتمہ ہی ہو گیا ہے بعینہٖ ایسا ہی جیسا کہ احد میں آنحضرت کی وفات کی خبر سن کر بعض صحابہ اسلام کی ترقی سے مایوس اور اُس کے متعلق سعی و کوشش سے دست بردار ہو گئے تھے اُن لوگوں کے اِس خیال کو سُن کر حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہم نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر آنحضرت وفات پا گئے ہیں تو کیا ہوا خدا تو زندہ ہے پھر ہم کیوں اسلام کے لیے کوشش کرنے سے باز رہیں۔ اِس واقعہ سے مسلمانوں کے اسلاف نے اپنے اخلاف کو اِس بات کا سبق دیا ہے کہ اِسلام کسی شخص کی ذات سے وابستہ اور اُس کے وجود پر منحصر نہیں ہے پھر کیا وجہ ہے کہ عبدالحمید خاں اگر معزول کر دیے جائیں تو مسلمان اسلام کی ترقی سے مایوس اور نا امید ہو جائیں۔ جب آنحضرت کی ذاتِ والا صفات پر اسلام موقوف نہیں تھا تو عبدالحمید خاں پر مسلمانوں کی قسمتیں کیوں منحصر ہونے لگیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب حکومت پارلیمنٹ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جس میں عیسائی ممبر بھی موجود ہیں اس لیے اب جو حکومت ہو گی وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت ہو گی خالص اسلامی حکومت نہ رہیگی اور خلافت برائے نام رہ جائیگی اور شخصی سلطنت کے زمانہ میں اُس کو جو اعزاز و افتخار حاصل تھا وہ اب باقی نہیں رہیگا۔

یہ خیال بھی کئی وجوہ سے ٹھیک نہیں ہے۔ قانونِ اساسی میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حکومت کا مذہب اِسلام ہو گا۔ اِس کے علاوہ پارلیمنٹ بمنزلۂ ایک مشیر کے ہے جس کے مشورے اور صلاح کی، سلطانِ وقت خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اِن مشیروں میں بھی مسلمانوں کی

تعداد بہ نسبت عیسائیوں کے دگنی سے زیادہ ہے۔ خلافت کا عین مقصد و منشا یہ ہے کہ عدل و انصاف رعایا کے ساتھ کیا جائے۔ اُن کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ سلطنت کو اعدا کے شر سے محفوظ و مصئون رکھا جائے اور خدا و رسول کے احکام کی پابندی کرائی جائے۔ ان تمام باتوں پر عمل پیرا ہونا پارلیمنٹ کا اصل اُصول و فرض اولیں ہے۔ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ جن ممالک میں پارلیمنٹ قایم ہوتی ہے وہاں بہ نسبت شخصی حکومت کے زیادہ امن و امان اور عدل و انصاف رہتا ہے۔ اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے تو اِس سے معلوم ہوا کہ قیامِ پارلیمنٹ گویا خلافت کے اساس کو استوار و مضبوط کرنا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ عیسائیوں اور غیر مذہب قوموں کو اِس میں کیوں شریک کیا گیا ہے۔ اُس کا آسان جواب یہ ہے کہ وہ عیسائی جو اسلامی حکومتوں کے زیرِ سایہ رہتے ہیں ذمی ہیں۔ اور ذمیوں کے حقوق از روئے اسلام مثل مسلمانوں کے قرار دیے گئے ہیں۔ آنحضرت نے صاف طور سے فرمادیا کہ لہم مالنا وعلیہم ماعلینا۔ یعنی جو فائدے ذمیوں کے ہیں وہ فائدے ہمارے ہیں۔ اور جو نقصان اُن کے ہیں وہ نقصان ہمارے ہیں۔ پس ایک ایسے فرقے کو جس کو اسلام ان پُر زور الفاظ میں مسلمانوں کے مساوی حقوق عطا کرتا ہے اُمورِ سلطنت سے بیدخل کرنا اور اُن فواید اور حقوق سے محروم رکھنا جو مسلمانوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں عین ناانصافی اور بیرحمی ہے۔ جس کی اسلام و انصاف ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر تاریخ اِسلام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے ابتدا سے غیر مذہب اقوام سے صلاح و مشورت لینے اور انکو دخیل سلطنت بنانے میں کبھی دریغ نہیں کیا تاریخ اِسلام میں بہت سے مشیرانِ سلطنت، بہت سے گورنر اور عہدہ دار ایسے پائے جاتے ہیں جو غیر مذہب تھے۔ اسلام کے اِن ہی سچے سیدھے سادے اور منصفانہ اُصول کی برکت تھی کہ وہ عرصۂ قلیل میں ربع مسکون پر محیط و منتشر ہو گیا

کیا مسلمان اب اُن ہی اُصول کو جن سے کہ یہ یہ برکات حاصل ہوئیں بنظرِ حقارت دیکھتے اور اپنے حق میں مضر خیال کرتے ہیں؟

اب ہم اس مختصر سی تمہید کے بعد دورِ حمیدی پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس دور میں ترکوں کو کیا کیا نقصان پہنچے اور کون کون سے فواید حاصل ہوئے اور ان دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سلطان نے سلطنت کو مخدوش اور غیر مطمئن حالت میں حاصل کیا۔ اور اپنی فراست و تدبیر کی سے ایک حد تک اُس کی کشتی گردابِ ہلاکت سے بچالی لیکن اُس نازک موقع کے لحاظ سے جس طرزِ عمل کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا اُنہوں نے اُس کو بالکل نظر انداز کر دیا جب کہ ملک میں چوطرف جہالت اور بے علمی کی گرم بازاری تھی جب کہ ہر جانب سے یورپین سلطنتیں سلطنتِ عثمانیہ پر دندان آز تیز کر رہی تھیں خزانے میں بالکل روپیہ نہیں رہا تھا۔ فوج کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ امن و امان ملک میں مفقود ہو گیا تھا۔ ہر ہر سررشتے ہر ہر صیغے میں بدنظمی اور لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں سلطان کا یورپین سلطنتوں پر بھروسہ کر لینا تمام قوم اور رعایا کو اپنا جانی دشمن سمجھ لینا۔ پرلے درجے کی خود مختارانہ اور جابرانہ اور قاہرانہ طرزِ حکومت کا اختیار کر لینا۔ رعایا کی علمی اور عملی قوتوں کا سلب کر لینا۔ اُن کے قول و فعل کی آزادی کو چھین لینا ایسی باتیں تھیں جن سے ملکی اور قومی ترقی میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ اور وہ علمی ترقیوں کا سیلاب جو سلطان عبدالعزیز کے آزاد عہد میں زور و شور سے بہنے لگا تھا یکلخت رک گیا۔ اور رعایا کے اُمنڈتے ہوئے جذبات معاً دب گئے۔ سلطان عبدالعزیز کی عہدِ حکومت میں چونکہ ترکوں کو ہر قسم کی تحریر و تقریر کی آزادی حاصل تھی اس لیے اُن میں بڑے بڑے مشہور اہلِ قلم اور محرر و انشا پرداز اور

اعلیٰ درجے کے شاعر اور ناظم پیدا ہونے لگے تھے۔ جب سلطان عبدالحمید کے زمانے میں وہ آزادی کی بہار ہاتھ سے نکل گئی تو عموماً ترکوں پر افسردگی اور عام قوم پر بے حسی اور مردگی چھا گئی۔ اگرچہ سلطان عبدالحمید اپنے عہدِ حکومت میں آئے دن مدرسے قایم کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان مدرسوں کی تعلیم بالکل ابتدائی ہوتی تھی۔ اور جو کچھ اور جیسی کچھ تعلیم دی جاتی تھی آزادی کے عنقا ہو جانے کے سبب نوجوان ترک کوئی فائدہ اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ میں جو نہایت وسیع اور فراخ اسلامی سلطنت ہے۔ اب تک ایک بھی یونیورسٹی نہیں حالانکہ ہندوستان میں اس وقت چار مختلف یونیورسٹیاں قایم ہیں۔ غرض یہ کہ سلطان نے اپنے عہدِ حکومت میں جو کچھ بھی رعایا کو تعلیم دی وہ سلطنت کی ضروریات اور قومی احتیاجات کے نظر کرتے بالکل ناکافی اور غیر مکمل تعلیم تھی۔ وہ اس تیس سال کے اندر اگر ایشیائی ٹرکی کو نہ سہی یورپین ٹرکی کو تو جاپان کے برابر تعلیم یافتہ کر دیتے ملک بھر میں پولٹیکل کانگرس تو کجا کبھی تعلیمی کانفرنس کے قایم کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اب قوم خود تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتی تو کس طرح اور کیونکر لے لیتی۔ سفر کی روک تھام اور نقل و حرکت کی شدید پابندیوں کی وجہ سے تجارت اور صنعت حرفت میں بھی رعایا کوئی معتدبہ ترقی نہیں کر سکی۔ چونکہ رعایا پر بالکل سلطان کو اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے وہ ملکی معاملات میں بھی بالکل بیدخل کر دی گئی تھی۔ بڑے بڑے گتے اور ٹھیکے صرف اجنبیوں کو دیئے جاتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جسقدر ملکی لوگ جن کو بمقابلہ غیر ملکیوں کے اپنے ملک کا زیادہ پاس و لحاظ قدرتاً ہونا چاہیئے تھا سلطنت کے کاروبار سے الگ ہوتے گئے اُسی قدر زیادہ غیر ملکی سلطنت کے مختلف شعبوں اور ذرایع آمدنی پر

مسلط ہوتے گئے۔ اور اس طرح سلطنت کی جڑ کھوکھلی اور کمزور ہوتی گئی چنانچہ
ان ہی وجوہ کی بنا پر ایک تہائی سے زیادہ ملک عبدالحمید خاں کے بتیس سالہ
قلیل عہدِ حکومت میں ہاتھ سے نکل گیا جس کو ترکان آلِ عثمان نے، اپنا
خون پسینا ایک کر کے حاصل کیا تھا۔ سلطنت کی مالی حالت کی ابتری کا
اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ چند سال پیشتر فرانس کا ایک مشہور
مالیہ داں ٹرکی کی فنانشیل حالت کی درستی کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ لیکن
جب اُس نے وہاں جا کر ہر ایک صیغہ کی حالت کو بنظرِ غور دیکھا۔ اور ابواب
آمدنی و خرچ کا موازنہ کیا تو اُس کو یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ جن اُصول پر
سلطنت کا انتظام ہے اُس کے لحاظ سے اس کی مالی حالت کی اصلاح
نہ صرف دشوار ہے بلکہ محال اور ناممکن نظر آتی ہے۔ اس سے بڑھکر
کوئی ابتری ہو سکتی ہے کہ سلطنت کا بجیٹ تک تیار نہیں ہوتا تھا۔ پارلیمنٹ
کئی ماہ سے بجیٹ پیش کرنے کے لیے تقاضوں پر تقاضے کر رہی تھی۔ مگر
وزرائے سلطنت بجیٹ نہیں پیش کر سکتے تھے۔ چھوٹی سی چھوٹی سلطنتوں میں
بھی جمیع وخرچ کے ابواب معین کیے جاتے ہیں۔ اور اُن کے مطابق موازنہ
اور بجیٹ تیار ہوا کرتا ہے لیکن ترکی جیسی بڑی عظیم الشان سلطنت کے لیے
یہ امر کس قدر قابلِ افسوس تھا کہ وہاں آمدنی و خرچ کے ابواب تک
معین نہ تھے۔ بدنظمی اور ابتری کی اس سے بڑھکر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

سلطان عبدالحمید خاں کے خوشامدی اُن کے کارناموں میں فوجی
اصلاحات کو بھی نہایت رنگ آمیز صورت میں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن
حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اور علمی و عملی ترقیاں اِن کے عہدِ حکومت میں
رُک گئی تھیں اُسی طرح فوجی ترقی بھی بالکل رُک گئی تھی۔ اگرچہ جرمنی افسر
فوج کی تعلیم و تربیت کے لیے اِن کے عہد میں مقرر کیے جاتے تھے لیکن
یہ کوئی اِن کے عہد کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ سلطان عبدالمجید خان کے

عہد سے ہی یورپین طریقہ پر فوجی اصلاحات کا آغاز شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اس کو ترقی دیتے پستی و تنزل کی حالت میں کر دیا ملک بھر میں کوئی ایسا کارخانہ نہیں جس میں اسلحۂ جنگ اور سامان حرب بوقتِ ضرورت بکفایت تیار ہو سکے اور یورپین سلطنتوں کی احتیاج باقی نہ رہے۔ لے دے کے استنبول میں اسلحہ سازی کا جو ایک کارخانہ ہے اُس میں سال بھر میں جس قدر ساز و سامان تیار ہوتا ہے وہ کسی جنگ میں تین مہینوں سے زیادہ کام نہیں آسکتا۔ اسی سے عہد حمیدی کی جنگی اصلاحات کا اندازہ لگا لیا جا سکتا ہے۔ سوائے پایہ تخت کی فوج کے جو سلطان کی حفاظت پر مامور تھی اطراف و اکناف اور سرحد کی فوجوں کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ بیچارے سپاہی بے آب و دانہ بھوکوں مرتے تھے۔ کوئی ان کا پرسان نہ تھا۔ بقول اڈوئیر النار کے نجد کی متعینہ فوج کے بعض سپاہی بھوک کی شدت برداشت نہ کر کے حنظل کے بیج کھا گئے۔ جس سے اُن کی انتڑیاں کٹ کٹ گئیں۔ ترکی سپاہی جو دنیا بھر کے سپاہیوں سے زیادہ وفادار اور صابر اور اطاعت گزار مشہور ہیں۔ ان مصائب و آلام سے بیزار اور تنگ ہو کر کئی بار آمادۂ بغاوت ہو چکے تھے۔ انجمن اتحاد و ترقی نے فوج کے اکھڑ اور اُجڈ سپاہیوں کو جو ہموار اور اپنا موافق بنا لیا اس کی وجہ یہی تھی کہ خود سپاہی اُن خرابیوں اور ابتریوں کو جو سابق سلطان کے عہد میں اُن پر گزر رہی تھیں اچھی طرح محسوس کر چکے اور مشاہدہ کرتے چلے آ رہے تھے حال میں شہنشاہ جاپان کی طرف سے ایک مشن تمام یورپ کا دورہ کرنے اور وہاں کے نظم و نسق کو بغور و تامل دیکھنے کے لیے نکلا تھا۔ تاکہ کسی ملک میں کوئی مفید بات نظر آئے تو اُس کی اتباع کی جائے۔ اور جاپان میں اُس کو رواج دیا جائے۔ پھرتے پھراتے یہ مشن استنبول میں بھی وارد ہوا اور یہاں کے آئین و انتظام اور فوج بری و بحری کی جانچ پرتال اور

دیکھ بھال کرنے کا موقعہ اُس کو ملا اپنی رپورٹ میں اُس نے یہاں کے فوجی نظام اور سلطنت کے آئین و انتظام کو تمام یورپ سے بدتر و بدتر بتایا ہے۔ یہ تو حال فوج بری کا تھا ترکی کی فوج بحری تو کسی شمار میں نہیں اس کے دوست دشمن خوشامدی اور غیر خوشامدی سب جانتے ہیں کہ بحری طاقت کے لحاظ سے ترکی یورپ کی سلطنتوں کے مقابلے میں کوئی ہستی نہیں رکھتی۔ حالانکہ آج کل سلطنت کی حفاظت و قوت کے لیے بحری قوت کا عمدہ حالت میں ہونا لازمات سے ہے۔ اِس بتیس سال کے عرصہ میں اگر سلطان تھوڑی تھوڑی بھی اِس صیغے میں اصلاح کرتے رہتے اور قوم کے روپیہ کو یورپ کے خزانوں اور یلدیز کے صندوقوں میں جمع کرنے کے بجائے جنگی بیڑوں کی تیاری میں صرف کرتے تو آج ترکی بحری طاقت کے لحاظ سے کم از کم یورپ کی چھوٹی سلطنتوں کے مقابلے میں تو کسی طرح پیچھے نہ رہتی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطان سے بوجہ اُن کی اُس گہری پالسی کے جو اُنہوں نے غیر ممالک کے مسلمانوں کو خوشنود اور اپنا طرفدار بنانے کی غرض سے اختیار کی تھی۔ ایسی عقیدت ہو گئی ہے کہ وہ اُن کی شان میں ایسی باتیں سننی کبھی گوارا نہیں کرینگے اور وہ کان جو اب تک محض تعریف اور بیجا حمایت کے ترانے سنتے رہے۔ اُس آواز کو سن کر جو اُن کے مزعومات کے خلاف نکلی ہو چھنائینگے۔ لیکن رورعایت یا کسی بیجا دباؤ سے امرِ حق کا چھپانا ہم ناحق کوشی سمجھتے ہیں۔ اور اپنی بے لاگ رائے کو جو واقعات اور اکثر قابل اور مدبر اور مشہور لوگوں کے خیالات پر مبنی ہے ظاہر کرنے سے نہیں باز رہ سکتے۔ ہم نہایت کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان سابق کے عہدِ حکومت میں بہت سی مفید اور عمدہ باتیں بھی عمل میں

آئیں۔ صیغۂ طبابت نے آپ کے زمانے میں بیحد ترقی کی حتیٰ کہ قسطنطنیہ کا طبی کالج یورپ کے کالجوں کی ٹکر کا شمار ہونے لگا۔ بہت سے کارخانے سرکاری خرچ سے جاری کیے گئے۔ اور اُن سے بیواؤں اور یتیموں کی امداد کی گئی۔ حاجیوں اور زایروں اور مسافروں اور تارک الوطنوں پر شاہانہ الطاف و اکرام مبذول رہا کیے اور حتی الوسع اُن کی اعانت و دستگیری فرمائی گئی۔ سرکاری خرچ سے بہت سے جدید مدرسے کھولے گئے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ حجاز ریلوے کی بنیاد ڈالی گئی جس سے نہ صرف سلطان کے کارناموں میں ایک سنہری کڑی کا اضافہ ہوا بلکہ اِس سے اُنہوں نے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو متحد و مرتبط بنانے اور اُن کو مذہبی اور مالی اور اخلاقی اور قومی فوایدپہنچانے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ اُن کا ایسا بڑا کارنامہ ہے جو اُن کی بہت سی برائیوں کی تلافی کر سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ کہنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتے کہ بمقابل اِن فواید کے سلطان سابق کی طرزِ حکومت سے ترکوں کو بہت سے ایسے نقصانات بھی برداشت کرنے پڑے جن کی تلافی اگر سعیٔ بلیغ کی جائے تو ایک عرصۂ دراز کے بعد ہو سکتی ہے۔

اِس قلیل عرصہ میں یہ دیکھنا کہ پارلیمنٹ نے کچھ کیا یا نہیں بالکل بعید از عقل و انصاف ہے۔ اُن خرابیوں کو جو سالہائے سال سے سلطنت کے رگ ریشے میں سرایت کر گئی ہیں ان چند مہینوں کے عرصے میں دور کر دینا اور ملک کو مالی اقتصادی اور پولٹیکل ترقیوں کی روشنی سے منور کر دینا ہتیلی میں سرسوں جمانے سے کچھ کم نہیں۔ دنیا میں جتنی ترقیات ہوتی ہیں وہ سب تدریجی اور آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہیں کسی چیز کا بگاڑ دینا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ اُس کا سدھارنا

ہے ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں - تاہم اس قلیل عرصہ میں پارلیمنٹ نے ملک میں جو جو اصلاحات جاری اور جو جو تحریکیں پیش کیں اُن کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرایض کو نہایت مستعدی اور جفاکشی اور فہم و تدبر کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔

پارلیمنٹ کی جفاکشی اور مستعدی کی دلیل یہ ہے کہ اُس کے اجلاس کی مدت اب چھ مہینے کردی گئی ہے۔ پہلے صرف چار ہی مہینے تھی۔ پارلیمنٹ کی اصلاحات نہ صرف پولیٹکل حدود تک محدود رہیں۔ بلکہ مذہبی تعلیم میں بھی اس نے بیش بہا اصلاحات کی تحریک کی ہے۔ پہلے مذہبی طلبہ کا امتحان نہیں لیا جاتا تھا اور وہ فوجی خدمت سے بچنے کے لیے برسوں تعلیم پاتے رہتے تھے۔ اب مذہبی تعلیم کے لیے امتحانات مشروط کردیے گئے۔ جو ان امتحانات کے ناقابل ہو۔ اُس پر فوجی تعلیم لازمی کردی گئی ہے مذہبی تعلیم میں حکمت و فلسفہ، تاریخ و جغرافیہ، انشا پردازی اور تفسیر و حدیث کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ اوقاف اور مالگزاری کا باقاعدہ انتظام ہو رہا ہے تعلیم نسواں کا اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر اہتمام کیا گیا ہے۔ بے مصرف اور بے فائدہ عہدوں کی تخفیف کی گئی ہے۔ اِس سے جو بچت ہوگی اُس کو بری اور بحری فوج کی اصلاح پر خرچ کیا جائیگا۔ بحری طاقت کی طرف جو ملک کی حفاظت کے لیے نہایت ضروری تھی خاص توجہ مبذول کی جارہی ہے چنانچہ ۵ ملین پونڈ کی اُس رقم میں سے جو غیر معمولی اخراجات کے لیے منظور ہوئی ہے ۴ ملین پونڈ بحری فوج کی اصلاح و درستی پر صرف کیے جائینگے سلطنت کے اخراجات کا تعین کیا گیا ہے اور ہر صیغہ اور ہر سررشتہ میں روپیہ جس بے تکے پن سے خرچ ہوتا تھا اُس کی روک تھام کے لیے خاص خاص قیود اور قواعد مقرر کیے گئے ہیں غرض یہ کہ پارلیمنٹ برابر لگاتار اپنے فرایض کو انجام دینے میں مصروف نظر آرہی ہے اگر وہ اسی طرح بغیر کسی اندرونی خلفشار کے کچھ مدت تک کام کرتی رہی تو اُمید ہے کہ ٹرکی بہت جلد اپنی حالت سنبھال لیگی۔

حال میں کریٹ کے متعلق ترکوں کی جدید حکومت نے دول کو جو دلیرانہ اور مستقلانہ

اعلان دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سابق سلطان کی طرح دب کر اپنے حقوق و فواید سے دستکش نہیں ہو جائیگی۔

غیب کا علم خدا کو ہے موجودہ حالات و واقعات کے نظر کرتے جہاں تک ہم دیکھتے ہیں سلطنتِ عثمانیہ کے حق میں پارلیمنٹ ابرِ رحمت نظر آتی ہے پارلیمنٹ نے رعایا کو قول و فعل کی آزادی دے کر اُن کے اُن دماغی اور ذہنی ملکات کو جو شخصیت کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور کسی طرح ظاہر نہیں ہونے پاتے تھے عملی صورت میں ظاہر کر دیا اور اُن کے ثمرات کو اُبلتے چشمہ کی طرح اطرافِ ملک میں بہا دیا۔ وہی ٹرکی جو سلطان عبدالحمید خاں کی شخصی حکومت کے زمانے میں سیاسی اور ملکی معاملات پر بحث کرنے والے اخبارات سے بالکل ناآشنا تھی۔ پارلیمنٹ کا افتتاح ہوتے ہی اُس کے ہر گوشہ سے اخبارات کے شور و پکار کی آوازیں آنے لگیں حتیٰ کہ حجاز اور نجد سے بھی جو کو سوادی اور جہالت میں مشہور ہیں اخبار نکلنے لگے سینکڑوں مفید ملک و قوم تصانیف جن کو خود مختاری کے زبردست ہاتھ نے پبلک کے سامنے آنے سے روک دیا تھا چھپنے اور آزادی و روشن خیالی کی روح پھونکنے لگیں۔

مسلمانانِ ہند کا پارلیمنٹ کے قایم ہو جانے سے ٹرکی کی ترقی کو شک کی نظروں سے دیکھنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ اُس پرندے کی سی ہے جو قفس میں پیدا ہوا قفس میں نشو و نما پایا جس کے پر ہمیشہ کترے گئے جس کو اڑنا کبھی نہیں سکھایا گیا جو پرواز کا نام تک نہیں جانتا۔ وہ قفس سے اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اگر کوئی اس کو نکال کر چھوڑتا ہے تو گھبرا کر پھر قفس ہی میں جا گھستا ہے وہ اپنے ہمجنسوں کو اڑتے پھرتے دیکھ کر متعجب ہوتا ہے اور قفس میں چہچہا کر اور بولیاں بول کر اپنے میں آپ خوش ہے اور اُن متمتعات کو کسی طرح نہیں جان سکتا جو آزادی میں حاصل ہیں۔ عموماً ہندوستان کے مسلمان غلامی کی زندگی بسر کرتے کرتے اور محکوم رہتے رہتے ایسے کوتاہ خیال اور غلامی پسند ہو گئے کہ آزادی کے نام تک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے حریت و آزادی اُن کے نزدیک ایسی وہ قبیح چیز ہیں ہے کہ اگر کوئی بے مانگے دے بھی تو وہ کوڑیوں کے دام نہ لیں پس ایسے لوگوں سے کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ہمجنس بھائیوں کو آزاد دیکھ کر تعجب و حیرت نہ کرینگے اور اُن فواید و ثمرات کا کچھ اندازہ کر سکینگے جو آزادی و حریت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

محمد عبدالباسط

سلطان محمد خان خامس

موجودہ سلطان ترکی جن کا اصلی نام "رشاد آفندی" ہے اور جو سابق سلطان عبدالحمید خاں کے علاتی بھائی ہیں ۳۔ نومبر ۱۸۴۴ء کو محل چراغاں میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت اُن کی عمر ۶۵ سال کی ہے۔ کسیقدر کشیدہ قامت اور خمیدہ پشت ہیں۔ اُن کی صورت عبدالحمید خاں کی صورت سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ بیدار مغزی اور زیرکی میں اگرچہ وہ اپنے بڑے بھائی سے پیچھے ہیں لیکن پھر بھی تدبر و دانشمندی کے جواہر سے معرا نہیں ہیں۔ چنانچہ بعض یورپین اخبارات کے نامہ نگاروں سے جو تقریریں اُنہوں نے کیں اور پارلیمنٹ کے افتتاحی جلسے میں اُن کی جو اسپیچ سُنائی گئی اُس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہوشمند اور فرزانہ ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ دو لمبا پانچ میں ۳۰ سال تک نظر بند رہنے کی بدولت وہ دنیا کی حیرت انگیز ترقیوں اور حالات و واقعات سے ضرور بے خبر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فارسی شعر کا اُنہیں خاص مذاق ہے اور مثنوی مولوی روم پوری یاد ہے۔ اُن کی لسانی کی بھی تعریف کی جاتی ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان سابق اُن کی ظرافت و بذلہ سنجی کے بہت مسرور ہوتے تھے۔ انہیں موسیقی اور مصوری کا خاص شوق ہے۔ علم و فروتنی میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ترکی و فارسی میں اچھا شعر کہتے ہیں۔

اُن کی اولاد میں اس وقت تین شہزادے ضیاء الدین، نجم الدین اور عمر حلمی نامی ہیں۔ اور ایک شہزادی ہے جس کا نام رضیہ سلطانہ ہے۔ یہ شہزادی سب سے چھوٹی ہے اور اس وقت اُس کی عمر ۲۲ سال کی ہے۔

۲۷۔ اپریل ۱۹۰۹ء کو اُنہوں نے قوم کی درخواست پر سلطنت ترکی کی دستوری حکومت کا تاج اپنے سر پر رکھا اور جامع آیا صوفیہ میں فوجی لباس پہنے ہوئے نماز جمعہ ادا کی یہیں اُن کی رسم تاجپوشی وقوع پذیر ہوئی۔ شیخ الاسلام نے سیف عثمانی اُن کی کمر میں باندھی جس کے بعد مبارکباد کی توپوں نے سارے قسطنطنیہ میں علم رونق اور چہل پہل پیدا کردی سرکاری طور پر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا اور تمام تاجروں اور پیشہ وروں نے اپنی اپنی دکانیں بیرقوں اور جھنڈیوں سے سجائیں۔

سلطان مذکور نے اپنے صرفخاص کے اخراجات میں بہت بڑی تخفیف کردی ہے۔ آزادی، تعلیم، صنعت و حرفت، امن، امان اور مذہب اسلام پھیلانے کی جانب اُن کا خاص میلان ہے جو اُن کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

وہ رعایا کے ڈیپوٹیشنوں، سفیروں، اور اخبارات کے نامہ نگاروں سے کشادہ پیشانی کے ساتھ ملتے ہیں اور عمدہ اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں۔ موسم سرما میں اُن کا ارادہ قلمرو عثمانی میں دورہ کرنے کا ہے علاوہ بریں وہ یورپ کی سیر کا بھی تصور رکھتے ہیں چنانچہ سُنا جاتا ہے کہ اوائل دسمبر میں اُن کا پیرس تشریف لیجانا ہے اُن کے پورے حالات ابھی تک اخباری دنیا میں نہیں آئے۔ اس لیے ہم یہیں پر مضمون ختم کرتے ہیں۔

محمد عبدالسلام۔

نالۂ عندلیب

صحیفہ کے اِس نمبر میں صفحۂ گزشتہ تک جتنے مضمون درج ہوئے ہیں۔ سب نثر میں ہیں۔ علاوہ بریں اُن میں سلطان عبدالحمید خاں کی ہمدردی کا کوئی مضمون نہیں ہے۔ اِس نظم نے دونوں ضرورتوں کو پورا کر دیا۔ لہٰذا ہم عندلیب حیدرآبادی کے ممنون ہیں۔ کہ اُنہوں نے بروقت یہ نظم روانہ کر کے خاص احسان کیا۔ اڈیٹر

ستم ہے مہرِ خموشی لبِ وداں کے لیے
تڑپ رہا ہے دلِ مضطرب فغاں کے لیے

اُٹھیگا گریۂ بے اختیار سے طوفاں
بہانہ مل گیا اب چشمِ خونفشاں کے لیے

ہجومِ عرضِ تمنا بنا ہے مُہرِ دہن
کہاں ہے تابِ سخن لاؤں میں زباں کے لیے

ہرے ہوں داغ کہن لفظ وہ چھپیں دل میں
نئی ہو طرزِ سخن ذکرِ پاستاں کے لیے

نشاط و عیش جہاں بیش خیمہ ہے غم کا
بہار آتی ہے گلزار میں خزاں کے لیے

جلائے برق نے گر گر کے خار و خس بھی وہی
کیے جو جمع عنادل نے آشیاں کے لیے

فلک، زمین، زمانہ، نصیب کا چکر
ستمگر اتنے ہیں اک جانِ ناتواں کے لیے

روشِ زمانے کی راحت پسند ہو کیا خاک
غبار اُٹھاتی ہے اک تازہ آسماں کے لیے

نشاطِ عمرِ گذشتہ کا رنج ہے تا زیست
غمِ ابد یہ رہا عیشِ جاوداں کے لیے

عدم سے ہستی میں ہم آئے موت کی خاطر
اُٹھائے زیست کے سو لطف اک زباں کے لیے

عبث عبث گلہ ہائے درازِ ناکامی
ہم آئے عرصۂ دنیا میں امتحاں کے لیے

الگ ہا جو زمانے میں اک زمانے سے
مزے اُسی نے زمانے میں اک جہاں کے لیے

فلک کی طرح وہ ہوتا ہے سرنگوں آخر
اُٹھائے سر جو بلندیٔ عز و شاں کے لیے

قیامت ایک نمونہ ہے اُس کی چالوں کا
فلک ہمیشہ سے دشمن ہے اوج والوں کا

کچھ ایسا ہائے زمانے میں انقلاب ہوا
کہ جو نصیب تھا بیدار محوِ خواب ہوا

غضب ہیں بوقلمونیٔ دہر کے آثار
ثواب کا جو کیا کام وہ عذاب ہوا

ستم ہے، قہر ہے یہ جزر و مدِ زمانے کا
سمجھتے تھے جسے دریا وہی حباب ہوا

بیان کر نہیں سکتا ہوں ماجرائے الم
مرا فسانہ بھی گونگے کا کوئی خواب ہوا

ہرا بھرا تھا جو فیضِ بہار سے گلشن
خزاں کے جور سے آخر وہی خراب ہوا

امنگیں جوش پہ آتے ہی مٹ گئیں افسوس
کہ وقفِ نالۂ ماتم مرا شباب ہوا

کچھ ایسے گر گئے اپنی نظر سے ہم افسوس
کسی سے آنکھ ملانے میں بیحجاب ہوا

بھڑک اٹھی ہے وہ سینے میں آتشِ پنہاں
ہر ایک داغ جگر رشکِ آفتاب ہوا

جو انتخابِ زمانہ تھے ہم زمانے میں
ستم بھی ہم پہ ہوا جو وہ لاجواب ہوا

بڑیں نصیب کے چکر کی بیڑیاں آخر — اسیرِ رنج دلِ خانماں خراب ہوا
فلک سے بانیٔ بیداد کو بھی رحم آیا — یہ ایسا کون مگر موردِ عتاب ہوا

مصیبتیں تھیں زمیں کے نہ آسماں کے لیے
سب آفتیں تھیں یہ عبدالحمید خاں کے لیے

فغاں فغاں وہ شہِ ذی حشم ہوا محبوس — کہ جس کی شمع شبستاں کا ماہ تھا فانوس
وہ شاہ عدل میں نوشیرواں سے جو بڑھکر — وہ شاہ جس کے ملازم قباد و کیکاؤس
وہ شاہ نظم و نسق میں جو فرد کامل تھا — وہ شاہ جس سے صغیر و کبیر تھے مانوس
وہ شاہ جس کا زمانے کے دل پہ سکہ تھا — وہ شاہ جس سے مدد مانگے ہر جبلی و روس
وہ شاہ جس سے نئی روشنی کی شمع جلی — وہ شاہ جس نے مٹائے خیالِ دقیانوس
وہ شاہ جس سے ہوئیں سینکڑوں ہی اصلاحیں — وہ شاہ جو کہ تدبر میں رشکِ بطلیموس
وہ شاہ خوف سے جس کے بروزِ جنگ و غا — نہ نکلی فوج عدو سے کبھی صدائے کوس
وہ شاہ راہِ شریعت پہ استوار تھا جو — وہ شاہ پھونکدیئے جس نے خرقۂ سالوس
وہ شاہ اپنی رعایا کے ہاتھوں قید ہوئیں — الٰہی کیسی تھی کمبخت وہ گھڑی منحوس
یہ سچ ہے زورِ مقدر پہ کچھ نہیں چلتا — یہیں تو ہوتی ہے ہر کاشتِ بشر مایوس

سب اختیار ہے انسان کو زمانے میں
نہیں ہے دخل تو قدرت کے کارخانے میں

ہلال و بدر سے ظاہر یہ حال ہوتا ہے — ہوا کمال تو آخر زوال ہوتا ہے
عجیب سانحہ گزرا ہے یہ تہِ افلاک — کہ جس کے سننے سے دل کو ملال ہوتا ہے
کھلی یہ حالتِ سلطانِ روم سے حالت — کہ پہلے مرگ سے بھی انتقال ہوتا ہے
الٰہی جائے جہنم میں ایسی آزادی — کہ خود رہائی پہ اب انفعال ہوتا ہے
یہ خوف ہے کہ نہ ترکی تمام ہو جائے — کچھ ایسا بیٹھے بٹھائے خیال ہوتا ہے
گھلائے دیتے ہیں اندیشہ ہائے آئندہ — اب اور دیکھیے کیا اب کے سال ہوتا ہے
ہماری قوم کے ادبار کے ہیں یہ ساماں — کہ اتفاق سے پیدا زوال ہوتا ہے
ابھی تو دیکھیے قسمت دکھاتی ہے کیا کیا — اب اور کیا غضب ذوالجلال ہوتا ہے
نہیں ہیں شعر یہ ہیں عندلیب کے نالے — زباں ہلاؤں تو اب غیر حال ہوتا ہے

طفیل مبدءِ فیاض پھر وہ ساماں ہو
وہی روش، وہی گلچیں، وہی گلستاں ہو

محمد عبدالوہاب عندلیب حیدرآبادی

ایڈیٹوریل

صحیفہ کا یہ نمبر، جن مضامین کو لیے ہوئے، پبلک میں آیا ہے وہ اُن خیالات کو ضرور صدمہ پہنچائینگے۔ جو عبدالحمید خان سابق سلطان ترکی کی محبت و ہمدردی کے نشہ میں سرشار ہیں۔ لیکن اگر وہ اُن کو تعمق سے دیکھینگے اور اُن دلائل و واقعات پر امعانی نظر ڈالینگے جن سے اِن مضامین میں بحث کی گئی ہے تو یقین ہے کہ اُن کا نشہ (اگر پورا نہیں اُتر گیا تو کم از کم) کرکرا ضرور ہو جائیگا وہو المطلوب۔

جن ممالک میں سلطان سابق کی معزولی، ناخوشی کے کانوں سُنی گئی ہے وہ عموماً اصلی حالات سے بیخبر تھے۔ یہ تقاضائے محبتِ اسلام اور بوجہ بعض اُن روشن کارناموں کے جو سلطان مذکور کے عہد میں ظہور پذیر ہوئے تھے اُن ممالک کے مسلمان خیال کرتے تھے کہ سلطان موصوف کا وجود باعثِ تقویتِ اسلام و موجب بہبودِ مسلمانان ہے۔ جب اُنہیں سلطان سابق کی حکمرانی کے نقایص معلوم ہو جائینگے تو اُنہیں اِس انقلاب پر افسوس کرنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔

یہ امر ضرور موجبِ تعجب ہوگا کہ آج کل اخباری دنیا میں جس کثرت سے سلطان سابق کے خلاف آوازیں سُنائی دے رہی ہیں جس کثرت سے مضامین شایع ہو رہے ہیں جس کثرت سے اُن کے عیوب گنائے جا رہے ہیں وہ اُن کی کارفرمائی کے زمانے میں کیوں نہیں ظاہر ہوئی؟ اِس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ممالکِ عثمانیہ میں تو اخبارات کی زبان حکماً بند تھی۔ اور ممالکِ خارجہ میں وہاں کے اخبار نویسوں کو سلطان کی بُرائیوں کے اظہار میں کوئی فائدہ نہ معلوم ہوتا تھا اُن کی آوازیں نہ تو یلدیز کوشک کی دیواروں سے ٹکرا سکتی تھیں نہ سلطان کو معزول کر سکتی تھیں۔ بجز اِس کے کہ مسلمانانِ عالم کی متحدہ خوش عقیدتی میں خلل آتا اور شیرازۂ ہمدردی بکھر جاتا۔ کچھ ہاتھ نہ آتا۔ پھر بھی انجمن اتحاد و ترقی کے وہ اخبارات جو بلادِ یورپ سے شایع ہوتے تھے عموماً شخصی حکومت کی برائیاں اور سلطان کی کمزوریاں گناتے رہتے تھے۔ لیکن نہ تو اُن کو کوئی وقعت تھی۔ نہ اُن کی انجمن کا کوئی اعتبار جماتھا۔

جب کم و بیش دنیا کی تمام تعلیم یافتہ قوموں کا اِس پر صاد ہو چکا ہے کہ پارلیمنٹری حکومت، بہترین طرزِ حکومت ہے۔ جب تمام تہذیب یافتہ ممالک میں صدیوں سے یہی حکومت قایم ہے۔ جب تعلیم و تہذیب دونوں کا تقاضا ہے کہ یہی حکومت قایم ہو جب خود مذہب نے اِسی حکومت کو استحسان کا خلعت بخشا ہے اور اُس کے

قیام کی ہدایت فرمائی ہے تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان اُس سے ناراض ہوں اور اُس کو اپنے حق میں مضر سمجھیں؟ اور وہ کونسی دلیلیں ہیں جو اِس کے مقابلے میں حکومتِ شخصی کو ترجیح کی ڈگری دلا سکیں؟۔

رفتارِ زمانہ اور روشِ راستی کے خلاف راستہ نکالنا گویا دیدہ و دانستہ گمراہی کے گڑھے میں گرنا ہے۔ اگر ٹرکی کی حکومتِ شوریٰ کو نامسعود و غیر مفید خیال کیا جاتا ہے تو ایران کے انقلابِ حالیہ کو کیا کہا جائیگا۔ جو مسلسل اور متواتر دو تین سال کی خانہ جنگیوں بدنظمیوں، بے اطمینیوں کے بعد، محمد علی شاہ قاچار کی معزولی، اور اُن کے سیزدہ سالہ لڑکے کی اورنگ نشینی کی شکل میں دنیا پر ظاہر ہوا ہے۔ اگر ایک قوم باغی، خود سر غدار ہو گئی تھی۔ تو دوسری قوم کو بغاوت، سرکشی اور سفاکی کا سبق کس نے پڑھا دیا؟۔

ترکی میں "پھانسی" کی سزاؤں کا سلسلہ جو ہنوز اب تک جاری ہے۔ بے شبہہ انصاف کی نگاہ میں کھٹکتا ہے۔ فرض بھی کیا جائے کہ بدقسمت عبدالحمید خان کے سابق حاشیہ نشینوں اور غاشیہ برداروں کی فتنہ آفرینی اور مفسدہ پردازی (جو سچ پوچھا جائے تو ینگ پارٹی کو آزادی اور حکومتِ پارلیمنٹ دلانے والی تھی۔ اور اِس وجہ سے پارٹی اُس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کرے کم ہے۔) بہت ہی سنگین تھی جس کا وزن کم کرنے سے تمام قسم کی سزائیں (مثلاً تنخواہ و مناصب کی منسوخی، جائداد و املاک کی قرقی، وطن سے اخراج، وغیرہ) عاجز تھیں تو یہ ممکن تھا کہ مدت العمر انہیں قید کی سختیاں جھیلائی جاتیں۔ اور رحم و مسامحت کے برتاؤ سے ستائش و آفرین حاصل کی جاتی۔ اِس سے انکار نہیں کہ "الفتنۃ اشد من القتل" پھر بھی فتنہ کی سزا قتل نہیں ہو سکتی۔ تاریخ اسلام کے بیسیوں صفحے شہادت دے سکتے ہیں کہ مغلوب فتنہ پردازوں کو اکثر معافی دی گئی یا جلاوطن کر دیا گیا۔ خلافتِ عباسیہ کی طویل مدت نے اکثر صوبوں میں خروج و بغاوت کے جھنڈے دیکھے۔ خلافتِ راشدہ کو بعض عرب قبیلوں کے ارتداد اور خروج عن الاسلام سے مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت علی کے بعد حضرت معاویہ کو اکثر مخالف طبقوں سے پالا پڑا۔ حضرت عثمان کی شہادت بھی بہت بڑا فساد تھی۔ غرض ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ خلیفۂ وقت یا سلطانِ زماں کے خلاف کارروائیاں کی گئیں لیکن یہی ہوا کہ فتنہ و فساد کا استیصال کیا گیا۔ اور اطاعت قبول کرنے کے بعد مجرموں کی معمولی گرفتاری کافی سمجھی گئی۔ آزادی کے حامیوں کو سمجھنا چاہیے کہ ملک میں دو خیال تھے۔ ایک کو فتح حاصل ہوئی دوسرے کو شکست۔ گو شکست پانے والا ناحق پر تھا لیکن جب وہ قبضہ میں آچکا ہے اور اطاعت قبول کرتا ہے تو بے ضرورت جان کھونے سے کیا حاصل؟ خدا و رسول کا انکار موجبِ قتل نہ ہو سکا تو جمہوریت کا انکار کیوں پھانسی کا مستوجب بننے چلا؟۔

سلطان سابق کو سلطان حال کے مقابلہ میں بزدل کہنا جوانمردی نہیں ہے اُن کی با اقتدار فرمانروائی ہزارہا دشمنوں کو اُن کی گھات میں رکھتی تھی اور اناركسٹ کے زہریلے پودوں سے قسطنطنیہ کی سرزمین خالی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے سلطان کی احتیاط و حفظ ماتقدم مورد اعتراض نہیں بخلاف اس کے سلطان حال کی دشمنی سے کسی کو کیا حاصل ہو سکتا ہے جب اُن کے ہاتھ میں کچھ رکھا ہی نہیں ہے تو انھیں اپنی جان کا کیا خوف ہو سکتا ہے؟۔

اگر سلطان سابق نے قوم کو پارلیمنٹ نہیں دی تو خود قوم کب اُسے لینے کی مستحق تھی۔ دو چار دس پانچ افراد شمار میں نہیں آ سکتے۔ ہماری بحث قوم سے ہے جب تک قوم نے قابلیت کا ثبوت نہیں دیا پارلیمنٹ نہیں لے سکی۔ جب وہ قابل ہو گئی۔ اُسے پارلیمنٹ بھی مل گئی۔ جب مسلم ہے کہ دنیا کے کسی خود مختار بادشاہ نے خود ہو کے قوم کو حکومت میں شریک نہیں کیا تو سلطان عبدالحمید خان کیونکر اس کلیے سے مستثنیٰ ہو جاتے؟۔

ایک اکیلا بادشاہ اور وہ بھی طوفاں رسیدہ کشتی کا ناخدا، پھر چٹانوں اور پہاڑوں میں کشتی کھینے والا جس کا نہ کوئی یار و یاور نہ مشیر و دستگیر۔ جو خود غرض اور نمکحرام کارپردازوں میں پھنسا ہوا ہو اور جس نے کسی کو قابل اعتماد نہ پایا ہو اگر بے راہرو ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔ ینگ ٹرکش پارٹی کو سمجھنا چاہیے کہ خود قوم میں پوری قابلیت نہیں پیدا ہوئی تھی ورنہ سلطان سابق کے حوالی موالی (جو قوم سے خارج نہیں تھے) غدار و نمکحرام نہ ہوتے اور سلطان کو ایسے مشورے نہ دیتے جو ملک میں تباہی و بربادی پیدا کرتے اگر پوری قوم شائستہ ہو گئی ہوتی تو سلطان میں اس قدر خود مختاری اور بے اعتمادی کیسے پیدا ہو جاتی۔ ایسی حالت میں اس نے اپنی عقل و رائے سے ملک کی سرسبزی و بہبودی کے متعلق جو کچھ بھی کیا ہے بہت غنیمت ہے۔ جو کچھ نہیں کیا ہے اُس پر کبھی مورد الزام و اعتراض نہیں ہو سکتا۔

ترکی عدالتوں میں سلطان سابق کے خلاف، بعض ساہوکاروں کے دعوے دائر ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد حکومت میں ان ساہوکاروں سے کچھ موتی اور جواہر لیے تھے اور ان کی قیمتیں نہیں ادا کی تھیں۔ ان ساہوکاروں کی سمجھ پر ہنسی آتی ہے اور افسوس بھی کیا وہ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ عدالتوں سے فیصلہ بھی پا لیں تو کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے عبدالحمید خان اب سلطان ترکی نہیں ہیں کہ یلدیز کا کوئی خزانہ دے دیں۔ نہ وہ آزاد پھر رہے ہیں کہ جیلخانہ بھیجے جائیں وہ پہلے سے ہی نظر بند ہیں اور اُن کے گزارہ کے لیے گورنمنٹ کی جانب سے جو رقم معین ہے وہ موتیوں اور جواہرات کی قیمت نہیں ادا کر سکتی۔ **ایڈیٹر**

کپڑے بدل کے باہر نکلنے پر اُسے محسوس ہوا کہ محل کے تمام رہنے والے رنج و غم میں ڈوبے ہوئے ہیں اور فکر و تشویش میں رہا کرتے ہیں۔

اب ہم پھر بوڑھے چرواہے کی خبر لیتے ہیں۔ ہفتہ کے دن ظہر کے بعد، وہ مسٹر فلینی کے گھر گیا۔ معلوم ہوا کہ فلینی کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ بات یہ تھی کہ ابھی ایک گھنٹہ پہلے پیٹر آیا تھا۔ اور سوسن سے اپنی شدید محبت کا اظہار کر کے اس بات پر رضامندی لے لی تھی کہ فلینی سے شادی کی اجازت طلب کرے۔

چنانچہ وہ فلینی کو کسی باغ کی سیر کرانے کے بہانے سے باہر لے کے چلا گیا تھا۔ اور نواب بیگم بھی انہی کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ کیونکہ وہ گیرڈی سے مل کے یہ طے کرنا چاہتی تھی کہ جب گیرڈی اُس کے شوہر سے انتقام لینا چاہے تو اُس کے بچوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ گیرڈی نے کشفِ اسرار کے لیے جو جو تدبیریں سوچی تھیں اور اخذِ انتقام کے واسطے جو جو منصوبے گانٹھے تھے وہ سب نواب بیگم کو معلوم ہو چکے تھے۔

یہ اسباب جمع ہو گئے تھے جن کی بدولت سوسن محل میں تنہا رہ گئی تھی بوڑھے چرواہے کو کھل کے ملاقات کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا وہ سیدھا محل میں چلا گیا اور سوسن سے مل کے کہنے لگا کہ اب وہ فارغ البال و خوشحال ہو گیا ہے اور گیرڈی کا شکریہ ادا کرنے کو پیرس آیا ہے۔ سوسن نے بوڑھے سے وہ تمام حالات بیان کیے جو اس عرصِ مدت میں جنگلی انسان پر بیتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ نواب بیگم یہیں باوا جان کے ہاں ٹھہری ہوئی ہیں اور ملکہ اپنے باپ کے پاس رہتی ہے۔ مگر اس نے وہ اسباب نہ بتائے جو اس جدائی کا موجب تھے۔ چرواہے نے ارادہ کر لیا کہ نواب کے محل کا رخ کرے اور ممکن ہو تو ملکہ کو بھی ایک نظر دیکھ آئے۔ سوسن نے اُسے منع کیا اور بولی کہ ملکہ تمہیں نہیں دکھائی جائیگی۔ مگر بوڑھے نے اپنی پختہ کاری کے برتے پر اُس کی ایک نہ مانی اور رخصت ہونے لگا۔ چلتے وقت سوسن نے کہا کہ اگر ملکہ سے تمہاری

ملاقات ہو جائے تو مجھ سے بھی آ کے قصہ بیان کرنا۔ چرواہا وعدہ کرتے ہوئے چلا گیا۔

سولہواں باب

خوفناک رات

ہفتہ کی رات اور رات کی پہلی ساعت تھی کہ پیٹر گستری کے محل میں نواب داخل ہوا۔ محل ہر قسم کی زینت سے آراستہ تھا اور شہانی روشنی سی جگمگا رہا تھا۔ مسٹر فلینی اور مسٹر مورینی وہاں پہلے سے موجود تھے جو نواب بیگم کے دوستوں میں سے تھے۔ انہیں دیکھکے نواب کو تعجب پیدا ہوا اور وہ مشوش ہو کے دل میں کہنے لگا۔ "الٰہی خیر! یہاں مجھے فتنہ پردازی کے سامان نظر آ رہے ہیں۔" ان دونوں نے نواب کو دیکھ کے صاحب سلامت کی۔ اور تعظیم کے لیے اٹھے۔ نواب ان کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اور کچھ رسمی گفتگو چھڑ گئی۔

پاؤ گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ ایک نوکر نے ریاول کے آنے کی اطلاع دی اب تو نواب کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہاں کوئی مکر کا جال پھیلایا گیا ہے۔ ورنہ ریاول جس سے پیٹر کی شناسائی نہیں یہاں کیونکر پہنچ جاتا۔ جب ریاول اندر آ گیا تو نواب نے اس سے پوچھا۔

"ریاول! تم یہاں کیسے آ گئے؟"

پیٹر:۔ (ریاول کو جواب کا موقع نہ دے کے) نواب صاحب! آپ کو ان کے آنے پر تعجب ضرور ہوگا۔ بات یہ ہے کہ آج ہی میں نے ایک دوست کے ہمراہ ان کو ہوٹل میں دیکھا اور وہاں میری ان کی معرفی ہو گئی۔ چونکہ میں نے آپ کو دعوت دی تھی مناسب معلوم ہوا کہ انہیں بھی

مدعو کروں۔"

اس تقریر سے نواب کی گونہ تشفی ہو گئی۔ مگر پھر بھی خلش باقی تھی کہ ایک نوکر نے دسترخوان تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔ سب مہمان اُٹھے۔ اور میز پر جا کے ہنسی خوشی سے تناول میں مصروف ہوئے۔ اس وقت نواب کا دل بالکل مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ اُسے جو خیال پیدا ہوا تھا اُس کی نسبت کوئی مزید آثار نہیں ظاہر ہوئے۔

جب سب دعوتی کھانے سے فارغ ہو چکے تو رقص و سرود کا رنگ جمنے لگا یہاں تک کہ گھڑی نے دس بجا دیے۔ اس وقت ایک خادم نے خبر دی کہ "مارکوئس جیمپیری تشریف لاتے ہیں۔"

یہ جملہ سنتے ہی نواب کے ہوش اُڑ گئے۔ خون خشک ہو چلا۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس کے سر پر گویا ایک بجلی گری۔ متحیر اور ہکا بکا ہو کے کھڑا تھا۔ اور کٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ حاضرین جلسہ بھی سخت انتشار میں پھنسے ہوئے تھے۔

کمرے میں یہی سماں بندھا ہوا تھا کہ مارکوئس جیمپیری داخل ہوا جو بعینہٖ جبلی انسان تھا۔ اس کو دیکھ کے نواب کی خود رفتگی بہت بڑھ گئی حاضرین بھی تشویش کر رہے تھے۔ مگر جوب نے آگے بڑھ کے سلام کیا اور حیرت و مسرت سے کہا "ہماری خوش قسمتی کا کیا کہنا کہ آپ نے بھی اپنی تشریف آوری سے جلسہ کی رونق بڑھا دی۔"

جب نواب کی حیرانی کچھ کم ہوئی اور طبیعت میں سکون پیدا ہوا تو وہ تمسخرانہ انداز سے ہنستا ہوا جبلی انسان کی طرف بڑھا اور کہنے لگا:۔

"جناب من! معاف فرمائیے! میری سمجھ میں آپ کا نام نہیں آیا۔ لہٰذا اگر آپ دوبارہ ارشاد فرمائیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔"

جبلی انسان (نہایت اطمینان سے) کیا آپ نے خادم کی زبان سے "مارکوئس جیمپیری" کا

نام نہیں سُنا؟"

نواب: "سنا تو سہی! مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا مارکوئس چمبری آپ ہی ہیں؟ اگر تکلیف نہ ہو تو مجھ پر اور ان معزز حاضرین پر نوازش فرما کے ذرا یہ تو بیان کیجیے کہ آپ جس خاندان کی طرف اپنے آپ کو منسوب کر رہے ہیں یہ کونسا خاندان چمبری ہے؟"

خبگلی انسان: "بہت اچھا سنیے! قدیم الایام سے لے کر آج تک فرانس میں اس نام کا کوئی اور خاندان نہ تھا۔ مگر صرف میرا خاندان۔ میری دادی مارکوئس لوئی کی بیوی تھیں۔ اُنہوں نے نواب سمسم سے دوسرا نکاح کیا تھا اُنہیں اپنے اگلے شوہر سے ایک بچہ تھا۔ "پال" اُس کا نام تھا۔ اور دوسرے شوہر سے بھی ایک بچہ ہوا تھا۔ اُسے "لاون سمسم" کہا جاتا تھا وہ لاون آپ ہی ہیں۔ پس آپ میرے چچا اور میرے باپ کے اخیافی بھائی ہیں۔"

نواب: "جھوٹ، افترا، بہتان، بے شرمی، بے حیائی، صاحبو! آپ نے دیکھا اس عجیب و غریب مقدمہ پردازی اور شعبدہ بازی کو۔ آپ نے دیکھا اس عجب و غریب انتساب کو۔ جسے خدا نے کسی شہدے گدے کے دل میں بھی نہ ڈالا۔"

حاضرین کی حالت یہ تھی کہ کوئی سر کی کہتا تھا کوئی پاؤں کی۔ کوئی مشرق کی سناتا تھا کوئی مغرب کی۔ خبگلی انسان بھی چیں بہ جبیں ہو گیا تھا اُس کی حالت متغیر ہو رہی تھی۔ پھر بھی اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک تمسخرانہ ادا سے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ نواب کہنے لگا۔

"دنیا اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ بھائی صاحب مرحوم نے شادی نہیں کی تھی اور ۱۸۵۴ء میں غرق ہو کے رحلت فرمائی تھی۔ پھر کس طرح کوئی اُن کا جائز قانونی بیٹا بن سکتا ہے؟ حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیے

کہ یہ شخص بڑا جعلساز، چور اور بدمعاش ہے۔ میں قطعاً نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ جب اس نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے تو ضرور ہے کہ دلیلیں بھی پیش کرے اور اس دعوے میں راستباز ثابت ہو۔"

جنگلی انسان کے پیچھے ہی ایک ملاح جس کی ڈاڑھی گنجان اور جس کے بال گھنے تھے۔ اس طرح آ کے بیٹھ گیا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی تھی یہ ملاح اُٹھ کے اپنی جگہ پہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "نواب صاحب بالکل صحیح فرماتے ہیں اور انہیں حق ہے کہ وہ اس شخص کو مارکوئس نہ کہیں۔ اس واسطے کہ یہ نہ تو مارکوئس چیمبری ہے۔ نہ اس لقب کا مستحق۔ کیونکہ اس کا باپ اب تک زندہ موجود ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام حاضرین کے مُنہ سے بے اختیاری میں ایک چیخ نکل گئی۔ اور سناٹا طاری ہو گیا۔ نواب کا لہو خشک ہونے لگا وہ ہانپتا کانپتا پیچھے ہٹ آیا۔ گویا اُس نے کسی ہولناک خیال کو محسوس کیا۔ اُس کے تصوّر میں پھرنے لگا کہ قریباً پچیس سال سے اُس کے بھائی کے آثار پوشیدہ طور پر اُس کو معلوم ہو رہے ہیں پھر وہ اپنی سابقہ جرح و قدح کی طرف لوٹ آیا اور حاضرین پر نظر ڈالی تو انہیں متحیر و سراسیمہ پایا۔ پس وہ کینہ توزی کی ہنسی ہنستا ہوا ملاح کی طرف بڑھا اور بولا: "آپ نے بالکل نیا مضمون سنایا جو آپ کے ساتھی کو نہ سوجھا تھا۔ آپ نے کہا ہے کہ مارکوئس چیمبری زندہ موجود ہیں وہ مارکوئس چیمبری شاید آپ ہی ہونگے ملاحوں کا بھیس بدلے ہوئے!"

ملاح: "خداوند! اگر میں ہی مارکوئس چیمبری ہوتا تو آپ پہچان نہ لیتے۔ اتنا تامل کیوں ہوتا؟"

نواب: "درست ہے۔ خیر میں دیکھوں تو سہی کہ تم اور تمہارا یہ ساتھی

کہاں تک دوڑ کے جاتے ہو۔ صاحبو! آپ نے دیکھا یہ کیسی ہنسی کے قابل باتیں ہیں۔ ان دونوں کو سوانگ لانے میں کمال ہے۔ پہلے ایک تھا، پھر دوسرا آیا۔ اب شاید کوئی تیسرا بھی آموجود ہو۔ اور اس سے بڑھی ہوئی بے شرمی کے ساتھ بہروپ بھرنے میں کوتاہی کرے بلکہ کیا عجب ہے کہ یہ بہروپیے ٹھٹھول کے لئے بہادر مرحوم کی کوئی شبیہہ بھی لاکے کھڑی کردیں۔ اور اپنے بہروپ کی صفائی پر داد طلب ہوں۔"

جنگلی انسان: "نواب صاحب! آپ کی یہ باتیں ہم کو اظہار حقیقت سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ یہاں نہ آپ کا کوئی حکم چل سکتا ہے۔ نہ آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہے۔ نہ آپ کی برہمی و برآشفتگی کوئی اثر پیدا کرسکتی ہے۔"

نواب: "کمبخت تجھ پر خدا کی مار! تو آخر ہے کون اور مجھ سے چاہتا کیا ہے؟ جو کچھ کہنا ہے کیوں نہیں کہتا؟"

جنگلی انسان: "جناب والا! میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مارکوئس پال چیمیری کا متروکہ جس کی مقدار ۶۰ لاکھ فرنک تھی، کیا کیا؟ وہ آپ کے پاس امانت ہے یا نہیں؟"

نواب: (انتہائے غضب میں آکے) او بدمعاش لچے اٹھائی گیرے! میں تیری اس بیجا جسارت پر صبر نہیں کرسکتا اور اپنے غصے کو روک نہیں سکتا۔ میں تجھے اور تیرے اس ساتھی کو اس ڈھٹائی اور بدزبانی کا ایسا مزہ چکھاؤنگا کہ عمر بھر یاد ہی تو کریگا۔ معزز حاضرین! آپ نے ان کی حرکات دیکھ لیں اور کلمات سن لیے۔ اب میں آپ سے مشورہ لیتا ہوں کہ ان شہدوں کو کیا سزا دی جائے کہ یہ آئندہ کسی معزز امیر کو دق نہ کریں؟"

اس جملہ کو پورا کرنے کے بعد، نواب منتظر تھا کہ کوئی اس کی تائید کریگا

اسی خیال سے وہ مسٹر فلینی کی طرف بڑھا۔ اور ہاتھ پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر فلینی نے تیوری چڑھا کے ہاتھ الگ جھٹک دیا۔ اور بولا "نواب صاحب! آپ پر ایک بڑے جرم کا الزام لگایا گیا ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ آپ اس الزام سے خود کو بری کریں۔ یہ ۶۰ لاکھ فرنک کا ترکہ کیا؟ اور اس کا امانت رہنا نہ رہنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

نواب: "بندہ پرور! خدا جانے آپ نے اس شہدے کی بات پر بجائے خود کیا خیال کر لیا۔ بات یہ ہے کہ برادر مرحوم پٹافیا کو جاتے ہوئے اپنا کچھ مال میرے پاس رکھوا گئے تھے۔ اور مجھے اس پر مطلق العنانی دے دی تھی۔ انہوں نے رحلت فرمائی اور وہ مال میرے حصے میں آیا۔"

فلینی: "اور یہ جو ان کے شادی کر لینے کے متعلق کہا گیا؟"

نواب: "یہ محض دروغ و افترا ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔"

فلینی: "اور وہ جو ان کے لڑکے کی نسبت بیان کیا گیا؟"

نواب: "وہ دروغ پر دروغ اور بہتان پر بہتان ہے۔ مجھ پر اگرچہ ایک شرمناک اتہام لگایا گیا ہے مگر مجھے اس کی کچھ پروا نہیں۔"

لیکن نواب کی حالت یہ تھی کہ چہرے سے اضطراب و بیقراری کی علامتیں ہویدا تھیں۔ سینے میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں مارے غصے کے دو مشعلیں نظر آتی تھیں۔ اور حلقہ ہائے چشم سے اتنی باہر نکل آئی تھیں کہ گویا اب گری پڑتی ہیں۔ منہ میں کف بھر آیا تھا۔ اور بدن پر ٹھنڈا پسینہ بہ رہا تھا۔ مختصر یہ کہ نواب مختلف کیفیتوں کے عجیب عالم میں پھنسا ہوا، بڑے فشار میں مبتلا تھا۔ فلینی کے سوالات سے دق تنگ آ کے کہنے لگا۔ "اگر کوئی مجھ سے اپنا بغض للہی نکالنا چاہتا ہے (اور میری مراد ان دو حیلہ سازوں سے نہیں ہے) تو وہ میرے روبرو آجائے

منہ کیوں چھپائے ہوئے ہے؟ (پیٹر سے) جناب عالی! آپ نے مجھے
کیسی دعوت دی ہے جس میں سراسر میری توہین و تضحیک ہو رہی ہے
یہ دونوں اس حالت میں یہاں کیسے آگئے ہیں؟ اور یہ کیسا مکر و فریب
پھیلایا گیا ہے۔"

پیٹر:۔ "نواب صاحب! میں آپ سے قسمیہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں
جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مجھ کو مطلق خبر نہ تھی۔"

نواب:۔ (غصہ سے) جھوٹے ہو تم۔ بالکل جھوٹے۔ تم ہی نے اپنے
گھر میں میرے لیے یہ جال بچھایا۔ اور مجھے اس میں پھنسانے کی
بے فائدہ کوشش کی۔"

یہ سن کے پیٹر کو بھی غصہ آگیا اور اس میں ضبط کی تاب نہ رہی
وہ نواب کی بری طرح خبر لینے کو تھا مگر فلانی نے روک لیا اور بولا۔
"پیٹر! یہ کیا کرتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بگڑنے کا موقع ہے۔ غصہ کو
تھوک دو۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھ کے چپ چاپ دیکھتے جاؤ کہ کیا تماشہ
نظر آتا ہے۔"

پیٹر:۔ "یا تماشہ دیکھوں۔ آپ نے سنا نہیں کہ اس نے کیسے بیہودہ الفاظ
میری شان میں استعمال کیے ہیں۔"

فلانی:۔ "کرنے بھی دو۔ اس وقت وہ اپنے آپے میں نہیں ہے۔ جو کچھ
کہہ رہا ہے۔"

نواب غصہ سے بڑبڑا رہا تھا۔ اور پاؤں زمین پر دے مار رہا تھا
اسی اثنا میں اس کی نظر فلانی پر پڑی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگے۔
"میری سخت اہانت کی گئی۔ اور سزا پہنچایا گیا جس کی مجھے توقع
نہ تھی۔ افسوس! اے دل تیرا باپ گالیاں کھا رہا ہے۔ اور
بے عزت کیا جا رہا ہے اور تو ٹھنڈے دل سے سب کچھ دیکھ رہا ہے

تیری شرافت میں رخنہ پڑ رہا ہے اور تو ٹس سے مس تک نہیں ہوتا۔"

ریاول: "(جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور جو اس وقت کانپ رہا تھا) باوا جان! میں سن رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں، اور انتظار کر رہا ہوں۔"

نواب: "بدبخت! تو کس بات کا انتظار کر رہا ہے۔ تیرے دل میں حمیت نہیں؟ تیری رگوں میں فرانسیسی خون نہیں؟ تو سپاہی اور سپاہی زادہ نہیں؟"

ریاول: "ضرورت کے وقت جو کچھ مجھ پر فرض ہوگا۔ میں اُسے انجام دونگا۔"

نواب: "نابکار! کیا تو بھی مجھے رنج پہنچانے میں حصہ لے رہا ہے۔"

ریاول: "(یہ جملہ سن کے ملاح سے مخاطب ہو کے) تو نے میرے والد ماجد پر ایک شرمناک تہمت باندھی ہے۔ پس مجھے یا تو ثبوت پیش کرنا چاہیے یا اپنے آپ کو یاداش کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔"

نواب: "(ریاول سے) او پاگل! تو کچھ سودائی تو نہیں ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی اُس کا سارا بہتان وافتراء سن چکا ہے پھر بھی سننے کی آرزو رکھتا ہے۔"

ٹیلینی: "(ملاح سے) تو نے ہمارے مہربان نواب کی امارت کو اپنی شیطانی فریب کاری کا نشانہ بنانا چاہا ہے۔ اس لیے تو مستوجب سزا ہو گیا ہے بجز اس صورت کے کہ تو نے جو دعویٰ کیا ہے اُس کے ثبوت کی دلیلیں پیش کرے۔"

ملاح: "خداوندا! میرے پاس ثبوت کی دلیلیں موجود ہیں۔ بشرطیکہ آپ حضرات کان دھر کے سنیں۔ ایک دلیل تو خود یہی ہیں (جنگلی انسان کی طرف اشارہ کر کے) اور۔۔۔۔۔"

نواب: "خبیث! مردود! بلہ فریب! تیری شامت تو نہیں آ گئی ہے۔"

ملاح بولا اور دوسری دلیلیں میں اس وقت بیان کروں جب آپ سب حضرات اطمینان سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ صاحبوں کو اپنی خود بیتی سنانا چاہتا ہوں جس میں دروغ کا شائبہ تک نہ ہوگا۔"

حاضرین جلسہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور بے ترتیبی جاتی رہی۔ ملاح بلند آواز سے کہنے لگا "سرداران قوم! چند سال کے پہلے جس جہاز کے ڈوب جانے کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ اور یہ خیال کیا گیا تھا کہ مارکوئس چیبری بھی اس جہاز پر سوار تھے۔ اور غرق ہو گئے۔ میں اسی جہاز کا ایک ملاح تھا۔ جب جہاز کا برا وقت آپہنچا اور وہ ڈوب گیا تو اکثر مسافر اس کے ساتھ ہی ڈوب گئے۔ مگر بعض خوش قسمت سطح آب پر تیرتے اور غوطے کھاتے بھی نظر آئے۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ سمندر کا پاٹ! اور تیر کے جان بچانے کی کوشش! سعی بیفائدہ ہے۔ تھوڑی دیر تک تو میں پوری چستی سے تیرتا رہا۔ لیکن پھر اعضا میں سنسناہٹ پیدا ہو چلی۔ اور میں بے دم ہو کے سمندر کی تہ میں جانے کو ہو گیا اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "ہمت نہ ہارو، ہمت نہ ہارو" اس آواز کو سن کے مجھے ڈھارس بندھی اور مخلصی کی کچھ کچھ امید ہو چلی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا شانہ کسی زبردست ہاتھ کی گرفت میں آگیا ہے میں بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ مگر یہ فرشتۂ غیبی بڑی پھرتی سے تیر رہا تھا۔ اور اس کا دم بندھا ہوا تھا۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ساتھ کھینچ رہا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کٹھن وقت اور ناامیدی کے عالم میں شکستہ جہاز کا ایک تختہ ہمیں مل گیا۔ اور ہم اس پر سوار ہو گئے۔ موجوں کی روانی اور ہوا کے بہاؤ نے ہمیں افریقہ کے ایک ساحل سے لگا دیا۔ جو حبشیوں کی عملداری میں داخل تھا۔ ایک بڑی موج نے ہمیں خشکی پر پھینک دیا جہاں بیٹھ کر پہلے تو ہم نے کچھ دم لیا۔ بعدازاں سیپیوں اور پھلوں کو

چنتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔

دو دن تک ہم جنگل کے میووں اور نہروں کے پانی پر بسر کرتے رہے تیسرے دن ہم کو دور پر ایک غوغا سنائی دیا۔ اور تھوڑی دیر میں ہم نے دیکھا کہ حبشیوں کی ایک ٹولی ہتھیار سجائی ہوئی، چیختی چلاتی، ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ یہ منظر دیکھتے ہی ہم سٹی بھول گئے۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑیں۔ مگر خیریت گزری اور خدا نے اپنا فضل کیا کہ ان حبشیوں نے ہمیں ستایا نہیں۔ صرف بیڑیاں پہنا کے اپنے شہروں کی طرف لے چلے۔ ہم لوگ مدت تک اُن کے پاس رہے۔ اس اثنا میں میری جان بچانے والے رفیق نے اُن سے ایسی نیک نفسی اور خوش خلقی کا برتاؤ کیا کہ وہ اُسے دل سے چاہنے اور عزت سے پیش آنے لگے۔ یہاں تک کہ کوئی کام اُس سے مشورہ لیے بغیر نہ کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ وہاں کے بادشاہ کو ہماری خبر پہنچی۔ لوگ ہمیں لے جا کے اُس کی ڈیوڑھی میں چھوڑ آئے۔ بادشاہ نے میرے دوست میں ذکاوت و فطنت کے آثار دیکھے تو اُس کو اپنا مشیر و وزیر بنا لیا۔ اور میں اس کا محرم راز بن گیا۔

ہم بادشاہ کے پاس کامل چھے سال تک ٹھہرے رہے۔ اور امید کرتے رہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ وہ ہمیں رخصت کر دیگا۔ مگر اُس نے ہمیں اجازت نہ دی اور ہمیشہ اپنے پاس رہنے پر اصرار کرتا رہا جب ہم کو اُس کی خدمت گزاری میں بیس سال گزر گئے تو اُس کا انتقال ہو گیا۔ مرتے دم اُس نے اپنے ولی عہد کو وصیت کی کہ ہم سے کوئی تعرض نہ کرے اور ہمارا راستہ صاف کر دے۔ اُس نے ہم کو سفر کی اجازت دے دی۔ ہم وہاں سے نکلے۔ سمندر کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے انگریزی عملداری میں آئے۔ انگریزی حکام نے

ہمارا استقبال کیا اور ہمیں پہننے کو عمدہ پوشاک دی۔ ہم وہاں سے ایک جہاز میں راہی انگلستان ہوئے۔

اثنائے راہ میں میرے دوست نے مجھ سے اپنا ماجرا بیان کیا مجھے معلوم ہوا کہ وہ فرانس کے ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے اور اُس کا نام "مارکوئس چیمپری" ہے۔ میں نے بھی اُس سے اپنی سرگزشت بیان کی کہ میں ایک گمنام خاندان سے تعلق رکھتا ہوں میرا نام اینڈری ہے۔ میرا کوئی عزیز و رشتہ دار سوائے ایک ماں کے باقی نہیں ہے۔ اس سفر کے ختم ہو جانے پر میں اُس کے دیدار کی آرزو رکھتا ہوں۔

انگلستان پہنچ کے ہم ایک اور جہاز میں سوار ہوئے۔ اور فرانس کا رستہ لیا۔ اس جہاز میں ایک ساہوکار بھی تھا جس کے نام سے مارکوئس واقف تھے۔ جہاز میں ان دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ ساہوکار کو مارکوئس کے دیکھنے سے سخت تعجب پیدا ہوا۔ دونوں ایک جگہ بیٹھ کے ہالینڈی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ میں مارکوئس کی حالت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی تو بیقرار ہو جاتے۔ کبھی بیہوری چڑھا لیتے اور کبھی بے اختیار رو پڑتے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ دونوں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اور ان سے کیسے جذبات ظاہر ہو رہے ہیں۔

فرانس پہنچنے پر میں نے اپنی ماں کی جستجو شروع کی۔ مجھے اطلاع ملی کہ اُس کو انتقال کیے پانچ سال گزر گئے۔ مارکوئس نے مجھ سے تنہائی میں وہ سب کیفیت بیان کی جو اُن کی بی بی اور بچے کے متعلق، ساہوکار کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں جب تک زندہ رہوں۔ اُنہیں کی خدمت میں رہوں۔ جسے سُن کے میں بہت مسرور ہوا اور جان و دل سے قبول کیا

میں نے اُن سے کہا کہ "آپ نے میری جان بچائی ہے۔ اب اگر آپ میری جان بھی لینا چاہیں۔ تو مجھے دریغ نہ ہوگا۔ میں ہمیشہ آپ کا خیراندیش رہونگا۔"

اُسی وقت اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آیندہ سے اُن کو اُن حقیقی نام سے نہ یاد کروں۔ بلکہ اُس فرضی نام سے پکارتا رہوں جو اُنہوں نے مجھے بتا دیا تھا۔ اِس سے غرض یہ تھی کہ جن حالات پر وہ مطلع ہونا چاہتے تھے اُن کی نسبت مخفی طور پر تفتیش کر سکیں۔

صاحبو! یہ راز آج تک میرے اور اُن کے درمیان سربستہ ہے اور آج میں آپ صاحبوں کے سامنے اِسے ظاہر کرتا ہوں کہ "مارکوئس پال جیمیری" خدا کے حکم سے زندہ اور صحیح سالم موجود ہیں۔"

نواب: "(انتہائے غضب سے زمین پر پاؤں مار کے) افوہ رے تیری حیلہ سازی اور ابلہ فریبی! کیسی تک بندی کی ہے کہ اچھے سے اچھے کو بھی ایک مرتبہ دھوکا ہو جائے۔ بس بس سن لیں ہم نے تیری دلیلیں۔ فریبی، اچکا، شہدا، کہیں کا۔ اگر تو سچا ہے اور وہ مارکوئس جس کا تو نے ذکر کیا ہے زندہ موجود ہے تو پردہ میں کیوں چھپا بیٹھا ہے۔ سامنے کیوں نہیں آتا۔ آخر ہم بھی تو دیکھیں کون مارکوئس ہے۔ وہ اِس وقت ہے کہاں؟ ہمارے روبرو حاضر ہو جائے۔"

نواب نے یہ جملہ ختم نہ کیا تھا کہ کمرے کی ایک جانب سے دروازہ کھلا اور مارکوئس جیمیری دبی ہوئی آواز میں یہ کہتا ہوا نکل پڑا "لو میں حاضر ہو گیا۔"

+ + + + + + + + + + + + + + + + +

تمام نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور سب پہ ایک

ربودگی طاری ہوگئی۔ حاضرین نے دیکھا کہ پردۂ غیب سے ظاہر ہونے والا بعینہٖ کرنیل گیرڈی ہے۔ حاضرینِ مجلس اُٹھ کے کھڑے ہوگئے لیکن ایسے بے حس و حرکت تھے کہ گویا بے جان و روح مجسمے قایم کردیئے گئے ہیں۔

مارکوئس آہستگی سے نواب کی طرف بڑھا۔ نواب نے بھیانک آواز سے زور کی ایک چیخ ماری اور پیچھے ہٹ آیا۔ اُس کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔ نگاہیں ترچھی پڑتی تھیں بوٹی بوٹی تھرتھرا رہی تھی۔ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ اور تصور میں مرگِ ناگہانی کا جہنم مُنہ کھولے ہوئے تھا۔

مارکوئس اگرچہ بظاہر سکون و اطمینان ظاہر کر رہا تھا۔ مگر اُس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ وہ نواب کے مقابل آکے ٹھہر گیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگا "نواب صاحب! آپ کو میرے حاضر ہونے کا انتظار تھا۔ لیجیے میں حاضر ہوگیا۔ مگر آپ کے چہرے پر خوشی کی وہ علامتیں کہاں ہیں۔ جو دو بھائیوں کی ملاقات کے وقت ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ خاصکر اُس وقت جب کہ عرصے سے بچھڑے ہوئے بھائی باہم ملے ہوں۔ نوابصاحب! آپ نے اپنے بھائی "مارکوئس پال جیمیری" کو بھلا دیا؟ بالکل فراموش کر دیا؟ ذرا سر تو اُٹھائیے، میری صورت دیکھیے، اپنی صورت دکھائیے۔ میری باتیں سنیے، اُن کا جواب دیجیے پچیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے کہ میں آپ سے جدا ہوا تھا۔ اور وہ چیز آپ کے پاس امانت رکھوا گیا تھا جو مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ کیا چیز تھی؟ میری بی بی مارشی نس لوسیا! آپ نے قول دیا تھا کہ اُس کی حفظ و نگہداشت کرینگے۔ نیز اُس بچے کی پرورش و پرداخت فرمائینگے جو لوسیا کو عنقریب پیدا ہونے والا تھا۔ اب میں صرف اِس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اُن دونوں کو آپ سے طلب کروں

اور ہاں نوابصاحب! وہ میرا اندوختہ کہاں ہے جو چلتے وقت میں آپ کے سپرد کر گیا تھا۔ اُس کو آپ نے کس صندوق میں چھپا رکھا ہے؟ آیا اب تک وہ امانت رکھا ہوا ہے یا آپ کی سخاوتِ بے اندازہ کی نذر ہو گیا؟ او بے رحم ظالم! خائن و قاتل! ساڈڈ چاوری کا خون ناحق ہر وقت تجھے عذاب میں رکھیگا۔ تو نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

نواب اِس وقت پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔ اور روتے روتے اُس کو ہچکی بندھ گئی تھی۔ اُس نے گلوگرفتہ آواز سے چیخ ماری۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُس کی حالت یہ تھی کہ اگر زمین شق ہو جاتی اور وہ اُس میں سما جاتا۔ یا آسمان پارا پارا ہو جاتا اور اُس پر ٹوٹ پڑتا۔ یا اونچے اونچے پہاڑ ٹکرے ٹکرے ہو جاتے اور اُس کو ریزہ ریزہ کر دیتے تو اُسے چین آتا اور وہ مطمئن ہو جاتا۔ مارکوئس نے اِس حالت میں اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "دیکھ! دیکھ! او پھاڑ کھانے والے بھیڑیے دیکھ! تیرے شانے کس طرح پھڑک رہے ہیں؟"

لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ اُس گھٹا میں سے جو آنسوؤں کے تار سے اُس کی آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی تھی، اپنے شانوں کو دیکھیگا۔ یا انتہائے خوف سے مُردوں کی طرح بے حس و حرکت ہو جائیگا بلکہ عنقریب اُس پر غشی طاری ہو جائیگی۔ یا مارکوئس کے قدموں پر گر پڑیگا۔ لیکن یہ سب غلط تھا۔ اُس نے حواس درست کیے، عقل کو ٹھکانے لایا۔ شیر کے مانند دلیر ہو کے اُٹھا۔ اور دروازے سے نکل کے فرار ہو گیا۔

لوگوں نے اُس کو روکنا چاہا۔ لیکن مارکوئس نے منع کر دیا اور

کہا:۔ روکنے کی کیا ضرورت ؟ اُس کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا منتقم حقیقی ہے۔ وہ اُس سے سمجھ لیگا۔"

نواب کے پیچھے ریاول بھی اُٹھا۔ اُس کا چہرہ رنج و غم کے مارے مبروص کے مانند سپید پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے بجلیاں نکل رہی تھیں وہ یہ کہتا ہوا کہ" ظالموں پر انتقام نازل ہوگا اور مظلوموں کا ضرور بدلا لیا جائیگا" اپنے باپ کے نشانِ قدم پر روانہ ہوا۔ اور کسی چیز کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا۔

اُس وقت مارکوئس کی طرف محبت بھری نظریں پڑنے لگیں اور تہنیت بھرے ہاتھ اُٹھنے لگے۔ حاضرین یک زبان ہو کے اُس کی مدحت سرائی کا راگ گانے لگے۔ مارکوئس اُن سے کہنے لگا:" صاحبو! آپ نے دیکھ لیا کہ میرے بھائی نے میرے ساتھ کیسی بھلائی کی! کوئی دشمن سا دشمن بھی ہوگا تو کسی کے ساتھ ایسی بُرائی نہ کریگا۔ جیسی اُس نے میرے ساتھ کی ہے۔ مگر خیر اُس کی نیک بخت بی بی اور سعادتمند بچوں کی خاطر سے میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ اپنے زندہ موجود ہونے کی اطلاع دے دوں۔ میں اس بارے میں سرکار سے بھی کوئی استغاثہ نہ کرونگا۔ وہ خدا جو واحد و قہار ہے میرا بدلا لے لیگا میں آپ صاحبوں سے صرف اتنی عنایت چاہتا ہوں کہ میرے خاندان کے جو جو اسرار آپ کو معلوم ہوئے ہیں وہ جوں کے توں آپ کے سینوں میں پنہاں رہیں! اگر وہ فاش ہو جائینگے تو مجھے بڑا صدمہ پہنچیگا۔"

حاضرین نے مارکوئس کی اس استدعا کو جان و دل سے قبول کیا اور اخفائے اسرار پر پیمانِ محکم باندھے گئے۔ پھر مسٹر فلینی نے کھڑے ہو کے کہا:۔ حاضرینِ مجلس! میں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر یہ بیان کر دینا

ضروری سمجھتا ہوں کہ مسٹر پیٹر گستری نے غریب زادی سے جو سوسن کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ شادی کی درخواست کی ہے جس کو سوسن نے منظور کر لیا ہے۔ پس میں ابھی سے آپ صاحبوں سے التماس کرتا ہوں کہ نکاح کے دن غربت کدے پر تشریف فرما ہو کے مجلس عقد کو رونق بخشیں۔"

یہ سُن کے جنگلی انسان نے پیٹر کو مبارکباد دی۔ پیٹر نے جواب دیا "میں آپ کی مبارکباد کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ساتھ ہی امید کرتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ آپ کو بھی بہت جلد فایز المرام کریگا اور آپ بھی بادۂ وصل پی کے دادِ عیش و کامرانی دینے لگینگے۔"

مسٹر موریسی:۔ (مارکوئس سے) کیا ملکہ آج ہی اپنی والدہ کے ہاں پہنچ جائینگی؟"

مارکوئس:۔ "بے شک! وہ آج ہی رات کو پہنچ جائیگی۔ (اینڈری سے جس نے اپنے مستعار کپڑے اُتار ڈالے تھے) نواب کے گھر میں تمہاری چالوں سے اب تک کوئی نہیں واقف ہوا ہے لہذا اب تم جاؤ اور وقت آنے تک اپنے فرایض منصبی کو بجا لاتے رہو۔"

حاضرینِ مجلس دیر تک اِن عجیب و غریب حالات کا تذکرہ کرتے رہے اور رات زیادہ آجانے کے بعد رخصت ہو گئے۔

سترہواں باب

جان جائے پر آن نہ جائے

اب ہمیں نواب کی خبر لینی چاہیے کہ وہ کس حال میں ہے۔ مارکوئس کے مقابلے سے تو وہ سر پر پاؤں رکھ کے اُفتاں خیزاں بھاگا تھا۔ رستے میں اُس کو کرایہ کی گاڑی مل گئی۔ جس نے اُس کو محل تک پہنچا دیا وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کے سخت اضطراب کے عالم میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ریاول اُس کے پیچھے ہی نکلا تھا۔ مگر راستے بھر میں کہیں اُس کو نواب کا پتہ نہ چلا۔ وہ سیدھا محل میں آیا۔ اور جا کے کمرے میں دیکھا تو نواب کو سخت درد و کرب کی حالت میں پایا۔ نواب نے اُس کو دیکھ کے پوچھا: "یہاں تم کیوں آئے؟"

ریاول: "یہاں نہ آتا تو اور کہاں جاتا؟"

نواب: "(تامل کر کے) خیر اب تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

ریاول: "میں واقف ہونا چاہتا ہوں کہ اب آپ کیا کرنے والے ہیں اور کیا ارادہ دل میں ٹھان رکھا ہے؟"

نواب: "میں کچھ نہیں جانتا۔"

ریاول: "آپ کو جاننا چاہیے۔ اب ہم کو ایک منٹ کی مہلت نہیں ہے ہماری عزت جاتی رہی۔ ہمارے وقار کا ایوان ڈھ گیا۔ ہم ذلیل و رسوا ہو گئے۔ ہمارا کوئی معین و یاور نہیں رہا۔ جان جائے تو جائے پر آن نہ جائے۔ ابا جان! آپ کے سامنے ہلاکت کا خوفناک گڑھا کھودا گیا اور آپ اُس میں گر کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ آپ کی پیشانی پر

کلنگ کا ٹیکا لگ گیا جس کو آبِ مرگ کے سوا دوسری چیز نہیں چھڑا سکتی آپ کے پاس ایک تنکا تک باقی نہیں۔ حتیٰ کہ آپ کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ بھی آپ کے نہیں ہیں۔ آپ کے تمام دیون کا ڈگریدار صرف وہی ایک مارکوئس ہے۔ جو آپ کے جور و جفا کا نشانہ بن چکا ہے۔ اُس کا ایک لفظ آپ کے خلاف فیصلہ صادر کرانے کو کافی ہو جائیگا۔ آپ کو اپنی بی بی بچوں کے مال سے بھی کچھ ملنے کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ کیونکہ وہ مال اُس شخص کا حصہ ہے جو اُس کا سب سے بڑا حقدار ہے۔ تاکہ اُس جفا و دغا کی کچھ تو پاداش ہو جائے جو اُس سے برتی گئی۔ ایسی حالت میں غور کیجیے کہ ہم کہاں پناہ لے سکتے ہیں اور کہاں جا کے مُنہ چھپا سکتے ہیں! پس ابا جان آپ ضرور مرنے والے ہیں۔ اور لا محالہ مرنے والے ہیں۔"

نواب: "بے شک بیٹا! میں ضرور مرونگا اور لا محالہ مرونگا لیکن۔"

ریاول: "ابا جان! آپ سے جو جو جرایم صدور پذیر ہوئے ہیں اُن سے بڑھکے شرمناک۔"

نواب: "تمہیں کیا معلوم کہ مجھ سے کیا کیا جرایم صادر ہوئے؟"

ریاول: "معلوم ہو گیا ابا جان معلوم ہو گیا۔ میں آپ کو ملامت نہیں کرتا کیونکہ میں خود ایک بڑے جرم کا مرتکب ہو چکا ہوں۔"

نواب: "تم سے کیا جرم + + + + ؟"

ریاول: "آپ کو اُس کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے اِس وقت صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم کو اُس ذلت و رسوائی کی مقدار جان لینی چاہیے جو ہمیں نصیب ہوئی ہے۔ ہمارے خاندان میں فقط اماں جان اور بہن ملکہ دو ایسی عورتیں ہیں۔ جن تک کسی طرح کا الزام نہیں پہنچ سکتا۔ اِس لیے ضرور ہے کہ اُن کی عزت و تمکنت

برقرار رہے اور خدا کے غضب کا شرارہ ہم پر ہی سرد ہو۔ تاکہ گناہگار کے ساتھ بے گناہ مفت میں نہ جل جائے۔"

نواب: "ریاول! آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

ریاول: "میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

نواب: "مرنے کے لیے تیار ہو جائیں اس کی کیا ضرورت؟"

ریاول: "اس کی سخت ضرورت ہے اب ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔"

نواب: "مگر ہم کیونکر مر جائیں۔ ریاول تجھ کو ہو کیا گیا ہے؟"

ریاول: "ہم کو ضرور مر جانا چاہیے۔ کیا آپ شرافت، مردانگی اور شرم و حیا کو خیرباد کہہ چکے ہیں؟"

نواب: "بھلا یہ چیزیں خیرباد کہنے کی ہیں؟ خدا جانے تم کیا کہے چلے جا رہے ہو!"

ریاول: "جب یہ اوصاف آپ میں باقی ہیں تو آپ سمجھ لیجیے کہ صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو ہماری پیشانی سے اس عار و ننگ کے ٹیکے کو مٹا سکتی ہے۔ اور بس۔ ہم کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں جب کہ حالت یہ ہے کہ نگاہیں ہم کو زخمی کیے دیتی ہیں۔ انگلیاں ہم پر اٹھ جاتی ہیں اور کوئی ہماری مدد کرنے والا نہیں ہے۔"

اس وقت نواب کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ اور اس کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ ریاول اس الماری کی طرف جس میں اس کے ہتھیار رکھے ہوئے تھے بڑھا۔ اسے کھول کے دو پستول باہر نکالے اور بولا "یہ لیجیے۔ ایک آپ رکھیے۔ ایک میں رکھتا ہوں۔ آدھی رات ڈھل جانے کے بعد، ایک ہی منٹ میں ہمیں ایک ساتھ ان دونوں کو اپنے دماغوں میں خالی کر لینا چاہیے۔ آپ اپنے دل کو ڈھارس دیجیے

اور خوب یقین رکھیے کہ عار و ننگ سے بچانے والا ایک موت ہی کا فرشتہ ہے۔ اور کوئی نہیں۔"

نواب: "(باحسرت و یاس) اچھا ریاول میں مرنے پر تیار ہوتا ہوں میں تمہارے قول کے مطابق عمل کرونگا اور یہ پستول رات کے ۱۲ بجے ہی میرے سر میں خالی ہو جائیگا۔۔۔۔ مجھے ضرور مرجانا چاہیے۔ مجھے بے شبہہ خودکشی کر لینی چاہیے۔"

ریاول: "دیکھیے آپ قول دے چکے اور ہم دونوں ایک عزم مصمم کی تکمیل کا عہد کر چکے۔ اب اس میں سرِ مو فرق نہ ہونا چاہیے۔"

نواب: "میں پوری طرح آمادہ ہو چکا ہوں۔ اب تم جا کے اپنی تیاری کرو۔"

یہ کہہ سن کے ریاول کمرے سے نیچے اترا۔ اس کے پیچھے ہی ایک اور آدمی بھی جو دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا نیچے اترا (اور وہ اینڈری تھا۔ جو مارکوئس کے حکم سے حسبِ سابق نوکروں کا لباس پہن کے آیا تھا اور جو کچھ یہاں گزرنے والا تھا اسے دیکھ رہا تھا) اس نے دیکھا کہ ریاول نیچے والے کمرے میں داخل ہوا۔ اور دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔ اس حالت کو دیکھ کے اینڈری حیران ہوا اور سوچا کہ کیا کرے۔ اس نے ارادہ کیا کہ جب وقت آئیگا تو وہ دروازے پر دستک دیگا۔ اور زور زور سے اسے پکاریگا۔ وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ دروازہ کھلا اور ریاول باہر نکل کے چلا گیا۔ اس کو دیکھ کے اینڈری کنارے ہو گیا رات اندھیری تھی۔ ریاول کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ اینڈری نے دیکھا کہ ریاول زینہ پر چڑھ رہا ہے اور پستول ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس موقع کو غنیمت جان کے وہ کمرے میں گھسا۔ میز پر پستول رکھا ہوا تھا اسے پھرتی سے اٹھا لیا اور گولی بارود سے خالی کر دیا۔ صرف پٹاخے کو بجائے خود رہنے دیا۔ اس کارروائی کو جلدی سے ختم کر کے خود باہر نکل آیا۔

ریاول ملکہ کے پاس جانے کو نکلا تھا۔ ملکہ کمرے میں غش کھا کے زمین پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ اُسے اِس حالت میں دیکھکے ریاول کے منہ سے چیخ نکلی۔ مگر پھر اُس نے حواس بر جا کیے۔ اور ملکہ کو زمین سے اُٹھا کے کرسی پہ بٹھایا۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہات دُھلائے۔ تھوڑی دیر میں ملکہ کو افاقہ ہوا۔ اور اُس نے آنکھیں کھول کے ریاول کی صورت دیکھی اور ایک آہِ سرد کھینچ کے اُسے سینے سے لپٹا لیا۔

ریاول: "ملکہ یہ تمہیں غش کیوں آگیا تھا۔ پیاری بہن! تم کو کوئی روحی صدمہ تو نہیں پہنچا؟"

ملکہ: "(دبی اور گھبرائی ہوئی آواز میں) ریاول! تم جو کچھ ارادہ ٹھانے ہوئے ہو اُس کی مجھے خبر ہوگئی اور اُسی کے اثر سے مجھے غش آگیا۔۔۔۔ اب تم میرے قبضے میں آگئے ہو۔ میں تم کو کبھی نہیں چھوڑنے کی۔"

ریاول: "نہیں ملکہ! ایسا نہ کرو۔ مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ دینا ضرور ہے اب میں زندہ رہنے والا نہیں۔ میں اور آبا دونوں ذلیل و رسوا ہو چکے ہیں دونوں اپنے وقار و عزت کو کھو چکے ہیں۔ اِس لیے ہم دونوں کو ایک ساتھ مرجانا ضرور ہے۔"

ملکہ: "مریں تمہارے دشمن! ایسا بُرا کلمہ مُنہ سے نہ نکالو۔ میں تم کو اپنے سے جدا ہونے دونگی نہ مرنے دونگی۔ رہ گئے آبا جان! اُنھوں نے کسی کا کیا چرایا چھپایا۔ جو ذلیل و رسوا ہوئے۔ اُن سے ایسی کیا حرکت سرزد ہوئی جو بے وقار و بے عزت ہو گئے؟"

ریاول: "پیاری بہن! میں تمہیں اُن دہشت افزا حالات سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ جو ہمیں مرنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

ملکہ: "اچھے ریاول! مجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ دیکھو اگر تم نے مجھ سے وہ حالات نہ بیان کیے تو میں اپنی بُری گت بنا لونگی۔"

یہ سُن کے ریاؤل نے مختصر سی تقریر میں وہ تمام حالات بیان کیے جن سے ناظرین بخوبی واقف ہیں۔ اثنائے تقریر میں ملکہ کبھی تو رونے لگتی، کبھی کانپ اُٹھتی، کبھی بے حس و حرکت ہو جاتی تھی۔ تقریر ختم کر کے ریاول نے پوچھا "اب تو تم سارا کچا چٹھا سن چکی ہو۔ بتاؤ کہ ہمیں مرجانا چاہیے یا نہیں؟"

ملکہ "ضرور مرجانا چاہیے۔ اب زندگی میں کوئی لطف نہیں رہا۔ ۔ ۔ ۔ شاید اسی وجہ سے جب ابا جان باہر گئے تھے، تو فرڈرک (یعنے اینڈری) نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ایک چور دروازے سے چلی جا سکتی ہوں مگر کیونکر جا سکتی؟ خدا کو تو مجھے اِن باتوں سے آگاہ کرنا مقصود تھا اچھا ہوا جو میں نہ گئی۔"

ریاول "خیر اُس وقت تم نہ گئیں۔ مگر اب تو اماں جان کے پاس چلی جاؤ وہ تمہارے انتظار میں بے چین ہونگی۔"

ملکہ "اب میں وہاں نہ جاؤنگی۔ اور جانے کی سکت بھی نہیں ہے۔ مجھے یہیں رہنا چاہیے۔"

ریاول "کیوں؟ اس کا کیا سبب؟"

ملکہ "سبب نہیں معلوم مگر مجھے یہاں رہنا ضرور ہے۔ ریاول! شریف انسان موت سے نہیں گھبراتا۔"

ریاول "اچھا تو اب تم مجھے چلے جانے کو کہتی ہو؟"

ملکہ "ہاں بس یہی چاہتی ہوں۔ اب تم جاؤ اور مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

ریاول "اچھا میں جاتا ہوں مگر تم کچھ یہ تو بتاؤ کہ آخر کرو گی کیا؟"

ملکہ "میں جو کچھ بھی کروں تمہیں اُس سے کیا واسطہ؟ تم اپنا راستہ لو اب وقت قریب آگیا ہے۔"

دونوں آخری ملاقات کے لیے باہم گلے ملے۔ اور با چشم پرنم و دل پُر درد ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ ریاول خودکشی کا ارادہ، استقلال کے ساتھ دل میں ٹھانے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور پستول لے کے وقتِ مقررہ کا انتظار کرنے لگا۔

اب ہم نواب کی طرف عنانِ توجہ معطوف کرتے ہیں۔ جب سے ریاول اُس کے کمرے سے نکل کے گیا ہے۔ وہ صمّ بکمّ بن کے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ خون کی گردش اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ دماغ چکرا رہا ہے اور سوزش نہانی سے تنور بنا ہوا ہے۔ قریباً پاؤ گھنٹہ تک یہی حالت رہی گویا اتنے عرصہ تک وہ آپے سے باہر تھا۔ پھر یک بہ یک اُس کی آنکھوں میں ایک تیز شعلہ دکھائی دیا۔ اور وہ کسی دہشت زدہ کی طرح اپنی جگہ سے پھلانگ کے دوسری جگہ کھڑا ہوگیا۔ اور بیل کے مانند پکارنے لگا۔ اُس کے سر کے بال کھڑے ہوگئے۔ چہرے کا نقشہ بگڑ گیا۔ رگیں اکڑنے لگیں حواس منتشر ہوگئے۔ اور وہ سمجھ گیا کہ بہت جلد پاگل ہو جانے کو ہے۔

وہ کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے کمرے میں گشت لگا رہا تھا پھر دفعتاً ٹھٹک گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کے کہنے لگا:۔ ہوّا۔ ہوّا۔ جنون۔ مالیخولیا۔ میں پاگل نہیں ہونا چاہتا۔ مگر میں اس قدر کیوں تھرتھرا رہا ہوں (قہقہہ مار کے اور بڑے زور سے ہنس کے) ہونہہ! میں مرجاؤں؟ میں خودکشی کروں؟ احمق لوگ مجھے یہی مشورہ دیتے ہیں۔ کبھی نہیں۔ مجھے زندہ رہنا چاہیے مجھے آخری وقت تک مدافعت کرنی چاہیے (قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہ) ان لوگوں نے کیا بُری عقلیں پائی ہیں۔ میرے مقابلے میں ان کو ڈرنا چاہیے۔ کانپنا چاہیے اور مایوس و ناکام ہو کے لوٹ جانا چاہیے۔ لوٹ جانا چاہیے۔ (قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہ) مجھے بھاگ جانا ضرور ہوا میں نواب ہوں

اور تمام آدمی مجھے جانتے ہیں۔ میں ابھی نئے دوستوں کو پیدا کرنا لگا بیشک مجھے بھاگ جانا پڑا۔ اور میں بھاگ سکتا ہوں۔ میرے پاس بہت سا سونا بھی تو موجود ہے۔"

یہ کہہ کے وہ الماری کی طرف بڑھا۔ اُسے کھول کے نوٹ گھر کی ہنڈویاں اور اشرفیوں کی چار ہمیانیاں نکالیں۔ اُنھیں جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس طرح چیخنے لگا جیسے شیر ڈوکتا ہے۔ اُس کی نظریں ترچھی پڑنے لگیں اور گویا اُس نے خودکشی کے ارادے کو بھلا دیا بعد ازاں اُس کو اپنے بھاگ جانے کی تجویز یاد آئی۔ اور وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ جاتے جاتے ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"نہیں اس دروازے سے نہیں چور دروازے سے بھاگ جانا چاہیئے"

یہ کہہ کے چور دروازے کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کے اُس کو کھولا ہی تھا کہ ایک کالا کالا سا ڈھانچہ سامنے دکھائی دیا۔ یہ ڈھانچہ دراصل انبڈری تھا جس نے ملکہ کو اس دروازے سے بھاگ نکلنے کا مشورہ دے کے کہا تھا کہ خود باہر ٹھہر کے اُس کا انتظار کرتا رہیگا۔ جب ملکہ کے آنے میں دیر ہوئی تو دریافت حال کے لیے وہ محل میں آرہا تھا۔

نواب نے اس دہشت زدگی اور حواس باختگی کے عالم میں اُس کو دیکھا تو خیال کیا کہ کوئی افسر پولیس جس کے پیچھے سپاہیوں کی جماعت ہے۔ مارکوئس کے حکم سے اُسے گرفتار کرنے کو آرہا ہے نیز محل کے تمام دروازوں پر پہرا بیٹھا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُس کی رہی سہی ہوش بھی خطا ہو گئے۔ اور وہ انتہائے دہشت سے واپس لوٹ آیا اور شیر کی طرح چیخیں مار مار کے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اُسے قریب ہی ایک آواز سُنائی دی۔ یہ ریاول کی آواز تھی جو ملکہ کو رخصت کر رہا تھا۔ اس کے بعد اُس کو زینہ پر کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی

بس پھر کیا تھا سمجھا کہ پولیس آگئی۔ چنانچہ کہنے لگا "آ گئے۔ آ گئے اور مجھے گرفتار کر لیا۔ میں کبھی اپنے آپ کو اُن کے حوالے نہ کرونگا۔ بچو! شہد دو! فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ میں نواب سمسم ہوں۔ مجھ سے ڈرتے رہنا چاہیے آئے۔۔۔ آ پہنچے۔۔۔۔ دروازہ کھول لیا۔۔۔ مجھے پکڑ لیا۔۔۔۔ میرا گلا دبوچ ڈالا۔۔۔ شریرو!۔۔۔ بدمعاشو۔۔۔ رذیلو۔۔۔ دور۔۔۔ دور۔۔۔ مجھ سے دور رہو۔۔۔ (ہاتھ سے ہوا کو ہٹا کے اور پاؤں سے زمین کو مار کے) مجھے چھوڑ دو۔۔۔ مجھے نہ پکڑو۔ چور۔ چور۔۔۔ ڈاکو۔۔۔ میں کبھی جیلخانے میں نہ جاؤنگا۔ میں جب تک زندہ رہوں ہرگز گرفتار نہ ہونگا"

یہ کہا اور جلدی سے پستول کو اُٹھا لیا اور اُسے کان میں رکھ کے لبلبی دبائی۔ فوراً تڑاکا ہوا اور اُس کی کراری آواز سے سارا محل گونج اُٹھا۔ ملعون نواب بیہوش ہو کے زمین پر گر پڑا اور اُس کے ناپاک خون سے زمین رنگین ہونے لگی + + +

ریاول اُس کو دیکھتے ہی دھک سا رہ گیا۔ اور بولا "کیا تو نے ہی یہ کام کیا تھا؟"

اینڈری "جی ہاں! میں نے اپنے آقا کے حکم سے ایسا کیا تھا۔"

ریاول "خانہ خراب! تیرا آقا کون اور تو کیا کہہ رہا ہے؟"

اینڈری "میرا آقا مارکوئس چیمپری ہے۔ میں اُسی کا نوکر ہوں۔ میرا نام اینڈری ہے۔ میں یہاں اصلی نام سے نہیں پکارا جاتا۔ میں ایک خاص مصلحت سے نواب صاحب کی خدمت میں رہتا تھا۔"

ریاول "خیر مجھے اس سے مطلب نہیں یہ بتا کہ تو نے پستول کو کیوں خالی کر دیا۔ میں اپنے دامن پر رسوائی کا دھبا لگا کے کس طرح زندہ رہوں۔"

اینڈری "آپ کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگا۔ جس کے دامن پر لگا تھا اُس پر خدا کا غضب نازل ہو گیا اور اب قصہ پاک ہو چکا۔"

ریاول "مگر میں اُسی کا تو بیٹا ہوں۔ ہماری خبریں شہر بھر میں مشہور ہو گئیں اور ہم ذلیل و رسوا ہو گئے۔"

اینڈری "سوائے اُن لوگوں کے جو آج وہاں جمع ہوئے تھے اور کسی کو کچھ نہ معلوم ہوا۔ چونکہ مارکوئس نے اُن سے اخفائے اسرار کا قول لے لیا ہے اس لیے بالکل اطمینان ہے۔ مارکوئس آپ کے چچا اور آپ کے معین و یاور ہیں۔ اُن کی اطاعت آپ پر فرض ہے۔ علاوہ بریں آپ بے گناہ ہیں اور آپ کو اِس جھگڑے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ پس آپ کو چاہیے کہ جس شرف و منزلت کو آپ کے والد نے برباد کر دیا اُسے آپ دوبارہ حاصل کریں۔ جس سے آپ کی والدہ اور ہمشیرہ کو بھی عزت حاصل ہو گی۔"

ریاول "ہائے تم نے مجھے یاد دلا دیا۔ میری بہن! میری ماں جائی! آؤ دیکھیں اُس پر کیا گزری؟"

دونوں فوراً ملکہ کے کمرے میں گئے۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ حیران ہوئے اور تلاش کرنے لگے۔ اینڈری نیچے اُتر کے ڈھونڈھنے لگا کہ کہیں ملکہ دروازے کے آس پاس نہ ہو۔ یہاں بھی اُس کا پتہ نہ چلا۔ آخر وہ سڑک پر پہنچا سڑک پر روشنی سی نظر آئی۔ جس میں تین آدمی دکھائی دیئے۔

یہ مارکوئس پال، جنگلی انسان، اور اُن کا ملازم تھا۔ مارکوئس مع لوسیا اور جنگلی انسان کے، نواب بیگم سے ملنے اور ملکہ کے دیکھنے کو فلینی کے گھر آیا تھا۔ ملکہ وہاں کہاں تھی۔ اُس کے نہ ہونے سے سب کو پریشانی ہوئی اس لیے یہ تینوں نواب کے محل کو آرہے تھے۔ اینڈری کو رستے میں دیکھکے مارکوئس نے پوچھا:" اینڈری! کہو کیا خبر ہے؟ تمہیں اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

اینڈری:" جی آپ دیر کی کیا پوچھتے ہیں۔ یہاں ملکہ کا پتہ ہی نہیں ہے۔"

مارکوئس:" ائیں یہ کیا؟ یہ تو کوئی نئی آفت آگئی۔ خدا رحم کرے۔"

اتنا کہکے وہ نواب کے کمرے میں آیا۔ نواب کے بدن سے خون بہہ رہا تھا۔ اور روح بیجان قالب پڑا ہوا تھا۔ مارکوئس کا دل بیٹھ گیا وہ بولا۔ یہی انجام ہے۔ خیانت کرنے والے بدنصیبوں کا۔ خدایا تو رحم فرما۔ ریاول! اب تو دے کے ایک تم ہی باقی رہ گئے ہو۔ تم ہی سے خاندان کا نام قائم رہیگا۔ میرے بچے ہینی! تم صبر کرو اور مرد بنے رہو۔ ملکہ کہاں رہ سکتی ہے؟ ضرور مل جائیگی۔"

پھر اس نے ریاول سے ملکہ کی حالت دریافت کی۔ [illegible] پہلے وہ کیا کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے اور ملکہ کے [illegible] کا اعادہ کیا اور کہا کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئی ہے اور خودکشی پر تلی ہوئی ہے۔ اس وقت اینڈری نے آکے مارکوئس سے کہا:" خداوند خاتون ملکہ پستول چلنے کے بعد محل سے نکلی ہیں۔ ماما نے اُن کو [illegible] آتے دیکھا؟

پستول کی آواز نے اُس کو بوکھلا دیا۔ ورنہ وہ ضرور اُنہیں ٹوک دیتی دربان بھی گھبرا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ سڑک پر کوئی واردات ہوئی۔ اسی لیے اُس نے دروازہ کھولا۔ اور دیکھنے کو باہر نکلا مجھے یقین ہے کہ ملکہ اُسی کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں نکل گئی اور تاریکی نے اُنہیں چھپا لیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ضرور ندی کی طرف گئی ہونگی۔"

ہنری کا تمام جسم کے مارکوس بیقرار ہوا۔ ریاول اور ہینی بھی سراسیمہ ہوئے۔ مارکوس بولا "میں بھی یہی خیال کرتا ہوں۔ پس اگر ہمارا خیال صحیح ہے تو ابھی وقت نہیں فوت ہوا۔ دوڑو جھپٹو اور تلاش کرو۔"

تینوں بے تحاشا ایک ایک جانب دوڑے اور مارکوس بھی گاڑی میں بیٹھ کے ایک طرف سدھارا جہاں پر یہ تینوں آ کے اُس سے ملینگے اور خبریں لائینگے۔

اٹھارہواں باب

ملکہ اور بوڑھا چرواہا

اینڈری کا خیال بالکل بجا تھا۔ بارود کے اُڑنے کی آواز جیسے ہی ملکہ کے کان میں پہنچی، وہ چمک گئی۔ اُس کی سدھ بدھ جاتی رہی۔ دماغ بیکار ہو گیا "ہائے ہم تباہ ہو گئے۔ ہم برباد ہو گئے۔ ہمارا گھر اُجڑ گیا۔ ہمارا خاندان بگڑ گیا" یہ الفاظ تھے جو انتہا کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے عالم میں اُس کی زبان سے مایوسانہ لہجے میں ادا ہو رہے تھے۔ وہ تیر کی طرح نیچے اُتری اور اُس دروازے سے جس کو دربان نے کھولا تھا باہر نکل گئی۔ جس رستے پر وہ چل رہی تھی ندی پر اُس کی انتہا ہوتی تھی۔

ڈھونڈھنے والوں نے تلاش میں صبح کر دی۔ ندی کے دونوں کنارے

چھان مارے۔ کوئی سڑک، کوئی گلی باقی نہ چھوڑی۔ ملاحوں، شکاریوں، پہرے والوں، اور پولیس کے شب گرد سپاہیوں سے بھی دریافت کیا مگر کسی نے نہ بتایا۔ کہ اُس نے ملکہ کو یا کسی پانی میں گرنے والے کو دیکھا ہے اس گم گشتگی پر مارکوئس کی دلجمعی ہوگئی اور اُس نے خیال کرلیا کہ ملکہ کو پیرس کی گلیوں سے واقفیت نہیں ہے۔ اس لیے وہ بھٹک کے کہیں چلی گئی ہے۔ اُس نے ہمراہیوں سے بیان کیا کہ اب زیادہ تلاش بے سود ہے اور تضیع اوقات کے سوا حاصل نہیں۔ چلو اب گھر جائیں۔ (یہ سن کے جنگلی انسان کی کمر بیٹھ گئی۔ اور انتہا سے زیادہ بیقراری اور مایوسی کی علامتیں اُس کے چہرے پر ظاہر ہوئیں) بیٹا! تم یاد رکھو خدا بے گناہوں کی مدد کرتا ہے اور اُن کو ہر آفت سے بچاتا ہے۔ وہ تمہاری بھی ضرور مدد کریگا۔ مگر تم گھبراؤ نہیں اور دل کو ڈھارس دیتے رہو۔"

مارکوئس اور جنگلی انسان گاڑی میں بیٹھ کے اپنے محل کو سدھارے ریاول اور اینڈری نے، نواب کے مکان کا رستہ لیا۔ چاشت کے وقت مارکوئس فلینی کے گھر آیا۔ یہاں مارشی نس اور سوسن، بڑی رات آئے تک جاگ جاگ کے سو رہی تھیں۔ البتہ نواب بیگم بیدار تھی اور فلینی بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھا کھا کے قریبًا دو گھنٹے سے جاگ اُٹھا تھا

مارکوئس نے اُنھیں رات کے واقعے سے آگاہ کیا۔ اُن کی رائے اس بات پر قرار پائی کہ فوراً خفیہ پولیس کو اطلاع دی جائے۔ اور اُس کی مدد سے شہر بھر میں ملکہ ڈھونڈھوائی جائے۔

اسی اثنا میں کسی بوڑھے کے آنے اور سوسن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کرنے کی اطلاع ملی۔ فلینی نے اُس بوڑھے کو صحن میں لاکے بٹھانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ سوسن تو ابھی جاگی نہیں ہیں میں ہی اُس سے ملتا ہوں۔ تحتانی منزل کے صحن میں جانے پر اُسے معلوم ہوا

کہ وہ بوڑھے چرواہے کے سامنے ہے۔ صاحب سلامت کے بعد یوں گفتگو شروع ہوئی:۔

فلینی: "کہیے جناب! کیا ارشاد ہے؟"

بوڑھا: "جی آپ سے مجھے کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔ آپ کو ناحق زحمت ہوئی معاف فرمائیے۔ میں سوسن بیگم کی ملاقات کو حاضر ہوا تھا۔"

فلینی: "وہ تو اب تک سو رہی ہیں۔ شاید رات کو دیر تک جاگی تھیں۔ اگر آپ کو کچھ فرمانا ہو تو مجھ سے فرما دیجیے میں اُن سے کہہ دونگا۔"

بوڑھا: "جی نہیں! میں اُن کا انتظار کرتا ہوں۔ مجھ کو اُن ہی سے کچھ عرض کرنا ہے۔"

فلینی: "کوئی راز کی بات ہے؟ جس کو میں نہیں جان سکتا؟ نامحرم اجنبیوں کا کسی کنواری لڑکی سے پوشیدہ طور پر معاملہ رکھنا خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کرتا ہے۔"

بوڑھا: "جناب من! میں اگرچہ آپ کو دوست رکھتا ہوں اور آپ کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن جو بات مجھے سوسن سے کہنی ہے وہ آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ تھوڑی دیر میں وہ خود بخود آپ کو معلوم ہو جائیگی۔ اس میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ سوسن بیدار ہو چکی ہے اور بوڑھے چرواہے کا انتظار کر رہی ہے۔ بوڑھا دل میں خوش ہوا اور فلینی سے اجازت لے کے سوسن کے کمرے میں آیا۔ سوسن نے پوچھا: "کہیے حضرت! کیا خبریں؟"

بوڑھا: "میں آپ سے وعدہ کر گیا تھا کہ ملکہ کی ملاقات کے اثنا میں جو جو حالات پیش آئینگے۔ وہ آپ سے بیان کرونگا۔"

سوسن: "بے شک! اور میں یقین کرتی ہوں کہ آپ ملکہ تک نہ پہنچ سکے ہونگے۔"

بوڑھا:۔ "بجا ارشاد ہے۔ مگر وہ خود مجھ تک پہنچ گئیں۔ اور پھر کیسے! اپنے باپ کے محل میں نہیں بلکہ ندی کے رستے میں۔"

سوسن:۔ "ائیں! ندی کے رستے میں!! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

بوڑھا:۔ "کل رات کو نواب کے گھر میں عجیب و غریب حادثے گزرے۔ نواب نے خودکشی کر لی اور اُس کا بیٹا بھی اُسی کے ساتھ راہیٔ عدم ہوا۔"

سوسن:۔ "ہائے افسوس! دم کے دم میں یہ کیا انقلاب ہو گیا!"

بوڑھا:۔ "اور مارے دہشت کے ملکہ کے بھی ہوش اُڑ گئے اور وہ باہر نکل کے ندی کو جانے لگی۔"

سوسن:۔ "ہے ہے! کہیں اُس نے اپنے آپ کو (خدانخواستہ) ڈبو تو نہیں دیا۔"

بوڑھا:۔ "اگر میں نہ روکتا تو یقیناً ڈبو دیتی۔"

سوسن:۔ "شکر ہے خدا کا۔ اللہ آپ کو اس نیکی کی جزا دے۔ اب ملکہ ہے کہاں؟"

بوڑھا:۔ "وہ اس وقت فوجی ہوٹل میں میرے کمرے میں ہے۔"

سوسن:۔ "تو میں اُسے دیکھنے کو ابھی چلتی ہوں آپ ذرا توقف فرمائیے۔"

بوڑھا:۔ "بہت اچھا۔ میں ٹھہرتا ہوں۔ آپ تیار ہو لیجیے۔"

سوسن نے لونڈی کو آواز دی لونڈی آئی اور اُس کے پیچھے ہی فلینی بھی آپہنچا جو بہت بے چین نظر آتا تھا۔

سوسن:۔ "(لونڈی سے) جا۔ کوچبین سے کہہ۔ فوراً گاڑی تیار کرے۔"

فلینی:۔ "بٹی! کیا ماجرا ہے؟ مضطرب کیوں ہے؟"

سوسن:۔ "ابا جان! بڑی ہولناک خبر آئی ہے۔ نواب اور ریاول دونوں نے خودکشی کر لی۔"

فلینی:۔ "نواب کی خودکشی تو درست ہے لیکن ریاول کی خبر غلط ہے۔ وہ ابھی ارادہ کر رہا تھا کہ بچا لیا گیا۔"

سوسن:۔ "اللہ تیرا [illegible] شکر۔ اور کس سے ملکہ [illegible] سے نکل بھاگیں۔"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر ۱۱ و ۱۲ صحیفہ جلد ۴

ایڈیٹوریل

سنہ ۱۳۱۹ف کے آغاز سے سرکار آصفیہ کے ورنیکلر مڈل اسکولوں اور اپر پرائمری و لوئر پرائمری مدرسوں میں نیا نصاب جاری ہوگا جس کو ایک خاص کمیٹی نے تیار کیا ہے۔ نیز ان مدارس کے نام تبدیل کیے جائینگے۔ ورنیکلر مڈل اسکولوں کو اورینٹل سکول یا مدارس فوقانیۂ مشرقیہ کہا جائیگا۔ جن میں منشی و مولوی کی جماعتوں تک تعلیم دی جائیگی۔ ان سے نیچے جو مڈل اسکول ہیں وہ مدارس متوسطہ کہلائینگے۔ ان میں سال ششم تک تعلیم ہوگی۔ ان کے نیچے تعلیم درجۂ ادنیٰ، و تعلیم درجۂ اوسط کے مدارس ہونگے۔ جن میں تیسرے اور پانچویں سال تک تعلیم دی جائیگی۔ مدارس ابتدائی میں بلحاظ حالات مقامی ایک اسپیشل جماعت بھی اضافہ کی جاسکیگی۔

نصاب مذکورہ میں انگریزی اور دینیات کا بھی ایک ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے جس کے نتائج آیندہ بہت مفید ثابت ہونگے۔ فی الحال ممالک محروسۂ سرکار عالی میں ورناکیولر مڈل سکولوں کی تعداد ۲۹ ہے۔ ان کے منجملہ ۹ مدارس یعنی مدرسۂ ویجاپور،

مدرسۂ ٹولیہ باغ، مدرسۂ گلبرگہ، مدرسۂ کوہیر، مدرسۂ اودگیر، مدرسۂ مکتل، مدرسۂ میدک، مدرسۂ مٹھوارہ، مدرسۂ نرمل، میں مولوی اور منشی تک تعلیم دی جائیگی باقی میں سال ششم تک۔

اس نصاب کے نفاذ کے بعد، اگر مدرسۂ دارالعلوم کے طلبہ کی تعداد میں اضافہ نہ ہو تو تعجب کی بات ہوگی۔ پس ایسی حالت میں سخت ضرورت ہے کہ جس طرح اصلاح نصاب کی جانب خاص طور پر توجہ کی گئی ہے اسی طرح اس کی اندرونی خرابیوں کی طرف بھی بطور خاص [illegible] کی جائے۔

امرت سر کا مشہور اخبار "وکیل" جن الفاظ میں حیدرآباد کی تعلیمی حالت پر اظہار افسوس کرتا ہے اُن کا نقل کرنا، ذمہ داران تعلیم حیدرآباد کے لیے خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ "حیدرآباد میں مشرقی یونیورسٹی قایم کرنے کا مدتوں غلغلہ رہا۔ لیکن جس ریاست میں، دارالعلوم اور مدرسۂ آصفیہ اور نظام کالج کا انتظام درست کرکے اہل ملک کے لیے اُن کو مفید بنانے کا کسی کو خیال نہیں ہوتا۔ وہاں یونیورسٹی قایم ہونے کی امید ہی فضول ہے۔ بڑودہ بمقابل حیدرآباد کے ایک مختصر ریاست ہے۔ اور ابھی تھوڑے دنوں سے یہاں تعلیم کا خیال پیدا ہوا ہے مگر اس وقت ریاست میں ایک کالج و بائی اسکول اور بیس انگلو ورنا کلر اسکولوں میں انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ۲۰۰۰ [illegible] اسکول ہیں۔ ۱۱ خاص مدرسے ۳ سنسکرت پاٹ شالائیں ۔۔۔ مکتب اور ۲ یتیم خانے ہیں تعلیمی محکمہ کا سالانہ مجموعی مصارف نو لاکھ ستر ہزار ایک سو روپیہ ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہونے کی وجہ سے ہر سال سکولوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ہیشہ نئے سکول کھلتے ہیں۔ انگریزی کے علاوہ سنسکرت اور اردو کی تعلیم بھی ہوتی ہے اور صنعتی تعلیم کا درس بھی نصاب درس میں داخل ہے۔ کاش ہمارے مسلمان رؤسا کو عبرت ہو اور وہ روپیہ جو تھیٹریکل کمپنی اور مسلمانوں کے دو فریق میں

مناظرہ کرا کے ہمیشہ کے لیے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے میں صرف ہوتا ہے۔ غریب مسلمانوں کو وظیفہ دے کر بڑھانے اور ہائی سکولوں کی حالت درست کرنے میں کیا جائے۔ ریاست کے خرچ سے ڈریڈ ناٹ بنانے کی تحریک کی جاتی ہے کہ گورنمنٹ خوش ہو مگر رعایا کو تعلیم دلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کرنیکا کچھ خیال نہیں"

چونکہ ۱۹۱۷ء کے آغاز سے حیدرآباد کی تعلیمی دنیا میں نئے انقلاب آنے والے ہیں اور مشیر تعلیمات کے عہدے پر ایک صاحب بہادر بھی تشریف لا چکے ہیں کیا عجب ہے کہ جہالت کی وہ نحوست جو بُرے ستاروں کے پھیر کی بدولت ملک پر چھائی ہوئی تھی، رشد و سعادت کی روشنی سے بدل جائے۔ اور تین لاکھ کے انسانہ کی نورانی چمک اپنا حقیقی جلوہ دکھانے لگے۔

صحیفہ کے انقلاب نمبر نے اکثر حلقوں میں ہل چل ڈالدی۔ موافق و مخالف دونوں کی نگاہیں اس پر پڑیں۔ اور ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ اس نے بعض تخیلات میں تبدیلی پیدا کردی والحمد للہ علیٰ ذلک۔

افسوس ہے کہ اس نمبر کے زیادہ نسخے نہیں چھپوائے گئے۔ ورنہ ان کی اشاعت سے اصلاح خیالات میں اور زیادہ ترقی ہوتی۔

جو خیالات اس نمبر کے مضامین سے متفق نہیں ہیں اور وہ واقعات و دلائل سے اس کی تردید کر سکتے ہیں ان کے مضامین کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا جائیگا۔ اور ان سب کو ایک خاص نمبر میں چھاپ دیا جائیگا بہتر ہوگا یہ اصحاب اظہار حق میں حصہ لے کر ملک کو مستفید و ممنون کریں۔

ہمارا وہ ناول، جس کے ختم ہونے کا عرصہ سے انتظار تھا۔ خواہ اس وجہ سے کہ بعض ناظرین کو نتیجہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا۔ خواہ اس سبب سے بعض حضرات

اُس کی طوالت سے گھبرا گئے تھے۔ اس نمبر میں ختم ہو گیا ہے۔ اس کا نام "معجزۂ محبت" رکھا گیا ہے۔ جن صاحبوں کے پاس اس کے اوراق مکمل ہیں اُن کی خدمت میں (بشرطِ اطلاع) اس کا ٹائٹیل بھیجا جائیگا جو علیحدہ چھپوایا گیا ہے۔

اس کے بعد کوشش کی جائیگی کہ کوئی دوسرا مفید و پر معنی ناول ناظرین کی دلبستگی میں حصہ لینے لگے۔

سال ختم ہونے کے لیے صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے اور ابھی تک بعض اصحاب ادائی چندہ میں تامل فرما رہے ہیں۔ متعدد مرتبہ اطلاع دی گئی ہے کہ چندہ پیشگی وصول کیا جاتا ہے پھر بھی یہ خیال دور نہیں ہوتا کہ ختم سال کے بعد چندہ دیا جائیگا۔

جن خریداران اضلاع و لوکل کے ذمے چندہ واجب الادا ہے اُن سے امید کی جاتی ہے کہ رسالے کی ضرورتوں کا لحاظ فرما کے بسرعتِ ممکنہ ہم کو ادائے شکریہ کا موقع دینگے۔

جن صاحبوں کو رسالے کا کوئی نمبر یا چند نمبر نہیں پہنچے ہیں وہ اسی مہینے میں اطلاع نہیں دیتے کہ رسالہ مکرر روانہ کیا جائے۔ بلکہ مطالبۂ چندہ کے وقت اُس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دفتر سے تو ہر مہینے میں تمام خریداروں کے نام رسالہ جاری ہو جاتا ہے اب وہ تمام صاحبوں کو برابر پہنچا یا نہیں اس کا علم دفتر کو کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسی طرح بعض اصحاب پتہ کی تبدیلی سے بھی آگاہ نہیں فرماتے۔ اُن کے بھی رسالے تلف ہو جاتے ہیں جس سے دفتر کا نقصان الگ ہوتا ہے اور رسالہ اُن کو برابر نہیں پہنچتا۔ ان حضرات سے بصد ادب استفسار کیا جاتا ہے کہ مذکورۂ بالا خرابیوں میں صحیفہ کس حد تک قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اور وہ ان کا کیا انسداد کر سکتا ہے؟

اڈیٹر

اسلام و نصرانیت

کا برتاؤ
علم و تمدن کے ساتھ

(سلسلہ کیلیے دیکھو نمبر ۸ جلد ۳)

مسلمانوں میں اُن اُصول سے کیا کیا نتائج و آثار ظاہر ہوے

اسلام کے اِن اُصول سے مسلمانوں کی طبیعتوں پر جو اثر پڑا اور اُن کے اسلاف نے اِسلام کی پیروی سے جو جو ثمرے حاصل کیے اُس کا مختصر سا بیان سطورِ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر کو فتح کیا۔ اور اسکندریہ پر چڑھائی کی اُس وقت آنحضرت کو وفات پائے ہوے، ایک روایت میں صرف چھ سال اور دوسری روایت میں نو سال گزرے تھے۔ وہ زمانہ اسلام کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اسکندریہ میں اگلے وقتوں کے بچے کھچے لوگوں میں ایک شخص یعقوبی مسیحیوں کا پیرو جس کا نام یوحنا نحوی تھا۔ رہا کرتا تھا پہلے اُس کا پیشہ ملاحی تھا۔ لوگوں کو کشتی میں بٹھا کر دریا کے پار اُتارا کرتا تھا اُس کی طبیعت میں علم سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ ایک دفعہ اُسے بعض ذی علم لوگوں کو کشتی میں بٹھانے اور اُن کے علمی مذاکروں کو سننے کا اتفاق ہوا طبیعت میں تو پہلے سے علم کے ساتھ ایک خاص مناسبت موجود تھی۔ علمی ذکر اذکار سن کر اُس کے سمندِ شوق پر ایک تازیانہ لگا۔ اِس نے یکلخت اپنے پیشۂ ملاحی کو ترک کر دیا اور تحصیلِ علم میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔ اُس وقت

اُس کی عمر کوئی چالیس سال کی ہوگی۔ لیکن باوجود اِس سن و سال کے چند ہی دنوں میں اُس نے وہ کمال پیدا کیا کہ جو لوگ بچپن سے اِس میدان میں قدم زن تھے اُن سے بھی بہت آگے بڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے بہت سے علوم میں دستگاہ وافی پیدا کی۔ اور اپنے وقت کا مشہور فیلسوف، مشہور طبیب، اور مشہور منطقی مانا گیا۔

یورپ کے اور نیز بہت سے مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ عمرو بن العاص نے جب اس کا ذکر سُنا تو اُس کو اپنے پاس بلایا اور اُس کی بہت خاطر مدارات کی۔ اور اِن دونوں میں نہایت الفت ہوگئی جس کا جا بجا چرچا ہونے لگا۔

یورپ کے فلاسفہ میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ:

"جو محبت عمرو بن العاص فاتح مصر اور یوحنا نحوی میں ہوگئی تھی اِس سے ہم کو اِس بات کا پتہ لگتا ہے کہ عربوں میں بلند خیالی اور آزادہ روی کس درجہ پر تھی۔ جوں ہی یوحنا کو جاہلیت کی بُت پرستی سے نجات حاصل ہوئی اور اُس نے توحید محمدی کے دائرے میں اپنا قدم رکھا اُس کو علوم فلسفیہ و ادبیہ میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھانے اور اپنی علمی قوتوں کو معرض ظہور میں لانے کا اچھا خاصا موقع مل گیا۔ اور اُس نے اِن میدانوں میں دل کھول کر جولانی کی۔"

مسلمانوں نے فارس، شام اور عراق کے باشندوں سے میل جول رکھنے میں کسی قسم کی تنگ دلی نہیں برتی۔ اُنہیں اِن لوگوں کو کاروبارِ سلطنت میں دخیل بنانے سے اُن کا دین مانع نہیں ہوا۔ چنانچہ تمام سرکاری دفاتر میں رومی زبان رائج تھی۔ اور عربی زبان نے اُس وقت رواج پایا جب کہ کئی سال اِسی عملدرآمد پر گزر گئے۔ اِس سے مسلمانوں کو تبادلۂ افکار کا پورا پورا موقع حاصل ہوا۔ اور مذہب کی رواداری نے اُنہیں علوم و فنون اور صنایع و حرف کی تحصیل و تکمیل پر متوجہ کر دیا۔

علوم ادبیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ میں مسلمانوں کی مہارت

آنحضرت کی وفات کے بیس سال بعد خلیفۂ چہارم حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے علوم ادبیہ کی تعلیم کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ اور ان علوم کے قواعد و ضوابط ایجاد فرمائے۔ مسلمان باوجود اس فتنہ و فساد کی تاریک گھٹا کے جو اس وقت ممالک اسلامیہ پر چھا رہی تھی۔ علم کی روشنی حاصل کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ باوجودیکہ خانہ جنگیوں نے جو اس زمانہ میں خلافت کے متعلق برپا تھیں لڑائی کی آگ چو طرف مشتعل کر دی تھی اور مسلمانوں کو اپنے مصالح و منافع سے بالکل بیخبر و غافل بنا دیا تھا تاہم یہ بے اطمینانی کی حالت ان کی علمی تلاش و جستجو کو کم نہ کر سکی۔

عربی تاریخ اور شعر و انشائے خلافت بنی امیہ میں لٹریچر کو جو ترقی دی اس کی نظیر کسی اور قوم کی تاریخ میں بہت کم ملے گی۔ خلفائے بنی امیہ آئے دن ان علوم کی سرپرستی فرماتے اور شاعروں، لکچراروں، اور عالموں کی قدر افزائی کرتے رہتے تھے۔ ان کی سلطنت کے آخری دور میں علوم عقلیہ کے آثار ظاہر ہونے اور عقلی اور مناعی کتابوں کے تراجم کیے جانے لگے۔

خلفائے امویہ نے دار الخلافہ کو مدینہ سے شام میں منتقل کیا۔ اور دنیوی چیزوں سے وہ تو بہرہ افتخار نہیں کیا جو خلفائے راشدین کا وتیرہ تھا جب ایران سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں ایلچی آیا اور آپ کو پوچھنے لگا تو لوگوں نے آپ کو بتلایا۔ آپ اس وقت فقیروں اور محتاجوں کے درمیان بقیع کے ایک درخت خرما کے نیچے آرام فرما رہے تھے لیکن جب معاویہ کے دربار میں بادشاہان عالم کے قاصد آئے تو وہ ان کو ایک قصر عالیشان میں جو عربی صنعت کی اعلیٰ سے اعلیٰ زیبائشوں سے آراستہ اور خوشنما او

نظر فریب درختوں اور باغوں اور فوارہ دار حوضوں سے مزین اور نفیس فرش و فروش سے سجا ہوا تھا دیکھکر دنگ ہو گئے۔ معاویہ کا یہ فعل کچھ دین کے مخالف اور اُس کے احکام کے مباین نہ تھا۔ بلکہ ایک جائز اور مباح چیز کو اُنہوں نے اختیار کیا تھا جس کے استعمال کی خدا نے کامل آزادی عطا فرمائی تھی۔ اُن کے اِس فعل سے فنون صنعت و حرفت کی جو ترویج و اشاعت ہوئی تھی وہ کسی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔

دوسری صدی میں مسلمانوں کی مشغولیت علوم کو فیہ کے ساتھ

بنی اُمیہ کی سلطنت کا خاتمہ ایسی حالت میں ہوا جب کہ عوام الناس فتنے فسادوں کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ جب بنی عباس کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی تو دوسری صدی ہجری کا صرف ایک تہائی حصہ گزر چکا تھا۔ (سنہ ۱۳۲ھ) خلیفہ منصور نے بغداد کو اپنا دار الخلافت بنایا جو رفتہ رفتہ علم و تمدن کا دار السلطنتہ بن گیا۔ منصور نے شریعت اور طب کی تعلیم کے لیے مدارس جاری کیے۔ اِسی کے عہد میں علوم فلکیہ کی تعلیم پر روپیہ صرف کیا جانے لگا۔ رشید اس کے پوتے نے اس بنیاد کو جو اُس کے دادا نے رکھی تھی اور مضبوط کیا۔ اور تمام مساجد کو ہر قسم کے علوم کے مدارس بنا دیا۔ جب مامون کا زمانہ آیا تو علم نے کافی ترقی اور پورا عروج حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بغداد میں جو کتابیں اُس کے عہد حکومت میں آئیں وہ اِس قدر کثیر التعداد تھیں کہ سو اونٹ اُن کو بمشکل اُٹھا سکتے تھے۔ اس نے مثیل سوم سے جو صلح کی شرائط کی تھیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی کہ قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ اس کی نذر کیا جائے۔ اِس کتب خانہ میں منجملہ اور نفیس و نادر کتابوں کے بطلیموس کی کتاب الریاضتہ السماویہ بھی تھی۔ مامون نے فوراً اُس کے ترجمہ کا حکم دیا۔ جس کا نام مجسطی رکھا گیا۔ اُن کتابوں کا احصا

مشکل ہے جو بنو عباس کے عہدِ حکومت میں ترجمہ کی گئیں۔

پبلک اور پرائیوٹ لائبریریوں کا قیام

اسلامی حکومتوں نے کتب خانوں کے متعلق جو توجہ کی اُس کی نظیر اور حکومتوں کے عہد میں مشکل ملیگی۔ چوتھی صدی کے اوائل میں قاہرہ کے کتب خانے میں صرف فلکیات اور طب کے متعلق ایک لاکھ نسخے موجود تھے اور جو طالب العلم قاہرہ میں مقیم تھے اُن کو وہ کتابیں اِستفادے کی غرض سے مستعار دی جاتی تھیں۔ اِس کتب خانے میں آسمان کے دو نایاب کُرے تھے ایک چاندی کا تھا جس کی نسبت مشہور تھا کہ وہ خاص بطلیموس کا بنایا ہوا ہے اور تقریباً تین ہزار دینار اُس پر خرچ کیے گئے ہیں اور دوسرا برنجی تھا اِسپین میں خلفا کے جو کتب خانے تھے اُن کی کتابوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی اور اُن کی فہرست چوالیس ۴۴ جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ تاریخی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف اسپین میں ستر ۷۰ کتب خانے موجود تھے اور اُن میں سے ہر ایک میں مطالعہ اور نقل و ترجمہ کی جدا جدا جگہیں مقرر تھیں۔

اُس زمانے میں خاص خاص لوگوں کو کتابوں کا بیحد شغف تھا وہ اپنے کتب خانوں کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیتے تھے سلطان سنجار نے ایک بار کسی اندلسی طبیب کو ملاقات کے لیے بُلا بھیجا تو اُس نے عذر کیا کہ میری کتابوں کے حمل و نقل کے لیے چار سے اونٹ درکار ہونگے اور میں اُن تمام کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ بغداد میں حنین ابن اسحاق نسطوری نے ایک عام کتب خانہ اپنے مکان میں کھول رکھا تھا جہاں طبی اور ریاضی علوم کے طالب العلم اُس کے پاس آیا کرتے تھے اور اُس کی کتابوں سے اور اُس کے علمی مذاکروں سے مستفید ہو کر جاتے تھے۔

مختلف علوم کے مدارس کا قیام اور طرزِ تعلیم

مملکتِ اسلامیہ کے وسیع حدود میں جن کی وسعت روس امپائر کی وسعت سے بڑھی ہوئی تھی چپہ چپہ پر مدارس قایم تھے۔ ہر ایک گوشۂ مملکت میں عام درسگاہیں پائی جاتی تھیں۔ مشرق میں مغول اور تتار اور مغرب میں مراکش فاس اور اسپین درسگاہوں سے معمور تھے۔

اس زمانے میں درس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر مدرس درس دینے سے پہلے اچھی طرح خود تیار ہو جاتا تھا اور جس موضوع پر درس دینا چاہتا تھا اُس کے متعلق اپنے خیالات کو ایک مستقل کتاب کی صورت میں لکھ لیتا تھا اس کے بعد وہ اُن مضامین کو کہتا جاتا تھا اور طلبہ لکھتے جاتے تھے بعد میں چل کر یہ دروس (یا لکچرز) کتابوں یا تحریرات کی شکل اختیار کر لیتے تھے یہاں ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ کل مورخین نے اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ یہ تمام تحریرات اور کتابیں بغیر کسی روک ٹوک بغیر کسی نگرانی اور بغیر کسی گھٹاؤ بڑھاؤ کے جو مصنف کی تحریر اور مرضی کے خلاف کیا گیا ہو ملک میں شایع ہوتی تھیں۔ ایک مورخ نے یہ لکھا ہے کہ بعض ممالکِ اسلامیہ میں اس طرح کا ایک قانون مقرر کیا گیا تھا کہ جو کتابیں عقاید کے متعلق شایع کی جائیں اُن میں سے کوئی کتاب بغیر اجازت کے شایع نہ ہونے پائے جہاں تک ہم جانتے ہیں جب تک اسلام۔ اسلام رہا اس قسم کا کوئی قانون نہیں وضع کیا گیا۔

اب ہم اسلامی درسگاہوں کی طرف اپنا روئے سخن پھیرتے ہیں گبن مسلمانوں کی علمی حمایت اور سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"مختلف ملکوں کے گورنر اور اُن کے وزرا علم اور علما کی قدر افزائی میں خلفا کی ہمسری کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور دارالعلموں کے

قایم کرنے میں اپنی فیاضی دکھاتے اور کم استطاعت طالب العلموں کی دستگیری کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر سمرقند و بخارا سے لے کر فاس و قرطبہ تک لوگوں کے دلوں میں طلب علم کا شوق و ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ کسی بادشاہ کے ایک وزیر (یعنے نظام الملک) نے دو لاکھ دینار بغداد میں قیام مدرسہ کے لیے دیدیئے تھے۔ اور پندرہ ہزار سالانہ کی ایک جاگیر اس کے مصارف کے لیے مقرر کی تھی۔ اس مدرسہ میں چھ ہزار طالب العلم علوم و معارف کی خوشہ چینی کرتے تھے۔ جن میں بڑے بڑے امیروں کے بچوں سے لیکر محتاج اور کم استطاعت لوگوں کے لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ محتاج طلبہ کی جاگیر کی آمدنی میں سے امداد کیجاتی تھی اور دولتمند طلبہ کے مصارف اُن کے ماں باپ اُٹھاتے تھے۔ اسکے علاوہ مدرسوں اور معلموں کو بیش قرار ماہواریں دیجاتی تھیں۔"

کسی زمانے میں مسلمانوں کی حکومتیں تین قسموں پر منقسم ہو گئی تھیں اور خلافت کے لیے تینوں کے تینوں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں ایشیا میں عباسی۔ یورپ میں اموی۔ افریقہ میں فاطمی۔ ان تینوں حکومتوں کی مناقشت حکومت اور سلطنت کے متعلق اس قدر نہ تھی جس قدر کہ علم اور ادب کے لیے تھی۔ مشرق میں سمرقند کا رصدگاہ کھڑے ہوے اس بات کو بتلا رہا تھا کہ ایشیا کے مسلمانوں کو فلکیات سے کتنا اعتنا ہے۔ لیکن اندلس میں جیرلڈ کا رصدگاہ کہہ رہا تھا کہ یورپ کے مسلمان اس بارے میں اُن سے کچھ کم نہیں ہیں۔

تمام بلادِ اسلامیہ کے طبی مدرسوں کا امتحان قاہرہ کے ایک طبی مدرسہ کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ اس مدرسہ کا امتحان دقیق اور مشکل ہونے میں مشہور تھا کسی طبیب کو اُس وقت تک علاج معالجہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی

جب تک کہ وہ اس امر کا سرٹیفکیٹ نہ پیش کرے کہ اس نے فن طب میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور سخت سے سخت امتحان پاس کر لیا ہے۔ یورپ میں سب سے پہلا طبی مدرسہ جو اس نمونہ پر قایم کیا گیا وہ وہ تھا جس کی بنیاد عربوں نے سالیرن نامی اٹلی کے ایک شہر میں ڈالی تھی۔ اور سب سے پہلا رصدگاہ جو بنایا گیا تھا وہ وہ تھا جس کو عربوں نے اشبیلیہ کے ایک شہر میں قایم کیا تھا۔

مسلمانوں نے سائینس کے مختلف شعبوں میں دلچسپی لی۔ انہوں نے لٹریچر کے تمام فنون میں حتیٰ کہ قصص اور خیالی حکایات میں بھی جو تمدنی اور معاشرتی حالات پر مبنی ہوتے تھے۔ مہارت و دستگاہ پیدا کی۔ ابتدا ابتدا میں یونانی اور سریانی سے علم حاصل کرتے رہے اور متقدمین کی کتابوں کو صحیح ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں نقل کرتے رہے۔ شروع شروع میں ان کے مترجم عیسائی اور صابی ہوتے تھے۔ بعد میں خود علمائے مسلمین نے یونانی اور لاطینی زبانیں سیکھیں اور ان دونوں زبانوں کی ڈکشنریاں تصنیف کیں تاکہ علوم کو ان کے اصل ماخذوں سے سیکھ سکیں۔ اور اپنی حاصل کردہ معلومات کو عربی زبان میں نقل کر سکیں۔ پہلے پہل دولتمندوں اور امیروں کے لڑکوں کے پروفیسر عیسائی اور یہودی مقرر کیے جاتے تھے۔ جب جابجا درسگاہیں قایم ہوگئیں تو ہر مذہب اور ہر ملت کے علما مدرس بنائے جانے لگے۔ ان میں سے ہر ایک اسی فن کا درس دیا کرتا تھا جس میں کہ وہ ماہر ہوتا تھا۔

(باقی آیندہ)

محمد عبدالباسط

نصیر فریدوں کوئی یاکہ بہرام ہوگا ولے گور سے عاقبت کام ہوگا

〃 ہوا پر ہے یہ بنیادِ مسافر خانۂ ہستی نہ ٹھہرا ہے کوئی یاں ایدل محزوں نہ ٹھہریگا

〃 طرفۃ العین کیا پیشِ نظر تو نے حباب عقدۂ زندگی و مرگ کو حل دریا میں

افسوس بہار و خزاں کو بقا کچھ نہیں ہے سب کچھ یہاں پر سدا کچھ نہیں

ذوق کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ حیات بقا کا ذکر ہے کیا اس جہانِ فانی میں

غالب رنگِ تکلینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے گرچہ اغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں

〃 ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہر گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادیاں

〃 ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

〃 بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

〃 اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

〃 جز نام نہیں صورتِ دنیا مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

〃 عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

〃 نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

ذوق یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

ظفر کھولکر آنکھ اپنی مثلِ حباب کچھ نہ ہم نے بجز فنا دیکھا

〃 خاک دنیا کی سیر کی ہم نے یہ تو اک یوں ہی خواب سا دیکھا

〃 یہ جہاں مہماں سرا ہے جو ہی مہمان ہے یہاں زندگی دو روزہ بہر جہاں کی مہمانی سی ہے

〃 کہتے ہیں منزلِ دنیا جسے گھر اُسکو نہ جان فکر کر خانۂ عقبیٰ کا کہ مسکن یہ ہے

〃 منعم اِس قصر و محل کی ہے بنا ناپائدار بعد تیرے کچھ یہاں تعمیر ہوگی اور ہی

〃 جوں نقشِ قدم مل گئے یاں خاکیں لاکھوں رکھا نہ فلک نے تو کسیکا بھی نشاں خاک

〃 سطحِ خاکی پہ بہت زور دکھائے لیکن عاقبت کھا ہی گئی رستم و سہراب کو خاک

〃 مہرۂ شطرنج کی صورت بساطِ دہر پہ مر گئے کتنے ہی اِس دنیا کی بردومات میں

شہید حبابِ بحرِ فنا دہر کا مکاں سمجھا میں ہیچ پوچ زمین اور آسماں سمجھا

شہید	جوں حباب اِس خاک کے پُتلے کا کیا ذکر ثبات	ہو گیا دم میں فنا گویا طلسمِ باد تھا
〃	قصرِ گردوں کا بھی قایم نہ رہیگا اکدن	کیا عجب گر نہ رہا قصرِ فریدوں ثابت
〃	نامرد کی ہوئی زنِ دنیا نہ مرد کی	اِس بیوا کا لیگئے دونوں جہاں سے داغ
〃	جو ہوتا ہستیِ فانی سے واقف	نہ ہنستا کھل کھلا کر گل چمن میں
〃	دنیا ہے خیال شکل حیرت	صورت کوئی اِس کی کیا بتائے
〃	آخر کو ہے ایک دن جدائی	کیا کوئی کسی سے دل لگائے

(۲) بے وفائی وجفائے معشوق (۴۹)

میر	جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں	بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں
〃	ملے برسوں وہی بیگانگی تھی	ہمارے زعم میں وہ آشنا تھے
〃	پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں صنم تو	اب کس طرح الماعت اِن کی کروں خدایا
درد	اُس قدر تھا یا کرم یا ظلم رانی اِسقدر	مہربانی اُس قدر نامہربانی اِسقدر
〃	بیزار اگر مجھسے ہو مختار ہو بہتر	دل جس سے ملے اپنا ملا کیجیے اُس سے
سوز	کوئی جا کر کہو اُس بے وفا کو	کہ اب بھی مان لے اپنے خدا کو
〃	کب توقع ہی کہ تم پاس بٹھاؤ گے ہمیں	ہاں جو بیٹھینگے تو جھنجھلا کے اُٹھاؤ گے ہمیں
〃	بدلے انعام کے دینے لگے دشنام مجھے	غیر دشنام نہ بخشا کبھی انعام مجھے
〃	بجز فسانۂ فرہاد و قصۂ مجنوں	تو وہ سنے کامری داستان کیا کیجے
〃	ایک دن مار ڈال جھگڑا کیا	اور کیوں مجھکو آزماتا ہے
〃	مرے سلام نہ لینے سے ہو گیا ناخوش	اگر وہ پھر اِدھر آئے تو میں سلام کروں
جرأت	تھی یہ خواہش کہ کریں ہم پہ ترحم کی نظر	سو وہ اب قہر سے بھی آنکھ دکھانا نہ رہا
〃	اُس بدگماں کو تو بھی نہ الفت کا ہو یقین	رکھ دیجو اُس کے آگے اگر سر اُتار کر
〃	اگر مر چلے ہیں جفا سے تمہاری	تو پیارے تمہیں کیا بلا سے تمہاری
〃	کیونکر مرے ملنے سے نہ اُسکا خدا رائے	جیسا کوئی ہوئے اُسے ویسا نظر آئے

قایم	تھی وفا اُس مرتبہ یا بے وفائی اِس قدر	آشنائی اُس قدر نا آشنائی اِس قدر
〃	آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف	اشفاق و عنایات و کرم مہر و تلطف
مصحفی	کعبہ و دیر میں ڈھونڈی جو کوئی لیکے چراغ	تجھسا کافر نہ ملے اور مسلماں مجھسا
〃	کوئی ہمیشہ گرفتارِ غم نہیں ہوتا	ستم تو ہوتے ہیں پر یہ ستم نہیں ہوتا
〃	تیروں پہ تیر کھا کر، زخموں پہ زخم اُٹھا کر	آئے گلی میں اُس کی ہم خون میں نہا کر
〃	ہماری اُن کی کسی دن موافقت نہ ہوئی	اِدھر سے عجز اُدھر سے رکھائیاں دیکھیں
〃	یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قرباں	وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا
〃	جو آشنا ہے اُس سے ہے نا آشنا ہے وہ شوخ	اور آشنا اگر ہے تو نا آشنا کے ساتھ
〃	قدغن ہے کہ اُس در پہ کوئی آنے نہ پائے	گر بے خبر آجائے تو پھر جانے نہ پائے
〃	اے مصحفی اُس شوخ کے وعدے پہ نہ جانا	اُسنے تو ہزاروں کو یوں ہی ٹالدیا ہے
〃	سو بار گیا میں اُس کے در پر	پوچھا نہ کسی نے یہ بھی تھا کون
〃	کوئی کسی جگہ ہے پڑا اور کوئی کہیں	اُس کی گلی میں اپنا ٹھکانا کہیں نہیں
انشا	ہے کون سی یہ وضع بھلا سوچیے تو آپ	باتیں اِدھر کو کیجیے اُدھر آنکھ ماریئے
نصیر	اے ستم ایجاد ہم تجھسے کہاں تک کہیں	طرزِ جفا اور ہے رسمِ وفا اور ہے
غالب	جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں	جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
〃	ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پہ مرنا	ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
〃	بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں	پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
〃	ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
〃	ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید	جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
مومن	کسی کا ہوا آج۔ کل تھا کسی کا	نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا
〃	میں نے دل تم کو دیا تم نے مجھے رسوا کیا	میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھسے کیا کیا
〃	ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو	عذر کچھ چاہیے ستانے کو
〃	امتحاں کے لیے جفا کب تک	التفاتِ ستم نما کب تک

مومن — بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں — تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے
〃 — کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لیے — دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لیے
〃 — اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
شہید — موت بدنام ہے قصد اسکا جفا پر آیا — اس نے مارا مجھے الزام قضا پر آیا
〃 — اے پردہ نشیں اور تو کس سے نہیں ملتا — ہاں مجھ سے ہی اک تجھ کو ملاقات نہیں اب
〃 — نار و شرار و شعلہ و شمع و چراغ و برق — کرتے شرارت آپ سے ہیں اکتساب سب
〃 — تندی و سرکشی نے تری دل جلا دیا — اتنا مزاج گرم ہے کیوں شعلہ خو عبث
〃 — ہے اب یہ تازہ چلن مجھ سے جنگ غیر سے صلح — غضب ہے مشفق من مجھ سے جنگ غیر سے صلح
〃 — آگے تھے ہم پر آپ کے لطف و کرم زیاد — اب اس کے بدلے ہو گئے جور و ستم زیاد
〃 — غم دیکے ہمیں خوش ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں — دل پھیر نہ دیا لے کر دلدار اسی کو کہتے ہیں
〃 — مجھ سے نہ رکھیو کوہ کنی کی کبھی امید — میں حال بے وفائی شیریں شنیدہ ہوں

(۳) بدنصیبی (۲۸)

میر — مر گئے نا امید ہم مہجور — خواہشیں جی کی اپنے جی میں رہیں
〃 — اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں گنج قفس رہی
درد — نشو و نما کی کس کو امید اے بہاریاں — میں خشک شاخ ہوں کہ نہ پھولے نہ پھل سکوں
〃 — یاوری دیکھیے نصیبوں کی — دوست بھی ہو گئے مرے دشمن
سوز — ساغر عیش دیا اوروں کو — سوز کو دیدۂ پر نم نہ بخشا
〃 — عیسیٰ نفس ہے وہ تو مرے دل کو کیا صلہ — درماں کی آرزو میں یہ بیمار ہی رہا
جرأت — بعد مدت کے جو گھر اس کے ہمیں لائے نصیب — بات کرنا بھی قسمت میں ہوا ہائے نصیب
〃 — کس کو آوارہ کیا یوں گردش ایام نے — جو کہ دکھلایا ہمیں اس بخت نافرجام نے
〃 — اس انجمن سے جرأت سب کامیاب آئے — حسرت بھرے پر ارماں اک ہم وہاں سے نکلے
〃 — ہمنشیں ہو گئے رقیب اپنے — کیا گلا کیجیے نصیب اپنے

بیدر کے موجودہ اور گزشتہ حالات

ایام تعطیلاتِ محرم میں مجھے بیدر جانے کا موقع ملا اور وہاں کے حالات معائنہ کرنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ جس طرح اورنگ آباد و ورنگل وغیرہ مشہور مقاموں کے دلچسپ حالات ناظرینِ صحیفہ کی خدمت میں پیش ہو چکے ہیں اُسی طرح یہ نہایت ضروری ہے کہ اِس قدیم اسلامی دارالحکومت کے حالات بھی قلمبند کر کے پیش کیے جائیں۔ پس ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے وہاں کی گزشتہ اور موجودہ حالت درج کرتا ہوں۔

مسلمانوں کی آبادی بیدر کا اسلامی دور احمد شاہ بہمنی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ اس مشہور بہمنی بادشاہ نے اپنا دارالسلطنت بیدر قرار دیا اور اُس کا نام اپنے نام کی مناسبت کے ساتھ احمد آباد رکھا۔ اور ایک قلعہ نہایت ہی مضبوط تعمیر کرایا۔ درحقیقت یہ سوال کہ ایک مشرقی بادشاہ نے جسے وراثتاً اپنی قدیم دارالحکومت کا دلدادہ رہنا چاہیے تھا کیونکر اپنے آبائی دارالحکومت کو چھوڑ کر دوسرا دارالسلطنت بنا لیا۔ قابلِ غور ہے۔ اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی وجہ وہ قدرتی خصوصیات سمجھنے چاہئیں جو بیدر کو حاصل ہیں۔

آب ہوا مع پیداوار یہاں کی زمین نہایت عمدہ سُرخ اور نرم پتھر کی ہے جس میں کبریتی اجزا بھی شامل ہیں اور بعض معادن بھی مثل کھڑیا۔ چونہ۔ گیرو۔ لوہا وغیرہ کے پائے جاتے ہیں۔ موقع کے لحاظ سے وہ قدرتی طور پر مسطح و ہموار ہے اور سطحِ سمندر سے ۲۳۳۰ فٹ بلند واقع ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ہوا صاف و نفیس ہے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد گرم اور غروب کے ساتھ ہی سرد ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برسات میں یہاں مطلق کیچڑ نہیں ہوتا۔ یہاں نیشکر، جوار، سفید چانول، دال، گیہوں وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ گویا انہی قدرتی اوصاف کی

وجہ سے نیز یہ سمجھ کر کہ گلبرگہ کا دارالسلطنت رہنا اُسی وقت تک مناسب تھا جب تک سلطنت کی حدود اس قدر وسیع نہ ہوئی تھیں۔ احمد شاہ نے اس دلچسپ مقام کو پائے تخت قرار دیا۔

موجودہ حکومت اس وقت یہ تعلقہ سرکار آصفیہ خلد اللہ ملکہ کے زیر نگین ہے جہاں اول تعلقدار، ناظم عدالت، مہتمم کوتوالی، مہتمم لوکلفنڈ وغیرہ رہتے ہیں قریباً تین چار ہزار مکانات پختہ موجود ہیں۔ سرکار کی طرف سے ایک ہائی اسکول لڑکوں کے لیے اور ایک پرائمری اسکول لڑکیوں کے لیے قایم ہے۔ اس کے علاوہ خانگی مدارس بھی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ سابق کی طرح اب تعلیم سے دلچسپی نہیں ہے۔ ناچ رنگ سے بہت اُنس ہے۔

چشمے بادلیاں یہاں قدرتی چشمے بادلیاں بکثرت ہیں جن کا پانی نہایت خوشگوار و شیریں رہتا ہے۔ ان کے منجملہ ایک چشمہ بیدر کے جانب غرب واقع ہے جس کی صورت ایک چھوٹے سے حوض کے مشابہ ہے اس کے اطراف مضبوط تبدیش ہے۔ اس میں پہاڑ کے دامن سے قدرتی طور پر پانی آتا ہے اس کے پانی میں گندھک اور لوہے کے اجزا شامل ہیں جو از روئے طب بعض امراض جلدیہ کو بہت نافع ہے۔ پانی میں گندھک کی بو اچھی طرح سے محسوس ہوتی ہے۔ صبح کے وقت اس قدر گرم رہتا ہے کہ بلا تکلف غسل کیا جاسکتا ہے۔ اوپر ایک سنگ سیاہ نصب ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے

"بنا کردہ عمارت ایں چشمۂ حیات دریں مقام شریف و روضۂ مطہر حضرت سید السادات المخدوم السید حنیف نور اللہ مرقدہ فی زمان السلطان الاعظم المتوکل علی اللہ القوی الغنی الغازی شہاب الدنیا والدین محمود شاہ بن محمد شاہ البہمنی اقل عباد اللہ درویش حسینی المخاطب مشہد من الحضرۃ الی اللہ "شفا خان" غفر اللہ سرہ و لوالدیہ فی سابع من شعبان سنہ عشرین و تسعمایۃ الہجریۃ النبویۃ"

دوسرا چشمہ جانب جنوب ہے اس کا پانی نہایت لطیف اور شیریں ہے اور جہرے سے نکل کر آتا اور حوض میں چلا جاتا ہے۔

تیسرا چشمہ جانب شرق ہے جہاں فرح باغ بھی واقع ہے اور جو آجکل لنگوروں کا مسکن ہے۔ اس کا پانی بھی ایک پہاڑ کی غار سے آتا ہے۔ اس میں بھی گندھک کی بو ہے۔ اس کی خاصیت بھی وہی بیان کی جاتی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ عام لوگ اس کا پانی نہیں پیتے نہانے وغیرہ کے کام میں لاتے ہیں۔ پہاڑ کے درے سے ڈیڑھ دو سو قدم تک تراشا ہوا ہے۔ جہاں سے پانی آتا ہے۔ وہاں ایک مورت بنی ہوئی ہے جس کی اب تک پوجا پاٹ ہوا کرتی ہے۔ اور ارادتمند ہنود دور دور سے آکر نہاتے ہیں۔

اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے چشمے بکثرت ہیں۔ غرضکہ بیدر کو خاص طور سے اس امر کی خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے پانی میں کبریتی اجزا شامل ہیں۔ ناظرین کو یہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یورپ میں جہاں کہیں اس قسم کے چشمے پائے جاتے ہیں اُن سے کیا کیا کام لیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے پانی میں نہانے کے لیے خود ہندوستان سے فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ کو اکثر لوگ جاتے ہیں۔ مگر کتنی بدقسمتی ہے کہ باوجود قدرت کی اُن فیاضیوں کے جو اس سرزمین کے ساتھ ہر چیز میں مشاہدہ کیجاتی ہیں کوئی اُن سے فائدہ نہیں اُٹھاتا ہے اور نہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان قدرتی مواقع کو عام طور سے شہرت دیجائے اور دور دور تک اُن کی خبر پہنچائی جائے۔ مشترکہ سرمایہ سے کمپنیاں قایم ہوں اور ایسے حمام تیار کیے جائیں جہاں لوگ خوشی سے آیا کریں ہماری رائے ہے کہ اگر پبلک میں ایسے کاموں کا ذوق نہیں پیدا ہوا ہے تو خود سرکار کو چاہیے کہ لوکلفنڈ سے اس کا انتظام کر دے۔ اگر

حکام مقامی اس بارے میں توجہ کریں تو ممکن ہے کہ بیدر زیارتگاہ عام و خاص ہو جائے۔

دستکاری سابق وحال | قدیم زمانے میں یہاں بہت سے کاریگر تھے جو برتنوں کا کام کرتے تھے۔ اور قدرتی فولاد کو جو سرزمین بیدر میں پیدا ہوتا ہے کام میں لاتے تھے جس کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ کل آباد دنیا میں تھی یہ کاریگر تھالی، ڈبیاں، صراحی، جام، چھریوں کے شام، قلمدان، دوات، خاصدان، حقہ، وغیرہ بہت سی اشیا تیار کرتے تھے جن پر چاندی کے بیل بوٹے بڑی خوبصورتی سے جمائے جاتے تھے۔ جنکو ہر نفاست پسند پسند کرتا تھا مگر یورپ کے مال کی ارزانی سے یہ قدیم صنعت بالکل تباہ ہوگئی۔ اب معدنیات سے لوہا فولاد نکالنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ صرف ڈھالنے والے اور بیل بوٹوں کا کام کرنے والے ایک دو مکان باقی رہ گئے ہیں۔ بدقسمتی سے جو کچھ ہیں بھی وہ اصول تجارت سے ناواقف ہیں نہ یہ جانتے ہیں کہ کن طریقوں سے سامان کی مانگ بڑھائی جائے۔ اسی ناواقفی کا نتیجہ ہے کہ ان کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے اور معمولی خواہشمند کی طرف متوجہ تک نہیں ہوتے۔ نیز اپنے عزیز و اقارب کو بھی یہ ہنر نہیں سکھلاتے اگر یہ لوگ اپنے کام کو اصول تجارت کے مطابق ترقی دیں تو بہت اچھا نفع اٹھا سکتے ہیں۔ نہ معلوم ہمارے پیارے قلمرو آصفیہ میں وہ زمانہ کب آئیگا جب کہ مشترکہ کمپنیاں قایم ہونگی اور یورپین اصول تجارت کے مطابق اپنے سامان کی مانگ بڑھانے کی کوشش کیجائیگی۔

قدیم عمارات | قدیم عمارات میں سب سے زیادہ قابل تعریف مدرسہ محمودیہ ہے۔ عموماً ہندوستان میں اسلامی عمارتوں کا نمونہ مساجد اور مقبروں یا محلات میں نظر آتا ہے۔ مدرسہ کی عمارت کم نظر آئیگی۔ اس لحاظ سے بیدر کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں ایک عالیشان دارالعلوم کی عمارت

اب تک دیکھنے والوں کو اس امر کی یاد دلاتی ہے کہ پیشیر و اسلامی حکومتوں میں اسلامی پریویٹ فیاضیاں قومی تعلیمی کاموں میں کس دلچسپی کا اظہار کرتی تھیں جو زمانۂ حال کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی فیاضی سے کسی طرح گھٹی ہوئی نہیں کہی جاسکتی۔ خواجہ محمود گاوان وزیر سلطنت بہمنیہ نے ۸۷۳ھ میں یہہ مدرسہ تعمیر کرایا۔ جس میں عربی، فارسی، دینیات وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی اور اس لحاظ سے یہ مدرسہ اُس وقت تعلیمی کوششوں کا مرکز تھا۔ علما، طلبا اور مدرسین کو بیش قرار تنخواہیں اوقافِ مدرسہ سے مقرر تھیں۔ اعلیٰ اعلیٰ مشہور و نامور علما دور دور سے آکر جمع ہوئے تھے جس میں خود وزیر اعظم محمود گاوان کا بھی درس ہوا کرتا تھا۔ یہ عمارت بہت مستحکم، نہایت عالیشان اور سہ منزلہ ہے بجلی کے صدموں سے تقریباً اس کا نصف حصہ منہدم ہوگیا ہے۔ مگر بقیہ حصہ اب تک پہلی آب و تاب کے ساتھ اپنی طرف سیاحوں کی نگاہوں کو کھینچ رہا ہے۔ مدراس ہائی کورٹ کی عمارت اس نمونے سے ملتی جلتی ہے۔ اس مدرسہ کے منار بہت دور سے نظر آتے ہیں۔ جب کہ برٹش انڈیا میں آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لیے خاص قانون نافذ ہے اور نہایت فیاضی کے ساتھ پرانے اسلامی آثار تازہ رکھے جاتے ہیں حتیٰ کہ لارڈ کرزن نے ابھی ابھی تاج محل کو ایک قندیل پیش کی ہے۔ تو ہماری دلی استدعا ہے کہ مبارک سرکار عالی اس مدرسہ کی عمارت کو جو اُسے قومی اور ملکی ترکے میں ملی ہے۔ محفوظ رکھنے کی طرف پوری التفات مبذول فرمائے۔ اگر یہ عالیشان عمارت ضروری تعمیر و ترمیم کے ساتھ جس سے اس کی قدیم طرز میں فرق نہ آئے۔ قابل حفاظت آثار الصنادید میں شامل کرلی جائے تو کیا عمدہ بات ہو۔ اکثر دفاتر کے لیے جدید عمارتیں شہر کے باہر تعمیر کی جارہی ہیں۔ حالانکہ بہت سی قدیم عمارتیں بیکار کس مپرسی کی حالت میں زمیں دوز ہورہی ہیں۔ حکامِ مقامی کو چاہیے کہ ان باتوں کی طرف غور فرمائیں۔ ہماری رائے میں مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ سرکار عالی میں حفاظت آثار قدیمہ کا ایک خاص سررشتہ قایم ہو جو ان تمام ابواب کی طرف اپنی غور و توجہ کو مبذول کرے۔ اگر کافی توجہ دلائی جائیگی تو میرا خیال ہے کہ سرکار عالی کو خود ان عمارتوں سے جو مختلف اضلاع سرکار عالی میں بکثرت نظر آتی ہیں معقول مالی منفعت ہوگی۔

فصیل شہر | شہر کے اطراف فصیل نہایت مستحکم موجود ہے۔ سنہ ۹۶۲ ہجری میں علی برید نے تعمیر کرائی تھی۔

قلعہ | "قلعہ ارک" کے نام سے ایک نہایت مستحکم و مضبوط اور مشہور قلعہ ہے اس کے اطراف تین خندقیں ہیں اور اندر بہت سی عالیشان عمارتیں ابھی تک موجود ہیں۔ ان عمارتوں میں تعلقداری کے دفاتر ہیں۔ اگر ان کی پوری پوری کیفیت لکھی جاے تو کئی صفحے درکار ہونگے۔ قلعہ کے اطراف برج ہیں۔ بعض بعض مقامات میں ابھی تک توپیں بھی ہیں۔ جو صرف تبرک کی طور پر رکھی ہوئی ہیں۔

مسجدیں۔ | یہاں ایک جامع مسجد اور بعض چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں جن میں صرف ایک دو آباد باقی ویران حالت میں ہیں۔

خانقاہیں۔ | جب بیدر عظیم الشان سلطنت بہمنیہ کا دارالسلطنت تھا تو ہر قسم کے باکمالوں کا بیدر کی سرزمین کو اپنے قدوم فیض لزوم سے مالامال کرنا لازمی تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دور دور سے بزرگان دین نے آکر اس شہر کو رونق دی۔ جن کے عالی شان مقابر و خانقاہیں جس طرح اب تک آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں اور اس امر کو یاد دلاتی ہیں کہ ان بزرگوں نے اپنے اخلاقی برتر نمونۂ زندگی سے پبلک کے دلوں میں کہاں تک طاقت حاصل کی تھی۔ اسی طرح ان کے حقیقی جانشینوں کا تا تعلیم یافتہ ہونا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ خدمات کے موروثی ہو جانے سے اسلام میں کس قدر سخت رخنہ پیدا ہو گیا۔ جو جو معاش اور جاگیریں سرکار سے مقرر ہیں وہ دراصل ملکی و

قومی و مذہبی خدمات کی ادائی میں مشروط ہیں۔ افسوس ہے کہ بزرگوں کے نام لیوا اپنے بزرگوں کے طریقے پر رہ کر خلق خدا کو فائدہ نہیں پہنچاتے حالانکہ ایسا کرنا اُن کا فرض ہے۔ اور اگر یہ چاہیں تو اب بھی بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

گنبد یہاں اولیا، مشایخین، علما، شعرا، شاہان اسلام اور وزرا کے اس قدر زیادہ مزار اور گنبد ہیں کہ اُن کی تفصیل رسالے کے کئی نمبروں میں بھی نہیں آسکتی۔ میں مختصر طور سے صرف مشہور گنبدوں کا ذکر کرونگا

گنبد رو فتح آشٹور شہر بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر سلاطین بہمنیہ کے گنبد ہیں۔ جن میں سلطان احمد شاہ بہمنی بانی بیدر کا گنبد نہایت عالیشان ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں نقش و نگار طلائی کیا ہوا ہے۔ اور ہر مقام پر قرآن شریف کی آیات سنہری حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ دوپہر کے وقت گنبد کا بالائی حصہ چمکتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس میں ہیرے وغیرہ جڑے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ چمک پیدا ہوتی ہے۔ سرکار کی جانب سے ہر سال عرس ہوتا ہے۔ اور چند خادم اور داروغہ وغیرہ مامور بکار ہیں۔ اس گنبد کے اطراف سلطان علاؤالدین ثانی بہمنی وغیرہ کے مقابر ہیں۔ جن پر قدیم چینی کا کام کیا ہوا ہے۔ ایک دو مقبرے بجلی کے صدمے سے منہدم بھی ہو گئے ہیں۔

گنبد بریدیہ شہر بیدر کے غربی جانب اُن بریدیوں کے مقابر ہیں جو سلاطین بہمنیہ کے معمولی اسباب زوال سے فنا ہو جانے کی بدولت اُن کے قایمقام ہوئے تھے۔ اِن میں علی برید شاہ کا مقبرہ جو اِن سلاطین میں سب سے زیادہ نامور بادشاہ گزرا ہے نہایت عالیشان ہے۔ گنبد کے اطراف کا رُخ کھلا ہوا ہے۔ لایق کاریگر نے اِس کو ایسا بنایا ہے کہ مطلق گرد و غبار نہیں جمنے پاتا مقبرے کے اندر چینی کے کام پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ

اکثر حروف مٹ گئے ہیں۔ مشہور ہے کہ مصنوعی جنگ کے وقت سولجروں نے بطور تفریح گولیوں سے نشانہ اندازی کی جس سے اس کے اکثر حروف نکل گئے حکام مقامی کو ضرور ہے کہ بلحاظ حفاظت آثار قدیمہ ایسے ابواب کی طرف خاص توجہ کریں۔ اگر شکایت صحیح ہے تو ضرور ہے کہ اس کا انسداد کیا جائے اور آیندہ کے لیے پہرہ وغیرہ کا انتظام رکھا جائے۔ جو بلحاظ قانون آثار قدیمہ خود سرکار انگریزی کے پاس نہایت ضروری ہے۔

گنبد سے ملحق ایک مسجد، مسافر خانہ، کتب خانہ ہے جس کی صرف عمارت باقی رہ گئی ہے کوئی کتاب نہیں ہے۔

اس کے اطراف بہت دور تک بریدیہ بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو سیاحوں کو دور دور سے نظر آتے ہیں۔ ان بادشاہوں کے مزاروں اور خصوصاً ان مقبروں میں جانے سے جہاں نہایت پُر اثر اشعار لکھے ہوئے ہیں بڑی رقت طاری ہوتی ہے کہ ایک زمانے میں وہ کس داب و رعب کے ساتھ سلطنت چلاتے تھے اور آج کس پُر عبرت خاک میں پڑے ہوئے ہیں

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مزارات بزرگان دین۔ یہ شہر بزرگان کرام و مشائخین عظام سے بھی خالی نہیں رہا ہے۔ بیسیوں باکمالوں نے یہاں آکر سکونت اختیار کی جن کے عالیشان مقابر و مزار ابھی تک رونق کے ساتھ قایم ہیں۔ ان کی تفصیل بھی موجب تطویل ہے لہذا چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

لنگور۔ بیدر میں لنگور اس کثرت سے ہیں کہ شاید ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ میں نہ ہونگے۔ ان کے لیے سرکار سے یومیہ دو روپیہ مقرر ہے جس کی مقدار ماہانہ ساٹھ روپیہ ہوتی ہے۔ اس رقم سے جوار کی روٹیاں قیدیوں کے ہاتھ سے تیار کرا کے ان لنگوروں کو تقسیم کی جاتی ہیں اس تقسیم کے لیے ایک داروغہ بھی مقرر ہے۔ ان کے متعلق طرح طرح کے

بیانات زبان زدِ عام ہیں۔ ان کی سات آٹھ ٹکڑیاں ہیں۔ ہر ٹکڑی میں سو سوا سو لنگور ہیں ہر ہر ٹکڑی پر ایک نر قابض رہتا ہے۔ وہی اُن کا حکمران کہلاتا ہے جس کو بغدہ کہتے ہیں۔ دوسرا نر اس ٹکڑی میں جانے کا مجاز نہیں۔ اگر چلا جائے تو آپس میں خوب مار کٹائی ہوتی ہے اور آخر میں جو غالب آتا ہے وہ حکمرانی کے لیے مامور ہوتا ہے۔ مادہ لنگور شہر بھر میں گشت کرتے ہیں اور جس قدر نر ہیں وہ سب فرح باغ میں رہتے ہیں۔ اُن کو باری باری سے روٹی تقسیم ہوتی ہے جس کی باری ہے وہی لیتا ہے۔ دوسرے لنگور ہرگز نہیں لیتے۔ اگر اُن کے روبرو ڈالی بھی جائے تو وہ دیکھ کر چھوڑ دیتے ہیں کھاتے نہیں۔ یہ جانور انسانوں کو ہرگز تکلیف نہیں دیتے۔ کوئی ان کو شکار کرنے یا اذیت دینے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس کا ارتکاب کیا تو کوتوالی اُس کو فوراً گرفتار کر کے سپردِ فوجداری کر دیتی ہے۔

محرم | یہاں کا محرم عموماً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا دیگر بلادِ ہند کا۔ ہندو مسلمان کھیل تماشوں میں حصہ لیتے ہیں۔ علم استادہ کرتے ہیں۔ دس بارہ دن روشنی ہوتی ہے البتہ خصوصیت یہ ہے کہ پنجوں کے ہمراہ جلوس نکلتے ہیں جن میں ایک لڑکے کو آراستہ و پیراستہ کر کے کسی بادشاہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُس کے ہمراہ لوازماتِ شاہی یعنی مصنوعی فوج، پالکی، نالکی، گھوڑے، اونٹ بیانڈ، باجہ، نوبت، نقارہ، خدام وغیرہ سب ہی موجود رہتے ہیں۔ اُنکے پیچھے ہزاروں آدمیوں کی خلقت رہتی ہے۔ اُس کو دیکھنے کے لیے اطراف و اکناف سے جوق جوق لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جہانگیر، دارا، نادر وغیرہ مرحوم بادشاہوں کا روپ بھرا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اعلیحضرت تبدگانِ عالی سے بھی نسبت دی جاتی ہے۔ بلاشبہہ یہ امر خلافِ دابِ حکومت اور شاہانِ ماسلف کی توہین میں داخل ہے۔ حکامِ مقامی کو چاہیے کہ ان باتوں کا انسداد کریں۔ نہ کہ خود ڈیرے نصب کر کے تماشہ دیکھیں۔ یہ کوئی شرعی رسم نہیں ہے

جس کی ممانعت سے احتیاط کی جائے۔ ان مصنوعی کھیل تماشوں میں ہر سال ہزارہا روپیہ بیجا صرف ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر حصہ حضرات مشائخین عظام کا ہے کاش یہ لوگ اپنے بزرگوں کے جادہ پر قایم رہ کر ایسی فضولیات سے خود باز رہیں اور دوسروں کو بھی گناہوں سے محفوظ رکھیں۔ تو کیا ہی اچھا ہو خدا ہم مسلمانوں کو توفیق نیک عطا فرمائے۔

محمد مصطفیٰ

کیجیے

مدام پاس و لحاظِ سخن کیا کیجے
کسی سے وعدہ اگر کیجیے وفا کیجے

بشر کو چاہیے اپنے کلام کی عزت
زبان سے جو کہا کیجیے کیا کیجے

رہے خیال کہ حاصل نہ ہو پشیمانی
کسی سے وعدہ سمجھ بوجھ کر کیا کیجے

جو گرجے اور نہ برسے وہ ابر ہے کیسا
جو تخم بوئیے اُس تخم کو ہرا کیجے

بڑا گنہ ہے یہ عالم کی ہر شریعت میں
نہ منحرف کبھی اقرار سے ہوا کیجے

نہ ٹوٹے عہد کبھی اس طرح ہو مستحکم
جو استوار ہوا ایسا مکاں بنا کیجے

جو بات لب پہ نہ ہو وہ زباں پہ آنے نہ پائے
دل و زباں کو ہم متفق رکھا کیجے

یہ کون سی ہے مروت کہ جھوٹ بولتے ہیں
جو کچھ ہو دل میں اسی کا صاف کہدیا کیجے

نہیں ہے وعدہ خلافی فریب سے خالی
کسی کے ساتھ نہ ہرگز کبھی دغا کیجے

ملا رہے ہیں تہی مغزیاں ہیں ہاں لیکن
صدائے گنبدِ خالی فقط سنا کیجے

ہمیشہ وردِ زباں رکھیے آیتِ اوفوا
مدام کوشش خوشنودیٔ خدا کیجے

دیئے ہیں کان خدا نے دو، اور ایک زباں
کہ ایک بات کہا کیجے دو سنا کیجے

ہو لمعہ وعدہ وفائی کی ہم کو بھی توفیق
مدام درگہِ خالق میں یہ دعا کیجے

لمعہ حیدرآبادی

برسات

کس کو ہے زاہد خیال این و آں برسات میں
بن گیا قبلہ دیر مغاں برسات میں

سبزۂ خفتہ ذیل انگڑائیاں پھر چونک کر
جاگ اٹھا پھر نصیب گلستاں برسات میں

پرتو سرسبزیٔ عالم کا اللہ رے عروج
بن گیا اخضر یہ نیلا آسماں برسات میں

ہیں ہری جنگل بھی گویا خاطر نظارہ باز
مٹ گیا ہے گرد کلفت کا نشاں برسات میں

گریہی نشو و نما روح نباتی کی رہی
کیا عجب باغ کماں ہو پرفشاں برسات میں

اٹھ رہی ہیں چار سو موجیں شراب ناب کی
خوب چل نکلی ہے ساقی کی دکاں برسات میں

دیکھنا عشاق کا رنگ شگفتہ خاطری
بجھ گئی ہے آتش سوز نہاں برسات میں

باغ ہو یا راغ ہو بستی ہو یا ویرانہ ہو
فرحت افزائی نظر ہیں یکساں برسات میں

کس قدر ہے آتش سیال گرمائی ہوئی
شیخ بھی کرتا ہے ٹھنڈی گرمیاں برسات میں

کیا طراوت کا اثر ہے بوستاں در بوستاں
ابر اٹھے کارواں در کارواں برسات میں

خشک مغزی مٹ گئی اس کی خدا کی شان ہے
شیخ رندوں کا ہوا ہے میہماں برسات میں

پیر صد سالہ کی خاطر بھی ہے کچھ ایسی ہری
ہے مثال سرو تن تن کر جواں برسات میں

سر پہ سایہ ابر رحمت کا رہے جب سیر ہے
لے قدح نوشوں کا ساقی امتحاں برسات میں

جس جگہ تھے سوکھے پتے اب گلوں کے ڈھیر ہیں
دیکھنا بدلا ہے کیا رنگ جہاں برسات میں

برق چمکی، رعد گرجا، ابر آیا جھوم کر
جوش پر ہیں خوب مے نوشیاں برسات میں

ڈوبنے سے بچ گئے تو جا کے کیچڑ میں پھنسے
ہائے دورے کی مصیبت الاماں برسات میں

کچھ چہک اٹھو خدارا عندلیب خوشنوا
دیکھو یہ اچھی نہیں خاموشیاں برسات میں

مانگتے تھے رند مدت سے دعا برسات کی
میکدے پر چھا گئی آخر گھٹا برسات کی

اب بھڑک اٹھینگے شعلے آتش سیال کے
گرمیاں کھلائیگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

رند میخانے سے باہر کس طرح رکھیں قدم
بن گئی ہے بیڑیاں موج ہوا برسات کی

سبزۂ مردہ نے لی کروٹ تو مردے بول اُٹھے
واہ کیا تاثیر ہے معجز نما برسات کی

اس کے ہر جھونکے میں ہے رنگِ شکستہ خاطری
واہ وا کیا روح پرور ہے ہوا برسات کی

گرد و کلفت خشکیٔ کام و زباں، سوزِ جگر
ہو گئی قربان سب پر کربلا برسات کی

ابر اُٹھے جھوم کر بادل برسنے لگ گئے
کیا نوید جانفزا لائی ہوا برسات کی

شور و غوغا ہر سو آبشاروں میں ہے کل
دھوم ہے صحن چمن میں جا بجا برسات کی

غنچے چٹکے، گل ہنسے، پھوٹی شگوفے باغ میں
نخل میں پہنچی ہے دھانی قبا برسات کی

موجیں بڑھ بڑھ کر چلیں دامن کو پھیلائے ہوئے
لُٹ رہی ہے خوب سیرِ جانفزا برسات کی

کارِ عنبیک دے رہی ہے کس کی یہ چشمِ حباب
مچھلیوں کو دید ہے منظور کیا برسات کی

خاک اُڑتی تھی جہاں سبزہ لہکتا ہے وہاں
کیا ہی سرسبزی ہے اصل علیٰ برسات کی

ہلکی ہلکی یہ پھواریں، ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا
کھب گئی ہے آنکھ میں اک اک ادا برسات کی

قلب کی گرمی بجھا دی آبِ آتش رنگ سے
رُت ہے یہ ای ساقی گلگوں قبا برسات کی

بال و پر لائے اگر زورِ کماں تو کیا عجب
زور پر ہے قوتِ نشو و نما برسات کی

ہے نوا سنجانِ گلشن کے لبوں پر یہ دعا
رُت نہ جائے حشر تک یارب بنا برسات کی

ہو گئے سبز آشیاں کے خار و خس تک عندلیب
خوب لوٹی ہم نے گھر بیٹھے فضا برسات کی

غزل

عندلیب حیدرآبادی

لبھاتے ہیں ستاتے کو بتانِ سیمبر پہلے
انہیں ان کی وہی کرنی جو پتھر کا جگر پہلے

خدا کی شان، انہیں دم بھر کو ملتی شان کتنی ہے
رہا کرتے تھے میرے ساتھ جو آٹھوں پہر پہلے

کہوں میں ہیوفا، تو کہتی ہیں کس صفائی سے
کوئی پوچھو انہیں سے دل دیا کیا جانکر پہلے

کہاں اے اشتیاقِ دید ارادہ پھر کہاں نکلا ہے
ذرا میں سی تو لوں کمبخت وہ زخمِ جگر پہلے

مجھی کو ہے کہ عشق اللہ، یکطرفہ بھی ہوتا ہے
سنا تھا لبوں کے دل پہ ہوتا ہے اثر پہلے

نگاہِ ناز نے مجنوں بنایا نامہ بر کو بھی
خبر کیا دیگا میری خود تو لے اپنی خبر پہلے

انہیں جب دل دیا تھا رو چکی تھی جان کو بھی ہم
نہ اب ہے ای تسلی اور نہ تھی پروا مگر پہلے

ریویو

سنبلستان حرفت مصنفہ قاضی محمد جلال الدین صاحب بی سی، معلم، ایم اے او کالجیٹ اسکول علیگڈھ۔ اس کتاب کے نام سے اُس کے موضوع کا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہ اُس سلسلہ کی سولہویں جلد ہے جس کو قاضی صاحب بطور اردو انسائیکلوپیڈیا کے شایع کر رہے ہیں جس میں صنعت و حرفت، سائنس، تاریخ، اور معلوماتِ عامہ کے متعلق مختلف کتابوں اور ماہواری اردو رسالوں سے نہایت کارآمد اور مفید ذخیرہ مہیا کیا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اس سلسلے کی اور جلدیں ہماری نظر سے نہیں گزریں۔ اس لیے اُن کی نسبت ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ اب تک اُردو کے نامی گرامی رسالوں میں مفید عام مضامین جس قدر شایع ہو چکے ہیں اُن کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا جاے۔ کیونکہ رسالوں کے گزشتہ نمبر پرانے ہو جانے کے بعد دستیاب نہیں ہو سکتے۔ اور اس طرح عام لوگوں کی نظریں اُن تک پہنچنے سے قاصر رہتی تھیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ اس اہم ضرورت کو قاضی صاحب نے پورا کیا اگر وہ اسی طرح اپنے سلسلہ کو جاری رکھیں تو اُردو لٹریچر میں نہایت بیش بہا اور کارآمد اضافہ ہو جائیگا۔

کتاب زیر بحث میں ریڈیم، ریشم، اسپنج، تار برقیات، دودھ، مکھن، سیاہ تاب کرنے کی ترکیب، زری مصالحہ صاف کرنے کی ترکیب، آئینہ پر قلعی کرنے کی ترکیب، کافور، الکٹریٹلی فوٹوگرافی، جنگی جہاز، تماکو، انگور، روئی وغیرہ وغیرہ عنوانات کے متعلق انگریزی اور اُردو رسالجات سے نہایت نافع مضامین انتخاب کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے ذرایع معاش بتلائے گئے ہیں جن کو اگر کوئی شخص عمل میں لاے تو وہ بہت کچھ کما سکتا ہے۔ اس میں کئی ایسے چٹکلے درج ہیں کہ اگر اُن سے کام لیا جائے

تو آدمی اچھی طرح روپیہ پیدا کر سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں اُس کتاب سے کاجل اور گیاس کے تیل کا بیان درج کرتے ہیں۔

"گیاس کا تیل کھلی ڈبیوں میں ہر گھر میں جلتا ہے۔ اس کے دھوئیں "سے تمام گھر کالا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں دو نقصان ہوئے۔ ایک تیل "جل کر ضایع ہوا دوسرے تیل کے دھوئیں یا کاجل نے تمام مکان کو سیاہ "کر دیا۔ عقلمندوں کو چاہیے کہ ہر ڈبیہ کی لوپہ کچی مٹی کے بڑے بڑے سرپوش "ٹانگ دیں اور ہر صبح کو کاجل کھرچکر جمع کرتے رہیں۔ تجربہ ہے کہ اگر "کاجل احتیاط سے جمع کیا جاوے گا تو ایک روپیہ کا تیل صرف ہونے کے بعد "۱۲ر کا کاجل وصول ہوگا۔ اور بعض وقت تیل کے پورے دام اٹھ آئے "یہ کاجل اعلیٰ قسم میں داخل ہے اور چھاپہ خانوں میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا "ہے جس کا نرخ عموماً دو ڈھ روپیہ سیر رہتا ہے۔ جن صاحبوں کو کوئی خریدار "نہ ملے وہ ایم زماں برادرس مراد آباد سے خط و کتابت کریں"

اس کتاب میں ایسی ایسی کئی ایک ترکیبیں درج ہیں جن کے پڑھنے اور جاننے سے واضح ہوتا ہے کہ علم صنعت اور سائنس کے کرشموں نے انسانی معاش کے دایرہ کو کس قدر وسیع کر دیا ہے۔ یہ ہم لوگوں کی کم بختی ہے کہ صنعت و حرفت اور سائنس کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتے اور صرف ملازمت پر جھکے ہوئے ہیں۔ ہم قاضی صاحب کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اس تالیف کو شایع کر کے حرفتی لٹریچر کو وسیع فرمانے کی کوشش کی کتاب مجم میں ۱۰۰ صفحوں کی ہے۔ قیمت ۶ر۔ ایم۔ زماں۔ برادرس۔ مراد آباد سے مل سکتی ہے۔

ایسٹ اینڈ ویسٹ خالق باری | مصنفہ مولوی احمد الدین صاحب مرحوم

نظم میں انگریزی، ہندی، فارسی اور بعض عربی اور بعض ترکی الفاظ کو جمع کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف زبانوں کے لغات یاد کرنے میں سہولت ہو

اِس صنف میں اور بھی کئی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن یہ کتاب باعتبار صفائی بیان کے اُن سب میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اِس کتاب میں اگر التزام کیا گیا ہے تو انگریزی الفاظ کا جن کے مترادفات کہیں ہندی میں، کہیں فارسی میں، کہیں عربی میں، اور کہیں ترکی میں بیان کیے گئے ہیں۔ اِس لحاظ سے اِس کو انگریزی لغات کی خالق باری کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ بعض لغات مکرر نظم کیے گئے ہیں اور بہت سے مصرع ضرورتِ شعری کی خاطر بھرتی کے لائے گئے ہیں۔ کتاب بحیثیت مجموعی اچھی ہے۔ حجم ۶۴ صفحے۔ قیمت ۴؎ افضل المطابع مراد آباد سے مل سکتی ہے۔

سنسکرت علم ادب | مصنفہ محمد شفیع الدین خان صاحب مراد آبادی

یہ ۱۹ صفحوں کا ایک مختصر مضمون ہے جس میں زبان سنسکرت کی تاریخی حالات اس کے علم ادب کی اقسام کا بیان ہے۔ نیز مسلمانوں نے سنسکرت سے جو جو کتابیں ترجمہ کیں اُن کی بھی مجمل کیفیت درج کی گئی ہے۔ اِس رسالہ کا پہلا حصہ بالکل موجز و مجمل ہے۔ اگر مصنف ذرا تفصیل سے کام لیتے اور دیگر مضامین کا اضافہ کرکے اُس کو شایع کرتے تو ہمارے خیال میں زیادہ مفید ہوتا اگرچہ اس مختصر رسالے سے سنسکرت کے علم ادب پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی لیکن اُس کے دیکھنے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ایک غیر زبان سے اعتنا کرنے میں کس قدر اپنی بے تعصبی اور رواداری کا ثبوت دیا۔ قیمت معلوم نہیں۔ مراد آباد میں مصنف سے مل سکتی ہے۔

فریاد بیکسی | یہ ایک مرثیہ ہے جو سیلاب رودِ موسیٰ پر حیدر آباد کے مشہور شاعر مولوی سید جلال الدین صاحب توفیق کے قلم سے نکلا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب توفیق نے اس سانحۂ دلگداز کے وقوع پذیر ہونے سے باشندگان حیدر آباد پر رنج و غم کی جو کیفیت گزری اُس کی ہو بہو تصویر الفاظ کے ذریعے سے کھینچ دی ہے۔ انہوں نے مایوسی خوف و دہشت اور رنج و غم وغیرہ وغیرہ کیفیات

اور جذباتِ انسانی کا فوٹو اس خوبی سے اُتارا ہے کہ پڑھنے والے پر بعینہٖ وہی حالت طاری ہو جاتی ہے لیکن اصل واقعہ کے خط و خال اس تصویر میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ مثلاً کئی روز تک پانی کا متواتر پڑنا، ندی کا طغیانی کرنا اور اُس کی موجوں کا تلاطم اور زور و شور۔ ندی کا آبادی کے اندر گھس آنا اور مکانات کو گھیر لینا، لوگوں کا بدحواس ہو جانا۔ اور عالیشان عمارات اور سر بفلک بنگلوں کا چشم زدن میں بیٹھ جانا۔ ننھی ننھی جانوں کا بلک بلک کر جان دینا۔ ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہونا۔ ندی کے اُتر جانے کے بعد شہر میں ہر طرف سناٹا چھا جانا اور در و دیوار سے وحشت اور اداسی کا برسنا۔ یہ تمام اُمور اِس مرثیہ میں مسلسل اور ترتیب وار نہیں بیان کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے بہت دور تک پڑھتے چلے جانے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ ہے کس واقعہ کے متعلق۔ البتہ کہیں کہیں موسیٰ ندی کا نام اور ڈوبنے اور مرنے کا جو ذکر آ گیا ہے اُس سے بالکل ناکافی تصور اس واقعہ کا ہوتا ہے۔ لیکن اُن موقعوں پر جہاں کہ کسی واقعہ کی عظمت سامع کے دل میں بٹھانی منظور ہو ایسے لوازم کا تفصیلی اور مسلسل ذکر جن سے اُس کا شان و جلال ظاہر ہوتا ہے نہایت ضروری ہے۔ اگر جناب توفیق اس اُصول کو ملحوظ خاطر رکھتے تو ہمارے خیال میں اُن کا مرثیہ نہایت شاندار اور بے نظیر ہو جاتا۔ تاہم اسقدر ہم ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ غم و الم کی کیفیت انسان کے دل پر جیسی گزری ہے یا گزر سکتی ہے یہ مرثیہ اُس کی ایک نہایت عمدہ تصویر ہے۔

حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۴ر۔ جناب میر رحمت علی صاحب رفیق (منڈی میر عالم۔ عقب دیوڑھی نواب محبوب یار جنگ مرحوم) کے پتہ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

محمد عبدالباسط

فلینی: "معلوم ہے۔ مارکوئس، ریاول، اور ہینی نے اُس کو بہتیرا تلاش کیا اور اب تک حیران ہیں مگر پتہ نہ چلا۔"

سوسن: "لیکن مجھے چل گیا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اِس وقت کہاں ہے۔"

فلینی: "کہاں ہے؟ بیٹی جلد بتا۔ میں رات سے بے چین ہوں۔"

سوسن: "(بوڑھے چرواہے کی طرف اشارہ کرکے) اِن بڑے میاں کے گھر میں موجود ہے۔"

فلینی: "(حیرت سے) اِن بڑے میاں کے گھر میں موجود ہے! تعجب!! (بوڑھے چرواہے سے) کیا اِسی بات کو آپ مجھ سے چھپا رہے تھے؟"

بوڑھا: "جی نہیں۔ مجھے اِس کے سوا سوسن بیگم سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

فلینی: "تو خیر کہتے رہیے۔ جب تک میں غریب "ہینی" کو خوشخبری دیئے آتا ہوں۔"

سوسن: "(باپ کے چلے جانے کے بعد) اب آپ جلدی سے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالیے۔ مجھے وہاں جانے کی جلدی پڑی ہے۔"

بوڑھا: "مجھے آپ سے ملکہ کی سرگزشت بیان کرنی ہے کہ وہ مجھ کو کیونکر ملی اور اب کس حال میں ہے۔ کل دن بھر میں پیرس کے گلی کوچوں میں پھرتا رہا۔ شام کو ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ۱۲ بجے دعوت سے فارغ ہو کے گھر جانے کو نکلا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور رات کا جوبن خوب نکھرا ہوا تھا نواب کا محل رستے میں پڑتا تھا۔ میں وہاں پہنچ کے لکڑی کی ایک بنچ پر دم لینے لگا۔ محل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور میں عالمِ سکوت میں بیٹھا ہوا تھا اتنے میں ایک عورت میری طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ کچھ ایسی گھبرائی اور بوکھلائی ہوئی تھی کہ اگرچہ قریب ہی سے گزری مگر میرے بیٹھے رہنے کا اُس کو مطلق علم نہ ہوا۔ میں نے قندیل کی روشنی سے اُس کو پہچان لیا اور اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

وہ بہت تیز جا رہی تھی۔ اور مجھے اُمید نہ تھی کہ میں اُس کو پا سکوں گا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ چلتے چلتے رُک گئی اور گھبرا کے سیدھے بائیں دیکھنے لگی۔ میں نے موقع کو غنیمت جان کے قدم بڑھایا اور گرتا پڑتا قریب جا پہنچا۔ وہ میری طرف خوفزدہ ہو کے مڑی۔ اُس کی صورت پر وحشت چھا گئی تھی۔ اور ہوش و حواس برجا نہ تھے۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "یہاں تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" بولی "مجھے ندی کا راستہ بتا دو"۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ندی میں ڈوبنا چاہتی ہے۔ مجھے اُس کی جوانی پر رحم آیا۔ ساتھ ہی اُس کی خوبصورتی اور عشق و عاشقی میری نظروں میں پھرنے لگی۔ میں نے اُس کو پہلے اپنے بازو بیٹھ جانے پر مجبور کیا۔ پھر نرمی سے سمجھانے لگا کہ اِس بیجا ارادے سے باز آئے۔ خدا کی قدرت، میری نصیحت کارگر ہوئی۔ اور اُس نے میرا کہا مان لیا چنانچہ مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ خودکشی سے باز آ گئی۔

میں نے کہا "چلو تمہیں نواب کے محل تک چھوڑ دیتا ہوں"۔ اُس نے منظور نہ کیا۔ پھر کہا "اچھا تم اپنی والدہ کے ہاں چلی چلو۔ مجھے اُن کی فرودگاہ معلوم ہے"۔ اِس پر بھی وہ راضی نہ ہوئی۔ میں مجبور ہو گیا اور ڈرنے لگا کہ مبادا اِس کو جنون ہو جائے۔ آخر پر میں نے کہا "میرے ہی گھر چلو۔ وہ یہاں سے قریب ہے"۔ یہ سن کے وہ تامل کرنے لگی۔ پھر بولی "اچھا چلو چلتی ہوں"۔

تھوڑی دور تک میرے ہاتھ پر سہارا دیئے ہوئے چلی۔ پھر بالکل تھک گئی ایک خالی گاڑی اُدھر سے جا رہی تھی۔ میں نے خدا کا شکر بھیج کے اُسے کرایہ پر لے لیا۔ گاڑی نے ہم کو کمرے تک پہنچا دیا۔ میں نے ملکہ کو ایک آرام کرسی پر بٹھا دیا۔ اور ایک مقوی شربت کا گلاس بھر کے پینے کو دیا۔ بارے اُس نے شربت کو پی لیا۔ بعد ازاں میں بھی ایک کرسی لے کے اُس کے روبرو بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کے حال پوچھنے لگا۔ وہ بولی "میں زندگی سے بیزار ہو گئی ہوں۔ میرا ارادہ گرجا میں داخل ہونے کا ہے"۔ میں نے کہا

"تمہاری والدہ کو تم سے بے انتہا محبت ہے۔ انہیں بڑا رنج ہوگا" بولی "میں کسی کو اپنے حال سے آگاہ کرنا نہیں چاہتی۔ آپ میرے محرمِ راز ہیں۔ میں آپ پر بھروسہ کرتی ہوں۔ آپ عہد کیجیے کہ کسی کو مجھ سے واقف نہ کرینگے۔ اماں جان کو میرے گرجا میں جانے سے بیشک بہت ملال ہوگا۔ مگر میں نن بن جانے کے بعد انہیں چٹھی لکھ بھیجونگی کہ میں بخیر و عافیت زندہ ہوں"

مجھے اُس کے خیالات پر بہت افسوس ہوا۔ میں نے دوسرے تذکرے چھیڑ دیئے۔ یہاں تک کہ اُسے نیند آگئی اور غافل ہو کے سو گئی۔ میں بھی ایک کرسی پر دراز ہو گیا۔ سورج نکلے میں بیدار ہوا۔ ملکہ اُسی طرح خواب نوشین میں مستغرق تھی۔ میں نے کہا چلو سوسن بیگم کو اس واقعہ سے آگاہ کروں۔ کمرے کو قفل لگایا اور آپ کی خدمت میں دوڑا آیا۔ اب آپ فرمائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے"

سوسن:- "آپ کچھ نہ کیجیے۔ فقط اپنے کمرے کی کنجی مجھے دیدیجیے اور بس میں سب کچھ سمجھ لونگی ۔۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ آپ نے بڑی ہوشیاری کی اور نہایت خوش اسلوبی سے اُس آہوئے رم خوردہ کو رستہ پر لگایا۔ ہم سب کو آپ کی اس حسن کارگزاری کا ممنون ہونا چاہیے"

اس وقت تک گاڑی بھی تیار ہو چکی تھی۔ سوسن بوڑھے چرواہے سے کنجی لے کے تنہا باہر نکلی۔ یہاں اُس نے فلینی اور ہینی کو اپنے انتظار میں کھڑا پایا۔ ہینی اُس کے ہمراہ چلنے پر آمادہ تھا۔ سوسن نے اُس کو ساتھ لے لیا اور فلینی کو مارکوئس کے انتظار میں وہیں چھوڑ دیا۔

گاڑی ان دونوں کو لے کے فوجی ہوٹل کے دروازے پر آئی جہاں ہوٹل والے کی بی بی ان کے استقبال کو موجود تھی۔

اُنیسواں باب

اجتماع

فوجی ہوٹل میں کسی کو نہ معلوم ہوا تھا کہ بوڑھا چرواہا ایک نوجوان لڑکی کو لیے ہوئے پچھلے پہر آیا ہے۔ سوسن نے ہوٹل والے سے کہا "خالہ جان! مہربانی کرکے آپ ہمیں بوڑھے چرواہے کے کمرے تک پہنچا دیجیے۔"

ہوٹل والی: "بیگم صاحبہ! وہ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں اور کنجی بھی نہیں چھوڑ گئے۔"

سوسن: "کنجی تو میرے پاس موجود ہے (کنجی دکھا کے) یہ دیکھیے۔"

ہوٹل والی: "(تعجب سے) کنجی آپ کو کیونکر ملی؟"

سوسن: "میں اُن کے کمرے میں جانا چاہتی ہوں۔ اس وجہ سے اُنہوں نے مجھے کنجی دے دی۔ اب آپ مطمئن ہو گئی ہونگی۔ چلیے دیر نہ کیجیے۔"

ہوٹل والی: "خیر چلیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ رہونگی۔"

سوسن: "آپ ہمارے ساتھ ساتھ رہ کے تکلیف کیوں اُٹھاتی ہیں ہم کوئی لٹیرے اُچکے تو ہیں نہیں کہ غریب بوڑھے کا مال چُرا لے جائیں۔"

ہوٹل والی: "توبہ ہے بیوی! میری کیا مجال جو آپ صاحبوں کی نسبت ایسا خیال کروں۔ بات اتنی ہے کہ آپ دونوں ماشاء اللہ سے نوجوان ہیں اور آج کل زمانہ بہت بُرا آیا ہے۔ آپ دونوں کا کسی خالی کمرے میں ——"

سوسن: "(بات کاٹ کے) آپ اس قسم کے کسی وسوسے کو دل میں جگہ نہ دیجیے۔ میں آپ کی دلجمعی کے لیے اتنا کہدینا کافی سمجھتی ہوں کہ پچھلی رات کو بڑے میاں ایک نوجوان عورت کو ہمراہ لیے آئے تھے۔ وہ اِن مارکوئس صاحب کی منگیتر ہے اور اب تک اُن کے کمرے میں سو رہی ہے۔ ہم اُسی کے دیکھنے کو آئے ہیں۔"

ہوٹل والی: "جب یہ بات ہے تو آپ خوشی سے وہاں جا سکتی اور جب تک جی چاہے ٹھہر سکتی ہیں۔ میں آپ دونوں سے معافی چاہتی ہوں کہ مجھ سے لاعلمی کی حالت میں گستاخی سرزد ہوئی۔ بڑے میاں کا کمرہ دوسری منزل میں تیسرے نمبر پر واقع ہے۔"

دونوں جلد جلد اوپر چڑھ گئے۔ سوسن دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ اور چپ چاپ کان لگا کے سننے لگی۔ مگر کوئی آواز نہ آئی۔ سوسن جنگلی انسان سے بولی: "میں پہلے جا کے اسے جگاتی ہوں۔ جب تک تم باہر ٹھہرو۔ جب میں بلاؤں اندر چلے آنا۔"

یہ کہہ کے اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ ملکہ ہنوز مستِ خوابِ ناز تھی۔ سوسن تھوڑی دیر تک اس کو دیکھتی کھڑی رہی اور اس کی زار حالی پر افسوس کرتی رہی۔ بعد ازاں اس نے ملکہ کی پیشانی کا بوسہ لیا جس سے وہ کلبلانے لگی۔ مگر آنکھیں نہ کھولیں۔ اس پر سوسن نے "ملکہ ملکہ" کہہ کے دو مرتبہ پکارا۔ اب وہ بیدار ہو گئی۔ اور سوسن کے گلے میں باہیں ڈال کے سرد آہیں بھرنے لگی۔ پھر بولی: "میری پیاری! ہم کہاں ہیں؟۔ ہاں ہاں مجھے یاد آ گیا۔ (ملکہ کے آنسو رواں ہوئے)۔"

سوسن نے آنسو پونچھ ڈالے اور تلطف و مہربانی کا اظہار کرنے لگی۔

ملکہ: "(بصدائے دلگیر) آہ سوسن کاش تم جانتیں! کاش تم جانتیں!"

سوسن: "میں جان چکی ہوں اور مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔"

ملکہ: "بڑی دہشت ناک بات ہے۔ میں نے نہایت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں ضرور مر جاؤنگی۔ جیسے میں ابھی ابھی خواب میں دیکھ چکی ہوں۔"

سوسن: "تو یہ تمہارے لیے مژدۂ روح افزا ہے اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ بہت جلد تمہاری شادی ہو جائیگی۔ اب تم اپنی خام خیالیوں کو دل سے دور کر دو۔ اور یقین جان لو کہ رنج و غم کا زمانہ جاتا رہا۔ فرحت و شادمانی کے دن آ گئے۔"

ملکہ: "سوسن! یہ کہاں تھی اپنی قسمت کہ وصال یار ہوتا اگر اور جیتی رہتی یہی انتظار ہوتا۔ مجھ پر تو خدا کا غضب ٹوٹا ہے۔ جو مجھے برباد کر کے رہیگا۔ شاید بوڑھی چرواہی نے خیانت کر کے تم سے وہ باتیں کہدیں جو میں نے اُس سے کہی تھیں"

سوسن: "اُس غریب کا تم کو ممنون ہونا چاہیے کہ اُس نے اپنی بہترین کوششوں سے تمہیں بہت فائدہ پہنچایا۔ اُسی نے مجھے بتایا کہ "ٹن" ہو جانے کے متعلق تمہارے سر پر وہی جنون سوار ہو گیا ہے جو پہلے ایک مرتبہ بڑی مشکلوں سے رفع ہوا تھا"

ملکہ: "پیاری سوسن! میں اگرچہ اب موت کے پنجے سے چھوٹ نکلی ہوں تاہم چاہتی ہوں کہ بقیہ زندگی کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو کے اس طرح بسر کروں کہ کوئی آنکھ مجھے نہ دیکھ سکے۔ اب میں کسی طرح دنیا کو صورت نہیں دکھا سکتی"

سوسن: "تم سخت غلطی کر رہی ہو۔ تم چاہتی ہو کہ تمہاری بوڑھی اور واجب الرحم ماں رنج و غم کا زہر پی کے قبل از وقت دنیا سے اُٹھ جائے۔ اُس پر اب تک جو مصیبتیں گزر چکی ہیں وہ تمہارے خیال میں کافی نہیں ہیں"

ملکہ: "افسوس! کیا اُنھیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں؟"

سوسن: "اگرچہ اُنھیں معلوم نہیں ہوا لیکن شام ہو بھی تو مضایقہ کیا ہے"

ملکہ: "نہیں سوسن! تمہیں معلوم نہیں کہ گزشتہ رات کو کیا کیا حادثے گزر چکے ہیں؟"

سوسن: "کیوں نہیں معلوم! جانتی ہوں کہ تمہارے والد نے خودکشی کر لی اور وہ اس کے مستحق ہی تھے۔ اُن کے کارنامے اُن کے دوستوں کو مجبور کرتے تھے کہ اُن سے بدلہ لیں۔ بلکہ اُنہیں خودکشی سے جینے میں زیادہ عذاب تھا۔ تمہیں اُن کی موت پر مطلقاً رنج نہ کرنا چاہیئے"

ملکہ: "اچھا یہ کہو! بھائی جان کا کیا حال ہے۔ اُن پر کیا گزری؟"

سوسن: "تمہارے بھائی زندہ موجود ہیں۔ لوگ اُن کی دیکھ بھال کر رہے تھے اس لیے وہ خودکشی نہ کر سکے۔ ملکہ! خدائے تعالیٰ بے گناہوں کا یار ہے اور اُن کی مدد کرتا ہے۔ اب اُمیدوں کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اپنی بوڑھی ماں

اور غریب بھائی کے حال پر رحم کرو۔ اور اپنی جان بچانے والے عاشقِ دلنواز کو بھلا نہ دو۔"

ملکہ: "آہ آہ سوسن! چپ رہو۔ خاموش ہو جاؤ۔ مجھ پر رحم کرو۔"

سوسن: "کیوں خاموش رہوں۔ کیا تم اپنے چچیرے بھائی کو نہیں چاہتیں؟"

ملکہ: "ہزار جان سے چاہتی ہوں۔ لیکن اب اُسے اپنی صورت دکھانی نہیں چاہتی۔"

سوسن: "تعجب! یہ تمہیں کیا جنون ہو گیا ہے۔"

ملکہ: "پہلے بیشک میں اُس کی محبت سے شرمسار ہوتی تھی۔ مگر اب خائف و ترساں ہوں۔ باوا جان نے اُس پر ایسے ظلم نہیں کیے ہیں کہ میں دیدہ دلیری کے ساتھ اُس سے چار آنکھ ہو سکوں۔ مجھے موت بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

یہ جملہ جیسے ہی ملکہ کی زبان سے ادا ہوا۔ خبگلی انسان ملکہ کے پیشِ نظر تھا ملکہ کے مُنہ سے دہشت میں چیخ نکل گئی۔ خبگلی انسان گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کے کہنے لگا: "عزیز ملکہ! بہر دلعزیز ملکہ! موت اُسے بھلی معلوم ہوتی ہے جو اُس کا سزاوار ہے۔ کیا تمہیں اپنی وہ عنایتیں یاد نہیں جو مجھ پر اور میرے باپ پر مبذول ہوئیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھ کو قعرِ بدنامی سے نکال کے اوجِ عزت پر پہنچانے والی تمہی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میرے اخلاق و عادات کی درستی کا موجب اور مجھے متمدن بنانے کا باعث، تمہاری ہی نوازشیں ہوئیں۔ اگر تمہاری محبت و عنایت میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو میں اُسی وحشیانہ حالت میں پڑا رہتا۔ اور ایسی گمنامی کے عالم میں جان دیتا۔ کہ کوئی مجھ پر دو آنسو بہانے والا بھی نہ ہوتا۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھے عقل و ہوش کے ساتھ زندگی بھی بخشی۔ تم اپنی اِن بے انتہا بیش بہا مہربانیوں کو کیوں نہیں خیال میں لاتیں تم میرے لیے برکتِ آسمانی ہو۔ اور رحمتِ یزدانی۔ تمہارے والد نے بے شک مجھ پر ظلم کیا۔ لیکن تم نے اُن کے جرم کا بہت بڑا کفارہ اِس طرح پر ادا کر دیا کہ مجھے مرنے سے بچا لیا۔ اب وہ وقت آیا ہے کہ تم گزشتہ کو بھلا دو۔ اور

آیندہ پر نظر ڈالو۔ یہی میرے والد کا خیال اور یہی میری والدہ کی رائے ہے۔"

ملکہ: "آپ کی والدہ! یہ آپ نے کیا کہا۔ آپ کی والدہ کہاں ہیں؟"

جبگلی انسان: "میری والدہ! آہ وہ دوسری مظلومہ ہے جو تمہارے والد کی پُر فریب کارروائیوں کا شکار ہوئی وہ زندہ پائی گئی اور خدا نے اُس کے شوہر سے اُس کو اسی طرح ملا دیا۔ جس طرح بیٹے کو ملایا تھا۔ وہ تمہاری ہی والدہ کی طرح سلیم الطبع اور نیک اخلاق ہے۔ تم اُس کو عنقریب دیکھو گی۔ وہ تمہیں بھی ایسا ہی چاہتی ہے جیسا مجھ کو۔ وہ جانتی ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا بھلائیاں کی ہیں۔ ملکہ! تم نہ صرف میری محسنہ ہی ہو بلکہ میری امیدوں کا دروازہ اور میری زندگی کا مدار و منشا ہو۔ ملکہ! عشق صادق کی حکایتیں بھی کیسی پُر لطف ہوتی ہیں۔ میں نے تمہاری جدائی میں کیسی کیسی آفتیں برداشت کیں خدا کی یہی مرضی تھی۔ اس لیے راضی برضا ہونا پڑا۔ لیکن اب وہ کانٹے جو ہمارے راستے میں بچھے ہوئے تھے سب دور ہو گئے۔ اور خوشیاں دو چند ہو کے آگئیں۔ میرا دل خوشی سے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ ملکہ! میں تمہیں چاہتا ہوں اور تم مجھے چاہتی ہو۔ یہ ایک قابل رشک بات ہے۔ میری پیاری محبوبہ! اب میں بہت جلد تمہارا ہو جاؤنگا۔ اور تم میری ہو جاؤ گی۔ پھر ہمارے درمیان کوئی چیز سوائے موت کے جدائی نہ ڈال سکیگی۔"

ملکہ: "پیارے عاشق! تم کہتے ہو کہ میں تمہاری ہو جاؤنگی حالانکہ واقعات گزشتہ کی یاد میرے کلیجہ کو مسوسے ڈالتی ہے اور مجھے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔"

جبگلی انسان: "پیاری! اب اس ذکر کو جانے ہی دو۔ گزشت آنچہ گزشت سمجھ لو کہ تقدیر میں یونہی تھا۔ اب ہم مستقبل کو یاد کرینگے۔ اور ماضی کا خیال کبھی دل میں نہ لائینگے۔ اتنا بہت کافی ہے کہ باوا جان نے تمہارے والد کے تمام قصور معاف کر دیئے۔"

اس وقت سیڑھیوں پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دینے لگی جبگلی انسان

خاموش ہوگیا اور دونوں خاتونیں ہمہ تن گوش ہو بیٹھیں۔ ایک منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا۔ اور مارکوئس۔ مارشی نس، اور ریاول، ان تینوں کو بہجت وشادمانی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ نشین لوگ ان کے داخل ہونے پر اٹھ کے کھڑے ہوگئے۔ مارکوئس نے ملکہ سے کہا "دیکھو! یہی تمہاری چچی لوسیا ہیں۔ تمہارے بھائی کے ساتھ اس غرض سے آئی ہیں کہ تمہیں لے کے تمہاری والدہ کے پاس جائیں"

لوسیا:۔ (آگے بڑھ کے) نورعین ملکہ! تم نے میرے بچے کے ساتھ جو جو نیکیاں کی ہیں وہ مجھے معلوم ہوئیں اور تم اس کے ساتھ جس اخلاص ومحبت سے پیش آتی رہیں اسے بھی میں جان چکی۔ اب تم بہت جلد میری بیٹی بنجاؤ گی۔ لو آؤ مجھ سے لپٹ جاؤ"

ملکہ نے روتے ہوئے اپنے آپ کو لوسیا پر ڈال دیا۔

سوسن:۔ (چپکے سے خبگلی انسان کے کان میں) خوشی مناؤ اب ملکہ کے دل سے کلیسا کا خیال دور ہوگیا۔ اور عنقریب تمہاری شادی ہوجائیگی"

جب اس جلسہ کو جمع ہوکے معتدبہ عرصہ گزر چکا اور پرامنگ لوگوں میں سیری کے ساتھ سکون پیدا ہوچلا۔ تو مجمع برخاست ہوا۔ ملکہ کو عرصہ کے بعد ماں کی ملاقات نصیب ہوئی۔ وہ گھڑی کیا ہی مبارک ومسرت تھی جب کہ خوشی کے آنسو، کثرت کے ساتھ، ماں بیٹی کے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے۔

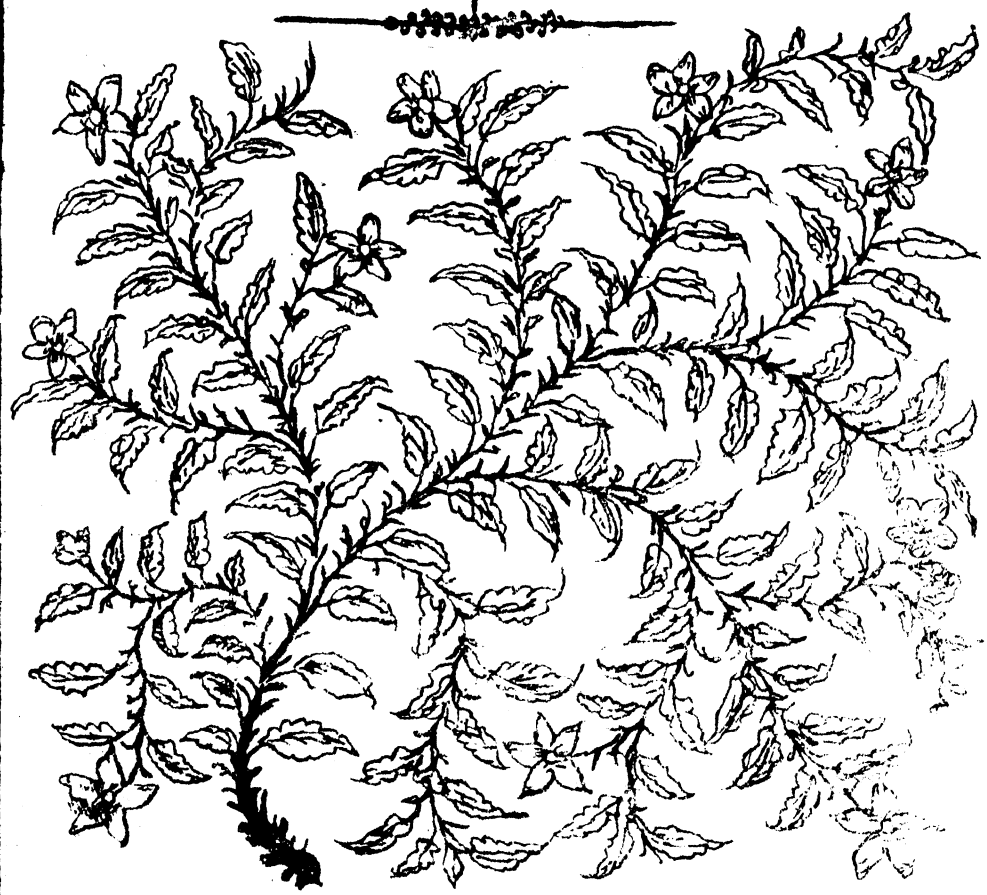
یہ دونوں اسی دن شنگین محل کو چلے گئے۔ ریاول۔ مارکوئس۔ اور بعض دوسرے دوستوں نے نواب کے جنازے کی مشایعت کی۔ کفن ودفن سے فارغ ہونے کے بعد وہ محل چھوڑ دیا گیا۔ اور اس پر "برائے فروخت" لکھ دیا گیا۔

ایک مہینے کے بعد ہینی چیمبری (خبگلی انسان) کی ملکہ سے پیٹیر گستری کی سوسن فلینی سے، اور جوب کی ہنا سے شادی ہوگئی۔ اور سب کے سب

پیرس میں رہنے لگے۔ مارکوئس نے بہو بیٹے کے لیے ایک نہایت خوش قطع محل تعمیر کرایا تھا۔ جو اپنے اسباب نمائش، سامان آرائش، اور اندرونی و بیرونی خوبیوں کے اعتبار سے پیرس میں ضرب المثل تھا۔ اسی محل میں نواب بیگم بھی رہتی تھی۔ جب تک خدا نے چاہا اُن کے عیش و کامرانی کی مجلسیں اور سرور و شادمانی کی دعوتیں اسی طرح منعقد ہوتی رہیں۔ ؎

اِن بچھڑوں کو تو نے جوں ملایا
بچھڑے ہوے سب ملیں خدایا

ختم شد



عرضِ حال

جس ناول کا ترجمہ، ناظرین کے ملاحظے سے گزرا۔ اُس کا عربی نام "انسان الغاب" ہے جس کا اصل نسخہ شاید یورپ کی کسی اور زبان میں تھا یہ ناول مجھے اپنے واجب التعظیم دوست، ملّا محمد عبد الباسط صاحب (مولوی فاضل) سے ملا تھا۔ میں اُن خصوصیات کی تصریح نہیں کرنا چاہتا جو اِس ناول میں پوشیدہ ہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اِس قسم کا کوئی ناول اُردو میں میری نظر سے نہیں گزرا تھا اِس لیے جیسے ہی میں نے اِس کا مطالعہ ختم کیا مجھے خیال آیا کہ اُردو کا سرمایہ اِس سے خالی رہے تو بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ فوراً میں نے ترجمہ شروع کر دیا۔ چونکہ مدرسہ کو گرمیوں کی تعطیل تھی اِس لیے کم و بیش ڈھائی مہینے میں ۲۷۔ مہر سنہ ۱۳۱۳ف کو ترجمہ ختم ہو گیا۔

یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ "روفائیل زاکی کوہین" جس نے اِس کو عربی کا لباس پہنایا بیروت کے مدرسہ اسرائیلیہ کا ایک طالب علم تھا۔ اور میں بھی زمانۂ ترجمہ میں عربی کا ابتدائی طالب علم تھا۔

جو لوگ جانتے ہیں کہ عربی کا طرزِ ادا اور اندازِ بیان، اُردو سے بالکل نہیں ملتا۔ نیز جنہیں معلوم ہے کہ ترجمہ میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں وہ اندازہ کر سکینگے کہ مجھے اثنائے ترجمہ میں کچھ محنت و جانکاہی اُٹھانی پڑی ہوگی یا نہیں؟۔

اثنائے طبع میں، اِس کے نامکمل اوراق جن جن صاحبوں کے مطالعہ سے گزرے ہیں۔ اُنہوں نے عموماً اِس کی نسبت دل خوش کن ریمارک کیے ہیں اِس سے میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت برباد نہیں ہوئی اور مجھے اُس کا معاوضہ مل گیا۔

ترجمہ کے وقت مجھے عربی پر پوری قدرت نہیں تھی نہ زمانۂ طبع میں (بوجوہِ چند در چند) مجھے اتنی مہلت ملی کہ میں اس پر نظرِ ثانی کر سکتا۔ لہٰذا مجھے اعتراف ہے کہ ترجمہ کو اصل سے مقابلہ کرنے پر بہت سی فروگزاشتیں ظاہر ہونگی اور چونکہ میں اُردو کا بھی ادیب نہیں ہوں اس لیے ضرور ہے کہ اس میں اردو کی بھی لغزشیں ہوں۔ اگر ناظرین اُن سے مطلع ہو کے مجھے مطلع کریں تو میں اُن کا شکر گزار ہونگا۔ اور طبعِ ثانی کا موقع پاؤنگا تو اُنہیں رفع کرنے کی کوشش کرونگا۔

ملا محمد عبدالباسط صاحب (مولوی فاضل) کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے ایک ایسے مخلص و محسن اور قابلِ قدر دوست کی عنایتیں بھی یاد آتی ہیں جس کے احسانات کی فہرست شمار و اعداد کی حسنون نہیں ہو سکتی مجھے زندگی بھر اس کا رہینِ منت رہنا پڑیگا۔ اور میں کبھی اس کے بوجھ سے سبکدوش نہ ہونگا۔

مولوی محمد نصیر الدین صاحب (منشی عالم) اہلکارِ مہتممیٔ تعلیماتِ بلدہ کی بروقت رقمی امداد سے اس ناول کی طبع کا باعث ہوئی۔ اگر ان کی یہ اعانت نہ پہنچتی ہوتی تو یہ ناول ہرگز اردوئے معلی کا خلعت نہ پہن سکتا پس اس ناول کی زندگی کے ساتھ اُن کی عطائے جزیل بھی یادگار رہیگی فقط

۲۴ شہریور ۱۳۱۸ف
جمعہ

محمد اکبر علی



اشتہار

دو پیکر اس میں قواعدِ زبانِ اُردو نہایت تحقیق کے ساتھ منضبط کیے گئے ہیں الفاظ
خلافِ قیاس کی سو سو مثالیں شعرائے مستند کے کلام سے دی گئی ہیں۔ تذکیر و
تانیثِ اردو اسماءِ غیر منصرف لفظ "نے" کے قواعد مبسوط طور پر لکھے گئے ہیں۔ کلکتہ کے
ناظمِ تعلیمات کی منظورہ ہے اور یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے قیمت عصہ۔

محاسنِ اسلام اس میں ادیانِ غیر اسلام کا رد کیا گیا ہے اور مسائل اسلام کی نسبت
دلائلِ عقلی سے ضروری التعمیل ہونا ثابت کیا ہے قیمت ۵ر

رسالۂ عمادیہ یہ ایک مختصر مگر جامع و مانع رسالہ قواعدِ زبانِ اُردو کا ہے
بالخصوص طالب العلموں کے لیے بہت مفید ہے قیمت ۳ر

حالاتِ سریاست کرناٹک نوابانِ کرناٹک کے احوال میں ہے۔ واقعات و اسبابِ
قیامِ سلطنتِ کرناٹک تفصیل سے لکھے گئے ہیں اور چونکہ
خاندان کے ایک سرسبد آوردہ ممبر نے لکھا ہے اس لیے تحقیق و تصدیق کو زیادہ
دخل ہے۔ قیمت ۲ر۔

ان کتب کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو اس کا چوتھائی رسالۂ صحیفہ کی ترقی کے لیے نذر کیا گیا ہے
ذوق کے قدردان و علم دوست حضرات ان کتب کو خرید کر صحیفہ فنڈ میں معقول رقم جمع ہونے کی کوشش کرینگے
تمام کتب کے خریداروں کو "رائے دربارۂ فرمین" کی ایک جلد تحفۃً دی جائیگی۔ مینیجر

فرہنگِ محاوراتِ فارسی موسوم بہ ارمغانِ آصفی

یہ کتاب تقریباً دو ہزار صفحہ پر جدول کی صورت میں ہے۔ اس میں لغت کا
فعل و مصدر کے ساتھ جس کو محاورہ کہتے ہیں مع حروفِ صلہ و مثال کے
یا ہے۔ اساتذۂ مسلم الثبوت کے اشعار چالیس ہزار کے قریب مثالاً مرقوم
ہر محاورہ کے معانیٔ مشکلہ سجوالۂ کتاب حاشیہ پر مختصر طور سے لکھ دیئے ہیں
کے لیے لغات و مصادر بہ ترتیبِ ابجد مرقوم ہیں۔ بہارِ عجم سے بہت زاید
ے اور مثالیں اس کتاب میں مذکور ہیں۔ شاعر کا تخلص مع اُس کے
کے لکھا گیا ہے۔ دولتِ آصفیہ خلد اللہ ملکہ نے پانچ ہزار روپیہ اس کے
ں عطا فرمایا ہے۔ بہت عمدہ کاغذ اور چھپائی کے ساتھ چھاپی گئی ہے
یداروں کے لیے آٹھ روپیہ اسکی قیمت مقرر کی ہے لیکن اہلِ استحقاق کی خاطر عایت کیجائیگی

کاتبہ العاصی و مولفہ الاسی محمد عبد المقتدر مدرس و قاضی [illegible] حیدرآباد

نودم کایں لغت را مصدر و حرف صلہ ایں است — کہ تا بیند در و آسانی
بہارِ ہندیانِ فارسی گو را نکو سنجد — نشاسد شیوۂ شیرینِ زبانانِ ایرانی
بہر حرفی سند آوردم از قولِ سخندانان — نشایندم بگو سی لے سخن حرف زباندانی